رجسٹرڈ نمبر اے ۵۳۰ | مئی ۱۹۵۵ء

سلیمان نمبر

# معارف

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

مطبع معارف اعظم گڑھ

مکتبۃ الشرق

آرام باغ (جوبلی) کراچی

جلد ۷۵ ماہ رمضان المبارک سنہ ۱۳۷۴ھ مطابق ماہ مئی سنہ ۱۹۵۵ء عدد ۵

فہرست مضامین

# معارف خاص نمبر

## سلوک و تصوّف



## متفرق مضامین



## قطعات و تاریخی مادّے

# شذرات

حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے چند ہی مہینوں بعد سے سلیمان نمبر کی تیاری شروع کردی گئی تھی، مگر مضامین کے حصول میں اتنی تاخیر ہوئی، جس کا پہلے تصور بھی نہ تھا، اور خیال یہ تھا کہ خواہ کچھ دیر ہو جائے مگر اس نمبر کو حتی الامکان مکمل ہونا چاہیئے، اس لئے اس کی اشاعت میں اندازہ سے زیادہ تاخیر ہوئی، مضامین میں کمیت کے بجائے کیفیت کا زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے، چنانچہ زیادہ مضامین جمع کرنے کی کوشش نہیں کی گئی اور قریب قریب کل مضامین انہی اصحابِ علم کے ہیں، جن کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے قریبی تعلق تھا، ان کے جلوے اتنے گوناگوں ہیں کہ ان کو ایک نمبر میں دکھانا مشکل تھا،

دامانِ نگہ تنگ گلِ حسنِ تو بسیار　　گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

تاہم اس کی کوشش کی گئی ہے کہ ان کے جمال و کمال کا اجمالی مرقع سامنے آجائے،

شروع میں خیال تھا کہ مختلف پہلوؤں پر الگ الگ مضامین لکھائے جائیں اور کتابی ترتیب پیدا کرکے مرتب کیا جائے، اگر مضمون نگاروں کو موضوع کا پابند کر دینے میں مضامین کے حاصل کرنے میں اور زیادہ دشواری ہوتی، اس لئے یہ خیال چھوڑ دینا پڑا، بیشتر مضامین کا موضوع اور اس کے مباحث عام ہیں یعنی ایک ہی مضمون میں مختلف پہلوؤں پر تبصرہ ہے، اس لئے وہ ترتیب تو نہ ہو سکی جو پیش نظر تھی، تاہم مضامین کی نوعی حیثیت کے لحاظ سے ایک موٹی سی ترتیب یہ قائم کردی گئی ہے کہ پہلے سیرت و سوانح کا حصہ ہے، پھر عمومی حیثیت کے مضامین، اس کے بعد علمی کمالات اور علمی و دینی کارناموں سے متعلق مقالات،

پھر سلوک و تصوف کے، اور آخر مین متفرق مضامین ہین، اس طرح ایک نوع کی ترتیب قائم ہوگئی ہے،

..........

ان مضامین سے حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی اور ان کے کمالات کے اہم رخ، اور ان کے بعض ایسے جلوے بھی سامنے آجاتے ہین، جو عام نگاہون سے مستور تھے، مگر ایک ایسی جامع کمالات ہستی کے حالات کا احاطہ جو تقریباً نصف صدی تک علم و فن کی ہر مجلس مین ضیا بار رہی ہو اور جس کے قلم نے اسلامی علوم و فنون کے دفتر کھنگال ڈالے ہون اور جس کے کارنامون سے دین و ملت کا ہر گوشہ معمور ہو، چند سو صفحات مین دشوار تھا، اس لئے یہ نمبر درحقیقت ان کا کوئی مفصل و جامع تذکرہ نہین بلکہ اس کا ایک اجمالی خاکہ ہے جس کی تفصیل انشاء اللہ حیات سلیمانی میں پیش کیجائیگی، وما توفیقی الا باللہ،

آئندہ مہینہ کا پرچہ شائع نہ ہوگا، اس لئے ناظرین انتظار نہ فرمائین،

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# سوانحِ حیات

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب

**ولادت و وطن** حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت بروز جمعہ بتاریخ ۲۲ر نومبر ۱۸۸۴ء مطابق ۲۳ صفر ۱۳۰۲ھ میں دیسنہ، ضلع پٹنہ (بہار) میں ہوئی، یہ گاؤں پٹنہ کے سب ڈویژن بہار شریف سے مشرق جانب آٹھ میل پر واقع ہے، اور ہمیشہ سے بڑا مردم خیز گاؤں رہا ہے، اور یہاں بڑے بڑے اطباء، ڈاکٹر، انجینیر، اور سرکاری حکام کے علاوہ علماء، فضلاء، صلحاء اور اتقیاء پیدا ہوئے،

**خاندان** سید صاحب اس گاؤں کے اُس خاندان کے لعلِ بے بہا تھے، جو دینی علوم کے ساتھ دینداری اور تقویٰ میں مدتوں سے ممتاز چلا آتا تھا، ننہال کی طرف سے زیدی اور ددھیال کی طرف سے حسینی سید تھے، اُن کے دادا مولوی محمد شیر صاحب المعروف بہ حکیم میر محمدی اپنے زمانہ کے مشہور طبیب تھے، اور صاحبِ دل صوفی بھی، اُن کی ایک کتاب نورِ محمدی مطبع معارف پریس اعظم گڈھ میں چھپی ہے جس میں سہروردیہ اور قادریہ سلسلہ کے بزرگوں کے کچھ حالات ہیں، فنِ طب میں انہوں نے دو کتابیں قرابادینِ محمدی اور مخزن الحکمۃ العلیا لکھیں، اُن کی وفات کی تاریخ یہ ہے،

کیا ہوا ثانی بقراط وارسطا طالیس
۱۳۰۳ھ

سید صاحب کے والد بزرگوار جناب سید ابو الحسن صاحب بھی بڑے حاذق طبیب تھے، زہد و تقویٰ وراثت میں ملا تھا، متانت و سنجیدگی، تہذیب و شائستگی، اور نفاست و نظافت کے بھی نمونہ تھے، پٹنہ ضلع کے مشہور قصبہ اسلام پور

کے رئیس چودھری ظہور الحق اپنے زمانہ کے بڑے صاحب ثروت و وجاہت رئیس تھے، اُن کے گھر کے سب افراد حکیم سید ابو الحسن صاحب کا بیحد احترام کرتے، اور اُن کے سامنے مؤدب ہو کر بیٹھتے تھے،

سید صاحب کے بڑے بھائی جناب سید ابو حبیب صاحب بھی فنِ طب مین بڑی مہارت رکھتے تھے اتباعِ سنت کا بڑا اہتمام رکھتے تھے، پوری عمر زہد و تقویٰ مین گذری، مجددی سلسلہ مین حضرت شاہ ابو احمد صاحب بھوپالی سے بیعت بھی تھے،

سید صاحب اپنے بڑے بھائی سے اٹھارہ سال چھوٹے تھے، اُن کی تاریخِ ولادت پر اُن کے دادا صاحب نے ایک قطعہ کہا تھا جس کے دو شعر یہ ہین،

چو جستیم تاریخ او از خرد یکایک سروشے ز تاریخ و سال
بگفتا کہ بے داد شد مصرعے شدہ مہر تابان ز برجِ کمال
۱۳۰۲ھ

یہ تاریخ ایسی نیک ساعت مین کہی گئی تھی کہ سید صاحب واقعی برجِ کمال کا مہر بن کر چمکے، اور یہ عجیب اتفاق ہی کہ یہ مہر صوبہ بہار کے ایک گاؤن مین ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء کو طلوع ہوا، اور انہتر سال کے بعد اسی تاریخ یعنی ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء کو کراچی کے اُفق مین غروب ہوا،

ابتدائی تعلیم | مکتبی تعلیم پہلے اپنے گاؤن کے ایک معلم خلیفہ انور علی اور پھر مولوی مقصود علی اکھدوی سے پائی، اُردو اور فارسی کی ابتدائی کتابین ختم کرنے کے بعد عربی مین میزان و منشعب اپنے بڑے بھائی مولوی ابو حبیب صاحب سے پڑھی، اس زمانہ مین اُن کے بڑے بھائی کو گاؤن کی مسلمان بی بیون کو اسلام کی صحیح تعلیم سے آشنا کرنے کی دھن تھی، اور اس کے لئے وہ ہفتہ مین ایک دن اُن کے سامنے اس طرح وعظ و تلقین فرماتے تھے کہ سید صاحب بی بیون کے بیچ مین بیٹھ کر مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی تقویۃ الایمان پڑھتے تھے، اور اُن کے بڑے بھائی صاحب مرحوم پردہ کے پیچھے سے اوسکی تشریح کرتے، اس طرح بھائی جو کچھ کہتے وہ سید صاحب کے دل مین بھی بیٹھتا جاتا، چنانچہ اپنی ایک تحریر مین فرماتے ہین،

"یہ پہلی کتاب تھی جس نے مجھے دینِ حق کی باتین سکھائین، اور ایسی سکھائین کہ اثنائے تعلیم و مطالعہ مین

بیسیون آندھیان آئین، اور کتنی دفعہ خیالات کے طوفان اُٹھے مگر اس وقت جو باتین جڑ پکڑ چکی تھین اُن مین سے ایک بھی اپنی جگہ سے ہل نہ سکی، علم کلام کے مسائل، اشاعرہ ومعتزلہ کے نزاعات، غزالی ورازی وابن رشد کے دلائل یکے بعد دیگرے نگاہون سے گذرے مگر اسمٰعیل شہید کی تلقین بہرحال اپنی جگہ پر قائم رہی"

بڑے بھائی سے تعلیم پانے کے بعد مزید تعلیم کے لئے اپنے والد بزرگوار کے پاس اسلام پور گئے، وہان سے ۱۸۹۹ء مین پھلواری شریف پٹنہ آئے، یہان ایک سال خانقاہ مجیبی مین رہ کر مولانا محی الدین (سجادہ نشین خانقاہ پھلواری شریف) سے عربی کی ابتدائی کتابین پڑھین، خانقاہ کے بزرگون کی صحبت مین علم وادب کا شوق پیدا ہوا، خود سید صاحب اپنی ایک تحریر مین فرماتے ہین،

"یہان خانقاہ مین ہر ہفتہ قوالی ہوتی تھی، اُس کے اثر سے اس قصبہ مین شعر وسخن کا چرچا تھا، مین نے بھی اس فضا مین سانس لی، اور یہین سب سے پہلے مولوی عبدالحلیم شرر کا ناول منصور موہنا دیکھا، اس کا یہ اثر ہوا کہ جس وقت کتاب ختم کی، پھوٹ پھوٹ کر رو دیا"

یہان کے قیام کے زمانہ مین شاہ سلیمان صاحب پھلواروی سے منطق کے ابتدائی دو چار سبق بھی پڑھے پھلواری سے مدرسہ امدادیہ دربھنگہ بھیج دیئے گئے، یہان چند مہینے رہے، اور داخلہ کے پہلے ہی ہفتہ مین وہان کے طلبہ کی انجمن مین "تعلیم نسوان" پر ایک ایسا مضمون پڑھ کر سنایا کہ ہر طرف تحسین وآفرین کا نعرہ بلند ہوا، یہ مضمون پٹنہ کے مشہور اخبار "پنچ" مین بھی چھپا،

**ندوہ مین داخلہ**

۱۹۰۱ء مین دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ مین داخل ہوئے، یہان سات سال رہ کر تعلیم کی تکمیل کی، طالب علمی کے زمانہ مین بھی متانت وسنجیدگی، تہذیب وشائستگی، مہر ومحبت اور خلق ومروت مین ممتاز تھے، یہ اوصاف اُن کو اپنے والد بزرگوار سے ورثہ مین ملے تھے، عمر کے ساتھ یہ اوصاف بھی بڑھتے گئے، اور ندوہ مین اُن کے علمی وادبی ذوق کی نشو ونما اور ترقی ہوتی رہی، دینی علوم کی تحصیل کے ساتھ شعر وسخن کا ذوق بھی ابتدا سے تھا، چنانچہ کم عمری ہی مین اپنے وطن دیسنہ کی انجمن الاصلاح کے سالانہ جلسہ مین ایک طویل ترکیب بند لکھ کر پڑھا جس کا

ایک شعر یہ ہے :

سچے کانون سے نہین سنتے ہین ارشادنبی　　ہین مسلمان بس اتنے ہی کہ کہلاتے ہین

اسی زمانہ مین امیرمینائی سے زیادہ متاثر تھے، ان کا دیوان مرأۃ الغیب برابر مطالعہ مین رکھتے تھے، دارالعلوم کے مشاعرون مین امیرمینائی ہی کا روپ بھرتے تھے،

**مضمون نگاری کی ابتداء**

ان کا سب سے پہلا مضمون ۱۹۰۳ء مین "وقت" کے عنوان سے مخزن لاہور مین چھپا جس کے اڈیٹر اس وقت اردو کے مشہور اہل قلم شیخ عبدالقادر تھے، اسی سال سید صاحب نے اپنے وطن کی انجمن الاصلاح کے سالانہ جلسہ مین "علم اور اسلام" پر ایک بسیط مضمون پڑھا جس کو اہل علم نے پسند کیا، اور جو علی گڈھ کے مشہور رسالہ علی گڈھ منتھلی میگزین مین اڈیٹر کے تعریفی نوٹ کے ساتھ چھپا،

**شاہ سلیمان پھلواروی کی پیشین گوئی**

اس زمانہ مین ندوہ کے معتمد مولانا سید محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا شاہ سلیمان پھلواروی اُس کے رکن تھے، یہ دونون بزرگ سید صاحب کی ذکاوت وذہانت کی وجہ سے اُن پر بے حد شفقت فرماتے تھے، خود سید صاحب بھی مولانا محمد علی مونگیری کی مذہبی اور دینی زندگی سے بہت متاثر ہوئے، غالباً ۱۹۰۳ء مین نواب محسن الملک دارالعلوم ندوہ تشریف لائے، اور طلبہ کا امتحان لیا، اور اُن سے اخبارات پڑھوا کر سُنے، اس امتحان مین سید صاحب اوّل آئے، انھون نے نواب صاحب کی مدح مین اپنا ایک عربی قصیدہ بھی پڑھ کر سنایا، جس سے نواب صاحب بہت محظوظ ہوئے، اس زمانہ کے اخبارات مین مولانا شاہ سلیمان پھلواروی نے اس قصیدہ کا ذکر کرکے لکھا تھا کہ انشاء اللہ ہر زمانہ مین ایک سلیمان بہار کی سرزمین مین علم اور دین کی خدمت کے لئے موجود رہے گا،

**مولانا شبلی کا سایۂ عاطفت**

۱۹۰۵ء مین جب مولانا شبلی دارالعلوم ندوہ کے معتمد تعلیم ہوکر لکھنؤ آئے، تو طلبہ نے اس خوشی مین جلسے کئے، تقریرین کین، نظمین لکھین، سید صاحب نے بھی اپنی مسرت کا اظہار ایک فارسی قصیدہ مین کیا جس کا مطلع یہ تھا :

بدہ ساقی مے کو بشکند جلباب ظلمانی خورد را نور بخشند از چراغ طور ایمانی

یہ پورا قصیدہ حیات شبلی مین موجود ہے، مولانا شبلی مین جوہر شناسی کا خاص مادہ تھا، اس لئے ندوہ مین آتے ہی اس جوہر قابل کو اپنے دامن تربیت مین لے لیا، اُن کے پاس مصر و شام کے مشہور عربی رسائل اور جدید تالیفات رہتی تھین سید صاحب اُن کا برابر مطالعہ کرتے رہے جس سے اُن مین جدید عربی ادب کا ذوق پیدا ہوا، اور آتنا بڑھا کہ وہ جدید عربی کے بھی اچھے ادیب شمار کئے جانے لگے، ۱۹۰۴ء (جمادی الثانی ۱۳۲۲ھ) مین مولانا شبلی نے ندوۃ العلماء کی طرف سے الندوہ نکالنا شروع کیا، مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی بھی اس کی ادارت مین شریک تھے، اسی زمانہ مین مولانا شبلی نے سید صاحب سے جرجی زیدان کی کتاب اللغۃ العربیہ کی تلخیص کرائی اور اس کو بہت پسند کیا، اور جنوری ۱۹۰۵ء کے الندوہ مین شائع کیا، سید صاحب نے الندوہ کے لئے پہلا مضمون "علم حدیث" پر لکھا جس کی داد مولانا حالی نے مولانا شبلی کو دی، مولانا نے سید صاحب کی علمی صلاحیت دیکھ کر اُن کی طالب علمی ہی کے زمانہ مین الندوہ کی دیکھ بھال کا کام اُن کے سپرد کر دیا،

**بنائے جامعیت** مولانا شبلی کی تربیت مین ایک طرف اُن کی مضمون نگاری کی مشق جاری رہی، دوسری طرف اپنے اُستاد مولانا حفیظ اللہ سے علم حدیث اور ہیئت مین علمی شوق کی تشنگی بجھا رہے تھے، اسی زمانہ مین شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کے رسالہ عجالۂ نافعہ کے پڑھنے سے اُن کو علم حدیث سے دلچسپی پیدا ہوئی، پھر بستان المحدثین کے مطالعہ نے اس کا شوق اور بھی زیادہ کر دیا، اور آخر مین ائمہ محدثین مین سے امام مالک نے اُن کے دل پر قبضہ کر لیا، اور موطا امام مالک سے بڑی گرویدگی پیدا ہو گئی، پھر حافظ ذہبی کی تذکرۃ الحفاظ اور حافظ ابن حجر کی فتح الباری کے مطالعہ سے محدثین کے کارنامون سے زیادہ واقف ہوئے،

حدیث کے شوق نے رجال کی طرف اور رجال نے تاریخ کی طرف رہنمائی کی، اور اس سلسلہ مین ابن ندیم کی کتاب الفہرست، حاجی خلیفہ کی کشف الظنون اور ابن خلکان کی وفیات کا مطالعہ کرتے رہے، اپنی ایک تحریر مین فرماتے ہین کہ مین نے ابن خلکان کی کتاب اتنی دفعہ پڑھی کہ اس کے حواشی اور حوالون سے اس کے اوّل و آخر کے صفحے

بھر گئے ہین،

منطق، فلسفہ، اور ادبِ عربی کا ذوق مولانا فاروق چریا کوٹی کے درس مین پیدا ہوا، اور جب مولانا شبلی سے دلائل الاعجاز پڑھی، تو اُس سے بہت متاثر ہوئے، اور اسی سے عربی لکھنے اور بولنے کی مشق پیدا کی، حماسہ اور نقد الشعر کے مطالعہ نے اس ذوق پر اور جلا دی اور ان مین عربی نظم کا بھی ذوق پیدا ہو گیا،

نقد مفتی عبد اللطیف صاحب سے پڑھی علم کلام کا شوق تمامتر مولانا شبلی کی تربیت کا نتیجہ تھا، طالب علمی ہی کے زمانہ مین شہرستانی اور ابن حزم کی الملل و النحل، ابن رشد کی کشف الادلہ اور شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ کے مطالعہ نے یکے بعد دیگرے اپنا رنگ دکھایا،

**عربی مین مضمون نگاری** دار العلوم ندوہ مین مصر و شام سے عربی اخبارات المؤید اور اللواء وغیرہ آیا کرتے تھے، سید صاحب اُن کو بالالتزام پڑھتے تھے، لکھنؤ کے مشہور اخبار اودھ پنچ کے ادارہ نے اُن سے عربی مضامین کے اردو ترجمے بھی کرانا شروع کئے، اس زمانہ مین مولانا عبد اللہ عمادی عربی مین ایک رسالہ البیان نکالا کرتے تھے، سید صاحب نے بھی اس مین عربی کے چند مضامین لکھے، اسی زمانہ مین اُن کی تحریرین مصر کے مشہور اخبار المنار مین بھی شائع ہوئین،

**خطیبانہ انداز کی پسندیدگی** ۱۹۰۷ء مین ندوہ کے فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی کا پہلا جلسہ رفاہِ عام لکھنؤ مین ہوا، اس جلسہ کی خصوصیت یہ تھی کہ اس مین جدید و قدیم علوم کے ماہرین دار العلوم ندوہ کے بلند بانگ دعوون کا امتحان کرنا چاہتے تھے، اس سلسلہ مین سید صاحب نے "علوم جدید و قدیم" کے موازنہ پر اردو مین تقریر کی، تقریر کے دوران مین کسی نے اٹھ کر کہا کہ اگر یہ عربی مین تقریر کرین تو ندوہ کی تعلیمی کرامات کا ہم یقین کرین، سید صاحب نے اسی وقت عربی مین ایسی تقریر کی کہ لوگ حیرت مین آگئے، مولانا شبلی نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ یہ تقریر پہلے سے تیار کر کے لائے ہین، اگر کوئی صاحب چاہین تو اسی وقت موضوع مقرر کر دین، یہ تقریر کرین گے، حاضرین مین سے خواجہ غلام الثقلین نے یہ موضوع دیا کہ "ہندوستان مین اسلام کی اشاعت کیونکر ہوئی"

سید صاحب نے بغیر کسی توقف کے فصیح و صحیح عربی مین تقریر شروع کردی، یہ دیکھ کر پورا جلسہ محو حیرت ہوگیا، اور ہر طرف سے نعرہاے آفرین بلند ہونے لگے، مولانا شبلی نے غایت خوشی مین اپنے سر سے عمامہ اُتار کر شاگرد کے سر پر باندھ دیا، یہ ہندوستان کی عربی تعلیم کی تاریخ مین بالکل نیا واقعہ تھا، اس لئے اس کا غلغلہ سارے ملک مین پھیل گیا،

**الندوہ کی سب اڈیٹری** سید صاحب ۱۹۰۶ء مین جب ندوہ سے فارغ ہوئے تو مولانا شبلی نے اُن کو الندوہ کا سب اڈیٹر مقرر کیا، اسی سال انھون نے "علم ہیئت اور مسلمان" "عربی زبان کی وسعت" "طبقات الارض" "برنابا کی انجیل" "مسئلہ ارتقا،، اور "قرآن مجید" وغیرہ مختلف موضوعون پر مضامین لکھ کر اپنے جامع الفنون ہونے کا ثبوت دیا، ان مضامین مین اُن کے استادی کے تحقیقی اور ادبی رنگ کی جھلک تھی، جو رفتہ رفتہ اور بھی نمایان ہوتی گئی، الندوہ کے مضامین سے اُن کی شہرت علمی حلقہ مین بڑھتی گئی، اور اب وہ کبھی کبھی مولانا شبلی کے بجائے الندوہ کے شذرات بھی لکھنے لگے،

۱۹۰۸ء کے الندوہ مین انھون نے جو مضامین لکھے ان مین ایمان بالغیب، اور مکررات القرآن کی داد مولانا شبلی نے ایک مکتوب مین لکھ کر دی، اور اُن کے تصنیفی سلیقہ پر اظہار مسرت کیا،

**ندوہ کی مدرسی** ۱۹۰۸ء مین وہ الندوہ مین علم کلام اور جدید عربی ادب کے استاد مقرر ہوئے، اور اس درس و تدریس کے زمانہ مین انھون نے دروس الادب کے نام سے دو عربی ریڈرین لکھین جو اب تک مقبول ہین،

۱۹۰۹ء کے الندوہ کے مختلف نمبرون مین اُن کا مشہور مضمون "خواتین اسلام کی شجاعت" شائع ہوا، جو اس قدر پسند کیا گیا کہ اس کو علٰحدہ رسالہ کی صورت مین بھی چھاپا گیا، اور اس وقت سے اب تک اُس کے متعدد اڈیشن نکل چکے ہین، اور اب اس کا ترجمہ انگریزی مین بھی ہوگیا ہے، اس زمانہ کے دوسرے مضامین مین "اسلامی رصدخانے" کو بھی بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، اور بعد مین اس کا بھی انگریزی مین ترجمہ ہوا،

**تدوین لغات جدیدہ** فروری ۱۹۱۰ء تک الندوہ کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے، اسی سال

ندوہ کے سالانہ اجلاس دہلی میں طے ہوا کہ عربی کے جدید الفاظ کی ایک ڈکشنری ترتیب دی جائے، یہ کام سید صاحب کے سپرد کیا گیا جس کو انھوں نے دو برس میں پورا کر کے ۱۹۱۲ء کے اجلاس لکھنؤ میں جس کے صدر علامہ سید رشید رضا مصری اڈیٹر المنار تھے، پیش کیا، یہ ڈکشنری لغات جدیدہ کے نام سے چھپ کر شائع ہوئی جس سے اب بھی عربی مدارس کے طلبہ کو بڑی مدد ملتی ہے،

**سیرۃ النبی کی تالیف میں شرکت**

۱۹۱۱ء میں جب مولانا شبلی نے سیرۃ النبی کی تدوین و ترتیب کا ایک شعبہ قائم کیا تو سید صاحب اُس کے لٹریری اسسٹنٹ ہوئے، اور اس کام میں استاد کی اعانت کے ساتھ ساتھ الندوہ میں مضامین بھی لکھتے رہے، اگست ۱۹۱۱ء میں الندوہ کی ادارت کا بار پھر ان پر ڈالا گیا، اور وہ یہ خدمت مئی ۱۹۱۲ء تک انجام دیتے رہے جس کے بعد اس الندوہ کا خاتمہ ہو گیا جس کے اڈیٹر مولانا شبلی اور مولانا حبیب الرحمن خان شروانی تھے، اُن کے اس دور کے مضامین میں "اشتراکیت اور اسلام" "اسماء القرآن"، اور "فنائے مادہ" کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے، ۱۹۱۱ء کے وسط میں انھوں نے سیالکوٹ کی انجمن شبان المسلمین میں ایک خطبہ دیا، جو "مذہب اسلام اور عقل" کے عنوان سے جولائی ۱۹۱۱ء کے الندوہ میں شائع ہوا،

**الہلال کی ادارت میں شمولیت**

۱۹۱۱ء میں اٹلی نے جب طرابلس پر حملہ کیا، تو اس سے پورے ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک شور برپا ہو گیا، اور اُن کی سیاسیات میں اُبال آگیا، سید صاحب بھی اس سے متاثر ہوئے، انکے استاد مولانا شبلی ملکی سیاست میں آزادی کے حامی تھے، اور اسلامی سیاست میں اتحاد اسلامی پر ایمان رکھتے تھے، اسی کا اثر اُن کے شاگردوں پر بھی ہوا، چنانچہ سید صاحب خالص علمی مشاغل چھوڑ کر سیاست میں آئے، جولائی ۱۹۱۲ء میں مولانا ابو الکلام آزاد نے جو مولانا شبلی کے صحبت یافتہ تھے، کلکتہ سے الہلال نکالنا شروع کیا، ملکی اور اسلامی سیاسیات میں اس کا مسلک وہی تھا جو مولانا شبلی کا تھا، اس لئے مئی ۱۹۱۳ء میں سید صاحب الہلال کے اسٹاف میں شامل ہو گئے، یہ وہ زمانہ تھا جب کہ یورپ کی بڑی سلطنتوں کی شہ پا کر بلقان کی ریاستوں نے ترکی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تھا، اور دوسرے اسلامی ممالک کی طرح ہندوستان کے

مسلمانوں کے جذبات کا سمندر بھی جوش میں آگیا تھا، ابھی یہ شور محشر بپا ہی تھا کہ اگست ۱۹۱۳ء میں کانپور کی مسجد کے انہدام کا واقعہ پیش آگیا جس میں نہتے مسلمانوں اور اُن کے معصوم بچوں پر بے دردی سے گولیاں چلائی گئیں، اس خونی سانحہ نے تمام ہندستان کو پرشور بنا دیا، سید صاحب نے ۱۲ اگست ۱۹۱۳ء کے الہلال میں اپنے خونِ دل سے "مشہدِ اکبر" کے عنوان سے ایک درد انگیز مضمون لکھا جس کی ایک ایک سطر اور ایک ایک جملہ میں اُن کی مذہبی حمیت، ملی غم خواری اور قومی درد کا طوفان اُمڈ رہا تھا، یہ مضمون الہلال کے جس پرچہ میں شائع ہوا، وہ حکومت نے ضبط کر لیا، الہلال میں انھوں نے اور بھی پر زور مضامین لکھے، اُن کے طرزِ نگارش میں چونکہ ابوالکلام ہی کا رنگ تھا، اور مضمون نگاروں کے نام شائع نہیں ہوتے تھے، اس لئے بعض مضامین مولانا ابوالکلام کی جانب منسوب ہو گئے، خود سید صاحب نے رسالہ مستقبل کراچی (اکتوبر ۱۹۴۹ء) میں تحریر فرمایا ہے،

"الہلال میں چونکہ مضمون نگاروں کے نام نہیں لکھے جاتے تھے اس لئے الہلال کے مضمونوں کے مجموعوں کے شائع کرنے والوں نے بلا تحقیق ہر مضمون کو مولانا ابوالکلام صاحب کی طرف منسوب کر دیا ہے، حالانکہ یہ صحیح نہیں، الحریۃ فی الاسلام، تذکار نزول قرآن، حبشہ کی تاریخ کا ایک ورق، قصص بنی اسرائیل، مشہدِ اکبر وغیرہ میرے مضامین ہیں"،

**دکن کالج پونہ کی پروفیسری**

سیاسی واقعات میں کچھ سکون پیدا ہوا تو سید صاحب پھر مولانا شبلی کے دفتر سیرت میں لکھنؤ آ گئے، لیکن جلد ہی ۱۹۱۳ء کے آخر میں مولانا شبلی کے ایما سے بمبئی یونیورسٹی کے ماتحت دکن کالج پونہ میں السنہ مشرقیہ کی معلمی قبول کر لی، اب وہ ملک میں ممتاز اہلِ علم کی صف میں شمار کئے جانے لگے، اس لئے مذہبی اور تعلیمی جلسوں میں اُن کی طلب شروع ہوئی،

**تدوین ارض القرآن**

ان مشاغل کے ساتھ پونہ کے قیام کے زمانے میں ایک اہم تصنیف ارض القرآن کی تالیف شروع کی، جس میں قدیم عرب کے جغرافیہ، اقوام عرب کی پرانی مذہبی اور تمدنی تاریخ پر محققانہ بحث کی گئی ہے، اور قرآن مجید کے بیانات سے اُس کی مطابقت دکھائی گئی ہے، جس زمانہ میں وہ دفتر سیرت میں کام کر رہے تھے، اُسی وقت سے

اس کے لئے مواد کی فراہمی شروع کر دی تھی، پونا مین اُس کی پہلی جلد ترتیب دی، اور دوسری جلد کے لئے مواد فراہم کیا، اور یہین بیٹھ کر الہلال کے لئے "علوم القرآن" کے عنوان سے ایک مضمون بھی لکھا تھا،

رحلتِ استاد | پونہ گئے ہوئے ابھی ڈیڑھ سال بھی پورا نہ ہوا تھا کہ ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو مولانا شبلیؒ جنت کو سدھارے مرض الموت مین شفیق استاد نے محبوب شاگرد کو تار دے کر بلوایا، اور جب وہ پہونچے تو مولانا نے معاہدہ کے طور پر شاگرد کا ہاتھ اپنے ہاتھ مین لے کر فرمایا "سیرت (یعنی سیرۃ النبی) میری تمام عمر کی کمائی ہے، سب کام چھوڑ کر سیرت تیار کرو" سعادت مند شاگرد نے بھرائی ہوئی آواز مین جواب دیا "ضرور ضرور"

وہ شفیق استاد اور مربی کی وفات سے بہت متاثر ہوئے، اور تاثرات کا اظہار "نوحۂ استاذ" مین کیا، جس کا مطلع یہ ہے،

اے متاعِ عزتِ پیشین کے پچھلے کاروان آہ وہ بھی ہٹ گیا باقی جو تھا تیرا نشان

اخبارون مین یہ نوحہ شائع ہوا تو عزیز لکھنوی، مولانا حبیب الرحمن خان شروانی اور مولانا حمید الدین فراہیؒ نے سید صاحب کی سخن وری اور سخن سنجی کی داد دی، لیکن عماد الملک بلگرامی نے اُن کو شعر وسخن کی طرف مائل ہونے سے روکا، اور انھون نے اُن کی نصیحت قبول کی، کبھی کبھی اشعار کہہ لیتے تھے لیکن اپنے کو "غیر فطری شاعر" کہتے تھے گو اربابِ نظر نے اُن کی شاعری کی بھی داد دی ہے، ڈاکٹر اقبال نے اپنے ایک مکتوب مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۱۶ء مین ان کو لکھتے ہین کہ

"آپ کی غزل لاجواب ہے، بالخصوص یہ شعر مجھے بڑا پسند آیا،

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل مین وہ ایک قطرۂ خون جو رگِ گلو مین ہے

مولانا شبلی مرحوم و مغفور نے تاریخی واقعات کو نظم کرنا شروع کیا تھا، اور جو چند نظمین انھون نے لکھی تھین وہ نہایت مقبول ہوئین، غزل کے ساتھ وہ سلسلہ بھی جاری رکھئے،"

شاید اسی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے سید صاحب کبھی کبھی اس قسم کی نظمین کہہ لیا کرتے تھے،

**تاسیس دارالمصنفین** مولانا شبلی نے اپنی وفات سے پہلے دارالمصنفین کا ایک خاکہ تیار کیا تھا لیکن اس کو عملی جامہ پہنا نہ سکے تھے، سید صاحب اُن کی رحلت کے بعد پونہ کی ملازمت چھوڑ کر اعظم گڈھ چلے آئے، اور مولانا مسعود علی صاحب ندوی کے انتظامی تعاون اور مولانا عبدالسلام صاحب ندوی کے علمی اشتراک سے ۱۹۱۵ء میں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی، یہ گویا بغداد کے دارالحکمت کا تخیل ہندوستان کے ایک شہر اعظم گڈھ کی سرزمین پر نمودار ہوا،

سید صاحب نے اپنی تصنیف ارض القرآن کی پہلی جلد کی اشاعت سے دارالمصنفین کے تصنیفی کام کی ابتدا کی، اور جب وہ اہل علم کے سامنے آئی تو اُن کو دارالمصنفین کے علمی کام کی نوعیت اور سید صاحب کی تحقیقات اور اُن کے علم ونظر کی وسعت کا اندازہ ہوا،

**انجمن ترقی اردو کی صدارت** اسی سال انجمن ترقی اردو کا سالانہ اجلاس پونہ میں ہوا جس کی صدارت سید صاحب نے کی، اس میں انھوں نے جو خطبۂ صدارت پڑھا وہ آگے چل کر اردو کی تاریخ پر تحقیق کرنے والوں کے لئے دلیل راہ بنا،

**سیاسی مشاغل** اس علمی و ادبی زندگی کے ساتھ سیاسی مشاغل بھی جاری رہے، ۱۹۱۴ء کے آخر میں جب ٹرکی نے جنگ عظیم میں شرکت کی، تو ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی جوش پیدا ہوا، اور اُن کے سیاسی لیڈر قید و بند میں ڈال دیئے گئے، اس موقع پر جو نیا گروہ اُن کی قائم مقامی کے لئے بڑھا اُس میں سید صاحب بھی تھے، چنانچہ ۱۹۱۵ء سے لیکر ۱۹۱۶ء تک انھوں نے مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے ساتھ سیاسی تحریکات میں حصہ لیا،

**رسالۂ معارف کا اجرا** لیکن اب اُن کا اصلی مرکز توجہ دارالمصنفین تھا، ابھی تک اس کا کوئی آرگن نہ تھا، اس لئے ۱۹۱۶ء کے رمضان المبارک میں معارف کا پہلا پرچہ اُن کی ادارت میں نکلا، اس کا اجرا ایسے مبارک مہینہ میں ہوا کہ اُس کی روشنی سے علمی دنیا آج تک منور ہے، معارف کے پہلے نمبر میں اُن کا مقالہ "روزہ" پر تھا، شروع کے نمبروں میں بیشتر مضامین انہی کے ہیں، رسالہ کی ادارت کے فرائض کے ساتھ استاذ مرحوم کے چھوڑے ہوئے مسودات اور سیرۃ النبی کی ترتیب و تبویب میں بھی مشغول رہتے، رفقا کے نئے علمی لائحہ عمل تیار کرنے اور دارالمصنفین کے مربیوں اور ہمدردوں کا حلقہ پیدا کرنے کا بار بھی اُن ہی پر تھا،

**دارالمصنفین کے فروغ مین جانکاہ کوشش**

دارالمصنفین کے قیام کے آغاز سے آخر وقت تک اُن کا معمول یہ تھا کہ فجر کی نماز کے بعد ناشتہ کر کے کتب خانہ مین آجاتے، ۱۲ بجے دن تک دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر کام کرتے، پھر کھانا کھا کر کچھ قیلولہ فرماتے، ظہر کی نماز کے بعد پھر کتب خانہ تشریف لاتے، اور عصر تک کام مین مشغول رہتے، عصر کی نماز کے بعد چاے پیتے، اس وقت رفقاے دارالمصنفین سے علمی مذہبی سیاسی اور تفریحی باتین کرتے، مغرب کی نماز کے بعد بھی کام کا سلسلہ جاری رہتا، مگر جب کثرت محنت سے صحت خراب رہنے لگی، تو رات کو کام کرنا چھوڑ دیا تھا، لیکن دن بھر محنتِ شاقہ کرتے، جب علمی مذہبی اور سیاسی جلسون مین شرکت کے لئے سفر مین جاتے تو تشنہ علمی ریاضت سے چھٹکارا اور کچھ آرام مل جاتا،

دارالمصنفین کے کتب خانہ، پریس اور دفتر کے تمام کارکنون سے اس طرح ہمدردی و محبت اور لطف و شفقت سے پیش آتے تھے کہ ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ سب سے زیادہ اسی کو محبوب رکھتے ہین، اور وہ اُن کی خوشنودی اور رضامندی کی خاطر بڑی تن دہی اور دلسوزی سے کام کرتا، اُن کی زندگی کا اصلی کارنامہ دارالمصنفین ہی ہے، جس کو وہ اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتے تھے،

اُن کے حُسنِ نیت کی وجہ سے دارالمصنفین کا علمی وقار ملک مین جلد ہی قائم ہوگیا، چنانچہ ابھی اس کو قائم ہوئے دو سال بھی نہین گذرے تھے کہ مہاراجہ بڑودہ کی طرف سے بڑے پیمانہ پر موازنۂ مذہب کا ایک ادارہ ایک فرانسیسی کی نگرانی مین قائم ہوا تو اسلامی علوم و مسائل کی تحقیقات اور رفع شبہات کے لئے دارالمصنفین ہی مرجع قرار پایا،

**جلسہ علماے بنگالہ کی صدارت**

۱۹۱۷ء مین علماے بنگالہ کے کلکتہ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کی، جس مین تمام رہنمایانِ ہند شریک تھے، اسی کے ساتھ کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس بھی اُن ہی تاریخون مین تھے، اس لئے مجلس علماے بنگالہ کا یہ جلسہ بڑا اہم تھا، اس مین سید صاحب نے جو خطبہ پڑھا، وہ بنگال مین بڑا اثر انداز ہوا، یہ پہلا خطبہ تھا جس مین جنگ کے ہیبت ناک اثرات کے باوجود مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کا نام جر

اس زمانہ مین نظربند تھے، جرأت کے ساتھ لیا گیا، اس سے لوگون کے دلون سے انگریزون کا رعب اُٹھا،

**۱۹۱۷ء کے علمی کام**

۱۹۱۷ء کے علمی مضامین مین "اہل السنت والجماعت" بڑا مقبول ہوا، پہلے یہ معارف کے کئی نمبرون مین شائع ہوا تھا، پھر رسالہ کی صورت مین چھپا، اس کا ترجمہ ملیالم، تلنگو اور بنگلہ مین بھی ہوا، اسی سال اُن کی کتاب "حیات امام مالک" شائع ہوئی، اُن کو امام مالک سے خاص عقیدت اور اُن کی موطا صحیحین سے زیادہ پسند تھی، گو آخر عمر مین جزوی مسائل مین بھی امام ابوحنیفہ کے مسلک کے پابند ہوگئے تھے، لیکن امام مالک سے عقیدت قائم رہی، ۱۹۰۸ء کے الندوہ مین "حیاتِ امام مالک" کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا تھا جو کئی نمبرون مین شائع ہوا تھا، اور تقریباً ۵۰ صفحے پر مشتمل تھا، اس کو اور زیادہ مکمل کرنے کا برابر ارادہ کرتے رہے، مگر دوسرے کامون کی مشغولیت نے اس کا موقع نہ دیا، اس لئے اسی مضمون کو رسالہ کی صورت مین شائع کردیا، یہ کچھ ایسا مقبول ہوا کہ اُس کی مانگ ابھی تک جاری ہے، اور اس کے کئی اڈیشن نکل چکے ہین،

**سیرۃ النبی جلد اول کی اشاعت**

۱۹۱۸ء مین اپنے استاذ مرحوم کی سیرۃ النبی جلد اول کو مرتب کرکے ملک کے سامنے پیش کی جس کے غلغلہ سے ہندوستان کا گوشہ گوشہ گونج رہا تھا، اس کی اشاعت پر سید صاحب نے بجا طور پر لکھا تھا کہ

ع شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

**ارض القرآن جلد دوم کی اشاعت**

اسی سال اُن کی محققانہ تصنیف ارض القرآن کی دوسری جلد بھی شائع ہوئی، جس مین اقوام عرب کے لسانی، مذہبی، تجارتی، اور تمدنی حالات پر بحث ہے، اس سے اُن کی علمی شہرت مین اور بھی زیادہ اضافہ ہوا، ۳۶ء مین مولوی سید مظفر الدین ندوی ایم اے نے اس کا انگریزی مین ترجمہ کیا اور معلومات مین اضافہ کرکے اس مین انگریزی کے لحاظ سے بعض ترمیمین اور تغیرات کئے،

۱۹۱۸ء کے معارف مین اُن کے جو مضامین شائع ہوئے، اُن مین "ہندوؤن کی علمی اور تعلیمی ترقی مین مسلمانون کی کوششین" کی طرف خاص طور پر لوگون کی نظر اٹھی، اس مین ہندو مسلمانون کو ایک دوسرے سے قریب

لانے کی کوشش کی گئی ہی، اربابِ تحقیق کو اس سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ سید صاحب کی نظر تاریخِ ہند پر بھی کتنی گہری ہی،

اس مضمون کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے،

**تحریکِ خلافت** ۱۹۱۹ء کا سال ہندوستان کے مسلمانون کے لئے بڑا پر آشوب تھا، پہلی جنگ عظیم کے بن اسلامی ممالک خصوصًا ٹرکی پر سخت وقت آیا، اس کے حصے بخرے کئے جا رہے تھے، ٹرکی کا سلطان قسطنطنیہ مین اتحادیون کے ہاتھون بے بس ہو رہا تھا، اتحادی فتح کے غرور کے نشہ مین خدا کی خدائی کی شکست وریخت مین مصروف تھے اور ملکون کی قسمت کا فیصلہ کر رہے تھے، اس وقت ہندوستان کے چند بہادر غیور اور دردمند مسلمان رہنماؤن نے اپنی جانون پر کھیل کر مجلس خلافت کے نام سے ایک مرکزی مجلس بمبئی مین قائم کی جس کی شاخین سارے ہندوستان مین پھیل گئین، اس مجلس مین مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی نے ایسی عظیم قوت پیدا کر دی کہ پورا ہندوستان اُس کی آواز پر اٹھتا اور بیٹھتا تھا، اس تحریک مین سید صاحب بھی پیش پیش رہے، اس کا پہلا اجلاس لکھنؤ مین ہوا، تو انھون نے علما، اور اربابِ سیاست کے درمیان حلقۂ اتصال کا کام دیا، اور ایسی پردرد تقریر کی کہ مسندِ صدارت سے پائین تک ساری مجلس بزم ماتم بن گئی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور چودھری خلیق الزمان وغیرہ کے سارے اختلافات خس و خاشاک کی طرح بہ گئے، اسی سال انھون نے سید الاحرار سید فضل الحسن حسرت موہانی کی رہائی کی تقریب مین "نظربندانِ اسلام" کے عنوان سے معارف کے کئی نمبرون مین ایک مضمون لکھا جو بہت پسند کیا گیا،

**وفد خلافت مین یورپ کا سفر** فروری ۱۹۲۰ء مین مولانا محمد علی کی سرکردگی مین ٹرکی کے معاملات مین انصاف طلبی اور مسلمانانِ ہند کے جذبات کی ترجمانی کے لئے ہندوستان سے جو وفد خلافت یورپ گیا تھا، اس کے تین ممبرون مین ایک ممبر یہ بھی تھے، صدر مولانا محمد علی، ارکان سید حسین اور سید صاحب اور سکریٹری حسن محمد حیات تھے، یہ وفد انڈین نیشنلزم اور پین اسلام ازم کو متحد کر کے ہندوستان کی آزادی کی جنگ لڑنے چلا تھا، جب یہ لوگ پورٹ سعید پہنچے اور سید صاحب جامع عباسی مین نماز مغرب

پڑھنے کے لئے گئے، تو وہاں ایک بزرگ فقہ کا درس دے رہے تھے، سید صاحب نے اُن سے مل کر وفدِ خلافت کی نوعیت بتائی تو تمام حلقۂ درس جوشِ مسرت سے لبریز ہو گیا، اور سب نے وفد کی کامیابی کے لئے دعا کی، اور جب سید صاحب مسجد سے نکلے، تو لوگوں کا اس قدر ہجوم ہوا کہ وہ بدقت جان چھڑا کر آگے بڑھ سکے، اس وفد کے ارکان اٹلی، فرانس اور انگلستان میں ٹرکی کے حقوق کے لئے زبان و قلم اور دعوت و اشاعت کے ذریعہ لڑتے رہے، لندن میں وزیر اعظم لائڈ جارج، لارڈ فشر اور دوسرے ممتاز لیڈروں سے ملنے کے علاوہ حجاز و شام اور مصر کے وفود سے بھی ملاقات کی، حجاز و شام کے وفد کے سرگروہ نوری سعید پاشا اور حداد پاشا تھے، سید صاحب نے اُن سے مل کر خلافت و جزیرۃ العرب کے مسائل اور ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات اور اُن کے مذہبی مطالبات بیان کئے، تو وہ سب بہت متاثر ہوئے، اور اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، اسی زمانہ میں سعد زاغلول پاشا بھی مصری وفد کے ساتھ لندن آئے ہوئے تھے، اُن سے بھی مل کر سید صاحب نے ہندوستانی مسلمانوں کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی، سعد زاغلول نے اُن کی عربی سے متاثر ہو کر کہا کہ آپ ہم سے بھی اچھی عربی بولتے ہیں، اس سفر میں آرنلڈ، براؤن، اسٹوری اور مارگولیتھ سے بھی ملاقات رہی، پروفیسر مارگولیتھ اور ایک اطالوی مستشرق سے مسئلۂ خلافت پر علمی نبرد آزمائی بھی ہوئی، اور اس مسئلہ پر مشہور انگریزی مجلہ "فارن افیرز" میں جو مدلل اور جامع مضمون لکھا اس کی تعریف مولانا محمد علی نے بار بار کی، وفد کے سیاسی کاموں کے ساتھ انڈیا آفس، برٹش میوزیم، آکسفورڈ اور کیمبرج کے کتب خانے بھی دیکھتے رہے جس سے اُن کا یہ سفر علمی حیثیت سے بھی مفید رہا، لندن سے واپسی کے بعد ڈاکٹر اقبال نے اُن کو ایک خط میں تحریر فرمایا،

"مراجعت مع الخیر مبارک" آپ نے بڑا کام کیا جس کا صلہ قوم کی طرف سے شکر گذاری کی صورت میں مل رہا ہے، اور دربارِ نبوی سے نہ معلوم کس صورت میں عطا ہوگا، وزرائے انگلستان کا جواب وہی ہے، جو ان حالات میں ہمیشہ دیا گیا،........ تاہم مجھے یقین ہے کہ ہندی وفد کا سفر یورپ بڑے اہم نتائج پیدا کرے گا،"

واپسی پر قصبہ بہار شریف ضلع پٹنہ کی خلافت کمیٹی نے ان کا شاندار خیر مقدم کیا، انھون نے اس کمیٹی کے بڑے اجلاس کی صدارت بھی کی، اس مین صوبہ کے اکابر علما، اور زعمار کے علاوہ بابو راجندر پرشاد (موجودہ صدر جمہوریہ ہند) بھی تھے، جنھون نے اپنی تقریر مین سید صاحب کی سیاسی بصیرت کو سراہا،

**سیرۃ النبی جلد دوم کی اشاعت**

لندن جانے سے پہلے استاذ مرحوم کی سیرۃ النبی کی دوسری جلد چھپنے کے لئے دیدی تھی، اس کا دیباچہ لندن ہی سے لکھ کر بھیجا، پہلی جلد نبوت کے پرآشوب عہد غزوات پر مشتمل تھی، دوسری جلد نبوت کے سہ سالہ امن کی زندگی کی تاریخ ہے،

**سیرت عائشہؓ**

ابھی وہ لندن ہی مین تھے کہ ان کی کتاب سیرۃ عائشہ شائع ہوئی، جس کا آغاز طالب علمی کے زمانہ مین کیا تھا، مگر اسکی تکمیل بعد مین کی، اس کی اشاعت پر بیگم صاحبہ بھوپال نے پانچ سو روپے انعام مرحمت فرمایا، ڈاکٹر سر اقبال نے یہ کتاب پڑھی تو سید صاحب کو تحریر فرمایا کہ

"سیرۃ عائشہ کے لئے سراپا سپاس ہون، یہ ہدیہ سلیمانی نہیں سرمۂ سلیمانی ہے، اس کتاب کو پڑھنے سے میرے علم مین بہت مفید اضافہ ہوا، خدائے تعالیٰ جزائے خیر دے"

**ترک موالات**

۱۹۲۰ء کے آخر مین یورپ کے سفر سے واپس ہوئے تو ترکِ موالات کی تحریک ہندوستان مین شروع ہوگئی، اور مجلس خلافت اور کانگریس کے پلیٹ فارم مشترک ہوگئے، سید صاحب نے بھی دوسرے علما اور زعمار کے ساتھ مل کر ترکِ موالات کی تحریک کے سلسلہ مین ملک کا دورہ کیا، اخبارات مین مضامین لکھے، جا بجا تقریرین کین، ۱۹۲۱ء مین مجلس خلافت کا جو سالانہ اجلاس میرٹھ مین منعقد ہوا تھا، اوسکی صدارت کی، اسی سال "خلافت عثمانیہ اور دنیائے اسلام" اور "خلافت اور ہندوستان" کے عنوان سے دو اہم تاریخی مضامین معارف کے کئی نمبرون مین لکھے، جو علٰحدہ علٰحدہ رسالون کی صورت مین بھی شائع ہوئے، ان رسالون سے تحریک خلافت کو بڑی مدد ملی، ۱۹۲۱ء کی کانگریس احمد آباد مین منعقد ہوئی، تو اسکی ورکنگ کمیٹی کے ممبر نامزد کئے گئے، اور سال بھر تک خلافت کیساتھ کانگریس کے کامون مین شریک رہے، جمعیۃ العلما

کی مجلس عاملہ کے بھی رکن مقرر ہوئے،

**دارالمصنفین کی شہرت**

۱۹۲۲ء تک دارالمصنفین کی شہرت مین چار چاند لگ چکے تھے، سیرۃ النبی کی دو جلدون اور سید صاحب کی تصانیف کے علاوہ مولانا عبدالسلام ندوی کی اسوۂ صحابہ اور سیرۃ عمر بن عبدالعزیز مولوی یونس فرنگی محلی کی روح الاجتماع، مولوی عبدالباری صاحب ندوی کی برکلے، اور "مبادی علم النسانی" اور مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی مبادی فلسفہ اور مکالمات برکلے، پروفیسر سجاد مرزا کی الاستدلال، تسہیل البلاغت وغیرہ جیسی سنجیدہ کتابون اور معارف کے بلند پایہ علمی تحقیقی مضامین نے تمام اصحاب علم ونظر کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا، اور اردو زبان کا لٹریچر ایک نئے نہج مین ڈھلنے لگا، ڈاکٹر اقبال نے معارف کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا کہ یہی ایک رسالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارت ایمانی مین ترقی ہوتی ہے، مولانا محمد علی مرحوم کو بھی معارف سے بڑا انس ہو گیا تھا، چنانچہ وہ اپنے ایک مکتوب مورخہ ۸ دسمبر ۱۹۱۹ء مین سید صاحب کو لکھتے ہین،

"میرے متعدد انگریزی رسالون کی جلدین نہین بندھی ہین، اور ممکن ہو کہ میرے عزیز دوست اور سارق کتب سید جالب صاحب اُن مین سے اکثر پر قبضہ بھی کر بیٹھے ہون، یہ شرف خاص معارف کو حاصل ہوگا کہ مجلدات تیار کرائی جائین گی،"

مولانا ابوالکلام آزاد اپنے ایک خط مین سید صاحب کو تحریر فرماتے ہین:۔

"معارف کے متعلق آپ کیا کہتے ہین صرف یہی ایک پرچہ ہے، اور تو ہر طرف سناٹا ہو بحمداللہ کہ مولانا شبلی مرحوم کی تمنائین رائگان نہ گئین، اور صرف آپ کی بدولت ایک جگہ ایسی بن گئی، جو صرف خدمت علم وتصنیف وتالیف کے لئے وقف ہو"

معارف اور دارالمصنفین کی شہرت بیرون ہند مین بھی پھیلتی جا رہی تھی، چنانچہ اسی زمانہ مین ڈاکٹر نکلسن (کیمبرج یونیورسٹی) نے اس کے ناقدانہ مباحث، علمی مقالات، مستشرقانہ معلومات اور مشرقی ومغربی علوم وخیالات کی آمیزش کی داد دی، اور اس حیثیت سے ہندوستان کی ترقی پر اپنی خوشی کا اظہار کیا، پھر فرانس کے مشہور مستشرق

موسیو لوئز ماسینان نے اپنے ایک لکچر "اسلام مین پیشہ کی اجتماعی حیثیت" کے سلسلے مین دارالمصنفین سے تعاون چاہا،

**بہار خلافت کانفرنس کی صدارت**

۱۹۲۲ء مین صوبہ بہار کی خلافت کانفرنس کی صدارت کی، اس کے خطبہ مین جزیرۃ العرب کی پوری تاریخی سرگذشت تھی،

**سیرۃ النبی جلد سوم کی اشاعت**

۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۳ء تک اپنی تصنیف سیرۃ النبی کی تیسری جلد کی تدوین مین مشغول رہے، جو ۱۹۲۴ء مین چھپ کر مشتاق نگاہون کے سامنے آئی، اس مین معجزہ کی حقیقت اسکے امکان و وقوع پر فلسفۂ قدیمہ، علم کلام، فلسفۂ جدیدہ اور قرآن مجید کے نقطہ ہائے نظر سے مبسوط تبصرہ ہے، اور اس کے بعد مکالمۂ الٰہی، وحی، نزول ملائکہ، عالم رویا، معراج اور شرح صدر کا بیان ہے، اس کی ترتیب، واقعات کی تفتیش و تلاش اور مسائل و نظریات کی بحث و تحقیق مین جو محنت و کاوش اور دیدہ ریزی کی گئی ہے، اس سے اُن کا علمی پایہ اور بھی بلند ہوا،

**وفد حجاز کی صدارت**

اسی سال یعنی ۱۹۲۴ء ہی مین ابن سعود اور شریف حسین مین جنگ کا آغاز ہوا، دونون نے مجلس خلافت کی طرف ہاتھ بڑھایا، اس وقت مسلمانانِ ہند نے سید صاحب کی قیادت مین ایک وفد حجاز کو بھیجا، تاکہ وہ فریقین کے سامنے مجلس خلافت کی تجاویز کو پیش کرے، سید صاحب نے دو ماہ جدہ مین رہ کر مفوضہ فرائض انجام دیئے، اور بڑی دلیری سے شریف حسین اور سلطان ابن سعود کی حکومتون سے حجاز مین مسلمانون کی ایک جمہوری حکومت کے قیام کے مسئلہ پر گفت گو اور خط و کتابت کرتے رہے، ایک جلسہ مین ایسی پرجوش تقریر کی کہ شریف حسین کے ایک حبشی سنتری نے تقریر کے بعد کہا کہ اگر یہ وفد انگریزون کی پناہ مین نہ ہوتا تو ہم صدر وفد کو گولی مار دیتے، جب وفد کے مشن مین سید صاحب کو ناکامی ہوئی، تو مصر کا رُخ کیا، اور وہان کے علماء و اکابر سے مل کر حجاز کے معاملہ پر گفت گو کی، شیخ ازہر نے انکی تجاویز سے اپنی رضامندی ظاہر کی، یہ اس وفد کی ایسی کامیابی تھی کہ دنیا کے تمام اخبارات نے اس کو نمایان سرخیون سے مشتہر کیا، اس سفر مین سید صاحب نے حجاز کی تعلیمی حالات کا بھی گہرا مطالعہ کیا، جس کو مضمون کی شکل مین معارف (مئی ۱۹۲۵ء) مین شائع کیا،

**ندوۃ العلماء کے کام** یون تو ندوہ کے معتمد تعلیمات کی حیثیت سے ہمیشہ اس سے دلچسپی لیتے رہے لیکن ۱۹۲۵ء مین اس کی طرف خاص توجہ کی، اور فروری مین اس کا سالانہ جلسہ بڑے اہتمام سے کرایا، جس مین علماء اور خواص نے بڑی تعداد مین شرکت کی، ندوہ کو ایک دارالاقامہ کی سخت ضرورت تھی، سید صاحب کی تحریک سے اس جلسہ مین یہ قرار پایا کہ ہندوستان کے ہر صوبہ کی طرف سے دس دس کمرون کا ایک بلاک تیار کیا جائے، مختلف صوبون کے اکابر نے اس پر آمادگی ظاہر کی، اور اس اجلاس کے بعد سید صاحب نے خود صوبہ بہار کا دورہ کر کے اس مقصد کے لئے ایک گران قدر رقم جمع کی،

**خطباتِ مدراس** اسی سال اکتوبر اور نومبر مین مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف سودرن انڈیا کی دعوت پر سیرۃ نبوی کے مختلف پہلوؤن پر آٹھ خطبے دیئے جو بعد مین خطباتِ مدراس کے نام سے شائع ہوئے، ان خطبون کے خلاصے وہان کے روزانہ انگریزی اخبارات "ہندو" اور "ڈیلی ایکسپرس" مین برابر نکلتے رہے، اور بہت دلچسپی سے پڑھے گئے، یہ اپنے مضامین و مباحث، ادب انشاء اور زورِ خطابت کے لحاظ سے اردو لٹریچر کے شاہکار سمجھے جاتے ہین[1]

اسی سفر مین بنگلور، وانمباڑی اور تریانور جا کر بھی مختلف مذہبی عنوانات پر خطبے دیئے،

**جمعیۃ العلماء کی صدارت** مارچ ۱۹۲۶ء مین جمعیۃ العلماء کا جو اہم سالانہ اجلاس کلکتہ مین ہوا، اس کے وہ صدر منتخب ہوئے، اس موقع پر انھون نے جو خطبۂ صدارت پڑھا، وہ مسلمانون کی سیاست مین یادگار ہے،

**پھر وفد حجاز** اسی سال پھر وفدِ حجاز کے صدر منتخب ہوئے، اس وقت ہندوستان مین شدھی اور سنگھٹن کا زور تھا، اس موقع پر دہلی مین مجلس خلافت کا ایک خاص اجلاس ہوا، اور حکیم اجمل خان مرحوم کی تحریک پر سید صاحب نے اس کی صدارت کی، اس اجلاس مین انھون نے ہندو اور مسلمانون کے تعلقات کی نسبت مسلمانون کے نقطۂ نظر کو بڑی وضاحت سے پیش کیا، اس سے فراغت کے بعد وفد خلافت لے کر حجاز گئے۔ اس کے ممبر مولانا شوکت علی، اور مولانا محمد علی، اور

---

[1] اس کا انگریزی ترجمہ جناب سید لطیف صاحب (فی الحال ہینڈ ماسٹر پاکستان ریڈیو) نے Living Prophet کے نام سے کیا ہے،

شعیب قریشی تھے، سلطان ابن سعود نے مسئلہ حجاز کے سلسلہ مین تمام دنیا سے مسلمانون کی ایک موتمر مکہ معظمہ مین طلب کی تھی جس مین ٹرکی، مصر، افغانستان، یمن اور دوسرے اسلامی ملکون کے نمایندے شریک ہوئے، اور چند ہفتون تک برابر اس کے جلسے ہوتے رہے، موتمر کے نمایندون نے سید صاحب کو موتمر کا نائب رئیس منتخب کیا، اور صدر موتمر کی غیر حاضری مین اس کی صدارت بھی کی، اس مین انھون نے جو عالمانہ اور مبصرانہ تقریرین کین، اُن سے ہندوستان کے مسلمانون کی علمی و دینی عظمت شرکا کے دلون مین قائم ہوگئی، حجاز مین وفد کے کامون کی مشغولیت کے باوجود اُن کا قلم بھی روان دوان رہا، چنانچہ وہان سے آنے کے بعد حجاز کے کتب خانے "کے عنوان سے معارف کے کئی نمبرون مین ایک طویل مضمون لکھا،

**مارگولیتھ سے علمی معرکہ** اس وفد سے واپسی کے بعد وہ زیادہ تر علمی، مذہبی، اور تعلیمی کامون مین مشغول رہے، ۱۹۲۵ء مین مانچسٹر گارجین کے ایک عیسائی مضمون نگار نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق بعض نامناسب باتین مارگولیتھ کی کتاب کے حوالہ سے لکھین جو خود مارگولیتھ نے واقدی کے جرمن ترجمہ ولہاؤسن کے حوالہ سے لکھی تھین، اس پر واقدی کے معتبر اور غیر معتبر ہونے کی بحث چھڑ گئی، سید صاحب نے ۱۹۲۶ء اور ۱۹۲۷ء کے معارف کے متعدد مضامین مین یہ ثابت کیا کہ واقدی کی حیثیت ایک داستان گو سے زیادہ نہین ہے، اور اس کا شمار معتبر مورخین مین نہین ہے، تاریخ و سیر مین اس کا حوالہ دینا ایسا ہی ہے، جیسے ملکہ الزبتھ کی سوانح عمری مین رینالڈس کا حوالہ دیا جائے، مارگولیتھ کے علاوہ ڈرہم یونیورسٹی کے عربی کے پروفیسر ڈاکٹر گولیم نے بھی اس بحث مین حصہ لیا تھا، سید صاحب نے دونون کو اپنے محققانہ اور فاضلانہ مضامین سے خاموش کیا، ان مضامین کا انگریزی ترجمہ اسلامک ریویو ووکنگ مین بھی شائع ہوا، اور ایک صاحب نے حجاز مین ان کا ترجمہ عربی مین بھی کیا،

**زہر کا تریاق** ۱۹۲۷ء مین ایک یورپین اہل قلم نے لکھا کہ "مسلمان ارسطو کی گاڑی کے قلی تھے" سید صاحب نے اپنے ایک مضمون مین اس کی فاضلانہ تردید کی جس کا انگریزی ترجمہ حیدرآباد دکن کے رسالہ اسلامک کلچر مین بھی شائع ہوا، اسی سال یہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ اسلام کا قانون عورتون کے لئے حد درجہ تنگ اور سخت گیر ہے،

سید صاحب نے "مسلمان عورتوں کے حقوق" کے عنوان سے اس کی تردید میں ایک طویل مضمون لکھا، اور یہ دکھایا کہ عورتوں کے ساتھ جتنی بے انصافیاں تھیں، ان سب کا خاتمہ آخری ربانی پیغام اور تکمیلی دین نے کیا، اور اُن کے واجبی حقوق دے کر ان کا درجہ بلند کیا،

**انجمن حمایتِ اسلام لاہور میں تقریر**

اسی سال کے وسط اپریل میں انجمن حمایتِ اسلام لاہور کی دعوت پر "عہدِ رسالت میں اشاعتِ اسلام" پر تقریر کی جو بہت پسند کی گئی، اس موقع پر لاہور کے تمام اصحابِ علم سے ملاقاتیں رہیں، ڈاکٹر اقبال نے بڑی تواضع سے ملنے میں پیش دستی فرمائی، ان کی قیام گاہ پر آئے، اور بڑی گرم جوشی سے ملے، اور پھر اُن کے اعزاز میں جتنی علمی صحبتیں رہیں، ان میں ڈاکٹر اقبال ہی شمعِ محفل رہے، چنانچہ سید صاحب نے پنجاب کے سفر سے واپسی پر شذرات میں تحریر فرمایا کہ ............ انھوں نے (یعنی ڈاکٹر اقبال نے) "شمع اور شاعر" لکھا ہے، لیکن میں نے تو لاہور میں خود شاعر کو شمع دیکھا، اور قدر شناسوں کو اس کا پروانہ پایا، اُن کی صحبت لاہور کے نوجوانوں کی دماغی سطح کو بلند کر رہی ہے، اُن کے فلسفیانہ نکات عالمانہ افکار شاعرانہ خیالات اُن کے آس پاس کی دنیا کو ہمیشہ متاثر رکھتے ہیں" اس ملاقات کے بعد دونوں میں اور زیادہ گہرے تعلقات پیدا ہوئے،

**جنوبی ہند کا سفر**

اسی سال کے اکتوبر میں مجلس العلماء کی صدارت کے لئے ترچناپلی تشریف لے گئے، یہ مجلس تامل زبان میں اسلام کی تبلیغ اور اشاعتِ تعلیم کا کام انجام دیتی تھی، اس سفر میں ویشارام، امبور، عمرآباد، بنگلور، میسور اور حیدرآباد دکن میں بھی تقریریں کیں، اس لمبے سفر کا مقصد ندوۃ العلماء کے دارالاقامہ کی تعمیر کے لئے چندے کا حصول تھا، وہاں سے واپسی کے بعد نومبر میں ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لئے امرتسر گئے، اسی اجلاس میں ندوہ کے لئے نواب صاحب بہاولپور نے پندرہ ہزار کی رقم عطا کی، امرتسر سے وہ جمعیۃ العلماء کے اجتماع میں شرکت کے لئے پشاور بھی گئے،

**دارالمصنفین کی روز افزوں شہرت**

۱۹۲۸ء میں خاص علمی کاموں خصوصاً سیرۃ النبی جلد چہارم کی تدوین میں مشغول رہے،

دار المصنفین اب اپنے مذہبی، علمی و ادبی کارنامون کی وجہ سے ہند اور بیرونِ ہند مین بہت مشہور ہو چکا تھا، فرانس کے علمی رسالہ "دنیائے اسلام" مین اس کا ذکر کئی بار کیا گیا، مصر کے رسالہ الزہرا مین اس پر ایک مقالہ بھی شائع ہوا، ایک ترک نوجوان شہاب الدین آفندی نے جو مولانا روم کے خاندان سے تھے، اپنے ہم وطن نادرۂ روزگار مہندس استاذ عیسیٰ اور اُن کے رفقاء کے حالات قلمبند کرنے کے سلسلہ مین دار المصنفین کی طرف رجوع کیا، امریکہ کے رسالہ مسلم ورلڈ اپریل ۱۹۲۸ء کے دو مضامین مین دار المصنفین کا ذکر خاص طور پر کیا گیا، ٹرکی مین الفاروق اور سیرۃ النبی کے حصۂ اول و دوم و سوم، سیرۃ عائشہ اور سیر الصحابہ کی بعض جلدون کے ترجمے ترکی زبان مین کئے گئے، اور وہان کے علماء اور عام شائقین نے ان کتابون کو توقع سے زیادہ پسند کیا،

اس کی علمی شہرت سے ہندوستان کے سیاسی لیڈرون کی نظرین بھی اس کی طرف اٹھین، اور وہ ایسا مرکز بن گیا، جہان مسلمان اور ہندو لیڈر بڑے فخر سے آتے تھے، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، بی اماں، مولانا حسین احمد، چودھری خلیق الزمان، ڈاکٹر محمود کے علاوہ گاندھی جی، مالوی جی، سروجنی نائیڈو، پنڈت موتی لال نہرو، اور پنڈت جواہر لال نہرو سب ہی یہان آئے، پنڈت موتی لال نہرو پوربی اضلاع کے دورہ مین جب اعظم گڈھ آتے تو ہمیشہ دار المصنفین ہی مین ٹھہرتے، شبلی منزل اُن کا بے تکلف مہمانخانہ تھا، پنڈت جواہر لال نہرو کا بھی ہمیشہ یہی طریقہ رہا، وہ جب بھی اعظم گڈھ آئے دار المصنفین مین آکر ٹھہرے، گاندھی جی جب اپنے دورہ مین اعظم گڈھ آئے تو اُن کے قیام کا انتظام تو دوسری جگہ تھا، مگر وہ خود شبلی منزل آئے، اور ایسے وقت آئے کہ اہلِ دار المصنفین ایک کھلی جگہ مین مغرب کی نماز پڑھ رہے تھے، یہ دیکھ کر گاندھی جی نہایت ادب اور خاموشی سے کنارے بیٹھ گئے، اور ساتھ والون کو باادب رہنے کے لئے اشارہ کیا، سید صاحب نے لالٹین کی روشنی مین اُن کو کتب خانہ دکھایا، دار المصنفین کے ایک رفیق نے اُن کے سامنے دستخط کے لئے اپنی یادداشت کی کتاب پیش کی تو انھون نے اردو مین دستخط کیا،

۱۹۲۸ء مین سید صاحب نے "ہندوستان اور علم حدیث" کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا جو دلچسپی سے پڑھا گیا، اس موضوع پر اردو مین یہ پہلا مضمون تھا، اس کی اشاعت کے بعد دوسرے اہلِ قلم نے بھی اس موضوع پر

مفید معلومات فراہم کئے، اسی سال حیدرآباد کے سفر کے موقع پر حضور نظام نے اُن سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی، اور اس کے نتیجہ مین ریاست حیدرآباد سے دار المصنفین کی سالانہ امداد جاری رکھی گئی،

**سارڈا ایکٹ کے خلاف احتجاج**

۲۸ئہ و ۲۹ئہ مین سارڈا ایکٹ یعنی نابالغون کی شادی پر پابندی کے سلسلہ مین مسلمانون مین بڑا ہیجان پیدا ہوا، انھون نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا، لیکن اس قانون کے بعض مسلمان حامیون نے فقہ اسلامی مین تحریف کرنے کی کوشش کی، اور نابالغ لڑکیون کے نکاح کو ناجائز بتایا، اور زورِ استدلال مین حضرت عائشہؓ کی نابالغی کی عمر نکاح سے بھی انکار کر دیا، سید صاحب نے معارف مین نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر پر محققانہ اور فاضلانہ بحث کر کے ایسے تمام لوگون کا منھ بند کر دیا، اور یہ اعلان کیا کہ نابالغون کا نکاح تو شرعاً جائز ہے، مگر ہر حال مین مستحسن نہین لیکن کسی غیر اسلامی حکومت کو مسلمانون کے نکاح و طلاق کے سلسلہ مین قانون بنانے کا حق نہین، غیر اسلامی حکومتون مین مناسب اصلاحات کو قانوناً نافذ کرنے کی صورت صرف یہ ہو کہ وہ حنفی تصریحات کے مطابق مسلمان والی یا قاضی کے ذریعہ جاری کی جائین، اسی سلسلہ مین انھون نے اس طرف بھی توجہ دلائی کہ سوراج قائم ہونے کے بعد مسلمانون کے پیشِ نظر جو معاملات ہین، اُن مین ایک مطالبہ یہ بھی ہو کہ آیندہ حکومت مین مسلمانون کے خالص مذہبی اور شخصی قوانین کے تحفظ، ترقی و اصلاح اور استحکام کے لئے ایک علٰحدہ نظام ہونا چاہئے، اور اس کے لئے ایک قابل عمل خاکہ پیش کیا جائے، اس طرح کلچرل اٹونومی کی صدا پہلی بار انھون نے بلند کی اور یہ بھی لکھا کہ اگر آسمان کو دیکھ کر موسم کے انقلاب کی پیشین گوئی کی جا سکتی ہو تو موجودہ حالات کو دیکھ کر مجھکو یقین ہے کہ اگر اس قسم کی تدبیر نہین کی گئی، تو مسلمانون کی ممتاز ہستی اس ملک مین قائم نہین رہ سکتی،

**عرب و ہند کے تعلقات پر لکچر**

۲۹ئہ کے مارچ مین ہندستانی اکیڈمی الٰہ آباد کی دعوت پر "عرب و ہند کے تعلقات" پر لکچر دیئے جن مین ہندو مسلمان دونون کو اُن کا وہ زرین عہد یاد دلایا جب دونون گوناگون تعلقات کے رشتون مین جکڑے ہوئے تھے، یہ خطبات تلاش و تحقیق، محنت و کاوش اور حسنِ استدلال

کے اعتبار سے بے مثل سمجھے جاتے ہیں، اُن کا انگریزی ترجمہ جناب سید لطیف صاحب ایم۔ اے (فی الحال نیو ایڈیٹر کراچی) نے کیا تھا، جو اسلامک کلچر حیدرآباد میں کئی سال تک شائع ہوتا رہا[1]،

ندوۃ العلماء کے لئے سرمایہ کی فراہمی

سنہ ۳۰ئہ میں زیادہ تر سیرۃ النبی جلد چہارم کی تدوین میں مشغول رہے، اسی کے ساتھ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی مالی حالت کو درست کرنے کی بھی فکر رہی چنانچہ اُن کی تحریک پر مدراس کے مشہور مخیر ساہوکار سیٹھ عبد الحکیم صاحب نے ندوہ کو پانچ ہزار روپے کی رقم عنایت کی،

عربوں کی جہازرانی

سنہ ۱۹۳۱ئہ کے مارچ میں "عربوں کی جہازرانی" پر بمبئی گورنمنٹ کے شعبۂ تعلیم کی سرپرستی میں چار خطبے دیئے، جو بڑی دلچسپی سے سُنے گئے، اُن کے اقتباسات بمبئی کے انگریزی اور اردو اخبارات نے شائع کئے، ان میں یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ موجودہ جہازرانی کی ترقی میں عربوں کا کتنا حصہ ہے، ان خطبات کا بھی انگریزی ترجمہ اسلامک کلچر حیدرآباد میں شائع ہوا،

قلمی جہاد

ان کا یہ سال زیادہ تر ان دشمنِ اسلام عناصر کے خلاف قلمی جہاد میں گذرا، جو مسلمانوں کو اپنی تحریروں سے گمراہ کرنے کی کوشش میں تھے، اسی زمانہ میں انگریزی اخبار اسٹیٹسمین میں ایک مضمون چھپا تھا جس میں واقعۂ کربلا کا حال ایسے انداز میں بیان کیا گیا تھا، جو مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے قابلِ اعتراض تھا، اس کے خلاف سید صاحب نے سخت احتجاج کیا، اسی طرح پنجاب یونیورسٹی کے نصاب میں ڈاکٹر وائل کی کتاب تاریخ اقوام اسلامیہ اور ڈاکٹر نکلسن کی تاریخ ادبیاتِ عربی داخل ہوئیں، تو انھوں نے وہاں کے اربابِ علم کو اس طرف توجہ دلائی کہ ان دونوں کتابوں میں اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق نہایت گمراہ کن نظریات اور لغو اعتراضات ہیں جن کو ایک مسلمان سننا بھی گوارا نہیں کر سکتا، مسلمانوں کے اخبارات نے بھی احتجاج کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کتابیں پنجاب یونیورسٹی سے خارج کر دی گئیں، اسی طرح جب رسالہ نگار لکھنؤ نے انبیائے کرام علیہم السلام، رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلامی عقائد و اعمال کے متعلق دل آزار مضامین لکھے، تو

---

[1] ان سطور کو لکھتے وقت یہ اطلاع ملی کہ یہ انگریزی ترجمہ کتاب کی صورت میں حکومت پاکستان شائع کرنے والی ہے،

سید صاحب نے اس کے خلاف بھی آواز بلند کی جس پر عام مسلمانوں نے اتنی مخالفت کی کہ اڈیٹر نگار کو توبہ نامہ لکھنا پڑا، جو نومبر ۱۹۳۱ء کے معارف مین بھی شائع ہوا،

**سیرۃ النبی جلد چہارم** ۱۹۳۲ء مین سید صاحب کی مشہور تصنیف سیرۃ النبی کی چوتھی جلد شائع ہوئی جس مین یہ دکھایا گیا ہو کہ نبوت محمدی نے دنیا مین کس عظیم الشان اصلاح کا فرض انجام دیا، اُس کی اشاعت سے دار المصنفین کی شہرت مین اور بھی چار چاند لگ گئے،

**مسلم یونیورسٹی علی گڈھ مین تقریرین** مارچ ۳۳ء مین مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی انجمن اردوئے معلی کی دعوت پر "ہندوستان مین ہندوستانی" پر ایک خطبہ دیا، یہ جلسہ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی صدر یار جنگ بہادر کی صدارت مین یونین ہال مین ہوا، جو اس موقع پر بھرا تھا، اس مین سید صاحب نے تاریخی حوالون سے بتایا کہ اردو کا نام دراصل ہندوستانی تھا، انگریزون کے آنے سے بہت پہلے دسوین صدی مین یہ زبان اسی نام سے پکاری جاتی تھی، اُن کی دوسری تقریر آفتاب ہوسٹل کے طلبہ کے سامنے ہوئی جس مین ان پر یہ اچھی طرح واضح کیا کہ ہماری یہ زندگی جو تمام تر دوسری قوم کی نقالی پر مبنی ہو، ہمارے اندر قومی روح کی سرگرمی نہین پیدا کر سکتی ہو اُن کی تیسری تقریر طبیہ کالج کے ہال مین ہوئی، اس مین اسلامی طب کی تاریخ کے ساتھ وہان کے طلبہ کو یہ نصیحت فرمائی کہ وہ ڈاکٹر بننے کے بجائے طبیب بننے کی کوشش کرین، کیونکہ ہندوستان کی صحت عامہ کا دارومدار دیسی طب پر ہے جس کی اکثر دوائین ہمارے ملک کی پیداوار ہین، وہ مسلم یونیورسٹی کے کورٹ کے ممبر بھی ۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۷ء تک رہے،

**تاج محل کے معمار کی تحقیق** اپریل ۳۳ء مین ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کے پہلے سالانہ اجلاس کی شرکت کے لئے لاہور تشریف لے گئے جس کی صدارت ڈاکٹر سر محمد اقبال نے کی تھی، اس جلسہ مین انھون نے اپنا ایک مقالہ پیش کیا جس کا عنوان "لاہور کا ایک مہندس خاندان جس نے تاج اور لال قلعہ بنایا" تھا، اس مین اس خاندان کے تقریباً ڈیڑھ سو برس کے علمی کارنامون کی سرگذشت نامعلوم گوشون سے بڑی تلاش و تحقیق سے

مرتب کی گئی تھی، اور تاریخ مین پہلی دفعہ اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ نادر العصر استاد احمد معمار شاہجہانی لاہوری کے حالات بتائے گئے، اور نہایت مستند شہادتون سے یہ ثابت کیا گیا کہ تاج کا معمار درحقیقت یہی استاد احمد معمار شاہجہانی لاہوری ہے جو ہندسہ، ہیئت اور ریاضیات کا بہت بڑا عالم تھا، اس حقیقت کے ظاہر ہونے کے بعد وہ تمام دعوے جو تاج کے کاریگرون اور معمارون سے متعلق مشہور تھے، بے سروپا ہو کر رہ گئے،

**مغربی ہند کا سفر**

جولائی ۳۳ء مین سیرت نبویؐ پر تقریر کرنے کے لئے بڑودہ تشریف لے گئے، اس کا جلسہ ہز ایکسلنسی دیوان بہادر کی صدارت مین بڑودہ کالج مین ہوا، بڑودہ سے بھروچ، بھروچ سے راندیر، راندیر سے سورت، سورت سے انکلشور، اور وہان سے ڈابھیل گئے، اور ہر جگہ ایک ایک دو دو مذہبی تقریرین کین،

**ضابطۂ جنایات قتل و قصاص کی ترتیب**

اسی سال حکومت حیدرآباد نے دارالمصنفین کو فقہ حنفی کی رو سے ایک ضابطۂ جنایات کی ترتیب و تدوین کی خدمت سپرد کی، چنانچہ سابق دولتِ عثمانیہ کی مجلۃ الاحکام کی طرح قانون جنایات بھی دفعہ وار مرتب کیا گیا، اور اس کا مسودہ سید صاحب نے حکومت حیدرآباد کو پیش کیا،

**خیام**

اسی سال اُن کی مشہور و معروف تصنیف خیام شائع ہوئی، انھون نے خیام پر پہلی دفعہ فروری ۲۴ء کے معارف مین ایک مضمون لکھا تھا جو دراصل پروفیسر اقبال معلم فارسی اورنٹیل کالج لاہور کے اس مقالہ کا جواب تھا جو انھون نے "شعر العجم اور عمر خیام" کے عنوان سے رسالہ اردو (اورنگ آباد دکن) مین تحریر کیا تھا، اس مضمون کو قلمبند کرتے وقت سید صاحب نے خیام کا ناقدانہ مطالعہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دسمبر ۱۹۳۰ء کی اورنٹیل کانفرنس منعقدہ پٹنہ مین ایک مقالہ پیش کیا، ارباب نظر نے توقع سے بڑھ کر اس کی قدر کی، تو یہی مقالہ ایک کتاب کی صورت مین منتقل ہو گیا اس کتاب کی ترتیب مین انھون نے سنین کی تحقیق و تطبیق، واقعات کی تلاش و تفتیش، ماخذون اور سندون کے حوالون اور خیام کی فلسفیانہ تصانیف کی جستجو مین جو فکر و کاوش کی ہے، وہ ایک اہم علمی کارنامہ ہے، اس سے خیام ایک بالکل ہی نئے رنگ مین ظاہر ہوتا ہے، اس تصنیف کی داد ہندوستان سے لیکر ایران کابل، اور یورپ تک کے فضلا نے دی، فردوسی کی ہزار سالہ برسی کے موقع پر افغانستان نے ایران کو جو تحائف دیئے ان مین ایک تحفہ خیام بھی تھا،

ہندستانی اکیڈمی الہ آباد نے اس پر پانچ سو روپیہ کا انعام دیا، ڈاکٹر سر اقبال نے اس کتاب کو پڑھ کر سید صاحب کو ایک مکتوب میں لکھا کہ "عمر خیام پر آپ نے جو کچھ لکھ دیا ہے، اس پر اب کوئی مشرقی یا مغربی عالم اضافہ نہ کر سکے گا۔"

**سفر افغانستان** | اسی سال نادر خان شاہ افغانستان کی طرف سے ایک تعلیمی دعوت ڈاکٹر سر اقبال، نواب سر راس مسعود وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی اور سید صاحب کو موصول ہوئی کہ وہ افغانستان آکر کابل یونیورسٹی کی ترتیب اور تنظیم اور وہاں کے تراجم و تالیف کے دائرے کو وسیع کرنے کے سلسلہ میں اپنے مفید مشورے دیں، چنانچہ سید صاحب ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو ہندوستان سے کابل روانہ ہوئے، پاسپورٹ کے ملنے میں تاخیر ہونے کے سبب وہ اپنے دوسرے رفقائے سفر کے ساتھ نہ ہو سکے، اور کابل اُن کے پہنچنے کے بعد پہنچے، سرکاری طور پر وہاں ان معزز مہمانوں کی بڑی پذیرائی ہوئی، علمی انجمنوں نے اُن کو سپاسنامے پیش کئے، اور عام لوگوں نے مختلف طریقوں سے اپنی محبت کا اظہار کیا، سید صاحب نادر خان سے ملے، تو ان سے مسئلہ تعلیم پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ افغانستان کی عربی و مذہبی تعلیم کا نصاب ایسا ہو کہ طلبہ میں موجودہ زمانے کے لحاظ سے سیاسی و اجتماعی اصلاحات کی طرف میلان بھی ہو، اور اُن میں مذہبی شیفتگی بھی پیدا ہو، شاہ افغانستان نے اس مشورہ کو پسند فرمایا، سید صاحب نے اسی قسم کے مشورے وہاں کے ماہرین تعلیم کو بھی دیئے جو انھوں نے قبول کئے، وہاں کے قیام کے زمانے میں انجمن ادبی کابل نے ہندوستان کے معزز مہمانوں کو ایک سپاسنامہ پیش کیا تو اس موقع پر افغانستان کے مشہور شاعر جناب قاری عبداللہ صاحب نے خیر مقدم کے عنوان سے ایک نظم پڑھی جس میں سید صاحب کے متعلق یہ اشعار تھے،

سوم سید کہ از ندوہ است — ز دانش بہ ہندوستان قدوہ است
ز فیض دمش تازہ شد جانِ علم — در اقلیم دانش سلیمانِ علم
چہ کلکش بمعنی طراز ندہ شد — خیالاتِ شبلی از و زندہ شد
چہ در شاہراہ حقایق شتافت — معارف از و رونقِ تازہ یافت
مضامینِ او جملہ محکم بود — نگارش بکلکش مسلّم بود

کابل سے چل کر غزنین آئے، جہاں حکیم سنائی اور محمود غزنوی کے مزار پر حاضری دی، پھر مقر، قلات غلزئی، قندھار، چمن، کوئٹہ اور ملتان کی سیاحت کرتے ہوئے اعظم گڈھ واپس آگئے، رخصتانہ میں نادر شاہ نے افغانستان کے بنے ہوئے چار عمدہ قالین، کچھ پشمینے اور اونی کپڑے بھی نذر کئے، اس طویل سفر میں اُن کے قلم کا مسافر بھی چلتا رہا، دن اور رات کے مختلف مشاغل کے باوجود سونے سے پہلے وہ سفر کے تمام واقعات قلمبند کر لیتے، چنانچہ آخر میں ایک سفرنامہ مرتب ہوگیا، جو معارف میں شائع ہوا، اور بعد میں سفرنامۂ افغانستان کے نام سے ایک کتاب بھی مرتب ہوگئی، اس سفر میں ڈاکٹر اقبال اُن سے بے حد متاثر ہوئے، چنانچہ ایک موقع پر تحریر فرمایا کہ

"آج سید سلیمان ندوی ہماری علمی زندگی کے سب سے اونچے زینے پر ہیں، وہ عالم ہی نہیں امیر العلماء ہیں، مصنف ہی نہیں، رئیس المصنفین ہیں، ان کا وجود علم و فضل کا ایک دریا ہے جس سے سیکڑوں نہریں نکلی ہیں اور ہزاروں سوکھی کھیتیاں سیراب ہوئی ہیں"،

**جامعہ ملیہ کی توسیعی لکچرز کی صدارت**

فروری ۳۴ء میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی دعوت پر ڈاکٹر بہجت وہبی جامعہ ملیہ آئے، حضرت معاذ بن جبلؓ کی اولاد میں سے تھے، مصر کی طبی درسگاہ میں علم تشریح کے استاد رہ چکے تھے، وہاں سے سبکدوش ہونے کے بعد یورپ میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے لگے، ۱۹۲۰ء میں سید صاحب سے طربطے واقع سوئزرلینڈ میں ملاقات ہوئی تھی، اسلامی احوال و ماجریات پر اُن کا مطالعہ گہرا تھا، جامعہ ملیہ میں آکر چار خطبے دیئے، ڈاکٹر انصاری کے اصرار پر ان کے پچھلے دو خطبوں کے جلسوں کی صدارت سید صاحب ہی نے کی،

**سفر رانچی**

جون ۳۴ء میں صوبہ بہار و اڑیسہ کے وزیر تعلیم آنریبل جناب سید عبد العزیز کی دعوت پر عربی مدارس کے ترتیب نصاب کے سلسلہ میں رانچی تشریف لے گئے، ان کے ساتھ اُن کے عزیز دوست مولانا مناظر احسن گیلانی (صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن) بھی تھے، حکومت بہار نے اُن کو کئی بار مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے پرنسپل کے تقرر کے سلسلہ میں پبلک سروس کمیشن کا اکسپرٹ ممبر بھی نامزد کیا،

**تاریخ ہند کی تدوین کی اسکیم**

اسی سال کے آخر میں بہت سے ہمدرد اہل علم کے تقاضے اور اصرار پر اسلامی ہند کی

مکمل تاریخ کی تدوین وترتیب کا ایک خاکہ ملک کے سامنے پیش کیا، مسلمانوں نے ہندوستان کو جو سیاسی، قومی، علمی، تمدنی حیثیت سے ترقی دی، اس کی ایک مکمل اور جامع تاریخ کی ضرورت روز بروز بڑھتی جارہی تھی، سید صاحب نے دسمبر ۱۹۳۴ء کے معارف میں یہ تجویز پیش کی کہ ایسی تاریخ پندرہ جلدوں میں لکھی جانی چاہیئے، پورے ملک نے اس تجویز کی تائید کی، چنانچہ دارالمصنفین میں بعض اہلِ قلم کی خدمات حاصل کرکے اس اہم کام کو شروع کرادیا گیا، جو اب تک جاری ہے،

**زنانہ جامعہ لاہور کا خاکہ**

جنوری ۳۵ئہ میں انجمن حمایت اسلام لاہور کی دعوت پر اس کی طلائی جوبلی میں شریک ہوئے انجمن نے اس موقع پر ایک اسلامی زنانہ جامعہ قائم کرنا چاہا تو اس کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی جس کے ایک ممبر سید صاحب بھی تھے، انھوں نے علامہ اقبال کے ساتھ مل کر ایک خاکہ تیار کیا، اس سفر کے سلسلہ میں لاہور، لدھیانہ، سہارنپور، دیوبند اور دہلی کے علمی و تعلیمی اداروں اور کتب خانوں کی بھی سیر کی ۔

**ضابطۂ فوجداری حیدرآباد پر نظرِ ثانی**

اسی سال ریاست حیدرآباد دکن نے شرعی حیثیت سے وہاں کے ضابطۂ فوجداری پر نظرثانی کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی جس میں ایک سابق جج ہائی کورٹ، مفتی ریاست اور سید صاحب تھے، اس کمیٹی نے ایک مہینہ میں اپنا کام پورا کیا،

**سیرۃ النبی جلد پنجم**

اسی سال اُن کی مشہور و معروف تالیف سیرۃ النبی کی پانچویں جلد شائع ہوئی، اس کا موضوع عبادات ہے، سیرۃ النبی کی جلدیں ہند اور بیرون ہند میں بے حد مقبول ہورہی تھیں، ہندوستان میں ان کی مانگ بڑھتی جارہی تھی، اور ہر جلد کے کئی کئی اڈیشن شائع ہوئے، پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ ترکی میں اس کی تین جلدوں کا ترجمہ ہوا، اور وہاں اُن کی مقبولیت کا اندازہ نواب فخر یار جنگ کے حسب ذیل مکتوب سے ہوگا، جو انھوں نے سید صاحب کو تحریر فرمایا :-

"میں کچھ عرصہ ہوا ترکی گیا تھا، ..... وہاں ایک بڑی جماعت ایسے لوگوں کی ملی جو سیرۃ النبی مبارک کی بڑی مداح ہے، اور اس کا جو ترجمہ ترکی میں ہوچکا ہے، اس کو وہ بہت شوق سے مطالعہ کرتے ہیں، خود استنبول تو چونکہ مغرب زدہ ہوچکا ہے، وہاں زیادہ وہ لوگ نہیں ملے لیکن بروصہ میں جو عثمانیہ

کا فتح استنبول سے پہلے قریب ڈیڑھ سو سال کے دور حکومت کا ہے، بہت سے احباب کو سیرۃ النبی کا ذکر دلچسپی سے کرتے سنا، خدا آپ کے مساعی جمیلہ کو بار آور کرے"،

فارسی میں بھی سیرۃ النبی کی چند جلدوں کا ترجمہ کابل میں کیا گیا، مکہ معظمہ اور مصر میں اس کے عربی ترجمہ کا خیال پیدا ہوا،

**اردو ہندی کا جھگڑا** اکتوبر ۱۹۳۵ء میں مرض ذات الجنب کا شدید حملہ ہوا، کئی مہینہ کے بعد شفا ہوئی، تو ڈاکٹروں نے چھ مہینے تک مکمل آرام لینے کی ہدایت کی، تین مہینے دہرہ دون جیسے صحت بخش مقام میں جا کر قیام بھی کیا، اور آرام کے بعد اپنے علمی مشاغل پھر شروع کئے، تو اردو ہندی کے روز افزوں جھگڑوں سے اُن کو بہت دکھ پہنچا، معارف کے شذرات کے ذریعہ اپنے دردمندانہ خیالات کا اظہار کیا کہ ہندی اور اردو دونوں کیلئے الگ ترقی کی راہیں کھلی رہنی چاہئیں کیونکہ زمانہ یہ فیصلہ کر چکا ہے کہ نہ اُردو ہندی کو مٹا سکتی ہے، اور نہ ہندی اردو کو، دونوں اپنی اپنی راہیں چلتی رہیں گی، انھوں نے یہی خیالات علی گڈھ میں آل انڈیا اردو کانفرنس میں ظاہر کئے جو اکتوبر ۱۹۳۶ء میں ہوئی،

**فلسطین کانفرنس کی صدارت** یہودیوں اور انگریزوں کی سازش سے فلسطین کا جو نیا نقشہ بننے کو تھا، اس سے ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی بڑا سیاسی اُبال اور مذہبی جوش پیدا ہوا، مدت کی سیاسی خاموشی کے بعد سید صاحب نے فلسطین کے مسئلہ میں اپنی آواز بلند کی، اور مولانا شوکت علی اور مفتی کفایت اللہ کے اصرار پر ۶ نومبر ۱۹۳۶ء کی آل انڈیا فلسطین کانفرنس دہلی کی صدارت کی، اس میں جو خطبہ پڑھا، وہ دنیائے اسلام میں بڑا مقبول ہوا، مصر اور شام کے اخبارات نے اس کے ترجمے چھاپے، مجلس اعلیٰ فلسطین کے صدر مفتی سید امین الحسینی نے خاص طور پر تار کے ذریعہ اُن کا شکریہ ادا کیا،

**ایک ناخوشگوار واقعہ** وہ فلسطین کانفرنس کی صدارت کر رہے تھے کہ ایک بر خود غلط اہل قلم نے ۵ صفحے کا ایک رسالہ "علامہ سید سلیمان ندوی کی قرآنی غلطیاں" لا کر اُن کے ہاتھ میں دیا، جس میں اُن کی تصانیف میں سے گیارہ غلطیاں فراہم کر کے یہ الزام لگایا تھا کہ ان کی تحریروں سے الحاد و اہمال کے جراثیم پیدا ہوتے ہیں، دسمبر ۱۹۳۶ء کے معارف میں ان اعتراضات کا جواب شائع ہوا، تو رسالہ کے مرتب نے مطمئن ہونے کے بجائے سید صاحب کو ایک عدالتی سمن کے ذریعہ دہلی کی عدالت میں طلب کرنے کی کوشش کی لیکن دہلی کے اس زمانہ کے مشہور وکیل جناب عبدالرحمٰن صاحب

کی وکالت اور وساطت سے یہ مقدمہ عدالت سے خارج ہوگیا، اور سید صاحب کو عدالت مین حاضر ہونے کی نوبت نہین آئی،

**ہندستانی اکیڈمی کے جلسہ کی صدارت**

جنوری ۳۶ء مین لکھنؤ کی نمایش گاہ مین ہندستانی اکیڈمی کی ایک کانفرنس کے شعبۂ اردو کی صدارت کی، اس اکیڈمی کا مقصد ہندوستان کو ادب کی راہ سے ایک کرنا تھا، لیکن اس کانفرنس مین اردو اور ہندی کے دو خیمے علحدہ علحدہ تھے، ایک کے ادیب نے دوسرے کی صورت تک نہ دیکھی، اس سے سید صاحب کو بڑا دکھ ہوا، اور اسی وقت اُن کو یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید ہندو مسلمانون کے دل ایک دوسرے سے جدا ہو رہے ہین، جیسا کہ انھون نے فروری ۳۶ء کے معارف مین اظہار کیا ہے،

**مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی طلائی جوبلی**

مارچ ۱۹۳۷ء مین مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی طلائی جوبلی علی گڈھ مین ہوئی، تو اس کے شعبۂ علوم و فنون اسلامی کی صدارت کی، اس مین خطبۂ صدارت کے علاوہ اپنا ایک مقالہ "عرب اور امریکہ" کے عنوان سے پیش کیا، جس مین یہ دکھایا کہ کولمبس سے پہلے عرب جہازران امریکہ پہونچ چکے تھے کیونکہ ان کو زمین کی گولائی اور اس کے تحتانی اور فوقانی حصون کا علم تھا، اسی لئے ماوراے بحر ظلمات تک پہنچنے کی کوشش کی،

**سفر مدراس و حیدرآباد**

اکتوبر ۱۹۳۷ء مین جامعہ دارالسلام عمرآباد مدراس کا خطبۂ اسناد دینے کے لئے وہان تشریف لے گئے، مدراس کو اُن سے اور اُن کو مدراس سے ذاتی اُنس ہوگیا تھا، مدراس سے حیدرآباد آئے، وہان اُن کی آمد کی اطلاع اخبار مین حضور نظام کی نظر سے گذری، تو اُن کے لئے خاصہ بھیجا، اور ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا، اس قیام کے زمانہ مین دائرۃ المعارف حیدرآباد نے اُن کے اعزاز مین نواب مہدی یار جنگ کی صدارت مین ایک جلسہ کیا، جس مین انھون نے اپنا ایک مقالہ عربی زبان مین "ابوالبرکات بغدادی اور اُس کی کتاب المعتبر" کے عنوان سے پڑھا، اسی روز سر مہاراجہ یمین السلطنت بہادر کشن پرشاد نے اپنے یہان مدعو کرکے ایک خلعت عطا کیا، اس سفر سے اعظم گڈھ واپس آئے تو حضور نظام نے اُن کے لئے سو روپیہ ماہانہ کا ذاتی وظیفہ مقرر کرکے ان کے علم و فضل سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا،

**ودیا مندر اور وار دھا اسکیم** ۱۹۳۸ء مین سی پی مین ودیا مندر کے نام سے جبری تعلیم کی مہم شروع ہوئی، اس مین اردو پڑھانے کا کوئی انتظام نہ تھا، اس لئے مسلمانون مین ہیجان پیدا ہوا، تو سید صاحب نے بھی اس کے خلاف احتجاج کیا، اور معارف کے ذریعہ یہ اعلان فرمایا کہ مخالفت اور دشمنی کی اسپرٹ سے نہین بلکہ اپنے صحیح حق کو حاصل کرنے اور ملک مین اپنی پوزیشن حاصل کرنے کے لئے اردو زبان سے قطع نظر کرنا ہمارے لئے قطعاً محال ہے، پھر مسلمانون نے جب کانگرسی وزارتون کی وار دھا اسکیم کی مخالفت شروع کی تو سید صاحب نے اُن کو بیجا جوشِ عمل کے اظہار سے روکنے کی کوشش کی، اور یہ مشورہ دیا کہ "اسلامی صوبون کی وزارتین، دار القضا، اور مسلمانون کی ابتدائی تعلیم وغیرہ کی تجویزون پر غور کرین، اور ان کو عمل مین لائین تاکہ اس باب مین غیر اسلامی صوبے بھی اُن کے نقشِ قدم پر چل سکین"، مگر افسوس کہ اسلامی صوبے اس کام کو اب تک انجام نہ دے سکے ہین،

**سیرة النبی جلد ششم** ۱۹۳۹ء مین اُن کی سیرة النبی کی چھٹی جلد شائع ہوئی، اس مین اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، یہ سیرت کے سلسلہ کی بڑی اہم جلد ہے، یون تو تمام جلدین جدید علم کلام کی اساس ہین،

**نقوش سلیمانی** اسی سال اُن کی کتاب نقوشِ سلیمانی بھی شائع ہوئی، یہ ان خطبون تحریرون اور مقدمون کا مجموعہ ہے جو اردو ادب و زبان سے متعلق اُن کے قلم سے نکلے، یہ گویا پچھلی چوتھائی صدی کی ادبی تحریکون کا ایک مرقع ہے، اس لئے یونیورسٹیون کے نصاب مین جلد داخل ہوگئی،

**سفر دکن** ۱۹۴۰ء کا آغاز ادبی اور علمی سفرون سے کیا، ۲۵ جنوری کو وہ ندوة العلماء کے کام سے حیدرآباد دکن گئے، وہان سے پونہ آئے، اور دکن کالج مین ایک تقریر مسلمانون کے تحفظ پر کی، اس مین مسلمانون کو خود یہ تجزیہ کرنے کو کہا کہ اسلامی کلچر کو وہ اپنے ہاتھون تباہ کر رہے ہین، یا اُس کو غیر برباد کر رہے ہین، پونہ سے بمبئی آئے، وہان کے اسمٰعیل کالج کی مسجد مین جمعہ کی نماز کے بعد ایک تقریر کی، جس مین فرمایا کہ دنیا کی قومون نے جب کبھی ترقی کی ہے، تو اُس کی قوت پرواز کے دو ہی پر ہوتے ہین، ایمان اور عمل، ہمارے نوجوان ان دونون سے بے پروا ہو کر ترقی کا خواب نہین دیکھ سکتے، اسمٰعیل کالج کے ہال مین ایک دوسری تقریر دکن اور گجرات مین اردو زبان کی تاریخ پر کی،

**سفر سرحد و پنجاب** اس سفر سے واپسی کے بعد ابھی تکان بھی دور نہین ہوئی تھی کہ پشاور، بہاولپور اور لاہور کا

سفر کرنا پڑا، اسلامیہ کالج پشاور کے سامنے ایک تجویز یہ تھی کہ اس مین ایک ایسا شعبہ کھولا جائے جس مین بعض پڑھے لکھے نوجوانون کو مختصر عربی، دینیات، اور طب کی تعلیم دیجائے، جو گاؤن مین پھیل کر اپنی روزی بھی کمائین، اور مسلمانون کی مذہبی خدمت بھی کرین، اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سید صاحب مدعو کئے گئے، وہان پہنچ کر مجوزہ نصاب کی ترتیب دینے کے علاوہ مختلف عنوانات پر کئی تقریرین کین، جن مین وہان کے نوجوانون کو یہ تلقین کی کہ وہ مسلمانون کے اکثریت کے صوبے مین رہنے والے کی حیثیت سے اپنے کو ایمان وعمل مین اتنا ممتاز بنالین کہ سارے ہندوستان کے مسلمان اُن کے پیچھے چلین، پشاور سے لاہور آئے، یہان کے اصحابِ علم نے بڑی پذیرائی کی، مختلف دعوتون مین علمی وقومی مسائل پر مبادلہ خیال کرتے رہے، لاہور سے بہاولپور آگئے، جہان کی جامعہ عباسیہ سنہ ۱۹۲۵ء مین ندوۃ العلما، لکھنؤ ہی کے طرز پر قائم ہوئی تھی، یہان کے وزیرِ تعلیم میجر شمس الدین اُس کے نصاب مین مزید اصلاح چاہتے تھے، سید صاحب نے پہنچ کر ضروری اصلاح کی، اس موقع پر وہان کے صادق ایجرٹن کالج کی تقسیمِ اسناد کا جلسہ ہوا، تو خطبۂ اسناد سید صاحب ہی نے دیا، دوسرے دن رات کو اسی کالج کے ایک بہت بڑے جلسہ مین "خصائصِ اسلامی" پر ڈیڑھ گھنٹہ تک تقریر کی، پھر شہر کی جامع مسجد مین "فضائل نبوی" پر ایک وعظ مین مسلمانون کو نسبتِ نبوی کے شرف کی بنا پر اشرف الامم ہونے کی حیثیت سے خیر الامم بننے کا شوق دلایا، اور اولاد کو اسی رنگ مین تعلیم دینے کا مشورہ دیا،

**رحمتِ عالم** اسی سال بچّون کے لئے "رحمتِ عالم" لکھی جس مین سلیس اور آسان زبان مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک ہی، گو یہ بچّون کے لئے لکھی گئی تھی، لیکن جوان اور بوڑھے سب اس سے مستفید ہو رہے ہین،

**مسلم یونیورسٹی کی طرف سے اعزازی ڈگری** سنہ۴۱ء کے نومبر مین ان کو مسلم یونیورسٹی علی گڈہ کی طرف سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری ملی، یہ گویا مسلم یونیورسٹی کی طرف سے اُن کے علمی وادبی کمال کا اعتراف تھا، لیکن اُن کے علمی فضائل اس رسمی ڈگری سے بہت بلند ہو چکے تھے، اس لئے انھون نے اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھنا پسند نہین کیا، فرماتے تھے جس وقت اس قسم کے اعزاز کی تلاش تھی، اس وقت یہ ملے نہین، اب اِن کی کوئی خواہش نہین، اس لئے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھنے سے کیا فائدہ،

**روحانی انقلاب** اسی سال ان مین ایک بڑا روحانی انقلاب پیدا ہوا، اب وہ اپنی زندگی کی اس منزل مین تھے، جب کہ ہندوستان کیا، بلکہ عالم اسلام کے ایک متبحر عالم، ایک بلند پایہ مفسر، ایک جلیل القدر متکلم، ایک دقیقہ سنج فقیہ، ایک بے مثل ادیب، ایک وسیع النظر مورخ، ایک اچھے سیاسی مفکر، اور ایک زبان آور خطیب کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے، اُن کی نجی زندگی بھی بڑی پاک وصاف رہی، اور اُن کے نزدیک رہنے والون کو یہ کہنے مین تامل نہ ہوتا کہ

ع مانندِ حرم پاک ہے تو میری نظر مین

لیکن اپنی دینی عظمت اور علمی جلالت کا لحاظ کئے بغیر حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ العزیز کے آستانہ پر جاکر اپنا سرِ نیاز جھکا دیا، حضرت مولانا کو بھی علم وفن کے ایک شہباز اور گلستانِ رسالت کے ایک عندلیبِ خوشنوا کو اپنے سایۂ عاطفت مین لینے مین بڑی مسرت ہوئی، اس تعلق کے بعد سید صاحب کے لیل ونہار ہی بدل گئے، گو اُن کی پوری زندگی، دینداری اور پرہیزگاری مین گذری تھی، لیکن بادۂ طریقت سے سرشار ہونے کے بعد اُن کی دینداری مین تقویٰ وتورع کا اور بھی زیادہ گہرا رنگ پیدا ہو گیا، عبادت وریاضت بڑھ گئی، ذکر خفی کے ساتھ ذکر جلی بھی کرنے لگے، تقریر وخطابت نے وعظ وپند کی شکل اختیار کرلی، زیادہ وقت علمی مذاکرون کے بجائے رشد وہدایت مین صرف ہونے لگا، اس انقلاب کے بعد اپنی تمام پرانی تحریرون پر نظر ثانی کی، اور جس مین ذرا بھی جمہور امت سے اختلاف کا شائبہ یا خلاف احتیاط کوئی بات نظر آئی، اس سے رجوع کیا، چنانچہ "رجوع واعتراف" کے عنوان سے جنوری سنہ ۱۹۴۳ء کے معارف مین ایک تحریر شائع کی جس مین فرماتے ہین کہ

"مذہبی مسائل کی تحقیقات مین میرا یہ عمل رہا ہے کہ عقائد مین سلف صالحین رحمہم اللہ تعالیٰ کے مسلک سے علیحدگی نہ ہو، البتہ فقہیات مین کسی ایک مجتہد کی تقلید تمام نہین ہوسکی، بلکہ اپنی بساط بھر دلائل کی تنقید کے بعد فقہاء کے کسی ایک مسلک کو ترجیح دی ہے، لیکن کبھی کوئی ایسی رائے نہین اختیار کی جس کی تائید ائمۂ حق مین سے کسی ایک نے بھی نہ کی ہو، خصوصیت کے ساتھ مسائل کی تشریح مین حافظ ابن تیمیہ حافظ ابن قیم اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہم کی تحقیقات پر اکثر اعتماد کیا ہے، ایسا بھی دو چار دفعہ ہوا کہ

ایک تحقیق کے بعد دوسری تحقیق سامنے آئی ہے، اور اپنی غلطی ظاہر ہوئی ہے، تو بعد کے اڈیشن مین اس کے مطابق تبدیل کر دی ہے، مثلاً معراج بحالتِ بیداری و بجسم ہونے پر قرآن پاک سے صحیح استدلال مجھے نہیں مل سکا، اور بعد کو اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی توفیق سے صحیح دلیل سمجھا دی تو دوسرے اڈیشن مین اس کو بڑھا کر مقام کی تصحیح کر دی، اسی طرح فنائے نار کے مسئلہ مین پہلے حافظ ابن تیمیہ اور ابن قیم کی پیروی مین کچھ لکھا گیا، بعد کو جمہور کی رائے کا اضافہ کر کے دونون کے دلائل کی تشریح کر دی، اور اب بحمد اللہ کہ اس باب مین جمہور ہی کے مسلک کا حق ہونا سمجھ مین آگیا ہے"

اسی طرح وہ پہلے تصویرون کے کھچوانے کو جائز سمجھتے تھے، اور زیورون مین زکوٰۃ کے عدم وجوب کے قائل تھے لیکن اس رجوع کے بعد جمہور علماء کا مسلک اختیار کیا، اس سلسلہ مین تحریر فرمایا،

"یہ باتین کسی معترض کے خوف سے نہین بلکہ اللہ تعالیٰ کے حضور مین اپنی ذمہ داری کو محسوس کر کے لکھ رہا ہون اور دعا کرتا ہون کہ بار الٰہا مجھے صراط مستقیم پر قائم رکھ اور جب کبھی تقاضائے بشری سے مجھ کو غلطی ہو تو مجھے متنبہ اور معاف فرما اور مسلمانون کو اس کے شر سے محفوظ رکھ اور مجھے راہِ صواب دکھا"

اس رجوع و اعتراف کو اُن کے مرشد نے بہت پسندیدگی کی نظر سے دیکھا،

اُن کو مرشد کی طرف سے خلافت بھی عطا ہوئی تھی جس کے بعد وہ خاص خاص لوگون کو بیعت بھی کرنے لگے تھے، جولائی ۱۹۴۳ء مین اُن کے مرشد کا وصال ہوا تو بڑے سوز و درد اور غم کے ساتھ "موت العالِم موت العالَم" کے عنوان سے ماتم کیا، اُن کی رحلت کے بعد اُن کی سوانح عمری لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے، لیکن یہ پورا نہ ہو سکا،

**اصلاحی کام** جنوری ۱۹۴۱ء مین نواب صاحب چھتاری کی صدارت مین اسلام کے سیاسی اور اقتصادی نظام کی ترتیب کے لئے ایک مجلس بنائی گئی جس کا پہلا اجلاس دار العلوم ندوۃ العلماء مین ہوا، اس کے ارکان سید صاحب کے علاوہ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی، مولانا عبد الماجد دریابادی، مولانا شبیر احمد عثمانی، اور ڈاکٹر ذاکر حسین بھی تھے، اس مین یہ طے پایا کہ مستند علماء اور لائق جدید تعلیم یافتہ اہل علم کی باہمی معاونت سے پہلے اسلامی سیاست و اقتصاد پر ایک

معتبر کتاب لکھائی جائے اور پھر اُس میں اس حصہ کو الگ کیا جائے جو موجودہ زمانہ میں اور نئے ہندوستان میں قابلِ عمل ہو، اس تجویز کو عمل میں لانے کے لئے سید صاحب نے اپنے ایک ندوی عزیز سے ایک کتاب بھی لکھوائی، آگے چل کر وہ معارف کے ذریعہ اس کی برابر تلقین فرماتے رہے کہ "مسلمانوں کو اپنے اصولِ حکومت، اصولِ اقتصاد، اصولِ معاشرت، معاملات، قانون اور احکام کے متعلق یہ سوچنا نہیں ہے کہ اُن کی جگہ پر کیا ہو، کیونکہ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ ان کا دین کیا ہو، بلکہ یہ سوچنا ہے کہ اُن کو کس طرح رائج کیا جائے اور نئی مشکلوں کے لئے اسلامی اصول کے مطابق کیا فیصلہ کیا جا سکتا ہے" (معارف جولائی ۴۶ء)

**حیات شبلی** | دار المصنفین کی تاسیس کے وقت ہی سے وہ اپنے اُستاد کو مختلف شکلوں میں خراجِ عقیدت پیش کر رہے تھے، چنانچہ ۱۹۴۲ء تک مولانا شبلیؒ کے مختلف مضامین، خطبات، اور مکتوبات کو جمع کر کے گیارہ جلدوں میں شائع کیا، کثرتِ کار کی وجہ سے اُن کی صحت خراب رہنے لگی، تو اُن پر استاد کی اس وصیت کا خیال غالب رہنے لگا کہ "جب تم اور دنیا کے کاموں سے فارغ ہونا تو تم ہی میری سوانح عمری لکھ دینا" چنانچہ ۱۹۴۰ء میں اس کام کو شروع کر دیا اور تین برس کی جانکاہ محنت کے بعد فروری ۱۹۴۳ء میں ۸۴۶ صفحے کی "حیات شبلی" لکھ کر اہلِ علم کے سامنے پیش کی، یہ ضخیم کتاب ایک شخص کی سوانحعمری ہی نہیں، بلکہ مسلمانانِ ہند کے پچاس برس کے علمی، ادبی، سیاسی، تعلیمی، مذہبی، اور قومی واقعات کی تاریخ بھی ہے، سید صاحب کی یہ آخری تصنیف ہے، سیرۃ النبی کی ساتویں جلد کے صرف دو باب ہی لکھنے پائے تھے کہ اس جہان رنگ و بو سے رخصت ہو گئے، اُن کی رحلت کے بعد اردو زبان کے دیرینہ خدمتگذار اور ممتاز ترین ادیب مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی مدظلہ العالی نے اُن کے علمی و ادبی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے تحریر فرمایا

"چھوٹی بڑی، نئی پرانی، دینی، علمی، ادبی، درجنوں کتابوں کے مصنف اور بے شمار مقالات کے راقم کو کوئی اردو خوان بھلانا چاہے تو بھی کیسے بھلا سکتا ہے، اپنی چالیس سالہ تصنیفی زندگی میں ادب صالح سے اردو کے ذخیرہ کو جتنا مالامال اس مرنے والے نے کیا ہے، اس سے بڑھ کر اور کون کر سکا ہے"

**ہسٹاریکل کانگریس کی صدارت** | ۴۳ء کا زیادہ تر حصہ صحت کی خرابی میں گذرا، لیکن اس سال کے آخر میں انڈین

ہسٹاریکل کانگریس کی طرف سے شعبۂ تاریخ ہند از منۂ وسطیٰ کی صدارت کا دعوت نامہ پہنچا تو اُن کے بعض علمی جذبات ابھر آئے اُن کو عرصہ سے اس بات کا دکھ تھا کہ غیر مسلم اہل قلم ہندوستان کے اسلامی عہد کو بدنام کرنے کی کوشش کر رہے ہین چنانچہ اس تلخ حقیقت کے اظہار کے لئے یہ صدارت قبول کر لی، کیونکہ اس کے اظہار کا اور کوئی بہتر موقع نہین ہو سکتا تھا، اپنی خرابی صحت کے باوجود مدراس کا لمبا سفر کیا، اور اپنے خطبہ مین جس حقیقت کا اظہار کیا، اس کو کانفرنس کے سنجیدہ لوگون نے اچھی طرح سمجھا،

**تبلیغی تقریرین** اسی سفر مین مدراس کے دوسرے مقامات مین بھی اُن کی تقریرین ہوئین، دیل ویشارام مین تقریر کا عنوان "ملت محمدیہ کی حقیقت" اور دار السلام عمر آباد مین "عبدیت" تھا، دار السلام کی مسجد مین دو روز صبح کے وقت قرآن پاک کے درس بھی دیے، پریم پٹ مین بھی فجر کی نماز کے بعد ایک مسجد مین درس ہوا، مدراس سے بمبئی تشریف لے گئے تو وہان کی جمعیۃ العلماء کی دعوت پر سورۃ الحمد کی تفسیر کے ضمن مین مسلمانون کے حال پر تبصرہ فرمایا، پھر شہر کی انجمن اسلام ہال مین "اردو" اور صابو صدیق ہال مین "ہندوستان مین علوم عربیہ کی خدمت" اور ایک مخصوص مجمع مین توبہ و انابت کے صحیح طریقے پر تقریرین کین، بمبئی سے حیدر آباد کا رُخ کیا، وہان ندوۃ العلماء کی مالی امداد کا کام کرتے رہے،

**سفر واردھا** حیدر آباد ہی مین تھے کہ گاندھی جی نے اپنے ہاتھ سے اردو مین سید صاحب کو ایک خط لکھ کر قومی زبان کے مسئلہ مین مشورے کے لئے واردھا بلایا، چنانچہ حیدر آباد سے واپسی مین واردھا اُتر گئے، اور وہان جو جلسہ ہوا، تو گاندھی جی کے سامنے اپنی تقریر مین ایک ملکی زبان کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ ہندوؤن اور مسلمانون کی زبان مین اسی حد تک فرق ہونا چاہئے جس حد تک اُن کے مذہبون اور تمدنون مین فرق ہی، اس لئے جہان تک مسلمانون کا تعلق ہی، اُن کی مذہبی و تمدنی اصطلاحون اور لفظون کا ماخذ عربی، فارسی اور ترکی ہونے کے علاوہ کوئی چارہ نہین، اور ایسی ہی اجازت ہندؤن کو بھی اُن کے مذہبی اور تمدنی خصوصیات کے لئے ہونی چاہئے، اس کے بعد لفظون کی صحت کا مدار لغت کی کتابون کے بجائے بازار کے چلن اور عوام کے رواج پر ہونا چاہئے، اور اس وقت ہماری زبان مین عربی، فارسی اور ہندی، سنسکرت، اور انگریزی، کا جو لفظ جس صورت مین بولا جاتا ہی، اسی کو برقرار رکھنا چاہئے، اس قسم کے خیالات وہ ۳۷ء سے پیش کر رہے تھے

چنانچہ ۳۷ء کے اگست مین جب راجندر عبدالحق پیکٹ ہوا تھا تو اس مین یہی طے ہوا تھا کہ ہندوستان مین جو سرکاری زبان ہو، وہ اردو اور ناگری دونون رسم الخط مین لکھی جانی چاہیئے اور اس زبان مین الفاظ کے انتخاب کا یہ معیار ہو کہ ان کا عام بول چال مین کس حد تک رواج ہے، اسی پیکٹ کے بعد حکومت بہار نے ایک ہندوستانی کمیٹی مقرر کی تھی، جس کے ایک ممبر سید صاحب بھی تھے، لیکن بہار اور واردھا دونون مشترکہ قومی زبان کا مسئلہ حل نہ کرسکے، اور یہ سیاست کے سیلاب کے تیز دھارے مین بہہ گیا،

**راندیر اور سورت کا سفر** سید صاحب کا مدراس، بمبئی، حیدرآباد اور واردھا کا سفر دسمبر ۴۴ء مین شروع ہوا تھا، اور اپریل ۴۵ء مین ختم ہوا، اُن کی صحت برابر گرتی جارہی تھی، پھر بھی اُن کے عقیدت مندون کا اصرار ہر جگہ سے ہوتا کہ وہ اپنے قدوم لزوم میمنت سے اُن کے علمی جلسون اور تعلیمی کاشانون کو شرف بخشین، ان کو بھی اپنے دینی اور علمی مشن کو جلد از جلد تکمیل کرنے کی دھن ایسی تھی کہ وہ دور دراز مقامات کا سفر کرنے مین اپنی خرابی صحت کا خیال مطلق نہ کرتے، چنانچہ جولائی ۴۵ء مین راندیر کے جامعہ حسینیہ اور مدرسہ اشرفیہ کی دعوت پر وہان تشریف لے گئے، اور جامعہ حسینیہ مین "الجد والجہاد لعلمی المعاش والمعاد" کے عنوان سے ایک تقریر کی، اور مدرسۂ اشرفیہ مین "خشیتِ الٰہی" پر خطبہ دیا، اسی سفر مین کچھ دنون بمبئی اور سورت مین بھی مقیم رہے،

**شدید علالت** اعظم گڈھ واپس آئے تو حوالیٔ قلب مین ریاحی درد کا سخت دورہ پڑا، اور حالت بہت ہی نازک ہوگئی، شفا ہوئی تو اطبا نے دماغی اور علمی کام چھوڑ دینے کا مشورہ دیا، لیکن عمر بھر کی لگی ہوئی عادت کا چھوٹ جانا مشکل تھا، اس لئے معارف کے صرف شذرات اور ہلکے پھلکے مضامین ہی لکھنے پر اکتفا کیا، معارف کے شذرات کے ذریعہ مسلمانون کو دینی اور ملی احیاء کی تلقین فرماتے رہے، اور اُن کو "تہنُّد" اور "تفرنج" دونون کے خطرات سے آگاہ کیا،

**ندوہ مین قیام کی تجویز** صحت کی خرابی کے بعد اُن کا ارادہ تھا کہ ندوۃ العلماء لکھنؤ مین مستقل قیام کرکے اسکی تعلیمی و مالی حالت درست کرین، وہ تقریباً چالیس سال تک ندوہ کے معتمد تعلیمات رہے، اور اعظم گڈھ سے ندوہ برابر آتے جاتے رہتے، وہان کے ہر معاملہ کو اپنا ذاتی معاملہ سمجھ کر نبٹانے کی کوشش کرتے، کبھی اساتذہ کی باہمی کشمکش کو دور کرتے، کبھی اسکی مالی اصلاح کے لئے طرح طرح کی تجویزون کو عمل مین لاتے، کبھی معلم بن کر درس و تدریس کا سلسلہ قائم کرتے، وہان کے

طلبہ کا اعتراف ہو کہ وہ کسی درجہ مین صرف و نحو پر باتین کرتے، تو معلوم ہوتا کہ سیبویہ اور زمخشری کی روح بول رہی ہے، ادب عربی کی فصاحت و بلاغت پر کچھ کہتے، تو اندازہ ہوتا کہ جاحظ اور جرجانی سامنے ہین، بوعلی سینا کی مشہور کتاب نجات کبھی پڑھا دیتے تو طلبہ کی آنکھین کھل جاتین، اگر بخاری یا مسلم کے درس مین اپنے نکات بیان فرماتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ ساری عمر اسی فن کی تحصیل مین گذاری ہے، فقہ اور اصول مین بھی بڑی عقدہ کشائی کرتے،

**قیام بھوپال** | ندوۃ العلماء مین اُن کے مستقل قیام کی صورت ممکن نہ ہوسکی، اسی اثنا مین نواب حمید اللہ خان والیٔ بھوپال نے اُن کو دعوت دی کہ وہ ریاست کے دارالقضاۃ اور عربی مدارس کو اپنی نگرانی مین لے کر خالص مذہبی اور شرعی رنگ مین کر دین، ۳۹ء و ۴۰ء مین نواب صاحب موصوف نے ریاست کے عربی مدارس کے انحطاط و تنزل سے متاثر ہو کر سید صاحب کی صدارت مین ماہرین تعلیم کی ایک مجلس مقرر کی تھی، جس نے ان مدارس کے لئے ایک نیا نصاب تیار کیا، اور اُن کی اصلاح و تنظیم کے لئے ضوابط بنائے، اس خاکہ کو عملی صورت مین لانے کے لئے نواب صاحب سید صاحب کو بھوپال برسون سے مدعو کر رہے تھے، بقول جناب شعیب صاحب قریشی "قاضی ریاست کا عہدہ تو اُن کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکا، لیکن عربی تعلیم کی اصلاح و ترقی کے موقع کو وہ انکار نہ کر سکے" چنانچہ جون ۴۶ء مین وہ بھوپال کے قاضی القضاۃ اور جامعہ مشرقیہ کے امیر کے عہدہ پر مامور ہوئے، لیکن دارالمصنفین اور ندوۃ العلماء سے تعلقات بدستور سابق قائم رہے، جس مقصد کے لئے بھوپال تشریف لے گئے تھے، اس کی تکمیل کے لئے وہان اکتوبر ۴۹ء تک قیام کیا، لیکن اگست ۴۸ء کے انقلاب کے بعد ریاست کے لیل و نہار ہی بدل گئے، اس اثنا مین وہ معارف کے لئے کوئی مستقل مضمون تو نہ لکھ سکے لیکن وفیات کے عنوان سے اپنے معاصرین کی رحلت پر اپنے غمناک تاثرات کا اظہار کرتے رہے، وفیات لکھنا ان کا خاص فن ہو گیا تھا، چنانچہ اُن کے معاصر جناب عبدالماجد صاحب دریابادی مدظلہ نے ایک موقع پر تحریر فرمایا کہ "سید صاحب کا وہ معاصر خوش قسمت ہے، جو اُن کے سامنے وفات پا جائے، اور اُن کی ماتم گساری کی دولت اس کے حصہ مین آئے"،

کبھی کبھی معارف مین شذرات بھی لکھ دیتے، اُن کے آخری شذرات جون ۵۰ء کے معارف مین شائع ہوئے جس کا آخری ٹکڑا یہ ہے

"ہم ہندو مسلمانون کے میل ملاپ اور میل جول پر دل سے یقین رکھتے ہین، لیکن یہ قطعاً فردوسی

نہین سمجھتے کہ اس غرض کو دین دھرم کا فرق مٹا کر ہی حاصل کیا جا سکتا ہے، بلکہ ہندو ہندو اور مسلمان مسلمان رہکر بھی اس غرض کو حاصل کر سکتے ہین جس کی مثالین انگریزون کی دی ہوئی تعلیم سے پہلے ہندوستان مین کثرت سے تھین اور اب بھی ہین"،

یہ گویا ہندوستان والون کے نام اُن کا آخری پیام تھا،

سفرِ حج | ۱۹۴۹ء کے اکتوبر مین وہ اپنی اہلیہ اور صاحبزادے سلمان سلمہٗ کے ساتھ حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے جس جہاز سے وہ روانہ ہوئے اس کے امیر بنائے گئے، اور حجاز پہونچکر شاہ ابن سعود کے مہمان خاص رہے، ابن سعود نے کئی بار اُن کو اپنے ساتھ کھانے پر مدعو کیا، حج کے بعد مدینہ منورہ مین ایک مہینہ قیام فرمایا، بارگاہِ نبوی مین رسولِ اکرم کے سوانح نگار نے اپنے دردِ عشق، عقیدت و محبت، عجز و نیاز، کیف و سرور کا اظہار ایک نعتیہ غزل مین کیا جس کے چند اشعار یہ ہین،

مکی مدنی ہاشمی و مطلبی ہے — آدم کے لئے فخر یہ عالی نسبی ہے
پاکیزہ تر از عرش و سما جنت و فردوس — آرامگہ پاکِ رسولِ عربی ہے
آہستہ قدم، نیچی نگہ، پست ہو آواز — خوابیدہ یہان روحِ رسولِ عربی ہے
بجھ جائے تری چھینٹون سے اے ابرِ کرم آج — جو آگ مرے سینہ مین مدت سے دبی ہے

مدینہ منورہ مین عالم اسلام کے علماء کا جب کوئی چھوٹا بڑا اجتماع ہوتا، تو اس مین وہ بھی مدعو کئے جاتے، اور ہندی زائرینِ حج کا بیان ہے کہ وہ تقریر یا گفتگو کرتے تو سب مین ممتاز نظر آتے،

حج سے دسمبر ۱۹۴۹ء مین واپس ہوئے تو بمبئی پہونچ کر سخت علیل ہو گئے، وہان اعظم گڈھ کے سیٹھ عبدالعزیز انصاری صاحب نے بڑے اخلاق و محبت و فیاضی سے اُن کی تیمارداری کی، شفا پائی تو جنوری کے وسط مین بھوپال آئے، وہان سے اپریل کے آخر مین اپنا تعلق ختم کر دیا، اہل و عیال کو لے کر اپنے منجھلے داماد کے یہان کانپور آ گئے، وہان سے لکھنؤ ہوتے ہوئے مئی مین اعظم گڈھ آئے، بھوپال سے کئی بار اعظم گڈھ آتے جاتے رہے، لیکن اس مرتبہ کی آمد سے رفقائے دار المصنفین خوش تھے کہ

پھر مستقل قیام کے لئے یہاں آجائیں گے، اور وہی اگلی رونق اور چہل پہل قائم ہوجائے گی، اب ان کو مکمل راحت اور سکون کی بھی ضرورت تھی،

**ہجرت** | لیکن کارکنانِ قضا و قدر نے ان کو مسلمانوں کی ایک نوزائیدہ سلطنت کی آخری خدمت کے لئے جون ۵۰ء میں کراچی پہنچا دیا، وہ کراچی گئے، تو ہندوستان میں اپنی ساری چیزیں اور ساری املاک چھوڑ کر گئے، اس ہجرت سے اُن کو شدید مالی نقصانات پہونچے، رحمۃ للعالمین کے سیرت نگار کو رب العالمین نے سب کچھ عطا فرمایا تھا، ایک ہجرت کی سعادت باقی تھی، وہ بھی پوری ہوگئی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح نگار کو اپنے محبوب رسول کی طرح مہاجر ہی بن کر اپنی زندگی کا خاتمہ بالخیر کرنا تھا، وہ پاکستان کے شہری بن گئے، تو ۵۱ء میں معارف پر سے نہایت دکھ کے ساتھ بعض مجبوریوں کی بنا پر ان کا اسم گرامی ہٹانا پڑا، جو اُس کے سرورق پر دُرِ آبدار کی طرح ۱۹۱۶ء سے چمکتا رہا تھا، لیکن معارف پر اُن کا نام رہے یا نہ رہے، یہ اُن ہی کی یادگار ہے، اس علمی رسالہ نے ملک کا جو بلند پایہ علمی ذوق بنایا، اور مضمون نگاروں کو تحقیق و تلاش اور وقتِ نظر سے مضامین لکھنے کا جو سلیقہ سکھایا، پھر مستشرقین یا گمراہ مسلمان اہلِ قلم نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جب کبھی زہر اگلا، اس کے خلاف اس میں جو تریاق پیش ہوا، وہ سب معارف ہی کے فیض ہیں، اگر وہ کوئی اور علمی کام نہ بھی کرتے تو صرف معارف کی ادارت ہی اُن کو زندۂ جاوید رکھنے کے لئے کافی تھی،

اب وہ دار المصنفین کے ناظم بھی نہیں رہ گئے تھے اور یہ اس ادارہ کی زندگی کی سب سے بڑی ٹریجیڈی تھی کہ وہ اپنی زندگی ہی میں اس سے علٰحدہ ہوگئے، گو وہ اس پر خوش تھے کہ اپنی زندگی ہی میں موت کے بعد اس کا نقشہ دیکھ لیا لیکن درحقیقت اس کے جریدہ پر ان ہی کا دوام ثبت ہے، سید سلیمان ہی دار المصنفین ہیں، اور دار المصنفین سید سلیمان ہی، ایک اسم کے دو مسمّی اور ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں، وہ ہندوستان میں علوم و فنون کا ایک تاج محل بنا کر پاکستان چلے گئے، اُن کے بعد جب کوئی علمی سیّاح اس تاج محل کو دیکھنے آتا، تو اس کو دیکھتا تو ضرور لیکن اُن کی عدم موجودگی میں اس تاج کو چودھویں رات کی چاندنی میں دیکھنے سے محروم رہتا،

**اہلِ پاکستان کی حسرت** | جب سید صاحب پاکستان کے باضابطہ شہری بن گئے، تو وہاں کے خواص و عوام کو بڑی

خوشی تھی کہ رسُولِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کا سیرت نگار اور عالمِ اسلام کا ایک متبحّر عالم اُن کی مملکت کا باشندہ ہوگیا ہے، حکومت پاکستان نے دستور بنانے کے سلسلہ مین ادارۂ تعلیمات اسلام کے نام سے علماء کا ایک بورڈ قائم کیا تھا، سید صاحب کو اس کی صدارت ڈیڑھ ہزار ماہانہ پر پیش کی گئی لیکن انھون نے اس کو قبول کرنے سے انکار کیا، اور رضا کارانہ طور پر وہان کے مذہبی، قومی، تعلیمی اور علمی کامون مین لگ گئے،

سنہ ۵۰ء کے نومبر مین انجمن ترقی اردو پاکستان نے اُن کے اعزاز مین ایک علمی جلسہ کیا جسکی صدارت ڈاکٹر محمود حسین وزیر مرکزی کابینہ نے کی، اور سید صاحب نے اپنا ایک مقالہ "ہندوستان کے نومسلم حکمران" پڑھا، لیکن اُن کے پاکستان جانے کی جو اصلی غایت تھی، اس کو اس عاجز راقم کو ایک مکتوب لکھ کر اس طرح ظاہر فرمایا:

"یہان اصلی کام دین کی خدمت اور حکومت اور اصحاب اقتدار کو ادھر متوجہ کرنا ہے، مسلمانون سے اس کی اشاعت اور علوم دین کی حفاظت کا کام مقدّم ہے"

ان ہی باتون کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ ارباب حکومت سے ملتے اور موقع بموقع اُن کو تلقین کرتے رہے، پھر اسی خیال سے اپنی قیامگاہ کے قریب ہی زیر تعمیر جامع مسجد مین قرآن پاک کا درس دینا شروع کیا، اس جامع مسجد کا نام انہی کے نام پر جامع سلیمانی رکھا گیا، اس درس مین شرکاء کی تعداد اتنی بڑھی کہ لاؤڈ اسپیکر لگانے کی ضرورت ہوئی، اس مسجد کے چارون طرف درس و تبلیغ کے کمرے ایک کتب خانہ اور ایک علمی ادارہ بھی بنانے کا خیال تھا، لیکن یہ اُن کی زندگی مین پورا نہ ہوسکا،

| سلہٹ جمعیۃ العلماء کی صدارت | |
| --- | --- |

جمعیۃ العلمائے اسلام کی دعوت پر جنوری سنہ ۵۱ء مین ڈھاکہ، چاٹگام اور سلہٹ کا ایک دورہ بھی کیا، سلہٹ کے جمعیۃ العلمائے اسلام کے ایک جلسہ مین ایک پر مغز صدارتی خطبہ بھی دیا جس مین مذہبی اور دینی خدمت کی ترغیب دینے کے علاوہ پاکستان کی اقلیتون سے فیاضانہ سلوک کرنے کی بھی نصیحت کی، چنانچہ فرماتے ہین:

"مین نے جب کبھی پاکستان مین غیر مسلم اقلیت پر کسی زیادتی کا حال سنا، تو بحیثیت مسلمان کے اس پر شرمندگی محسوس کی، مسلمانون کا فرض ہے کہ خواہ کسی دوسرے ملک مین اُن کے ہم

ہم مذہبوں پر جو کچھ گذرے مگر وہ اپنے ملک کی اقلیت کی پوری پوری حفاظت کریں، اور اسی طرح دوسرے ملک میں وہ اپنے بھائیوں کی مدد کر سکتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی غیر مسلم اقلیت (معاہد) پر ظلم کریگا تو قیامت کے دن خدا کے سامنے اسکا دامن پکڑونگا، اور یہ بھی فرمایا کہ جو اس پر ظلم کریگا وہ جنت کی خوشبو تک نہ سونگھیگا، اس سے اندازہ لگانا چاہئے کہ ایک مسلمان پر غیر مسلم اقلیت کی جان و مال، عزت و آبرو کا کتنا بڑا فرض ہے،

**تعلیمی و قومی سرگرمیاں** وہاں سے واپسی کے بعد موتمر اسلامی کا جلسہ تھا جس میں انھوں نے شرکت فرمائی، اس کے بعد ہی ٹانڈو میں ایک دینی درس گاہ قائم ہوئی، تو اس کی تاسیس میں پورا حصہ لیا، اور اس کے سرپرست مقرر ہوئے، اسی سال پنجاب یونیورسٹی کا ایک کمیشن مقرر ہوا تو اس کے ممبر بنائے گئے، نومبر ۱۹۵۱ء میں ملتان میں ایک تبلیغی جلسہ ہوا، تو اس میں شرکت کی، پھر قائدِ اعظم کی یادگار میں ایک مجوزہ دار العلوم کی جو کمیٹی بنی، اس کے بھی رکن ہوئے، اور اس کے لئے لاہور، ملتان، اور راولپنڈی کا سفر کیا، دستور ساز اسمبلی کے بنیادی حقوق کی سب کمیٹی کے بھی ممبر مقرر کئے گئے، اس کمیٹی میں ان کا سب سے بڑا کام یہ ہوا کہ اس کے ارکان کو قرآن اور سنت کے اتباع کی اہمیت یہ واضح کر کے بتائی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو کتاب اور سنت کی جو دو نعمتیں عنایت فرمائی ہیں، ہدایت الٰہی انہی دونوں کے اندر منحصر ہے، اب جو بھی ایک کو چھوڑ کر صرف دوسری پر قناعت کرے گا، وہ یقیناً گمراہ ہوگا، اور وہ ضلالت کی خودکشی سے کبھی بچ نہیں سکتا، سید صاحب نے اس نکتہ کی وضاحت بار بار کی، چنانچہ مذکورۂ بالا کمیٹی کے ممبروں کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آگئی، اور انھوں نے اپنی رپورٹ میں یہ دفعہ رکھی کہ کوئی ایسا قانون نہ بنایا جائے گا، جو قرآن پاک اور سنت کے خلاف ہو،

فروری ۱۹۵۲ء میں انھوں نے دنیائے اسلام کے تمام علماء کو کراچی میں مدعو کیا، یہ کانفرنس احتفال علمائے اسلام کے نام سے منعقد ہوئی، اس کی کامیابی کے متعلق اپنے ایک مکتوب میں عاجز راقم کو تحریر فرماتے ہیں،

"احتفال علمائے اسلام کی مشغولیت کے سبب سے جواب نہ دیسکا، احتفال کامیاب رہا، گو ادھر کے علماء کی شرکت نہ ہو سکی، تاہم مختلف ملکوں کے علماء یکجا ہو گئے، خصوصاً ایران اور نجف کے علماء کی آمد سے سنی اور

شیعہ علماء کے درمیان توافق بحمد اللہ پیدا ہوا، اور ہم آہنگی ہوگئی۔"

مارچ ۵۲ء میں لاہور میں پاکستان ہسٹاریکل کانفرنس کے شعبۂ اسلامی تاریخ کی صدارت کی، اور اس میں ایک مقالہ بھی "دیبل" کے عنوان سے پیش کیا، وہاں عربی زبان و ادب کی بھی ایک کانفرنس ہوئی، اس کی بھی صدارت انھوں نے فرمائی، پھر اسی مہینہ پنجاب یونیورسٹی میں اُن کا ایک توسیعی لکچر بھی ہوا،

اسی سال عرب ممالک کی سب سے بڑی علمی اکیڈمی مجمع الفواد الاول نے اُن کو اپنا رکن بنایا، ابو علی سینا کی ہزار سالہ جوبلی کے موقع پر حکومت عراق نے انکو اپنا مہمان مدعو کیا، لیکن اس میں شرکت نہ فرما سکے،

اپریل ۵۲ء کا پورا مہینہ ملتان اور راولپنڈی میں گذارا، یہاں عربی مدارس کے سالانہ جلسے ہوتے رہے، انکی تنظیم کے لئے مفید مشورے دیئے، ملتان کو قائد اعظم کے مجوزہ دارالعلوم کیلئے پسند فرمایا،

کراچی یونیورسٹی قائم ہوئی تو اس کے سینٹ کے ممبر نامزد کئے گئے، جناب لیاقت علی خان مرحوم کی یاد میں حکومت نے پانچ لاکھ کے سرمایہ سے ایک کتب خانہ قائم کرنا چاہا، تو اس کی تاسیس و تشکیل کی خدمت انہی کے سپرد ہوئی،

ان کے ذریعہ پاکستان کے مذہبی و قومی کام تو انجام پا رہے تھے، لیکن خود ان کے لئے وہاں اب تک کوئی معاشی صورت پیدا نہیں ہوئی تھی، چنانچہ ایک مکتوب میں اس راقم کو تحریر فرمایا کہ معاشی صورت پیدا کرنے کے لئے ارادہ ہے کہ وہی پیشۂ قدیم کتب فروشی اختیار کیا جائے، چنانچہ مکتبۃ الشرق کے نام سے کتابوں کی ایک دوکان کھولی، پاکستان کے آئین کے سلسلہ میں وہاں کی حکومت نے ادارۂ تعلیمات اسلام قائم کیا تھا، اس کی صدارت ان کو برابر پیش کی جارہی تھی، لیکن وہ اس کو قبول کرنے سے انکار کرتے رہے، لیکن ہجرت کے تقریباً ستائیس مہینے کے بعد یہ عہدہ کچھ شرائط کے ساتھ قبول فرمایا، وہ اپنے ایک مکتوب مورخہ ۱۰؍ اگست ۵۲ء میں اس حقیر کو تحریر فرماتے ہیں کہ

"یہ (یعنی عہدۂ صدارت ادارۂ تعلیمات اسلام) دو برس پہلے میرے سامنے پیش کیا گیا تھا، مگر میں نے بعض شرط رکھے تھے، وہ اب پورے ہو رہے ہیں، یعنی آئین کے ساتھ قانون رائج کرنے کی اصلاح کا کام اب شروع ہوا ہے، تو میں نے ۲؍ اگست کو قبول کرلیا تاکہ پورے مسودہ آئین پر رائے دی جاسکے،

گو آئین کا کام اب ختم ہو رہا ہے "

یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اپنے شرائط پر عہدہ قبول کیا، تو کتنا الاؤنس لینا پسند فرمایا،

۱۹۵۲ء کے آخر مین جمعیۃ العلمائے اسلام کے صدر مقرر ہوئے، اور اُس نے پاکستان کے دستور کو اسلامی بنانے مین جو مساعی کی، اس مین اُن کا حصہ نمایان رہا،

۱۹۵۳ء کے مارچ مین پاکستان ہسٹاریکل کانفرنس کی صدارت کیلئے ڈھاکہ تشریف لیگئے، وہان خطبۂ صدارت میں اردو اور بنگالی کے تنازع کے سلسلہ مین اپنے درد مندانہ خیالات کا اظہار کیا جو وہان کے ناعاقبت اندیش طلبہ کو پسند نہین آئے، اسلئے جب کانفرنس کا اجلاس دوسرے روز شروع ہوا، تو انھون نے ہنگامہ برپا کرنے کی کوشش کی، جس سے اجلاس کو ملتوی کر دینا پڑا، اور جب سید صاحب موٹر پر بیٹھ کر اپنی قیامگاہ کو واپس جانے لگے، تو شرارت پسند طلبہ نے اُن کی موٹر گھیر لی، نازیبا الفاظ استعمال کئے، اور تشدد پر آمادہ ہو کر اُن کی اہانت پر اتر آئے، لیکن وہ اُن کی اہانت نہین کر رہے تھے، بلکہ علم و حکمت، تحقیق و بصیرت، فکر و تدبر، عظمت و جلالت، اور متانت و وقار کی تذلیل کر رہے تھے، مشرقی بنگال کے طلبہ کا یہ شرمناک رویہ اُن کی قومی زندگی پر ہمیشہ کے لئے ایک بدنما داغ بن کر رہے گا، یہ طوفان بدتمیزی ختم ہوا، تو ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے سید صاحب کی قیامگاہ پر آکر اظہار ندامت کیا، اور معافی مانگی، لیکن اُن کی ذات والاصفات ان رسمی باتون سے بہت ہی بلند تھی، ڈھاکہ سے کراچی واپس جانے لگے تو ہندوستان مین اپنے منجھلے داماد جناب سید حسین صاحب اڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ فتح پور ہنسوا کے یہان آکر ٹھہرے، یہین دارالمصنفین کا ایک چھوٹا سا قافلہ سراپا محبت بنکر اُنکی قدمبوسی کیلئے حاضر ہوا، وہ اپنے نقش گزارون کو دیکھکر بیحد مسرور ہوئے، بڑے لطف و محبت سے پیش آئے، اور وعدہ فرمایا کہ اس سال رمضان المبارک کے بعد دو مہینے دارالمصنفین مین آکر گذارین گے، جس سے دارالمصنفین مین اُنکی روحانی اولاد بہت خوش ہوئی، اسی سفر مین دارالعلوم ندوہ کی مقناطیسی قوت نے اُن کو اپنی طرف کھینچا، اور وہ فتح پور سے کھنچ کر ندوہ چلے گئے، وہان کے طلبہ اپنے بچھڑے ہوئے باپ سے بڑے والہانہ انداز سے ملے، اور وہ بھی اپنے مجبور فرزندون سے ملکر اشکبار ہوئے، اُن کے اعزاز مین جمعیۃ الاصلاح کی طرف سے جمالیہ ہال مین ایک جلسہ ہوا، تو پورا بھر گیا، جب سید صاحب نے ہال کے زینہ پر قدم رکھا تو عمارت پر حسرت بھری نگاہ ڈالی، اور درد بھری آواز مین یہ شعر پڑھا

میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو
میں اپنے آپ کو مانند مہمان لیکے آیا ہوں،

اس کے پڑھنے پر اُن کی طرح اور لوگوں کی بھی آنکھیں اشکبار ہوگئیں، جلسہ کی کارروائی، تلاوت قرآن پاک سے شروع ہوئی، قاری نے شروع میں یہ آیت پڑھی،

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ
جب کہ قافلہ چلا تو ان کے باپ (یعنی حضرت

إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا أَن
یعقوبؑ) نے کہا کہ میں یوسف کی خوشبو پاتا ہوں،

تُفَنِّدُونِ ، (یوسف)
اگر تم مجھ کو بیوقوف نہ بناؤ،

اس کو سُن کر تمام حاضرین متاثر ہوئے خود سید صاحب ضبط نہ فرما سکے، بے اختیار اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تانتا بندھ گیا، ایک طالب علم نے عربی میں سپاسنامہ پڑھا جس کے بعد سید صاحب بڑے درد بھرے انداز سے اپنی تقریر شروع کی، پوری تقریر سوز و درد کا مرقع تھی، اس میں پاکستان کی ہجرت کے اسباب بیان فرمائے، اور آخر میں اپنے عزیز طلبہ کو یہ پیام دیا،

سبق پھر پڑھ صداقت کا شجاعت کا عدالت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

ندوہ کے طلبہ کے نام ان کا یہ آخری پیام تھا جو ان کی مادر درسگاہ کے ہر زمانہ کے طلبہ کے لئے باقی و جاری رہیگا،

دارالمصنفین کے خدام رمضان المبارک کے بعد اعظم گڈھ اُن کی تشریف آوری کا انتظار کر رہے تھے کہ پہلے ایک خط میں موانعِ سفر کے اسباب لکھے، پھر اپنی علالت کی اطلاع دی، آخری خط میں اُن کے روبصحت ہونے کی بشارت تھی، لیکن ۱۴ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ مطابق ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء کو عشاء کے بعد یکایک ریڈیو سے خبر ملی کہ وہ اللہ کو پیارے ہوگئے، آہ!

عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا،

وہ ہم سے رخصت ہوگئے اور زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں:-

رفتم و از رفتنِ من عالمے تاریک شد
من مگر شمعم چو رفتم بزم برہم ساختم

مگر عالم بالا میں اُن کو دیکھ کر فرشتے پکار رہے ہونگے کہ جگہ خالی کرو مداح آتا ہے محمد کا"

# بچپن اور طالب علمی کے کچھ واقعات

از

مولانا ابو ظفر صاحب ندوی

علامہ سید سلیمان ندوی کی ولادت ۱۳۰۲ھ مین ہوئی، جیسا کہ اُن کے والد ماجد حکیم سید ابو الحسن مرحوم کے سفینہ مین درج ہے، مقام ولادت صوبہ بہار ضلع پٹنہ کا ایک چھوٹا سا گاؤن دسنہ نامی ہے جو بہار شریف سے تین چار کوس کے فاصلہ پر واقع ہے، جہان زیادہ تر سادات آباد تھے، اور اس کے باشندون کی بڑی تعداد تعلیم یافتہ ہونے کے سبب اُس کی شہرت دور دور تک تھی، جس گھر مین علامہ کی ولادت ہوئی تھی، وہ گھر آج بھی مسجد سے متصل موجود ہے،

آپ کا اصلی نام سید ابو نجیب ہے کیونکہ خاندانی نام زیادہ تر "ابو" پر ہین، چنانچہ اُن کے چچا کا نام ابو تراب، اور دوسرے کا ابو یوسف، اور اُن کے بڑے بھائی کا نام ابو حبیب تھا،

آپ کے منجھلے چچا سید ابو تراب دہلی، لکھنؤ وغیرہ کا سفر کر چکے تھے، اور آج سے تقریباً ستر سال قبل جدید تہذیب سے متاثر ہو کر سر سید احمد خان کے ہم خیال ہو گئے تھے، ان ہی نے اُن کا نام سلیمان رکھا تھا کہ جب وہ لندن سے واپس آئے گا، تو لوگ اس کو "مسٹر سلومن" کہین گے، چنانچہ اسی نام سے اُن کی شہرت ہوئی، اور علامہ موصوف نے خود بھی اسی کو پسند فرما کر اپنا نام سید سلیمان قرار دیا،

لطف کی بات یہ ہے کہ واقعی اپنے چچا کی زندگی ہی مین علامہ موصوف لندن گئے جس پر انھون نے بڑی مسرت کا اظہار کیا کہ میری پیشین گوئی صحیح نکلی،

آپ کا پدری سلسلہ نسب امام موسیٰ رضا تک پہنچتا ہے، اور مادری امام زید تک،

**ابتدائی تعلیم** آپ کی عمر چار پانچ برس کی ہوگی کہ آپ کی بسم اللہ ہوئی، اور وہ مکتب مین بٹھا دیئے گئے، آپکے پہلے استاد کا نام مولوی مقصود علی تھا، مولوی صاحب موصوف خاکسار کے بھی پہلے استاد تھے، لیکن مین اس قدر کم عمر تھا کہ انکی علمی قابلیت کا صحیح اندازہ اس وقت نہ لگا سکا، البتہ اس قدر یاد رہ گیا ہے، کہ فارسی کی بڑی چھوٹی سب کتابون کا درس دیتے تھے،

مجھے ہندوستان کے دوسرے صوبون کا حال نہین معلوم لیکن آج سے ستر بہتر برس قبل، صوبہ بہار کے ضلع پٹنہ کے دیہاتون مین مکاتب کا نظام میری ابتدائی عمر تک موجود تھا،

گاؤن کا کوئی زمیندار کسی مولوی کو بہت معمولی تنخواہ پر اپنے بچون کی تعلیم کے لئے مقرر کرتا تھا، تنخواہ کے علاوہ ناشتے کھانے کپڑے اور دھوبی حجام کے مصارف سب کا بار زمیندار پر ہوتا، ہر موسم مین کچھ غلہ بھی زمیندار ان کو دیتا تھا اس کے علاوہ گاؤن کے دوسرے بچون کو بھی اس کے ساتھ تعلیم کی اجازت ہوتی تھی، اُن کے والدین بھی مولوی صاحب کی اپنی اپنی استطاعت کے مطابق خدمت کرتے تھے، اس طرح مولوی صاحب کی زندگی خوش حالی سے بسر ہوتی تھی لڑکون کی تعداد بیس پچیس سے زیادہ نہین ہوتی تھی، اور بعض بعض گاؤن مین متعدد مکتب ہوتے تھے،

ان مکتبون مین ہندو مسلمان دونون کے بچے پڑھتے تھے، معلم عموماً فارسی دان مسلمان ہوتے، اردو کی تعلیم برائے نام ہوتی تھی، سارا زور فارسی ادب پر صرف ہوتا تھا، اس زمانہ مین مسلمان شرفا خطوط بھی فارسی ہی مین لکھتے تھے، نصاب درس مین مندرجہ ذیل کتابین ہوتی تھین،

آمد نامہ، گفتگو نامہ، تعلیم عزیزی، کریما، ماقیما، گلستان، بوستان، یوسف زلیخا، اخلاق محسنی، سکندر نامہ، بہار دانش، سہ نثر ظہوری، رقعات عالمگیری، اور انشائے خلیفہ وغیرہ،

تاریخ اور جغرافیہ کی تعلیم قطعی نہین ہوتی تھی، البتہ حساب مین جمع تفریق، ضرب تقسیم تک کی تعلیم ہوتی تھی، خوش خطی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا، طلبہ عموماً ۱۴۔۱۵ سال کے اندر نصاب ختم کرکے شہر چلے جاتے، جہان عربی یا انگریزی مدارس مین داخل ہوجاتے،

یہ مجھے معلوم نہین کہ علامہ موصوف نے کے برس اس مکتب مین تعلیم پائی، مکتبی تعلیم ختم ہونے کے بعد موصوف کے بڑے بھائی حکیم سید ابو حبیب صاحب نے تعلیم دینی شروع کی، آہستہ آہستہ تھوڑے طلبہ یہان بھی جمع ہوگئے، یہ مکتب بھی کچھ عرصہ تک چلا، اور ایسا یاد آتا ہے کہ اُن کے حج کے لئے جانے کے سبب یہ سلسلہ ختم ہوگیا، ان مکاتب کی تعلیم مین بیت بازی بھی تھی، کبھی ایک ہی مکتب کے طلبہ دو جماعتون مین تقسیم ہوکر بیت بازی کرتے، اور کبھی دو مکتبون کا ایک دوسرے سے مقابلہ ہوتا،

علامہ سید سلیمان ندوی کے مکتب مین بھی دو پارٹیان تھین، جہان تک مجھے یاد ہے ایک پارٹی کے امیر علامہ موصوف اور اُن کے مشیر خاص مولوی حکیم سید نجم الہدیٰ صاحب ندوی تھے، اور دوسری کے مولوی محمد قاسم صاحب، یہ دونون آج بھی بقید حیات ہین، اسکا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ علامہ موصوف کو شاعری سے ایک خاص لگاؤ ہوگیا، اور ہزارون اشعار ان کو زبانی یاد ہوگئے، خاکسار بھی باوجود کم سنی کے ان جلسون مین عموماً شریک رہتا تھا،

اسی سلسلہ مین علامہ نے ایک بیاض تیار کی تھی، جس کے سرورق کو رنگ سے خوشنما کردیا تھا، اس مین ہزارون منتخب اشعار درج تھے، میرے والد مرحوم کی وفات ۱۹۲۹ء تک، یہ بیاض میرے ذاتی کتب خانہ مین موجود تھی، چونکہ بیت بازی مین حریف خود ساختہ اشعار بھی پیش کرتے تھے، اس لئے علامہ موصوف کو تقطیع کی طرف خاص توجہ کرنی پڑی جس سے اُن کو فن عروض پر اس قدر عبور ہوگیا تھا، کہ علماء مین اس کی مثالین کم ہون گی،

علامہ موصوف کو کھیل کود اور اس قسم کے تفریحی مشاغل سے مطلق دلچسپی نہ تھی، اُن کے احباب جب تاش یا شطرنج کھیلتے، تو وہ صرف تماشائی ہوتے تھے، یا اخبار وغیرہ پڑھنے لگتے، اگر کبھی کسی کھیل مین شرکت کی تو وہ کبڈی ہے، جس کا رواج ہندوستان کے تمام صوبون مین کسی نہ کسی شکل مین آج بھی موجود ہے،

علامہ صغر سنی مین ایک کھیل اور بھی کھیلا کرتے تھے، آپ کے والد، دادا، بھائی، بلکہ خاندان کے بیشتر بزرگون کا پیشہ طبابت تھا، اس لئے گھر مین علاج معالجہ کا چرچا ہر وقت رہتا تھا، اس کی نقل مین کبھی کبھی مختلف قسم کی شیشیون مین پانی بھر کر بچون کا علاج کرتے تھے، اُن کی بڑی ہمشیرہ جب پوچھتین کہ یہ کیا کرتے ہو تو کہتے کہ بیمارون کا علاج کرتا ہون، لوگ کہتے کہ لڑکا آگے چل کر بڑا طبیب ہوگا، لیکن باوجود اُن کے والد کی دلی تمنا کے یہ

پیشین گوئی پوری نہ ہوئی،

عربی کی ابتدائی تعلیم اپنے برادر معظم حکیم سید ابو حبیب صاحب مجددی سے حاصل کرنے کے بعد دربھنگہ تشریف لے گئے، اُن کے ہم مکتبون مین سے صرف مولوی سید نجم الہدیٰ صاحب نے اُن کا ساتھ دیا، وہان کچھ عرصہ تک تعلیم پاتے رہے، افسوس ہے کہ اُن کے کسی استاد کا نام حافظہ نے محفوظ نہین رکھا،

علامہ موصوف بچپن سے کم سخن اور خاموش طبیعت کے انسان تھے جس سے ان کے استاد اُن کو غبی اور کند ذہن سمجھتے تھے، اور اُن کے تیز زبان ساتھیون کو ذہین اور صاحب ذوق سمجھ کر اُن کی طرف زیادہ توجہ کرتے تھے، اور پھر جب حصول فضل وکمال کے بعد دنیا مین اُن کی شہرت ہوئی تو ان کی کم سخنی کی وجہ سے لوگ اُن کو مغرور سمجھنے لگے، علامہ موصوف کو اسکا اندازہ ہوا، تو انھون نے اپنے کو شگفتہ بنانے کی بے حد کوشش کی، اور آخری عمر مین تو واقعی اس قدر شگفتہ ہو گئے تھے کہ اُنکی مجلس سے اٹھنے کو دل نہین چاہتا تھا،

ایک لطیفہ سننے کے قابل ہے علامہ موصوف اپنی شہرت کے شباب کے زمانہ مین کسی تقریب سے حیدرآباد تشریف لے گئے، اتفاق سے اس وقت دربھنگہ والے استاد وہان موجود تھے، انھون نے اخبار مین پڑھا کہ مولانا سید سلیمان صاحب تشریف لائے ہین، اور فلان جگہ مقیم ہین، تو شاہ سلیمان صاحب پھلواروی کو سمجھ کر اُن سے ملنے کے لئے آئے، مگر اُن کے بجائے ایک دوسرے سلیمان کو پایا، مجھے یاد نہین کہ خود استاد نے شاگرد کو پہچان لیا، یا تعارف کے بعد پہچانا، تعارف کے بعد استاد نے کہا کہ "سلیمان! تو تو بڑا غبی اور کند ذہن تھا، اس قدر بڑا آدمی کیسے بن گیا" احباب نے قہقہہ لگایا، اور بات آئی گئی ہوگئی،

دربھنگہ کی تعلیم کے کچھ دنون کے بعد پھلواری شریف (متصل پٹنہ) کے مدرسہ مین داخل ہوئے، جناب شاہ سلیمان صاحب پھلواروی کے بڑے صاحبزادے شاہ حسن میان مرحوم آپکے ہم عمر تھے، اور غالبًا ہم جماعت بھی تھے حسن میان حُسنِ صورت اور حُسنِ سیرت دونون مین نمایان تھے، ندوۃ العلماء کا جو سالانہ جلسہ عظیم آباد پٹنہ مین ہوا تھا، اس مین خاکسار بھی باوجود کمسنی کے شریک تھا اس وقت حسن میان کی عمر ۱۴-۱۵ سال سے زیادہ نہ تھی، اور علامۂ موصوف کی بھی

کم و بیش یہی عمر رہی ہوگی

جہان تک مجھے یاد ہے، اس جلسہ مین شرکت کے لئے علامہ موصوف کے والد حکیم سید ابوالحسن صاحب بھی تشریف لائے تھے، وہ اس جلسہ سے اتنا متاثر ہوئے کہ انھون نے طے کیا کہ علامہ موصوف کو ندوہ بھیج دیا جائے، چنانچہ دوسرے سال وہ لکھنؤ پہنچ گئے۔ ان سے پہلے اُن کے ہم مکتب مولوی محمد قاسم صاحب ابن حضرت شاہ تجمل حسین صاحب اور مولوی عبدالسبحان پہنچ چکے تھے، غالباً موصوف دوسری جماعت مین شریک ہوئے، کیونکہ جب مین ندوہ مین پہلی جماعت مین داخل ہوا تو وہ چوتھی جماعت مین تھے اور شرح وقایہ پڑھتے تھے،

ندوہ مین ورزش کا بھی انتظام تھا، مگر ورزش قدیم طریقہ کی تھی، اور کشتی کے لئے اکھاڑا بنا ہوا تھا، اس کے آس پاس مگدر رکھے ہوتے، ڈھال اور لکڑی کی تلوار بھی تھی، لاٹھی چلانا بھی سکھلایا جاتا تھا جس کو طلبہ شوق سے سیکھتے تھے، اس زمانہ مین مسٹر مکڈانل اودھ کے لفٹنٹ گورنر تھے، یہ مسلمانون پر بڑے مہربان تھے، انھون نے اس کی ابتدا اردو زبان کی جڑ کاٹنے سے شروع کی، اودھ کی عدالتی زبان اردو کو بدل کر ہندی کر دی[۵]، دوسرا حملہ ندوہ پر ہوا، اور چوتھا علی گڑھ پر لیکن نواب محسن الملک جیسے سیاست دان نے تو کالج کو بچا لیا، مگر غریب ندوہ چکر مین آگیا، مکڈانل صاحب نے اراکین ندوہ سے دریافت کیا، کہ ندوہ مین ڈھال، تلوار، مگدر، کشتی کی مشق کیا جہاد کی تیاری کے لئے کرائی جاتی ہے؟ اس سے اہل ندوہ اس قدر گھبرائے کہ سب کھیل بند کر دیئے گئے اور پھر ایک عرصۂ دراز کے بعد ورزش کے بعد فٹ بال کرکٹ، ہاکی، اور شب جمعہ کو کبڈی کا رواج ہوا لیکن علامہ موصوف نے کبھی بھی ان ورزشی کھیلون مین دلچسپی نہین لی، ورزشی کھیلون کا وقت عصر سے لیکر مغرب تک تھا، علامہ موصوف یہ وقت رسالہ، اخبار، یا کتب بینی مین صرف کرتے، ندوہ دار الاخبار کے جس مین ہندستان کے اکثر اخبارات اور رسالے آیا کرتے تھے، ناظم مقرر ہوئے، اس سے انھون نے خود بھی فائدہ اٹھایا، اور دوسرون کو بھی اس کی ترغیب دیتے تھے، کچھ دنون کے بعد انھون نے ایک علمی پارٹی تیار کرلی جس کے ممتاز ممبر مشہور شاعر

---

[۵] معارف اردو کے بجائے ہندی نہین کی تھی، بلکہ اردو کے ساتھ ہندی کو بھی عدالتی زبان بنا دیا تھا،

جلیلؔ جانشین امیرؔ مینائی کے صاحبزادے مولوی صدیق حسن صاحب اور عثمان پاشا تھے، جو شیخ پورہ ضلع مونگیر کے باشندے تھے، اسی زمانہ میں ایک ادبی انجمن تہذیب الاخلاق کے نام سے قائم کی جس میں طلبہ کو تحریر اور تقریر کی مشق کرائی جاتی جمعہ کے بعد اس کا جلسہ ہوتا، کبھی مہتمم صاحب اور کبھی کوئی دوسرا مدرس اس کا صدر ہوتا، بعض دفعہ آخری درجہ کا کوئی موقر طالب علم اس فرض کو انجام دیتا، اس انجمن کی نظامت، جہاں تک مجھے یاد ہے، اکثر انہی کے ہاتھ میں رہی، وہ بہترین مقررین میں تھے، لیکن انکی تقریر میں جوش و خروش نہ ہوتا اور نہ وہ جذبات کو ابھارنے والی ہوتی، بلکہ زیر بحث مسئلہ کو دلائل اور امثال کے ذریعہ سنجیدگی کے ساتھ دل نشین کرنے کی کوشش ہوتی، ایک مرتبہ "محنت" پر تقریر کی تھی جس سے یہ خاکسار اس قدر متاثر ہوا کہ اسی دن سے فٹ بال اور کرکٹ کے بجائے، کتابوں سے زیادہ دلچسپی لینے لگا، جس سے کچھ لکھنا پڑھنا آگیا،

اب علامہ ممدوح نے مضمون نگاری بھی شروع کردی تھی، اس زمانہ میں مولوی عبد الحلیم صاحب شرر لکھنوی کے ناولوں کی بڑی دھوم تھی، اور مشہور رسالہ "دلگداز" ماہوار نکلتا تھا جس میں اس زمانہ کے مذاق کے مطابق تاریخی، علمی اور ادبی مضامین ہوتے تھے، اس قسم کے ایسے رسالے اور ناول وہ بہت پڑھتے، ابتداء شباب سے اُن کی آنکھیں خراب تھیں، اس لئے بار بار ڈاکٹروں نے ان کو ترک تعلیم کا مشورہ دیا تھا، وہ ترک تو کیا کرتے، رات کے ایک ایک بجے تک کتابوں کے مطالعہ میں مشغول رہتے،

اس زمانہ کا بہترین اردو رسالہ "مخزن لاہور" تھا جس کے اڈیٹر شیخ عبد القادر بار ایٹ لا تھے، لکھائی چھپائی، کاغذ کی عمدگی کے علاوہ وہ ایک خالص ادبی رسالہ تھا، اور اردو داں طبقے میں بہت مقبول تھا، علامہ ممدوح کا پہلا مضمون اسی رسالہ میں شائع ہوا،

اوپر ذکر ہوچکا ہے کہ ابتدائی تعلیم کے زمانہ میں علامہ ممدوح بیت بازی میں پیش پیش تھے، جس سے اُن میں شعری ذوق پیدا ہوگیا تھا، جو لکھنؤ آکر اور تیز ہوگیا تھا، ندوہ کے طلبہ میں مولوی رکن الدین دانا سہسرامی، سید عبد الغفور شہرؔ بہارانی، مولینا فاروق چریاکوٹی کے صاحبزادے طاہین وغیرہ شاعری کرتے تھے، اس زمانہ کے اساتذہ میں داغ، امیر، جلیلؔ، ریاضؔ و مضطر

وغیرہ بقیہ حیات تھے، لکھنؤ میں گذشتہ ادبی سرگرمیاں پوری طرح موجود تھیں، عشرت لکھنوی کا نام طلبہ میں زیادہ معروف تھا، "پیام یار" نامی رسالہ طرحی اور غیر طرحی غزلوں کے ساتھ ہر ماہ نکلتا تھا، مرثیہ کی مجلسیں اور مشاعرے بکثرت ہوتے تھے، علامہ موصوف ان مشاعروں میں اکثر شرکت کرتے، آخر خود بھی شعر کہنے لگے، اور انھیں اپنے احباب خاص طور سے مولوی صدیق حسن اور عثمان پاشا کو سنا کر داد لیتے تھے،

علامہ موصوف نے ایک بیاض بھی تیار کی تھی، اس کے ایک جانب عربی اور دوسرے جانب اردو اشعار تھے، جس وقت یہ بیاض میرے ہاتھ آئی، اس وقت میں متنبی پڑھتا تھا، اس کو میری بد ذوقی کہیے کہ اُن کے عربی اشعار مجھے پھیکے نظر آئے، متنبی نے جس مضمون کو صرف دو مصرعوں میں ادا کیا تھا، علامہ موصوف نے بہ تغیر الفاظ چار مصرعوں میں کیا تھا، (ناظرین اس کا لحاظ رکھیں کہ میں اون کے اوائل زندگی کا حال لکھ رہا ہوں) میری اس بدمذاقی کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس کا ایک عربی شعر بھی مجھے یاد نہ رہا، مگر اُن کے اردو اشعار مجھے بہت یاد ہو گئے تھے، جو اُن کے دیوان یا بیاض سے نقل کئے تھے،

وہ اکثر مشاعروں میں شریک ہوتے تھے، اور اپنی غزل بھی سناتے تھے، ایک مرتبہ ایک مشاعرہ کی خبر شام کو ملی، رات کو مشاعرہ تھا، غزل کہنے کی کوشش کی، اور صرف ایک شعر کہنے پائے تھے کہ احباب آگئے، وہ ان کے ساتھ چل پڑے، اس زمانہ میں وہ ڈاسن کا جوتہ، علی گڑھ نما پاجامہ، کرتا، یا کف دار قمیص، شیروانی، چشمہ اور ترکی ٹوپی استعمال کرتے تھے، اور ہاتھ میں چھڑی لیکر باہر نکلتے تھے، اسی شان سے مشاعرہ میں پہنچکر یہ بیٹھ گئے، اُن کی صورت شکل، اور لباس دیکھ کر شمع اُن کے سامنے بھی آئی، پہلے تو بہت پریشان ہوئے لیکن انتقال ذہن نے پریشانی سے بچا لیا، انھوں نے یہ معذرت کی کہ مجھے مشاعرہ کی مطلق خبر نہ تھی، ابھی احباب نے اطلاع دی، فوراً اٹھا چلا آیا، البتہ ایک شعر ذہن میں آیا ہے، وہ عرض کرتا ہوں،

سر سے قدم تلک ہے ردائے حیا پڑی　　حاجت ہی کیا ہے آپ کو صاحب نقاب کی

یہ شعر لکھنؤ کے رنگ کا تھا، خوب داد ملی،

اس زمانہ کا ایک دلچسپ واقعہ قابلِ ذکر ہے، مولانا فاروق چریا کوٹی رحمۃ جن کی شاگردی کا فخر بندہ کو بھی حاصل ہے، ندوہ سے مستعفی ہونے کے بعد نائب کے طور پر جناب مفتی عبداللطیف صاحب مقرر ہوئے، (بندہ کو ان سے بھی تلمذ کی نسبت ہے) یہ فقہ حنفی کے بہت بڑے ماہر تھے، اور اس میں ان کو بڑا غلو اور مزاج میں بے حد تقشف تھا، ان کو بہت کم کسی نے مسکراتے ہوئے دیکھا، احکام کی تعمیل کرانے میں اس قدر سخت تھے کہ عدول حکمی تو بڑی بات ہے، تاخیر بھی روا نہ تھی، طلبہ ہی میں سے بعض کو انھوں نے جاسوس بنا رکھا تھا، جن کے ذریعہ طلبہ کی مخفی باتیں ان کو معلوم ہو جاتیں، ان کی حکومت میں معافی کی کوئی دفعہ ہی نہ تھی، وہ شخصی حکومت کا مکمل نمونہ تھے، طلبہ ان کے نام سے تھراتے تھے، بعض طلبہ سمجھتے تھے کہ جن ان کے تابع ہے، جو طلبہ کے پرائیوٹ حالات سے ان کو باخبر کر دیتا ہے، ایک دن معلوم ہوا کہ مفتی صاحب کہیں باہر جانے والے ہیں، یہ خبر سن کر طلبہ نے ڈرامہ کی تیاری شروع کر دی، اور ان طلبہ کو خاص طور سے شریک کیا گیا، جن کی نسبت جاسوسی کا خیال تھا، چنانچہ رات کو کھیل شروع ہوا، علامہ موصوف انگریز جج بنے، اور مولوی ضیاء الحسن علوی ان کی لیڈی، مقدمہ شروع ہوا، ڈرامہ کا قصہ مجھے یاد نہیں رہا،

ڈرامہ ختم ہونے کے قریب تھا کہ غل مچا، مفتی صاحب آ گئے، ہر شخص اپنے اپنے کمرہ میں پہنچ گیا، اس ذکر کا اصل منشا یہ ہے کہ اس ڈرامہ میں بھی علامہ موصوف کا انتخاب ایک اعلیٰ عہدہ کے لئے کیا گیا، جس کے لئے اعلیٰ قابلیت کی ضرورت تھی، اس انتخاب سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت بھی وہ اپنے ہم عصروں میں اتنے ممتاز تھے کہ سب کی نگاہ انہی پر پڑی، دوسری قابلِ تعریف بات یہ ہوئی کہ مفتی صاحب کو اس کی بھنک لگ گئی تھی، مگر وہ مجرموں کو گرفتار نہ کر سکے، جس کے سرغنہ سید سلیمان تھے،

استاذ محترم علامہ شبلی نعمانی کی تشریف آوری کے بعد ان کا رنگ ہی بدل گیا، دارالاخبار، دارالمطالعہ وغیرہ سے دست بردار ہو گئے، ہفتہ وار ادبی انجمن میں بھی بہت کم حصہ لیتے، اور اب ان کا زیادہ وقت استاذ محترم کی خدمت میں گزرتا، خصوصاً عصر سے مغرب تک اردو کی ادبی کتابوں کا شوق سرد پڑ گیا، اب زیادہ تر عربی

کتابون کا مطالعہ ہوتا، جس مین تاریخ وادب کا حصہ زیادہ تھا، مضامین بھی علمی اور تاریخی ہونے لگے،

استاذِ محترم علامہ شبلی نعمانی نے تربیت کے لئے چند ہونہار طلبہ کو منتخب کیا تھا، جس مین سید سلیمان، عبد السلام، حافظ عبد الصمد، عبد الواجد، قمر الدین وغیرہ تھے، یہ لوگ بعد عصر وہان پہنچ جاتے، علامہ شبلی کے پاس عربی کے متعدد اخبارات ورسائل اللواء، المؤید، الہلال، المقتطف وغیرہ آتے تھے، وہ کسی ایک طالب علم سے کوئی مقالہ پڑھوا کر سنتے، پھر اخبار لے لیتے، اور فرماتے کہ تم اپنی عربی مین اس کو بیان کرو، جہان تک مجھے یاد ہے، اس مین علامہ سید سلیمان اور عبد الواجد صاحب زیادہ ممتاز رہتے،

استاذ محترم کی صحبت کا اثر یہ ہوا کہ ان مین تلاش اور تحقیق کا مادہ پیدا ہوتا گیا، اور مضامین مین گہرائی آنے لگی، اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ متقدمین کی معصومیت کا جو رعب ان پر چھایا تھا، وہ اٹھ گیا، چنانچہ متعدد کتابون پر تنقید لکھی، اس سلسلہ مین ہندوستان کے بعض قدیم مشاہیر علماء کی غلطیان نکالین، جس سے اُن کے حلقہ مین ایک شور مچ گیا،

علامہ موصوف بہت ذہین تھے، اُن کا حافظہ بھی بہت قوی تھا، پشاور سے لیکر چین کی سرحد تک خاکسار کو جن جن اصحاب علم سے ملنے کا اتفاق ہوا، ان مین مولانا انور شاہ کشمیری دیوبندی (محدث) مولانا ابو الکلام آزاد، اور علامہ سید سلیمان ندوی کو قوتِ حافظہ مین بے نظیر پایا،

ایک دفعہ مین نے ابن بطوطہ کے سفرنامہ کے حوالہ سے مالابار کے حالات لکھے، نظرِ ثانی کے وقت علامہ موصوف نے مجھ سے کہا، تم نے غلط لکھا ہے، مین نے سفرنامہ کا اردو ترجمہ لاکر پیش کر دیا، دیکھ کر فرمایا صحیح نہین ہے، عربی اڈیشن مین دیکھو، اس کو دیکھ کر فرمایا، دیکھو مترجم نے ضمیر کا مرجع غلط قرار دے کر ترجمہ کیا ہے، غور کیا تو واقعی صحیح تھا،

استاذ محترم شمس العلماء مولانا ابو الفضل حفیظ اللہ صاحب اس جماعت کو جس مین علامہ موصوف تھے، درسِ قرآن دے رہے تھے، اسی اثنا مین آنریبل سید شرف الدین جج کلکتہ ہائی کورٹ تشریف لے آئے، اور درجہ مین بیٹھ گئے، اور وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ کی ایسی تفسیر کی خواہش کی جس سے لفظ "ضالاً" سے جو شبہہ پیدا ہوتا ہے وہ دور ہو جائے، جہان تک مجھے یاد ہے، درجہ مین صرف سید سلیمان ایسے تھے جنھون نے لغت، محاورہ اور ربط کے لحاظ سے ایسا ترجمہ

یا تشریح کی جس سے جج صاحب موصوف کو تسکین ہو گئی،

ایک دفعہ پٹنہ مین خدا بخش خان مرحوم چیف جسٹس حیدر آباد سے ملنے کے لئے گئے، خاکسار بھی ساتھ تھا، وہ اپنے مشہور کتب خانہ (پبلک اورنٹیل لائبریری) کے اس سائبان مین بیٹھے تھے جس سے متصل بازار کی سڑک تھی، اس وقت موجودہ بلڈنگ تیار نہین ہوئی تھی، میز پر کچھ کتابین تھین، اور وہ کسی خاص کام مین مصروف تھے، ہم لوگ کرسی پر بیٹھ گئے، اور باتین ہونے لگین، اثنائے گفتگو مین آیۃ الکرسی کے متعلق گفتگو ہونے لگی، یہ مجھے یاد نہین ہے کہ آیۃ الکرسی کی ایک تفسیر خوبیضی کی تھی، یا خود اُن کی تھی، یا کسی مفسر نے کسی کتاب مین لکھی تھی، علامہ موصوف کو سنائی، انھون نے جو اصلاح دی، یا جو بات کہی، اُسے سن کر جج صاحب پھڑک اُٹھے، اور دیر تک تعریف کرتے رہے،

علامۂ موصوف اردو فارسی، عربی کے علاوہ عبرانی زبان سے بھی واقف تھے، وہ جب دکن کالج پونہ مین اسسٹنٹ پروفیسر تھے، تو ایک یہودی سے اس کو سیکھا تھا، اور ارض القرآن لکھنے مین اس سے مدد لی تھی، انگریزی لکھ اور بول نہین سکتے تھے لیکن اخبار اور کتابین پڑھ لیتے تھے،

ندوہ سے فارغ ہونے کے بعد علامۂ موصوف بڑی کشمکش مین مبتلا ہو گئے، اُن کے والد ماجد اُن کے خسر اور بڑے بھائی کی خواہش تھی کہ وہ خاندانی پیشہ یعنی طب کی تعلیم حاصل کرین لیکن خود اُن کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی، استاذ محترم علامہ شبلی کی بھی یہی رائے تھی کہ طب کی تعلیم کے بجاے وہ علمی کامون مین مصروف ہون، چنانچہ انھون نے استاد سے جب اس کا تذکرہ کیا، تو استاد نے اُن کے خسر کو ایک خط لکھا کہ سید سلیمان کو اُن کی علمی تحقیقات مین مصروف رہنے دو،

پھر اتفاق ایسا ہوا کہ استاذ محترم کسی ضرورت سے پٹنہ تشریف لے گئے، اور مولوی ابو یوسف صاحب (سید سلیمان صاحب کے خسر) اُن سے ملنے گئے، اس مسئلہ پر دونون کی گفتگو ہوئی، آخر مین استاذ محترم نے فرمایا کہ اُن کے والد سے کہہ دو کہ سید سلیمان کو ہمین دیدین، والد کو یہ پیغام ملا تو استاد کی شفقت کو دیکھ کر خاموش ہو گئے، لیکن طب اور تصوف دونون لائنون سے علاحدہ ہو جانے کو خاندانی روایات کے خلاف سمجھ کر آخر عمر تک

پسند نہیں کیا، اس میں شبہ نہیں کہ اگر وہ طب کی تعلیم حاصل کرتے تو بھی اپنی ذہانت اور قوتِ حافظہ کی بدولت بہترین طبیب ہوتے لیکن ضلع پٹنہ کے باشندوں کے علاوہ اُن کو کوئی نہ جانتا، اور عالمِ اسلامی اُن کی بہترین تصانیف سے محروم رہ جاتا،

انھوں نے سب سے پہلی ملازمت ندوہ ہی میں کی، ایک ادیب کی حیثیت سے اُن کا تقرر ہوا، الندوہ کے نائب اڈیٹر بھی رہے، اسی زمانہ میں آسی مدراسی مرحوم کے بڑے صاحبزادے قاری عبدلوتی عربی زبان میں ایک ماہوار رسالہ "البیان" نکالتے تھے، علامہ اس کے بھی اڈیٹر تھے، اور ابتدا میں اسی کے ذریعہ حجاز، عراق، شام اور مصر وغیرہ میں اُن کا تعارف ہوا،

ان کی پہلی شادی اُن کے چھوٹے چچا کی لڑکی سے ہوئی تھی جس سے تین بچے پیدا ہوئے، دوسری سے کوئی اولاد نہیں تھی، اور تیسری سے متعدد اولادیں ہوئیں جن میں اس وقت چار لڑکیاں، اور ایک لڑکا سلمان سلمہ موجود ہے، آپنے اکھتر (۷۱) سال کی عمر میں بمقام کراچی وفات ہوئی، اور ان کی وفات سے نہ دسنہ ضلع پٹنہ (بہار) کا کوہ نور گیا، بلکہ ہندوستان و پاکستان کی علمی دنیا اس کی ضیاباری سے محروم ہو گئی،

# اخلاق وسیرت کے کچھ جلوے

از

سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب

حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ اخلاق و سیرت کے لحاظ سے خلق عظیم کا نمونہ تھے، اُن کے حسن اخلاق کے جلوے اتنے گوناگون ہین کہ ایک مختصر سے مضمون مین ان کا احاطہ دشوار ہے، ذیل کی سطور مین صرف اُن کی ایک ایک جھلک دکھانے کی کوشش کی گئی ہے،

**حب وطن** اپنے وطن دیسنہ سے بڑی محبت رکھتے، جب گھر آتے اور یہان سے رخصت ہونے لگتے، تو اشکبار ہوجاتے، طالب علمی کے زمانے سے آخر عمر تک اس کے اجتماعی کامون مین سے پوری دلچسپی لیتے رہے، وہان کے باشندون نے ۱۸۹۶ء مین اپنی معاشرتی و علمی اصلاح و ترقی کے لئے ایک انجمن قائم کی تھی جس کے ماتحت اردو کا ایک شاندار کتب خانہ بھی ہے، اس کی ترقی مین ہر قسم کی امداد کرتے رہے، انجمن کے سالانہ جلسون مین کبھی اپنی نظم سناتے، کبھی مقالہ پڑھتے، اور کبھی تقریر کرتے، اس کے بعض جلسون کی صدارت بھی کی، فرمایا کرتے تھے کہ یون تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے بہت سی کانفرنسون کی صدارت کا شرف عطا کیا، لیکن جو لذت وطن کی انجمن الاصلاح کی صدارت مین محسوس ہوئی، وہ کسی اور مین نہین ہوئی،

انجمن کا سالانہ اور بڑا سے بڑا وقتی چندہ پابندی سے ادا کرتے تھے، اپنے جد بزرگوار کی ایک تصنیف نور محمدی اپنے خرچ سے چھپوائی، اور اس کے سارے نسخے انجمن کے کتب خانہ کو دیدیے کہ اس کی فروخت کی آمدنی کتب خانہ کی ضروریات مین خرچ ہو، اسی طرح اپنی تصنیف خطبات مدراس کی پانچ سو جلدین اس کتب خانہ کو دین جن کی

قیمت ۵۵۰۰ روپے تھی،

قدیم آبائی مکان کے علاوہ ایک پرفضا مقام پر ایک شاندار بنگلہ بنوا لیا تھا، اُس مین اپنے اہل وطن کے ساتھ بیٹھ کر بڑی راحت محسوس کرتے، زندگی کے آخری دن اسی مین گذارنے کی تمنا اُن کو تھی، لیکن مشیت کو کچھ اور ہی منظور تھا،

اپنے ایک ہم مکتب دوست کو ایک مکتوب مورخہ ۱۷ رجون ۱۹۴۸ء مین لکھتے ہین:-

"خلوت خانۂ حق کے سوا کہین آرام نہین، ع جز بخلوت گاہِ حق آرام نیست" ..........

...... دیسنہ کا اس پیری مین قیام کا خیال ہمیشہ سے تھا، اسی لئے وہان سب کچھ لگایا مگر افسوس کہ انقلاب زمانہ نے سارے منصوبے خاک مین ملا دیے، اب تو یہ بھی معلوم نہین کہ بقیہ ایام عمر کہان گذرین گے"......

اہلِ وطن سے لگاؤ — تمام اہلِ وطن سے بڑا اُنس رکھتے تھے، ۱۹۱۵ء مین اُن کے ایک محبوب ہم وطن مظفر امام محمد وحید ڈپٹی کلکٹر کا انتقال ہوا تو بیحد مغموم ہوئے، ان سے صرف ہم وطنی کا رشتہ تھا، لیکن اُن کی وفات پر ایک پیام تعزیت کو تحریر فرمایا:-

"آہ! صرف دیسنہ کا چراغ بجھ گیا، بلکہ ہمارے دونون کا بھی چراغ گل ہوگیا، ہماری زندگی کا نشاط جاتا رہا، وطن کی یاد فراموش ہوگئی، اور اس کی محبت سرد، خدا کی قسم میری زندگی مین یہ سب سے بڑی مصیبت ہوگی، اگر میرے دونون بچے مرجاتے، تو اتنا غم نہ ہوتا بس اب ہوچکا

غریبان را دل از بہر تو خون است — دلِ خویشان نمی دانم کہ چون است

۱۹۳۳ء مین دیسنہ کی ایک جوان خاتون کی حسرتناک موت ہوئی، سید صاحب اس وقت وطن ہی مین تھے، مرحومہ سے دور کا رشتہ تھا، لیکن ان کا جنازہ اٹھا تو اس کے پیچھے وہ زار وقطار رو رہے تھے، اور جب جنازہ کی نماز پڑھانے لگے تو چہرہ آنسوؤن سے بالکل تر ہوگیا،

جناب سید عبد الحکیم صاحب جو اب بھی بقیہ حیات ہیں، اُن کے رشتہ کے چچا ہوتے ہیں، عمر میں وہ سید صاحب سے تقریباً بارہ تیرہ برس بڑے ہیں، اُن سے تمام عمر اپنے حقیقی چچا سے زیادہ محبت کرتے رہے، ایک خط مورخہ ۲ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں اُن کو لکھتے ہیں :-

"آپکے دل کو مجھ سے، اور مجھے آپکے دل سے جو لگاؤ ہے، وہ سوال اور استدلال سے باہر ہے، یقیناً آپنے اپنے دل کو بہت دکھ کھا اور یہاں بھی ہر روز آپ کو خط نہ لکھنے اور آپکے خط نہ آنے کا خیال رہا،"

پھر کراچی سے ۱۵ جنوری ۱۹۵۱ء کو اُن کو تحریر فرماتے ہیں :-

"آپ کو اس ناکارہ سے جو رابطۂ قلبی ہو، اس کا میرے دل پر اثر ہمیشہ رہا، اور وہ اب تک اسی طرح ہے"

ع حقِ مہربان نام و نشان است کہ بود

......افسوس ہے کہ وطن کا شیرازہ، اور احباب و اعزہ ایسے متفرق ہوئے کہ ان کے دیدار سے محرومی رہے گی، اور اس کا اپنے قلب پر بڑا اثر پاتا ہوں، یہاں کیا آیا کہ دنیا ہی بدل گئی، ہندوستان بھلانے سے بھی نہیں بھولتا،...... خدا جانے چمن پر کیا گذری"

سید عبد الحکیم صاحب کو بھی اُن سے بڑی فریفتگی رہی، یوں تو وہ عمر میں بڑے ہیں لیکن آخر میں وہ اُن سے روحانی استفادہ بھی کرنے لگے تھے، سید صاحب کی طالب علمی کے زمانہ سے اُن کے آخر عمر تک دونوں میں برابر خط و کتابت قائم رہی جس کو سید عبد الحکیم صاحب نے حرز جان بنائے رکھا ہے، یہ خطوط ایسی قیمتی دستاویز ہیں جن سے سید صاحب کے سوانح حیات مرتب کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔

آخر زمانہ میں جب کبھی سید صاحب کا قیام وطن میں رہتا، تو اُن کا معمول تھا کہ روزانہ فجر کی نماز کے بعد مسجد میں کلام پاک کا درس دیتے، جمعہ کے روز وعظ بھی کہتے، اپنے ایک مکتوب میں سید عبد الحکیم صاحب کو لکھتے ہیں کہ وطن کی ہر ٹھیکری میرے لئے لعل و گوہر سے زیادہ عزیز ہے، حب الوطن من الایمان، لیکن اس لگاؤ کے باوجود گاؤں کی

متنازعہ فیہ باتون مین پڑنے سے حتی الوسع پرہیز کرتے، فرماتے کہ قیام وطن کے زمانہ مین جذبات مین تین دور آتے ہین پہلے دور مین خیال ہوتا ہے، میرے ہم وطن چھوٹی چھوٹی باتون مین الجھ کر خواہ مخواہ تضیع اوقات کرتے رہتے ہین، دوسرے دور مین خود ان چھوٹی چھوٹی باتون کے سننے کا جی چاہتا ہو، تیسرے دور مین نفس ان باتون مین حصہ لینے کو آمادہ کرتا ہے، اس وقت رخت سفر باندھ لیتا ہون، جب کسی اہل وطن سے کوئی شکایت ہوتی، تو درگذر کرکے خاموش ہوجاتے اور فرماتے میرا تو یہ مسلک ہی

ع: تو خصم باش و زما دوستی تماشا کن

اہل وعیال سے محبت | اُن کی خانگی زندگی شفقت و محبت کے مناظر سے معمور ہے پہلی اہلیہ کے مرض الموت مین بڑی دل سوزی اور تن دہی سے تیمارداری کی، اُن کو اعظم گڈھ سے لکھنو علاج کے لئے لے گئے، اور قرض لیکر علاج کراتے رہے، مگر وہ تیرہ سال کی رفاقت کے بعد ۱۹۱۸ء مین جنت کو سدھارین، رفیقہ حیات کی جدائی پر غیر معمولی اثر ہوا جس کا اظہار ایک نظم "فراق یار" مین کیا؛ اُن کے غم والم کی خبر اکبر الہ آبادی کو ہوئی تو انھون نے خطوط مین اشعار لکھ لکھ کر اُن کو تسلی دی: پہلے خط مین یہ شعر لکھ کر تلقین کی،

اگرچہ تلخ ملا جام عمر فانی کا
مگر محل نہین ساقی سے بدگمانی کا

دوسرے خط مین یہ رُباعی لکھ کر دلجوئی کی،

جس سے میری زندگی تھی مرگیا کیون کرسکا
چرخ نے مجھ پر ستم یارب! کیا کیون کرسکا

واقعات جانگزا کا کیون ہوا ایسا وقوع
کیون نہ میری آہ سے قانون فطرت ڈرسکا

پھر اور دوسرے خطوط مین یہ متفرق اشعار تھے،

صدیون فلاسفی کی چنان اور چنین رہی
لیکن خدا کی بات جہان تھی وہین رہی

ساتھی جو تھے رنج وراحت کے اس موقعے ہاتھون چھوٹ گئے،

اب یاس گرائے دیتی ہے، سب دل کے سہارے ٹوٹ گئے

مرنے والا مر چکا، اور رونے والا رو چکا، وائے بر ہستی اگر مقصود ہستی ہو چکا،

پہلی اہلیہ نے دو اولادیں چھوڑی تھیں، سیدہ مرحومہ، اور ابو سہیل سلمہ اللہ ڈکسٹم آفیسر مشرقی پاکستان، ان ہی سے دل بہلا کر بقیہ زندگی تجرد میں گذار دینے کا تہیہ کیا تھا، لیکن اپنے والد بزرگوار کے اصرار پر ۱۹۲۰ء میں دوسرا عقد کیا، یہ اہلیہ بھی مشکل سے ڈیڑھ سال زندہ رہیں، اُن کی وفات پر پرانا غم تازہ ہوگیا، وطن اور اہلیۂ ثانی کے گھر کو یاد کر کے مغموم اور بے چین رہتے تھے، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں،

"دیسنہ اور اس کے مکان کی ایک کوٹھری میرے لئے تاریخی غم کی یادگار بن گئی ہے، اور میرے احساس کو صدمہ پہنچا رہتا ہے"،

تیسرا نکاح، ر جنوری ۱۹۲۳ء عیسوی میں ہوا، ان اہلیہ سے ایک لڑکا عزیزی سلمان سلمہٗ اور چار لڑکیاں ہیں، شمیمہ (اہلیہ ابو عاصم صاحب ایڈوکیٹ کراچی) شگفتہ (اہلیہ سید حسن صاحب، اڈیشنل کمشنر بریلی ڈویژن)، اور دو ابھی ناکتخدا ہیں، اپنے تمام بچوں سے بڑی محبت رکھتے تھے، سب سے چھوٹی اولاد کو برابر اپنی گود میں بٹھائے رکھتے، حتی کہ کبھی کبھی سفر میں بھی اس کو ساتھ لے جاتے، ان سب کو آپ ہی کہکر مخاطب کرتے، جب ان سے کسی بات پر ناراض ہوتے، تو ڈانٹنے اور جھڑکنے کے بجائے، صرف یہ کہتے کہ یہ طور طریق حرکت مجھ کو پسند نہیں، کئی بچے بچپن ہی میں فوت ہوگئے، ایک داماد اور ایک لڑکی کی جوانمرگی کا بھی غم اٹھانا پڑا، لیکن اُن کی اکلوتی اولاد سید نقی اشرف سلمہ اللہ (اسٹیٹ بینک پاکستان) کو اپنی آغوش شفقت میں لیکر ان دونوں کا غم غلط کرتے رہے،

**ہمدرسوں سے تعلق** اپنے مکتب اور درس کے ساتھیوں سے انکو ہمیشہ لگاؤ رہا، انکے ایک ہم مکتب جناب سید محمد حنیف تھے جو تعلیم ختم کرنے کے بعد مختار ہوئے، لیکن وارستگی مزاج کی بنا پر مختاری چھوڑ دی، اور اپنے وطن دیسنہ سے منتقل ہو کر اپنی سسرال گیلانی میں سکونت پذیر ہوگئے، وہ غایت سادگی میں کھڑا دن استعمال کرتے ہیں، اور ناس برابر لیتے رہتے ہیں، ایک بار سید صاحب کو دیسنہ سے گیلانی جانے کا اتفاق ہوا، یہ وہ زمانہ تھا جبکہ انکی علمی شہرت بہت زیادہ

پھیل چکی تھی، گیلانی پہنچ کر دریافت کیا کہ میرے پرانے ساتھی اور بھائی کھڑا ونڈ الناس کہاں ہیں، ان کو تلاش کرکے بڑے اخلاق محبت اور بے تکلفی سے ملے، سید محمد حنیف صاحب ۱۹۴۵ء میں حج کے لئے گئے تو مکہ معظمہ میں سید صاحب سے ملاقات ہوئی، اتفاق سے سید محمد حنیف صاحب وہاں سخت علیل ہوگئے۔ ان کی علالت کی خبر سید صاحب کو ہوئی تو عیادت کے لئے گئے، اور ہر طرح ان کو تسلی دی، سید محمد حنیف صاحب اس واقعہ کو جب یاد کرتے ہیں تو یہ کہکر آبدیدہ ہوجاتے ہیں کہ کہاں میں ایک لاابالی آدمی جو کس مپرسی میں پڑا ہوا تھا، اور کہاں سید صاحب کی ذات والاقدر جن کی تعظیم کے لئے حکومت سعودی کے بڑے بڑے حکام سر و قد کھڑے ہوجاتے تھے۔ وہ میری عیادت کے لئے آئے، اور تسلی و تشفی سے سرفراز کرتے رہے،

سید صاحب کے ایک دوسرے ہم مکتب مولانا محمد قاسم صاحب دیوبندی تھے، مکتب کی تعلیم ختم کرنے کے بعد کچھ دنوں دارالعلوم ندوہ میں تعلیم پائی، پھر دیوبند میں تکمیل کی، مختلف مدرسوں میں ملازمت کرنے کے بعد آخر میں مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں مدرس ہوئے، سید صاحب ندوہ سے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں ان کو دیوبند ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"دوسروں کے نام آپکے خط پر خط آئے اور میں آپکے خط دیکھنے کو ترسوں، مجھے یاد نہیں کہ آپنے کبھی خط لکھنے میں سبقت فرمائی، صاحب چاہ مشکل نہیں نباہ مشکل ہے"

اور یہ بے تکلفی آخر وقت تک قائم رہی، دارالمصنفین کے دور قیام میں ان کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"اللہ رے ناز حسن کہ بولیں بھی وہ تو یوں ہاں وہ کہاں ہے در پہ جو میرے پڑا رہا

مجھولے دوست اچھے ہیں کبھی نہ یاد آؤں، آپ کو دارالمصنفین کا خیال آیا، تو غیر سے استفسار کی کیا حاجت تھی تمہاری وہ مزاوار خطاب نہ تھا"

ندوہ کے ساتھیوں میں مولوی ضیاء الحسن علوی ندوی مرحوم کو بہت عزیز رکھتے تھے، ان کی وفات پر بے حد ملول ہوئے، چنانچہ معارف کے ایک مضمون میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا،

"افسوس کہ میرے رفیق قدیم اور صدیق حمیم مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی ندوی نے ایک مختصر علالت کے بعد ۱۴ رجون ۱۹۴۵ء کو الٰہ آباد میں جہاں وہ عربی مدرسوں کے انسپکٹر اور مشرقی امتحانوں کے رجسٹرار تھے، ستاون برس کی عمر میں وفات پائی، اس حادثہ کی اطلاع مجھے ۱۸ رجون کو لکھنؤ میں اسی مدرسہ میں ملی، جہاں میں اور مرحوم مل کر ایک جان دو قالب تھے، افسوس کہ ایک قالب خالی ہو گیا، اور دوسرا نیم جان موجود ہے، مرحوم مجھ سے عمر میں تقریباً پانچ برس چھوٹے گو تعلیم کے درجہ میں دو ایک سال بڑے تھے، اس لئے بظاہر یہی امید تھی کہ ان ہی کو میری جدائی کا صدمہ برداشت کرنا پڑے گا، مگر تقدیر یہی تھی کہ مجھے اُن کے فراق کا غم سہنا پڑے گا، اسی لئے امید غلط ثابت ہوئی، اور تقدیر کا فرمان نافذ ہو کر رہا،

ع: اکنون چہ توان کرد تقدیر چنین بود"

مولوی ضیاء الحسن مرحوم تعلیم میں اُن سے دو ایک سال سینیر تھے، اس لئے آخر وقت تک سید صاحب کو "تم" کہہ کر مخاطب کرتے تھے، ایک بار ضیاء الحسن صاحب مرحوم انکو اپنی ایک تحریر پڑھ کر سنا رہے تھے، سید صاحب نے اُن کو ایک جگہ ٹوکا، وہ بولے "سلیمان! تم اردو کیا جانو" اس فقرہ سے سید صاحب بہت محظوظ ہوئے، اور کئی بار اپنی نجی صحبتوں میں اس کا ذکر کیا،

**معاصرین سے محبت** اپنے معاصرین اہل علم میں ڈاکٹر اقبال سے بڑا گہرا لگاؤ رکھتے تھے، نجی مجلسوں میں کہا کرتے کہ عالم اسلام میں ایک عرصہ کے بعد ڈاکٹر اقبال جیسا مفکر اعظم پیدا ہوا ہے، ان کو موحد خالص، رسول کا شیدائی، دین کامل کا علمبردار، فلسفہ اسلام کا ترجمان، اور تجدید ملت کا طلب گار کہا کرتے، جب اُن کی رحلت کی خبر ملی تو معارف میں اسکا بڑا دردناک ماتم کیا، جس کے بعض ٹکڑے یہ ہیں:-

"صفر کی انیسویں اور اپریل کی اکیسویں کی صبح کو عمر کی اکسٹھ بہاریں دیکھ کر اور شاعری کی دنیا میں چالیس برس چہچہا کر یہ بلبل ہزار داستان اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا، وہ ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزت اور اسلام کا فخر تھا، آج دنیا ان ساری عزتوں سے محروم ہو گئی، اور ایسا عارف فلسفی، عاشق رسول شاعر

فلسفۂ اسلام کا ترجمان اور کاروانِ ملت کا حدی خوان صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا، اور شاید صدیوں کے بعد پیدا ہو، اس کے ذہن کا ہر ترانہ بانگِ درا، اُس کی جانِ حزین کی ہر آواز زبورِ عجم، اس کے دل کی ہر فریاد پیامِ مشرق، اس کے شعر کا ہر پرواز بالِ جبریل تھا، اس کی فانی عمر گو ختم ہو گئی لیکن اُس کی زندگی کا ہر کارنامہ جاوید نامہ بن کر انشاء اللہ باقی رہے گا، امید ہے کہ ملت کا یہ غم خوار شاعر اب عرشِ الٰہی کے سایہ میں ہوگا، اور قبول و مغفرت کے پھول اس پر برسائے جا رہے ہوں گے، خداوندا! اس کے دل شکستہ کو جو ملت کے غم سے رنجور تھا، غم خواری فرما، اور اپنی ربانی نوازشوں سے اس کے قلبِ حزین کو مسرور کر"

سر شیخ عبد القادر سے بھی متاثر تھے، ان کو پہلی دفعہ ۱۹۰۵ء میں پٹنہ میں ندوۃ العلماء کے جلسہ میں دیکھا تھا، اس موقع پر انھوں نے ایسی دلچسپ تقریر کی تھی جس سے حاضرین جلسہ کے ساتھ سید صاحب بھی محو حیرت ہو گئے، ان کے بیان کے مطابق اس کا یہ اثر ہوا کہ

"دل میں ایسی ہی تقریر کرنے کا جذبہ پیدا کر دیا جس کی مشق بعد کو ہوئی"

بعد میں اُن سے اچھے خاصے مراسم پیدا ہو گئے تھے، اور جب اُن کا انتقال ہوا، تو اُن کی یاد میں لکھا،

"مرحوم کی شخصیت گوناگوں اوصاف کی حامل تھی، اور ہر مجلس و محفل میں ان کی یکساں قدر و منزلت تھی، وہ نیک طینت، نرم مزاج، متواضع، اور ملنسار تھے، اُن کی مختلف النوع خدمات میں میرے نزدیک سب سے بڑی خدمت اُن کی ادبی خدمت ہے، اور وہ بھی خاص نوع کی، یعنی لکھنے والے تو بیسیوں ہیں، مگر ان کا کارنامہ یہ کہ انھوں نے بیسیوں کو ادیب انشاپرداز، اہلِ قلم، مصنف، اور شاعر بنا دیا، اور حق یہ ہے کہ انہی نے ہندوستان کو اقبال بخشا"

سیاسی دوستوں میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری سے قلبی تعلق رکھتے تھے، ۱۹۳۶ء کے موسم گرما میں دہرہ دون میں تھے، ۹ مئی کی شام کو وہاں کی ایک سڑک پر دور سے ڈاکٹر انصاری کو موٹر پر جاتے دیکھا، صبح اُن کی قیامگاہ کی

تلاش کی کوشش کی، معلوم ہوا کہ وہ رات ہی دہلی چلے گئے، اور شام کو اطلاع ملی کہ وہ راستہ ہی مین جنت کو سدھار گئے، یہ خبر سُن کر سید صاحب کا دل دھڑکنے لگا، آنکھین اشکبار ہوگئین، سینہ سے آہون کے شعلے اٹھنے لگے، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن کے صبر وتمکین کی ساری متاع جل کر خاکستر ہو رہی ہے، ڈاکٹرون نے اُن کو لکھنے پڑھنے کی ممانعت کی تھی لیکن اُن کی طبیعت نہ مانی، اور ڈاکٹر صاحب کا ماتم لکھنا شروع کر دیا جس کا آخری ٹکڑا یہ ہے:

"طرابلس اور بلقان کے ہنگامون نے ہمارے چند جدید تعلیم یافتہ نوجوانون کو خفتہ سوتے سے بیدار کر دیا تھا، محمد علی مرحوم اس قافلہ کے سالار تھے، اور ڈاکٹر انصاری اس کے سب سے پرجوش رہبر تھے، افسوس کہ ان دونون دردمندون نے دل ہی کے آزار مین وفات پائی، دل کا درد مجاز بن کر نمودار ہوا، اور اُن کی قومی زندگی کا باعث ہوا، اور وہی حقیقت بن کر اُن کی موت کا سبب ہوا"

محمد علی نے داغِ مفارقت دیا، اور اب

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی　　اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

صلحاء وعلماء کا احترام | مکتبی تعلیم ختم کرنے کے بعد اپنے وطن دیسنہ سے نکلے تو کچھ دنون جناب شاہ محی الدین صاحب پھلواروی کے سامنے بھی زانوے تلمذ تہ کیا تھا، انکی قدر ومنزلت سید صاحب کے دل مین آخر وقت تک قائم رہی، ایک تحریر مین فرماتے ہین :-

"مجھے خانقاہ مین خاص حضرت شاہ محی الدین صاحب مرحوم کے قرب قیام کی، اور ایک ساتھ طعام کی، اور زیر درس کتابون مین شاگردی کی سعادت حاصل ہوئی، مجھے اس نسبت پر فخر، اور ناز تھا، اس پر مسرت تھی"

جناب شاہ سلیمان صاحب پھلواروی سے ان کا کوئی رشتہ تو نہ تھا، لیکن سید صاحب کے والد مرحوم اُن کے پیر بھائی اور اُن کے خسر کے مرید تھے، اس لئے سید صاحب اُن کو اپنا بزرگ سمجھتے رہے، اور خود شاہ صاحب ان کو اپنے عزیز سے کم نہین سمجھتے تھے، جب شاہ صاحب کا وصال ہوا تو سید صاحب نے

اُن کے صاحبزادے مولنا سید شاہ غلام حسین صاحب پھلواروی کو ایک خط مورخہ ۱۹ر اگست ۳۳ء مین لکھا:

"شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو مجھ ذرہ بے مقدار کے ساتھ جو شفقت تھی، وہ مجھے ہمیشہ یاد رہی، ...... بنارس کے جلسۂ ندوہ مین شاہ صاحب نے مولانا شبلی کی تحریک پر مجھ کو اپنی ایک عبا بطور استحسان و انعام دینا منظور فرمایا تھا، مین ہمیشہ اس کا تقاضا کرتا، اور اس تقاضے مین اب بھی، اور اس عمر مین بھی، مجھے کیا لطف آتا تھا، ایک دفعہ مین نے جب ہنوز عمر کی پختگی اور عقل کی تکمیل نہین ہوئی تھی ایک عریضہ لکھا، اس مین جدید انشا پردازی کی پیروی مین السلام علیکم نہین لکھا تھا، اس پر اُن کی بزرگانہ ڈانٹ مجھے اب تک یاد ہے"

مولنا سید محمد علی مونگیری قدس سرہ العزیز سے بھی بہت متاثر تھے، جس زمانہ مین وہ ندوہ مین تعلیم پاتے تھے، مولنا مرحوم ندوہ کے ناظم تھے، ایک روز انھون نے سید صاحب کو بلا کر پوچھا تم کو کس فن سے ذوق ہے؟ سید صاحب نے جواب دیا "عربی ادب اور منطق سے"، پھر پوچھا "کیون"؟ سید صاحب نے کہا "اس لئے کہ یہ دونون اصل مقصود مین علوم کی خادم اور ذریعہ ہین، مولنا نے فرمایا کہ آخر ان اصل علوم کی طرف کب توجہ ہو گی، سید صاحب نے کہا کہ جب ان مین کمال پیدا ہو جائے گا، یہ سُن کر مولنا نے فرمایا تو اسی خادم اور ذریعۂ علوم مین تو ہمارے علمار کی پوری عمرین بسر ہو جاتی ہین، اور اصل مقصود کی نوبت نہین آتی، اس کے بعد انھون نے یہ حکایت بیان کی کہ ایک صاحب کو تصنیف کا شوق پیدا ہوا، تو وہ قلم بنا بنا کر رکھنے لگے، یہان تک کہ تمام کمرہ قلمون سے بھر گیا، کسی نے ان سے پوچھا کہ حضرت یہ آپ اتنے قلم بنا بنا کر کیون رکھ رہے ہین، تو متانت سے بولے کہ میرا ارادہ تصنیف کا ہے، پوچھنے والے نے کہا کہ پھر وہ کب شروع ہو گی، جواب دیا جب ان قلمون سے فرصت ملے گی، یہ تمثیل اس بات کی تھی، کہ عربی نصاب کا بڑا حصہ دینی علوم کی تمہید اور ذریعہ کے طور پر پڑھایا جاتا ہے، مگر ہوتا یہ ہے کہ یہ ذریعۂ تعلیم اصل تعلیم کی جگہ لے لیتا ہے، سید صاحب کا بیان ہے کہ مولنا کی یہ حکایت میرے لئے اس درجہ موثر ہوئی کہ مین نے پھر تمام عمر ذریعۂ علوم اور مقصدِ علوم کے درمیان کبھی مغالطہ نہین کھایا، اور عین وقت پر میری ایسی رہبری ہوئی کہ جس نے میرے خیالات کی دنیا پلٹ دی،

مولانا حمید الدین فراہی بی اے کا بھی بہت احترام کرتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں "ان سے قرآن پاک، اور فلسفۂ جدیدہ کے سبق تو کم ہی پڑھے، مگر صحبت بار بار اٹھائی، اور مشکلات میں مشورے بار بار کئے، سیرت کی تیسری جلد میں جو معجزات پر ہے، اُن ہی کے فلسفہ کی تقلید کی ہے"،

مولانا عبد الباری فرنگی محلی کے اخلاق جود و سخا، تواضع و انکسار، ارشاد و ہدایت، وعظ و نصیحت، تلاش و مطالعہ اور قومی درد کے بیحد مداح تھے، سیاسی کاموں میں ایک عرصہ تک اُن کے ساتھ رہے، اور جب ۴۸ سال کی عمر میں اُن کی وفات کا دردناک حادثہ پیش آیا، تو اُن کے اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرمایا "جدید تعلیم یافتوں کی سیاسی جدوجہد کو مذہبی تحریک بنا دینا، ان ہی کا کارنامہ شمار کیا جائے گا، اس لئے اُن کی یہ غیر متوقع موت صرف فرنگی محل کا نہیں بلکہ اسلام کا سانحہ ہے، اور بنا بریں اُن کی جواں مرگی ہمیشہ کے لئے تاریخِ اسلام کا ایک اندوہناک واقعہ شمار کیا جائے گا"۔

مولانا سجاد نائب امیر شریعت بہار کی رحلت کی خبر پائی، تو بے حد ملول رہے، ایک نجی خط میں اپنے ایک ندوی عزیز مولانا مسعود عالم کو لکھتے ہیں :-

"ہاں بھائی! تمہارے دونوں خطوں میں مولانا سجاد مرحوم کے تاثرات کا عکس تھا ع اک تیر تھا جو ہائے کلیجہ کے پار تھا، ۲۰ ر دسمبر کو خط سے اطلاع ملی وہ دن ہے اور آج کا دن ہے کہ کوئی رات ان کی یاد اور تصور ذہنی سے خالی نہیں، معارف میں ماتم لکھنے بیٹھا تو زبان و قلم نے ساتھ دینے سے انکار کیا، مجبوراً چار سطریں لکھ کر چھوڑ دیں، ہمارا صوبہ خالی ہو گیا، اور کیا کہوں ع اک عالی دماغ تھا نہ رہا،

مولانا حسین احمد صاحب مدنی سے بھی بڑی عقیدت رکھتے تھے، جب ان میں تصوف و سلوک کا ذوق پیدا ہوا، تو پہلے مولانا حسین احمد ہی کے جانب اُن کا میلان ہوا، اور ان ہی سے بیعت کا ارادہ رکھتے تھے لیکن ایک روز خواب میں دیکھا کہ ایک پلنگ پر حضرت مولانا اشرف علی تھانوی تشریف فرما ہیں، اور اسی کے پاس ایک دوسرے پلنگ پر وہ خود مولانا حسین احمد صاحب کے ساتھ بیٹھے ہیں، یکایک مولانا حسین احمد اپنی جگہ سے اٹھے اور سید صاحب

کا ہاتھ پکڑ کر مولانا اشرف علیؒ کے سامنے پیش کر کے فرمایا، "ان کو میری طرف سے قبول فرمائیں" اسی خواب کے بعد وہ مولانا تھانویؒ کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے،

وہ اپنی زندگی کے آخر زمانے میں بقول اُن ہی کے "روح کی الجھن" میں مبتلا ہو گئے، اور اسی سے نجات کے لئے حضرت مولانا اشرف علی کی طرف رجوع فرمایا تھا، اس انقلاب کے بعد اُن کے پاس بہت سے خطوط آئے کہ اُن کے جیسے فاضل اجل اور محقق کو ایک پُرانے طرز کے عالم کے سامنے سر جھکانے کی کیا ضرورت تھی، اس کے جواب میں اکثر نجی صحبتوں میں فرماتے تھے کہ یہ لوگ مجھکو زبان سے تو فاضل اور محقق کہتے ہیں، مگر درحقیقت مجھ کو بے عقل جانتے ہیں آخر اس بات پر کیوں نہیں غور کرتے ہیں کہ ان کے خیال کے مطابق اگر واقعی محقق اور علّامۂ دہر ہوں، تو کیا بلا وجہ میں نے مولینا تھانوی کا دامن تھاما، ؟ ان لوگوں کو سمجھنا چاہیئے کہ میں نے اپنے اندر کوئی تو کمی پائی جس کی تکمیل کے لئے وہاں گیا، اسی سلسلہ میں اپنے ایک نجی خط مورخہ ۳۱ر دسمبر ۱۹۴۱ء میں سید عبد الحکیم صاحب کو لکھتے ہیں،

"آپ اپنی محبت سے مجھے سب کچھ سمجھتے ہیں لیکن من آنم کہ من دانم، علماء پر فرائض کا بار عام مسلمانوں سے زیادہ ہے، اس لئے اگر وہ درست نہ ہوں تو ان پر عذاب دوسروں سے زیادہ ہے، معاملہ دماغ کا نہیں، قلب سلیم اور قلب منیب کا ہے، نفس کا نہیں، روح کا ہے، میری اتنی زندگی بندوں میں گذری اب کچھ اس زندگی کے لئے بھی کرنا چاہیئے، جو باقی ہے، علم اور قوم کی خدمت بہت کچھ ہو چکی، ..... ابھی میری منزل مقصود بہت دور ہے، ..... صرف تسبیح اور مراقبہ سے کچھ نہیں ملتا، جب تک دل کا تعلق دل والے سے نہ ہو، ہم تو بندوں کی رضامندی، اور ناراضی میں گرفتار ہیں، مالک کی رضامندی، اور ناراضامندی کی کس کو فکر ہے، دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے صحیح راستہ پر چلائے"

وہ "فرائض کے پابند" اور "بدعات سے نفور" تو شروع زندگی سے رہے لیکن آخر میں استقامت و تثبیت "رغبت الی الطاعات" "صلاح دل" اور "حصول اخلاص" کے خواستگار ہو گئے تھے،

انکسار | طبیعت میں انتہا درجہ کی متانت و سنجیدگی تھی، اس لئے دور سے دیکھنے والے اُن کی خاموشی اور کم آمیزی کو

اُن کے غرور اور پندار علم پر چوٹ کرتے تھے، ایک بار دہلی کے ایک رسالہ نے اُن کے خلاف کچھ لکھنا شروع کیا، اس رسالہ کے اڈیٹر سے منشی ذکاء اللہ مرحوم کے نامور فرزند جناب عنایت اللہ صاحب (سابق ناظم دارالترجمہ حیدرآباد دکن) کے بھی مراسم تھے، سید صاحب نے عنایت اللہ صاحب کو لکھا کہ رسالہ مذکور کے اڈیٹر سے دریافت فرمائیں کہ مجھ سے اُن کو کیا شکایت ہو، جو میرے پیچھے پڑ گئے ہیں، عنایت اللہ صاحب نے اڈیٹر مذکور کو ایک خط لکھا، انھوں نے جواب دیا کہ مولوی سید سلیمان بڑے مغرور آدمی ہیں، اُن کے غرور کو توڑنا چاہتا ہوں، عنایت اللہ صاحب نے اپنی طرف سے اُن کو جواب دیا کہ میں بھی سید صاحب سے ملتا رہا ہوں، اُن کو کسی حال میں مغرور نہیں پایا، البتہ عالم اور بہت بڑے عالم ہیں، اپنے علم کے پندار کو قائم رکھنا چاہتے ہیں، تو یہ تو اُن کا بڑا وصف ہے،

وہ تحریر میں بھی مغرور نہ تھے، معارف کے شذرات لکھتے وقت برابر یہ خیال رکھتے کہ کہیں سے انکی بُو نہ آئے، اکثر ایسا ہوا کہ اگر "ہمیں" "میں" لکھ جاتے، تو اس کو کاٹ کر اڈیٹر معارف یا خاکسار یا ہیچمدان بنا دیتے، اپنے نام کی رعایت سے ہیچمدان ہی لکھنا زیادہ پسند کرتے تھے، اپنی تحریر کے مسودے اکثر اپنے شاگردوں کو نظر ثانی کرنے کے لئے بلا تکلف دیدیتے، اور اُن کے مشوروں کو قبول کرنے میں مطلق تامل نہ کرتے، نجی صحبتوں میں دوستوں اور شاگردوں سے بہت بے تکلف رہتے، اگر ذہن میں کوئی اچھا فقرہ آجاتا، تو بلا تکلف کہہ ڈالتے، بعض اوقات ان فقروں سے اُن کے شاگردوں کو آنکھیں نیچی کر لینی پڑتیں،

اُن کے فطری انکسار کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا کہ ایک بار حیدرآباد دکن تشریف لے گئے، تو وہاں کے مشہور شاعر جناب امجد صاحب حیدرآبادی سے ملنے اُن کے مکان پر گئے، امجد صاحب نے اس کے شکریہ میں یہ اشعار لکھ کر بھیجے،

کروں شکر کس منہ سے تیرا خدایا ‍ ‍ ‍ سلیمانِ اعظم میرے گھر میں آیا
ازجلوۂ حسن خویش حیران کردی ‍ ‍ ‍ کافردل را مگر مسلمان کردی
بنواختی از قدومِ خود امجد را ‍ ‍ ‍ این مورِ ضعیف را سلیمان کردی

تو سید صاحب نے اس کے جواب مین یہ رباعی لکھ کر بھیجی،

امجد تو اسیر زلف احسان کردی　　　وز زور سخن دلم درخشان کردی
منت بہ غریب شہر چندان کردی　　　کان مور ضعیف را سلیمان کردی

**لینت ومروت** طبیعت مین لینت ونرمی اور حلم ومروت اس قدر غالب تھی، کہ کسی معاملہ مین سختی ودرشتی جانتے ہی نہ تھے حتیٰ کہ گھر کے ملازمون اور بچون پر بھی سختی نہ کر سکتے تھے، ان کی زبان کبھی کسی درشت کلمہ سے آلودہ نہ ہوتی، اُن سے کبھی کسی کو کوئی نقصان نہین پہونچا، اور نہ کسی کی دل شکنی کی، اگر کسی بات سے ان کے شاگردون کو آزردگی ہوجاتی تھی، تو طرح طرح سے اس کی تلافی کی کوشش کرتے تھے، اس وصف کا یہ نتیجہ تھا کہ جو شخص ان پر حاوی ہوجاتا، وہ اُن سے جو کام چاہتا لے لیتا تھا، اور بعض اوقات اپنی طبیعت کے خلاف ایک کام کرنے پر مجبور ہوجاتے،

تحمل اور برداشت کے پہاڑ تھے، دوسرون کی تلخ سے تلخ باتون کو پی جاتے، اور ناگوار سے ناگوار واقعات مین ان کے ابرو پر شکن نہ آتی، اس راہ مین انھون نے اپنی ہستی فنا کر دی تھی، اُن کے دل پر کچھ بھی گذر جائے، مگر زبان پر کبھی شکوہ نہ لاتے تھے، انھون نے مظلوم بننا گوارا کر لیا، مگر ظالم بننا گوارا نہ کیا، وہ نسلاً سید تھے ہی عملاً بھی سید تھے،

وہ اپنی سیاسی زندگی مین بھی شرافت اور مروت کے پیکر ہی بنکر کام کرتے رہے کسی سے سبقت لے جانے کی کوشش کو بھی اچھی نظر سے نہین دیکھتے تھے، چنانچہ ایک مکتوب مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۲۰ء مین ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے سید عبد الحکیم صاحب کو تحریر فرماتے ہین،

"............مین نے بعد کو مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی دونون سے الگ کہا کہ مجھے چھوڑ دیجئے، مجھے دوسرے کو دھکا دے کر آگے بڑھنا پسند نہین لیکن دونون نے نامنظور کیا"

۱۹۲۶ء مین ہندوستان کی طرف سے جو وفد حجاز گیا تھا، سید صاحب اس کے صدر، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، اور شعیب قریشی اس کے اراکین تھے، سلطان ابن سعود کی بادشاہت کے بارہ مین سید صاحب کی رائے دوسرے اراکین سے مختلف تھی لیکن انھون نے کھلم کھلا اختلاف کرنے کے بجائے، سیاسیات ہی سے کنارہ کشی اختیار

کی، مولانا محمد علی مرحوم نے اس سلسلہ میں بعض ایسے مضامین لکھے اور بیانات دیئے جن سے سید صاحب کو اتفاق نہ تھا، لیکن ان کا جواب دینے کے بجائے، وہ خاموش رہے، اسی زمانہ میں وہ دہلی تشریف لے گئے، تو مولانا محمد علی سے ملاقات ہوئی، سید صاحب نے اثنائے گفتگو میں اُن سے کہا کہ آپ چاہے جیسے بھی مضامین لکھیں یا بیانات دیں میں خاموش ہی رہوں گا، مولانا محمد علی کی حاضر جوابی تو مشہور ہے، انھوں نے برجستہ کہا کہ یہ مضامین اور بیانات تو آپ کو خاموش کرنے ہی کے لئے شائع کئے جا رہے ہیں، اس حاضر جوابی سے سید صاحب خود بھی محظوظ ہوئے، اور کئی بار اپنی نجی صحبتوں میں اس کو دہرایا، لیکن اختلاف رائے کے باوجود مولانا محمد علی کے بے حد مدّاح اور بڑے گرویدہ رہے اور جب اُن کے انتقال کی خبر ملی، تو دیر تک آبدیدہ رہے، اور غایت اضطراب میں ٹہل ٹہل کر سکون پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے، اور معارف میں اُن کا بڑا دردانگیز ماتم کیا جس کے بعض ٹکڑے یہ ہیں،

"افسوس وہ پُر درد آواز جو ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۰ء تک ہندوستان اور دنیائے اسلام کے ہر قیامت آفریں سانحہ میں صدائے صور بن کر بلند ہوتی رہی، ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی، وہ بیقرار دل جو مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت بے تاب ہو جاتا تھا، اور اوروں کو بے تاب کرتا تھا، دریغا کہ قیامت تک کے لئے ساکن ہوگیا، وہ اشک آلود آنکھیں جو دین و ملت کے ہر ماتم میں آنسوؤں کا دریا بن جاتی تھیں، حسرتا کہ ان کی روانی ہمیشہ کے لئے بند ہوگئی، وہ مترنم لب جو ہر بزم میں خوشنوا بلبل بن کر چہکتے تھے، اُن کے ترانے اب ہمارے کان نہ سنیں گے، وہ آتشیں زبان جو ہر رزم میں تیغ براں بن کر چمکتی تھی، اُس کی تابش اب کسی معرکہ میں ہماری آنکھوں کو نظر نہ آئے گی، وہ پرجوش سینہ جو ہمارے مصائب کے پہاڑوں کو سیلاب بن کر بہا لے جاتا تھا، اس کا تلاطم ہمیشہ ہمیشہ کیلئے تھم گیا، اور وہ پرزور دست و بازو جو شب و روز کی خدمت گذاری اور ہنر آزمائی میں مصروف تھا، وہ اب ایسے جھکے کہ پھر نہ اٹھیں گے، اور افسوس کہ شکست خوردہ فوج کا وہ آخری سپاہی جو اعداء کے نرغہ میں تنہا لڑ رہا تھا، آخر زخموں سے چور ہو کر ایسا گرا کہ پھر کھڑا نہ ہو سکا، الوداع

وَالسّلام الی یوم القیام،

پروفیسر محمود شیرانی مرحوم سے برابر علمی چشمک رہی لیکن اُن کی وفات پر بھی بہت ملول اور افسردہ ہوئے، اور اُن پر ایک مستقل مضمون معارف میں شائع کیا، اور اُن کے اوصاف کا ذکر ان الفاظ میں کیا،

"مرحوم نیک مزاج، کم آمیز، سادگی پسند اور خاموش طبع تھے، اُن کی طبیعت میں تلاش، محنت، تحقیق و تدقیق کا مادہ بدرجۂ اتم موجود تھا، ......... مرحوم کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کی شاندار روایات کا بڑا اثر تھا، ...... حافظ قرآن تھے، یہ خود ایک بڑی نعمت ہے، اور وسیلۂ مغفرت"

وہ کسی کے متعلق بھی بُری رائے نہ رکھتے، اُن کا قول تھا کہ جب میں کسی سے ملتا ہوں تو اس کو اچھا ہی سمجھتا ہوں، اور اس وقت تک اچھا سمجھتا رہتا ہوں جب تک کہ وہ خود اپنے کو بُرا نہ ثابت کردے، اپنے ایک ندوی عزیز کو ایک مکتوب میں لکھا کہ

"محبت، اعتماد، اور مسامحت میرا دستور العمل ہے، چنانچہ اس وقت تک اس میں کامیابی ہوئی ہے، جس دن یہ بات نہیں رہے گی، میں نہیں رہوں گا" (مورخہ ۹ اپریل ۱۹۴۱ء)

**اشتعال انگیزی** البتہ مذہب اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب کوئی اہلِ قلم گستاخانہ اور ناروا حملہ کرتا، تو اُن کے اشتعال اور رنج کی کوئی حد نہ ہوتی، اور اس کے جواب میں اُن کی جو تحریر نکلتی، وہ بہت ہی زہرناک ہوتی، ایسے موقع پر فرماتے کہ میرے قلم میں ایسا زہر بھی ہوتا ہے کہ سات سمندر کا پانی بھی اس کے زہریلے اثرات کو دور نہیں کر سکتا،

**کشادہ دستی** دار المصنفین میں اُن کی زندگی سو روپے ماہانہ وظیفہ سے شروع ہوئی، جو ۳۲ سال کی خدمت کے بعد ۲۵۰ روپے سے زیادہ نہ بڑھ سکا، آبائی جائداد سے اخیر عمر میں فائدہ اٹھانے لگے تھے، اس سے ساٹھ ستر من غلہ سالانہ مل جایا کرتا تھا، لیکن اس محدود آمدنی میں اللہ تعالیٰ نے اتنی برکت عطا فرمائی تھی کہ بڑی صاف ستھری زندگی بسر کرتے تھے، ضرورت کا ہر سامان اُن کے پاس موجود تھا، متعلقین کو اچھا کھلاتے اور پہناتے، بعض اوقات معاشی تنگی تو ضرور محسوس ہوئی لیکن کبھی کسی قسم کی تکلیف اٹھانے کی نوبت نہیں آئی، اعزہ و اقربا کی امداد بھی کرتے

رہتے تھے، اُن کے ایک عزیز چار سو روپیے کے مقروض تھے، قرضدار کا بڑا سخت تقاضا تھا، انھون نے اپنی پریشانی کا حال سید صاحب کو لکھا، اُن کا خط پڑھ کر بہت متاثر ہوئے، اور حسب ذیل جواب دیا،

"آپ کا لفافہ ملا جس سے آپ کی پریشانیون کا حال معلوم ہوا، دل مضبوط رکھیے، اور خدا پر بھروسہ کیجئے...... اس مین امداد کے لئے مین حاضر ہون، چار سو قرض ہین، یہ قرض آپ مجھ پر سمجھین، مجھ سے جہان تک ہو سکے گا، اس کی صورت نکالون گا، اگر سو روپیے سال وہ لینا منظور کرین تو مین آسانی سے انشاء اللہ دے سکون گا، اور اگر وہ چار سو اسی وقت لینے پر مصر ہین، تو یہ بھی بفضل خدا ہو سکتا ہے، مگر اچھا ہو کر اکتوبر کی تعطیل تک آپ مہلت لین، یہ اس لئے کہ ڈاک سے بھیجنے مین، لوگون کو معلوم ہو جائے گا، اور یہ کچھ اچھا نہین،

اور جب یہ قرض ادا ہو گیا تو وہ بے حد مسرور ہوئے، ایک بار ان کے ایک عزیز نے وطن کے قیام کے زمانہ مین ان سے کچھ قرض لیا، اور ایک دوسرے صاحب کو لکھا کہ یہ رقم اُن کو ادا کر دی جائے، جب وہ دینے لگے تو فرمایا یہ رقم قرض کے خیال سے دی ہی نہین گئی تھی جس کی واپسی کا سوال ہو اور اس کے لینے سے انکار کر دیا،

ایک عزیزہ کی لڑکی کی شادی تھی، وہ خرچ کی کمی محسوس کر رہی تھین، سید صاحب کو معلوم ہوا تو چپکے سے دو سو روپیے اُن کے پاس بھجوا دیئے، شادی ہو جانے پر ان عزیزہ نے اپنے بعض اعزہ سے اس رقم کا ذکر کیا، سید صاحب کو معلوم ہوا تو اس سے اُن کو بڑی آزردگی ہوئی،

قومی چندے پابندی سے ادا کرتے رہے، ایک مکتوب مورخہ ۲ مئی ۱۹۳۰ء مین سید عبدالحکیم صاحب کو تحریر فرماتے ہین :-

"اب میرے سالانہ چندون کی فہرست سنئے، جو سالانہ ادا ہوتے ہین، اور امسال ہو چکے ہین، ہمہ وظائف سالانہ ندوہ سو روپیے، مدرسہ سرائے میر دس روپیے، مدرسہ اسلامیہ اعظم گڈھ بارہ روپیے، انجمن امداد غربا اعظم گڈھ بارہ روپیے، رکنیت ندوہ پانچ روپیے، رکنیت ایجوکیشنل کانفرنس پانچ روپیے،

امارت شرعیہ دس روپے، انجمن تبلیغ الاسلام امبالہ دس روپے، انجمن تبلیغ صوبہ متحدہ چھ روپے؛"

ان چندوں کے علاوہ وطن کی انجمن الاصلاح کو عہ اور وہاں کی مسجد کو بھی عہ رسالانہ مستقل دیتے تھے،

اس کے علاوہ عارضی چندے بھی دیتے رہتے تھے،

دارالمصنفین کی ۳۲ سال کی خدمت کے بعد جب بھوپال تشریف لے گئے تو ایک ہزار تنخواہ مقرر ہوئی، وہاں تقریباً چار سال رہے، لیکن اس زمانہ کی آمدنی کا بڑا حصہ بعض اعزہ کی شادی انجام دینے، متعلقین کی خاص خاص ضروریات پوری کرنے اور اہل و عیال کے ساتھ سفر حج کرنے میں صرف ہوا،

**استغنا و بے نیازی** دارالمصنفین کے قیام کے زمانہ میں جب اُن کے فضل و کمال کا شہرہ ہوا تو مختلف جگہوں سے بڑی بڑی تنخواہوں کی ملازمتیں اُن کے سامنے پیش ہوئیں، مگر انھوں نے ہمیشہ اُن کے قبول کرنے سے انکار کیا، ۱۹۱۶ء میں ڈاکٹر اقبال نے پنجاب یونیورسٹی میں ایک جگہ پیش کی، اس کو قبول کرنے سے بھی معذوری ظاہر کی، اس پر ڈاکٹر اقبال نے ان کو لکھا کہ

"مجھے یہ معلوم تھا کہ آپ ملازمت کوئی قبول نہ کریں گے، لیکن سنڈیکیٹ کے بعض ممبروں کی تعمیل ارشاد میں آپ کو لکھنا ضروری تھا، کسی قدر خود غرضی کا شائبہ بھی میرے خط میں تھا، اور وہ یہ کہ میں چاہتا تھا کہ جس طرح پنجاب والوں کو صوبہ متحدہ کے علماء و فضلاء سے بیشتر فائدہ پہونچا ہے اب بھی وہ سلسلہ آپ کے یہاں رہنے سے بدستور جاری رہے۔۔۔۔۔۔"

تقسیم ہند کے بعد پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات کی صدر نشینی جس کی تنخواہ ڈیڑھ ہزار ماہوار تھی پیش ہوئی، اس کو بھی قبول نہ کیا، اور دوسروں کے لئے سفارش کردی،

ایک بار مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے شعبۂ دینیات کی پروفیسری قبول کرنے کے لئے اصرار کیا گیا، تو فرمایا کہ پھر دارالمصنفین کو کیا کروں گا، بعض ذمہ دار اشخاص نے تجویز کیا کہ یہ ادارہ بھی وہاں منتقل کر دیا جائے، سید صاحب نے جواب دیا کہ پھر استاذ مرحوم کا مزار کس کے حوالہ کروں گا؟"

ایک بار علماء کے ایک اجتماع مین شرکت کے لئے پشاور تشریف لے گئے، نواب زادہ سر عبد القیوم نے تمام علماء کو اپنے یہان مدعو کیا، اور دعوت کے بعد ہر ایک سے علٰحدہ علٰحدہ ملاقات کی، جب سید صاحب مل کر رخصت ہونے لگے، تو مصافحہ کرتے وقت سو روپیہ کا ایک نوٹ اُن کے ہاتھ مین دیدیا، مہمان نوازی کا یہ اخلاق سید صاحب کو پسند نہ آیا، لیکن مروت مین خاموش رہے، اور نوٹ واپس نہ کر سکے، مگر لکھنؤ آکر یہ رقم دار العلوم ندوہ کو دیدی اور اس کی باضابطہ رسید سر عبد القیوم کے پاس بھجوادی،

۳۵ء مین ذات الجنب کے مرض مین مبتلا ہوئے، تو کئی مہینے تک علیل رہے، علاج مین آٹھ سو روپیہ کے مقروض ہو گئے، دار المصنفین کی طرف سے یہ تجویز پیش ہوئی کہ علاج کے سارے اخراجات ادارہ کی طرف سے ادا کئے جائین، لیکن انھون نے اس کو گوارا نہ کیا، اور خود ہی قرض ادا کیا،

پاکستان ہجرت کی تو آبائی مکانات، شاندار بنگلہ، باغ، جائداد، گھر کا سارا سامان حضور نظام کا وظیفہ اور بھوپال کے پراوڈنٹ فنڈ کی رقم سب سے منھ موڑ لیا، اور مہاجرت کی صعوبتین برداشت کرتے رہے، جولائی ۵۱ء مین اس راقم کو لکھا کہ مہاجرت کی شان بہت بلند ہے، مہاجر صحابہ کی قدر اب معلوم ہوتی ہے، نہرو لیاقت پیکٹ سے یہان کے مہاجرون کو بہت کچھ سہولتین دی گئین، اُن سے فائدہ اٹھانے کے لئے بار بار اُن کی خدمت مین گذارش کی گئی، لیکن غایت استغنا مین ۱۰ اگست ۵۲ء کو تحریر فرمایا:

"ہندوستان چھوٹنے پر جائداد و مکان کی محبت دل سے نکل گئی اور بقول شاعر

بلبل نے آشیانہ چمن سے اٹھا لیا　　اس کی بلا سے بوم رہے یا ہما رہے

سلوک کی وہ منزل جو تصوف کی راہ سے شاید برسون مین طے ہوسکتی ہے، اس ہجرت مین دم کے دم مین طے ہو گئی"

پاکستان پہونچے تو ادارۂ تعلیمات اسلام کی صدارت پیش کی گئی، اس عہدہ کی بڑی تنخواہ تھی، یہ ادارہ دستور سازی مین مدد دینے کے لئے قائم کیا گیا، لیکن پورے دو سال تک اس کو یہ کہکر قبول کرنے سے انکار کرتے رہے کہ جب تک قوانین

مروجہ اسلامی نہ بنائے جائیں گے اتنہا دستور سے کوئی مملکت اسلامی نہیں بن سکتی، ہی، اور جب اُن کو مروجہ قوانین پر نظر ثانی کرنے کی اجازت ملی، تو عہدہ قبول فرمایا، لیکن اس کی مدت ایک سال سے کچھ ہی زیادہ رہی، اس سے پہلے سوا دو سال تک متوکلانہ زندگی بسر کی، اور معاشی صورت پیدا کرنے کے لئے بقول انہی کے اپنا پیشۂ قدیم کتب فروشی اختیار کیا، اور اسی لئے مکتبۃ الشرق قائم کیا،

**دارالمصنفین سے لگاؤ** دارالمصنفین کے لئے انھوں نے جیسی قربانیاں کیں، اُن کی مثالیں اس زمانہ میں کم ملیں گی، اگرچہ حالات نے اُن کو آخر میں دارالمصنفین سے جدا کر دیا تھا لیکن اس کے ساتھ اُن کی قلبی وابستگی آخر دم تک قائم رہی، اس کی ہر خلش پر بے چین ہو جاتے، اور اس کے ازالہ کی تدبیریں بتاتے، اور اس کی فلاح و بہبود کیلئے مفید مشورے دیتے رہتے، وہ ہندوستان ہی میں تھے کہ جون ۱۹۴۶ء میں بھوپال چلے گئے، دارالمصنفین سے ان کا ہٹنا کم اہم واقعہ نہ تھا، مگر بھوپال کے زمانۂ قیام میں وہ بدستور دارالمصنفین کے ناظم رہے، وقتاً فوقتاً اس کی دیکھ بھال کے لئے آتے، اور ہدایتیں بھیجتے رہتے جس سے اُن کی کمی محسوس نہ ہوتی لیکن وہاں کے قیام کے دوران میں شاہ معین الدین صاحب ندوی نے دارالمصنفین کے مستقبل کے بارہ میں اپنی کسی تشویش کا اظہار کیا تو اس کے جواب میں دسمبر ۱۹۴۹ء میں ارقام فرمایا:

"میں دور ہوں مگر حالات سے قیاس کرتا ہوں کہ دارالمصنفین کا مستقبل خطرہ سے خالی نہیں ہے، معلوم نہیں اس کو کیا پیش آئے، یہ ظاہر ہے کہ اس کی تباہی میری تباہی ہے، اور مجھے اس سے کتنا رنج ہوگا، آپ کا یہ کہنا کہ اگر آپ واپس نہیں آئے تو میرے لئے بھی کہیں فکر کیجئے، مناسب نہیں کیونکہ ویرسویر ایک ضعیف العمر کو اس خاکدان فنا کو چھوڑنا ہی ہے، اور آپ لوگوں کو بہرحال اس ادارہ کو چلانا ہے، یہی عزم ہونا چاہئے۔"

وہ جب کراچی چلے گیے، تو وہاں سے اپنے شاگردوں کو تحریر فرمایا گیا کہ

"پہلے دارالمصنفین ایک شخص (مولانا شبلیؒ) کی یادگار تھا، اب اس کو دو کی یادگار سمجھ کر زندہ رکھو۔"

پھر علیحدہ علیحدہ خطوط لکھ کر شاگردوں کو تلقین کی کہ

"......... آپ اسکو (یعنی دارالمصنفین) کو اپنی زندگی کا کام بنائین، ورنہ لاکھون کا سرمایہ اور عمرون کا حاصل تباہ ہوجائے گا"

از رجب دارالمصنفین کے پرانے نظام مین تبدیلی ہوئی، اور جناب شاہ معین الدین صاحب ندوی کو شعبۂ علمی کی نظامت سپرد کی گئی تو بڑی مسرت واطمینان کا اظہار فرمایا، چنانچہ مارچ ۱۹۵۱ء کے ایک مکتوب مین اُن کو تحریر فرماتے ہین،

"دارالمصنفین مین آپ لوگون نے جو کچھ طے کیا، اس پر مین راضی اور درگاہِ الٰہی مین داعی ہون کہ اس کو دارالمصنفین کے حق مین نافع فرمائے

سپردم بتو مایۂ خویش را　　تو دانی حساب کم و بیش را

آپکے ہونے کو مین اپنا ہی ہونا سمجھتا ہون اور مجھ کو آپ کی قائم مقامی سے ویسی ہی خوشی اور طمانیت ہے جو کسی روحانی اور جسمانی خلف الصدق کی جانشینی سے ہوسکتی ہے خدا کا شکر ہے کہ مین نے اپنی زندگی ہی مین اپنی موت کے بعد کا نقشہ دیکھ لیا، اب آپ سے جہان تک ہوسکے دین وملت کی خدمت سمجھ کر اس کام کو انجام دین، اور ساتھ ہی اپنے رفقار کی تیاری مین مصروف رہین، تاکہ ایک چراغ سے دوسرا چراغ جلتا رہے، اور استاد مرحوم کا سلسلہ قائم رہے، الحمدللہ آپنے معارف اور شذرات کے معیار کو قائم رکھا، اور "س" اور "م" مین شاید ہی کسی کو فرق محسوس ہوتا ہو، وللہ الحمد"

خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را

# سیرۃ السید کے کچھ نمونے اور سبق

از

جناب مولانا عبد الباری صاحب ندوی

حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ "سید سلیمان" نام کے ایک طالب علم کی حیثیت سے دار العلوم (ندوہ) مین ۱۳۱۸ھ کے آخر (غالباً ذی الحجہ) مین داخل ہوئے، اور راقم ہذا دوسرے ہی سال ۱۹ھ کے شوال مین، اس طرح بچپن اور نوعمری کے ابتدائی سالون کو چھوڑ کر اُن کی پوری زندگی کے ہر دَور کو دُور و نزدیک سے دیکھنے جاننے اور سمجھنے کے مواقع حاصل رہے، آخری دور — قیام پاکستان — مین بھی دو مہینے کے قریب بہت قریب سے چشم و گوش دونون کو دید و شنید کی سعادت میسر رہی، ڈھائی ہفتے تو کراچی مین خود اُن کا مہمان رہا، ملتان مین خیر المدارس کے سالانہ جلسۂ دستار بندی مین یک جائی کا شرف حاصل رہا، اور پانچ ہفتے کے لگ بھگ حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب مدظلہ[1] کی خدمت مین لاہور مین حاضری رہی، تو اس دوران مین کئی بار یونیورسٹی کی کمیٹی اور جامعۂ اشرفیہ کے سالانہ اجتماع کے سلسلہ مین تشریف لائے، اور خواجہ تاشی کے رشتہ سے مستقل حضرت ممدوح کے وہ بھی مہمان ہوئے

ندوہ مین نہ صرف طالب علمانہ معیت و رفاقت رہی، بلکہ جب استاذ مقرر ہوئے تو شاگردی کی دولت بھی ملی، استاذ مرحوم و محترم علامہ نعمانی کی مجالس مین سالہا سال اُن کے پیچھے صفِ نعال مین شریک رہا، سب سے طویل دور اُن کا دار العلوم (ندوہ) اور دار المصنفین کی معتمدی و نظامت کا رہا، اس کم و بیش چوتھائی صدی کے دوران مین دونون

---

۱؎ حضرت مفتی صاحب مجدد تھانوی علیہ الرحمۃ کے اجل خلفاء مین ہین، متعنا اللہ بطول بقائہ۔

اداروں کے گوناگون معاملات سے باضابطہ و بے ضابطہ خاکسار کو بھی تعلق رہا، "سیرت سلیمان" کے جلی و خفی نمایان اور غیر نمایان نقوش سب سے زیادہ اسی عہد مین ثبت ہوتے رہے، مکاتبت مین مرحوم زیادہ مستعد نہ تھے، پیش قدمی تو بلا ضرورت شدید شاذ ہی فرماتے، جواب بھی بارہا ہفتون مین مرحمت ہوتا، خود مجھکو اپنے قلبی تغیرات کی بنا پر حفاظت مکتوبات کا بھی ہمیشہ اور پورا اہتمام نہین رہا، پھر بھی وفات کے بعد پرانے کاغذات جو الٹے تو "سید المکاتیب" کا ذخیرہ بھی ڈھائی سو سے زیادہ ہی نکلا

نصف صدی سے بھی زیادہ رابطہ کے اس تسلسل اور تنوع کی بنا پر اس مین شک نہین کہ "سیرت السید" کا بڑا کثیر مستند سرمایہ اس بے مایہ کے پاس ہونا چاہئے تھا، اسی توقع مین ہندوستان و پاکستان کے بعض ارباب رسائل کا حکم و اصرار ہوا کہ ان کے رسالون کی خصوصی اشاعتون اور مستقل سیرت کی تالیف مین کوئی بڑا اور خاص حصہ لے سکتا ہون،

لیکن اس حسن ظن کے بدلنے پر ان کو کس طرح آمادہ کرون، اور کیونکر یقین دلاؤن کہ خود زندگی کے جس عالم سے گذر رہا، بلکہ جس پر زندگی ختم کر رہا ہون، وہ بجھی ہوئی آگ کے ایک ڈھیر سے زیادہ نہین خصوصاً جب سے اپنی ناسمجھی کی سمجھ مین یہ آگیا ہے کہ اسلامیت اور انسانیت کسی کا بھی بیڑا کاغذ کی ناؤ سے پار نہین لگ سکتا، اور زبان و قلم کی رائج الوقت وبا سے ملک و ملت کے کامون مین فلاح سے زیادہ فساد ہی کا مشاہدہ دن رات ہوتا رہتا ہے،

اس وقت سے یقین فرمائین کہ گو خود بھی اس وبا کے تعدیہ سے پوری طرح محفوظ نہین تاہم مسلمان اور انسان دونون کے دن بدن بگاڑ کو بناؤ سے بدلنے کی تدبیر اس کے سوا نظر نہین آتی کہ خود مسلمان جن پر ساری دنیا کی ہدایت و امامت کی ذمہ داری ہے، وہ زبان و قلم کم چلائین، اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے شعبہ و زاویہ مین مسلمان بن بنا کر زیادہ دکھلائین، یہ حقیقت اس بذات خود سراپا ناکارہ کے لئے دن دوپہر کے سورج سے بھی بڑھ کر اتنی روشن و بین ہو چکی ہے کہ لکھنا بولنا یونہی کیا آتا ہے، انہی مواقع پر اور بھی زبان گنگ اور قلم کند ہو جاتا ہے، خصوصاً تکلف و آورد سے ایک سطر بھی لکھنا پہاڑ ہوتا ہے:

اس کے علاوہ واقعاتی و تاریخی حافظہ پیدائشی طور پر حصہ مین بہت کم پڑا اور اب تو ناپید ہونے کے برابر ہے، لفظی روایت کسی بات کی گھنٹہ بھر بعد بھی مشکل ہی سے کر سکتا ہون، کسی گذشتہ واقعہ و معاملہ کی جزئیات

وتفصیلات ذہن مین ڈھونڈھے نہین ملتین، زیادہ تر بس ایک معنوی، وہ بھی دھندلا سا خاکہ دماغ مین رہ جاتا ہے خود سید صاحب مرحوم کا قلم دینیات مین جیسی جیسی تاریخ وار جزئیات کے ساتھ متوفی کی مستوری فرمایا کرتا تھا، کسی موقع پر پاکستان ہی مین بڑی حیرت سے مین نے پوچھا کہ حضرت یہ آپ کے حافظہ کی کرامت ہے، یا کوئی یادداشت روزنامچہ اس اہتمام سے ضبط فرماتے رہتے ہین، ؟ جواب مین اُن کا محبوب مسکرانا تو یاد ہے، لیکن جواب کیا ملا، یا سرے سے کچھ ملا بھی ؟ یہ بالکل یاد نہین آرہا،

ایسی صورت مین دوستون کے حکم پر معذرت وندامت کے سوا پیش ہی کیا کر سکتا تھا، البتہ دار المصنفین مین حضرت مرحوم کے مسند نشین برادر عالی قدر شاہ معین الدین سلمہ کو یہ "جیتے جی مرحوم" خدا جانے کیسے اتنا یاد آگیا کہ اُن کے حکم پر حکم کا تار نہین ٹوٹ رہا ہے، آخر جب یہان تک نوبت پہنچی کہ سید صاحب کی بارگاہ مین آپ کا مضمون نہایت ضروری ہے، خواہ اس کے انتظار مین پرچہ کی اشاعت مین تاخیر کرنا پڑے، تو ذہن پر دباؤ زیادہ پڑا، اور ان سطرون تک پہنچا ہون، والاتمام من اللہ،

---

سید صاحب کے علمی وعملی کمالات مین سب سے اونچا مقام اُن کی تصنیفی وقلمی یا ذہنی ودماغی خدمات کو حاصل ہے، ذہن وذہانت مین اُن کی طالب علمی کے متعدد رفیق[1] ومعاصر متوقد الذہن اُن سے بڑھ چڑھ کر تھے، اور کہا جاتا تھا کہ اُن کے سامنے سید صاحب کا چراغ جلنا مشکل ہے، لیکن ہر وصف کا کمال اس کا نقطۂ اعتدال ہوتا ہے، متوقد یا بھڑکتے ہوئے ذہنون کے علوم وافکار کو اکثر جھلس ہی جاتے دیکھا، ذہن کا کوئی متوازن تخلیقی کارنامہ ذہانت کی نرم ومعتدل آنچ ہی چاہتا ہے، مرحوم کا سبق آموز ذہنی کمال اُن کا ذہنی توقد نہین توازن تھا، چلتا اُن کا ذہن اُن کے جسم کی طرح متانت ہی کی چال تھا، لیکن پڑتا ہر قدم مضبوط وہموار زمین پر، بہت زیادہ ذہین، ذکی آدمی ہضم کم کرتے ہین، البتہ ذہانت کے زور سے اُگلتے زیادہ اور جلد ہین،

سید صاحب کو طالب علمی ہی کے زمانہ سے پڑھنے اور کتب بینی کرنے اپنے ساتھیون کے مقابلہ مین زیادہ

---

[1] مثلاً سید ظہور احمد وحشی شاہجہان پوری،

ہر طرح کی چیزین پڑھتے اور ایسا معلوم ہوتا کہ خوب چبا چبا کر ہضم کرتے، طلسم ہوش رُبا تک کو اس توجہ سے پڑھا تھا کہ چندہ کے ایک وفد مین ساتھ تھا، یاد نہین کیا صورت پیش آئی کہ کئی میل پیدل چلنا پڑا، غالبًا کچھ پانی بھی برس رہا تھا، اس عالم مین وہ طلسم ہوش ربا اس طرح سُناتے جارہے تھے، جیسے کتاب پڑھ رہے ہون، راستہ تفریحی سفر بن گیا، شاگردی کی سعادت کے بعد سے خدمت مین حاضری زیادہ ہونے لگی تھی، جب حاضر ہوتا، کچھ نہ کچھ پڑھتے لکھتے ہی پایا، آخر تک یہ رنگ دیکھا کہ کوئی معمولی اخبار و رسالہ یا کوئی گری پڑی کتاب بھی سامنے آگئی تو اُسی وقت اٹھا کر دیکھنے لگتے، ذرا بھی کوئی بات دلچسپی کی پاتے تو ایسا معلوم ہوتا، کہ خالی وقت گذاری کے طور پر نہین توجہ کے ساتھ پڑھ رہے ہین،

طبیعت اخّاذ بہت تھی، ہر ادنیٰ و اعلیٰ کتاب و رسالہ اور ہر کہ و مہ کی باتون سے مطلب کی بات اخذ کر لیتے، اُور حسب موقع کام لیتے، فورًا قابلِ قبول نہ نظر آتی، تو غور فرمانے پر جب جتنا جز بھی کسی کی بات کا ان کا دل و دماغ قبول کرتا، تو قبول ہی نہین، اعتراف بھی بڑی کشادہ دلی سے فرماتے، ایک آدھ مثال خود اپنے تجربہ کی یاد آگئی؛ مین کہا کرتا ہون کہ یقینی موت ہے یا زندگی؟ زندگی تو اتنی غیر یقینی کہ یقین پل بھر کا نہین اور موت اتنی یقینی کہ ہو کر رہے "تیاری یقینی چیز کے لئے زیادہ کرنی چاہیئے، یا غیر یقینی کے لئے؟ فرمایا کہ یہ بات تمھاری ایسی جی کو لگ گئی کہ اس سے کام لیتا رہتا ہون، حیدرآباد مین وجودی رنگ کے ایک بڑے صاحبِ حال و قال بزرگ حضرت مولانا محمد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے، شیخ اکبر کے مسلک پر مخلوقات کی توجیہ معلوماتِ الٰہیہ کی تجلیاتی نمود و ظہور سے بڑے جوش و خروش سے فرماتے، نئے پُرانے دونون طبیعتون کے اہلِ علم بہت متاثر ہوتے جن مین ہمارے مولانا گیلانی، اور ڈاکٹر میر ولی الدین جیسے مشہور و معروف اصحابِ علم و قلم تک داخل ہین، بلکہ دونون ماشاء اللہ مجاز و خلیفہ ہین، علما کو اُن کا زمانے کے خصوصًا بڑے حریص تھے اور چھاپہ تمام تر آیات و احادیث ہی سے مارتے، سید صاحب کا میلان ایک تو ابتدا مین اہلحدیث کی طرف زیادہ رہا، دوسرے زیرِ تربیت اپنے مجددی مسلک کے بڑے بھائی کے رہ چکے، وجودیت کے نام ہی سے چوکنا ہوتے، تاہم جب آخری مرتبہ حیدرآباد تشریف لے گئے، تو وجہ اپنی اخذ و استفادہ کی طالب علمانہ صفت و سیرت کی بنا پر خاکسار اور مولانا

گیلانی کی "ترغیب وتعریف" سے کئی بار حضرت ممدوح سے ملے، اور ان کے "حال" سے کافی متاثر ہوئے،

مین نے مولانا کی وجودیت کو سمجھنے کے لئے سید صاحب کو قرآن مجید کی اُن آیات کی طرف خاص طور سے توجہ دلائی جن مین خلق وخلاقیت کو علم کے ساتھ غیر منفک طور پر وابستہ ٹھہرایا گیا ہے، مثلاً الا یعلم من خلق بلیٰ وھو الخلّٰق العلیم، وغیرہ، اور کچھ جدید فلسفیانہ وعقلی نظریات ورجحانات سے بھی اس کی تشریح کی، بڑی توجہ ودلچسپی سے سنا، پھر کچھ دن بعد فرمایا کہ بھائی ان آیات سے تم لوگون کی وحدۃ الوجود تو ابھی سمجھ مین نہین آتی لیکن تمھاری گفتگو کے بعد سے علم وخلق کی وابستگی کی آیات پر غور کرتا رہا، اس مین شک نہین ہے کہ دونون کا ربط بہت تفکر وتدبر کے لائق ہے (او کما قال)

عرفی طالب علمی سے لے کر علمی شہرت وعظمت کے اوجِ کمال تک اشخاص اور کتابون دونون سے کھلے دل ودماغ کے ساتھ اخذ واستفادہ کا یہی کمال کہنا چاہئے کہ اُن کو زندگی بھر لفظاً ومعنًی "سچا طالب علم" بنائے رہا، انکے گوناگون کمالات مین وہبی صلاحیتون سے بہت زیادہ کسبی طور پر ان صلاحیتون سے زیادہ سے زیادہ کام لینے کو دخل رہا، فطری ذہانت وذکاوت، طباعی وجودت والے دنیا مین کم نہین ہوتے، ندوہ مین سید صاحب سے پہلے اُن کے ساتھ اور بعد ایک سے ایک بڑھ کر ذہین وطباع داخل وفارغ ہوتے رہے لیکن "سید سلیمان ندوی" ہونے مین سب پیچھے رہے، بڑا راز اس کا اُن کے کسبِ طلب کا کمال ہی تھا، اُن کی طالب علمانہ اور عالمانہ زندگی وسیرت کا یہ بڑا قیمتی سبق ہے،

علمی ذوق وشوق کی عام فضا ندوہ مین اُستاذِ محترم (علامہ نعمانی ؒ) کے دور مین پیدا ہوئی، لیکن سید صاحب جہان تک دیکھا سنا، اس سے پہلے بھی کتاب کے کیڑے تھے، کھیل کود مین کوئی نمایان شرکت تو قطعاً یاد نہین آتی، نہ میل جول، اور سیر وتفریح کی زیادہ عادت تھی، یہی رنگ طبیعت کا آخر تک رہا، کہ خاص تعلق کے لوگون تک بھی "دلے بزندش" ہی پہنچ پاتے، گویا یکسوئی ان کا طبعی امر تھا، جو علم وعمل کی ہر راہ مین کسب کمال کی شرط ہے،

اعمال و اخلاق کے اعتبار سے ایک دینی درسگاہ کے شایان شان تو دار العلوم (ندوہ) کا کوئی زمانہ نہین کہا جاسکتا، لیکن سید صاحب کی طالب علمی کا زمانہ خصوصیت کیساتھ بڑا مسموم تھا، طلبہ کیا بعض اساتذہ تک کی اخلاقی حالت کچھ اچھی نہ تھی، طلبہ کا کمرون مین چھپ چھپ کر تاش کھیلنا، راتون کو پھاٹک پھاند کر تھیٹر جانا معمولی باتین تھین، پھر رات دن ساتھ رہنے والے طالب علمون مین ایک کا حال دوسرے سے کب تک چھپتا ہے باین ہمہ سید صاحب کی اس زہریلے ماحول سے تاثر کی کوئی بات دیکھنا کیا سننا بھی قطعاً یاد نہین، بس ایک ہی بات کی شہرت تھی کہ پیالہ اُن کا زیادہ بند رہتا، مراد بکرے کا گوشت، اور گھی کے تار والا پیالہ ہے، جو اس زمانہ مین پانچ روپیہ ماہوار مین مستطیع، غیر مستطیع سب ہی طالب علمون کو دو وقتہ ملتا تھا کسی کے پیالہ مین تار نہ ہوتا، تو دسترخوان ہی پر صدائے احتجاج بلند ہوتی، نماز کی غیر حاضری پر منتظمین نے سب سے کارگر سزا اس عزیز پیالہ کا بند کر دینا ہی قرار دے رکھی تھی، اور مسجد مین بہتون کو اس تار والے پیالہ کی کشش ہی پہنچاتی،

ایک اور اصطلاح "پوستین" یعنی کاہل کی چلی ہوئی تھی، غالباً بہار سے درآمد کی ہوئی اور بہاری طالب علمون ہی کی چلائی ہوئی۔ بے تکلف احباب غریب سید صاحب پر اس کی خوب چوٹ کرتے، اُن کے پیالہ کی قربانی کا ذمہ دار زیادہ تر اسی کو خیال کیا جاتا۔ یہ چیز زندگی کی اکثر عادتون مین کم و بیش زندگی بھر اُن کی رفیق رہی، خطون کا مہینون جواب نہ دینا، کہین جانے آنے یا سفر کا ارادہ کر کے بارہا پورا یا وقت پر پورا نہ ہونا، اکثر اس طبعی خصوصیت کا مظہر ہوتا، "پوستینی" اور کتب بینی مین بھی کچھ طبعی مناسبت معلوم ہوتی ہے، جس کا تجربہ راقم "پوستین" کو خود اپنی آخر زندگی مین خصوصاً ہو رہا ہے، اپنے مذاق کی کتابین وغیرہ تو صبح سے رات تک پڑھتا رہ سکتا ہون، کتاب و مضمون کی صورت مین کچھ لکھتا بھی رہ سکتا ہون، لیکن عجیب بات ہے کہ خط کا ایک کارڈ بھی طبیعت پر جبر کر ہی کے لکھا جاتا ہے، جگہ سے حرکت کرنا، اس کا تو یہ حال ہو گیا ہے کہ صبح یا شام مشی کی عادت کم و بیش چالیس سال سے جاری ہے، وہ تو عادت ہی کی بدولت چلی جاتی ہے، باقی کسی سے ملنے یا کسی اور کام سے کہین جانا ہوتا ہے تو دونون ہفتون، اور بارہا مہینون ٹالتا رہتا ہون، اس ناکارہ کا تو ذکر ہی کیا، سید صاحب کی طرح بعض دوسرے اکابر علم و قلم کا بھی

یہی حال دیکھا سنا، مولانا عبد الحمید فراہی رحمۃ اللہ علیہ جید عالم اور اپنے رنگ کے یگانہ مفسر ہی نہ تھے، بڑے صاحب تقویٰ و تقدس بزرگ تھے، اُن کے چھوٹے بھائی نے خود اپنی اور مولانا ممدوح کی اس "پوتینی" کی بڑی دلچسپ اور مزہ دار توجیہ سنائی، کہ ہم دونوں بھائیوں کے دو اصول ہیں، ایک کا یہ کہ جو کام کل ہو سکے، آج نہ کرو، اور دوسرے کا یہ کہ جو دوسرے سے ہو سکے، خود نہ کرو، امزاج کی سنجیدگی بھی کچھ نہ کچھ سست روی کا رنگ اختیار کر لیتی ہے، سید صاحب کی غیر معمولی سنجیدگی اُن کا بڑا نمایاں وصف تھا، جلد بازی سے کسی کام میں بھی ذہن و جسم کسی سے بھی کام لینا گویا جانتے ہی نہ تھے

اسی کی برکت تھی کہ ندوہ میں اعمال کے ساتھ عقائد کی سستی کا جب ایک تیز سیلاب آیا، تو سید صاحب اپنی جگہ سے اس سیلاب کی عین زد میں ہو کر بھی زیادہ نہ ہلے، راقم ہذا "روشن خیالی" میں اپنے کو اُن سے بہت آگے پاتا، نقل کی کوئی بات عقل کی کسوٹی پر پوری اترے بغیر مان لینا بڑی بے عقلی جانتا تھا، پھر بھی سید صاحب کے علم و عقل کا اتنا قائل تھا کہ اپنے شکوک و شبہات اُن ہی کے سامنے زیادہ پیش کرتا، ایک مرتبہ جبر و قدر کے متعلق اچھی طرح یاد آتے کہ اُن کی تفہیم و توجیہ سے خوب تشفی ہو گئی، اگو بعد میں شرح صدر الحمد للہ کہ خود کتاب اللہ سے نصیب ہوا، کہنا یہ ہے کہ سید صاحب خصوصاً ندوہ کے دور "روشن خیالی و عقل پرستی" میں بھی "عقل پرست" کبھی نہیں ہوئے،

نقد ہر سود در جیب زیان انداختہ" گو عقائد و ایمانیات کی سستی و کمزوری سے بڑھ کر کوئی ضرر و زیان نہیں تاہم ندوہ میں علم و قلم کا ذوق و شوق اور دور دورہ اسی دور کی یادگار ہے، اس ذوق شوق کی بدولت ندوہ کہ دینداری کے جذبہ سے اخلاقی مفاسد کا زور بھی کم ہوا، جس میں کچھ بھی صلاحیت ہوتی تقریر و تحریر، ادب و انشا، اردو عربی یا دونوں — کے میدان میں اتر پڑتا، بعض غریب صلاحیت و عقل دونوں سے کورے کچھ نہیں تو نخاس سے ٹوٹی پھوٹی میز کرسی خرید کر روزانہ قلم کاغذ لے کر بیٹھ ضرور جاتے، اور بوزنہ صفت نقالی ہی سے اپنی تشفی کرتے، زیادہ چلن تاریخ اور ادب کا تھا، دونوں کی صلاحیت و مناسبت سے قطعاً محروم ہونے کے باوجود کھینچا نہ جا کر ابن خلدون و ابن خلکان خود میں بھی بوزنہ وار ہی دیکھا کرتا، عربی میں زبردستی مقرر بننے میں اتنی کامیابی حاصل کی کہ ایک دن استاد محترم (علامہ نعمانی) نے خود اپنے سامنے تقریر کرائی، اور پسند فرمائی، تقریر کا موضوع بھی عجیب

وغریب — اب بالکل سمجھ مین نہین آتا، کہ کیون، — میونسپلٹی اختیار کیا تھا، مگر صلاحیت کے خلاف زبردستی کے دن چل سکتی تھی، نہ مورخ بن سکا، نہ ادیب نہ مقرر، نہ عربی کا نہ اردو کا، طبیعت کو نسبۃً عقلیات سے کچھ لگاؤ پایا، وہ بھی زیادہ عقلیات جدیدہ سے، جس کی شُدبُد عربی رسائل خصوصاً المقتطف — سے شروع ہوئی، دینی مذہب کا جوڑ عقلیات مین کلامیات سے زیادہ لگتا ہے، اور جس طرح الفاروق، المامون کا مصنف تاریخ پسندون کا آئیڈیل بنا، اسی طرح الکلام، اور علم الکلام کا مصنف، اس عقل کے دیوانہ کا بن گیا تھا،

ہمارے سیدالعلم کی قلمرو سے ماشاءاللہ کلامیات و عقلیات کی اقلیم بھی باہر نہ تھی، ضابطہ کا شاگرد تو یون بھی اُن کا ہو چکا تھا کہ استاذ مقرر ہونے پر میری جماعت کا بھی ایک سبق اُن سے متعلق تھا، غالباً ادب کی کسی کتاب کا، ساتھ ہی اس زمانہ مین جب وہ مدرسہ سے باہر مع اہل وعیال ایک چھوٹے سے مکان (موجودہ مرکز دعوت و تبلیغ کے قریب) قیام فرما تھے، تو میری حاضریان زیادہ ہونے لگی تھین، ان حاضریون مین کس نوع کا استفادہ زیادہ کرتا تھا، یہ بالکل یاد نہین، اپنی اُس وقت کی طلب و ذوق کو دیکھتے قرین قیاس یہی ہے کہ کلامی و عقلی چیزون مین زیادہ مستفید ہوتا ہون گا،

ندوہ کی تاریخ کا یہی وہ دور ہے جس مین ایک طرف علامہ نعمانی جیسے صاحب علم و قلم کی تربیت مین ہونے والے "علامہ ندوی" کے علم و قلم کے دبی ڈھکی جوہر روز بروز کھل رہے تھے، اور دوسری طرف حرف شناس راقم ہذا کی نیازمندیان بھی اسی زمانہ سے سید صاحب کی خدمت مین بڑھین،

اس عہد مین مرحوم سے متعلق دہرانے والا وہی سبق برابر ملتا رہا کہ ذہنی و وہبی صلاحیتون والے اور وہ بھی ندوہ مین اُن کے برابر کے یا بڑھے ہوئے موجود تھے لیکن کسب، طلب، اخذ و استفادہ کی دھن اور لگن مین ان کا ہمسر کوئی معلوم نہین، جب اُن کے قیام گاہ کے چھوٹے سے بیرونی کمرہ مین حاضر ہوتا، فرش پر لیٹے بیٹھے کتاب یا قلم ہی سے مشغول پاتا، یا کبھی کبھی کسی بچہ کے ساتھ پدری شفقت کا حق ادا کرنے مین، شبلوی مجالس مین اور بھی بہت سے طلبہ و اساتذہ ہوتے تھے، لیکن سید صاحب کا شاید ہی کسی مجبوری مین کوئی دن ناغہ جاتا ہوگا

اور خاص طور پر عام مجلس کے علاوہ اپنے مضامین کی اصلاح وغیرہ کے سلسلہ مین دوسرے خاص اوقات مین بھی سب سے زیادہ حاضر ہونے والون مین وہی تھے،

---

ملک مین چھوٹی بڑی سیکڑون دینی درسگاہون کے ہوتے ندوہ نے ایک نیا دارالعلوم قائم کرکے دینی تعلیم وتربیت کے جن نئے مقاصد کا بیڑا اٹھایا تھا، ان مین سب سے نمایان وقت کا ایک اہم دینی مطالبہ ایسے علما کا پیدا کرنا تھا، جو عصری تقاضون اور علوم وفنون سے آگاہ ہون، اور اُن کے مقابلہ مین دین کی علمی وعملی خدمات کا حق ادا کر سکین، اس مقصد عظیم خصوصاً جدید علوم وفنون کی تعلیم کے لئے جیسا سامان وسرمایہ درکار تھا، ندوہ کو کبھی میسر نہ آیا، بے سروسامانی کے دیکھتے اپنے طلبہ مین نفس مقصد کی روح پھونکنے مین جتنی کامیابی حاصل کی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ظاہری ساز وسامان بھی اگر کسی معتدبہ درجہ مین فراہم ہوتا، تو اسلامی نقطۂ نظر سے دینی ہی نہین، دنیوی یا سیاسی وقومی قیادت کا مرکز ہندوستان کیا شاید سارے عالم اسلامی کا آج ندوہ ہی ہوتا،

پھر بھی بہت سے ندویون نے اس روح سے جو نک کر ذاتی شوق وشغف اور کوششون سے جس حد تک ندوہ کے مقصد کو پورا کر سکتے تھے کیا، اور جماعتی حیثیت سے ندوی قلم نے جدید طبقات مین جو اعتبار پیدا کیا، اور کم وکیف دونون طرح جو خدمات انجام دین کسی دوسرے مدرسہ وادارہ مین اس کی مثالین شاذونادر افراد ہی تک ملتی ہین، وہ بھی اعتراف کرنا چاہئے کہ ندوہ ہی کی آواز بازگشت ہے، دارالمصنفین جیسے ایک مستقل ومستند تصنیفی ادارہ اور تربیت گاہ کو ندویون ہی نے وجود بخشا، اور کون نہین جانتا کہ اس وجود کا آغاز وانجام سید صاحب ہی کی ذات تھی، نری کتب فروشی یا کتب سازی کے علاوہ اب خالص تحقیقی وتصنیفی ذوق یا اُس کی تربیت وتعلیم کے جو کچھ بچے کھچے آثار رہ گئے ہون، اُن کو اسی ذات والاصفات کے باقیات صالحات مین شمار کرنا چاہئے،

راقم سطور نے کسی کتاب کے دیباچہ یا مقدمہ مین مرحوم کے اس مرتبہ ومقام کے مد نظر اُن کو دارالمصنفین کا "سید الطائفہ"[1] لکھا تھا، لیکن آج جب ماضی ومستقبل کی طرف نگاہ جاتی ہے، تو اُن کی ہستی دارالمصنفین ہی نہین ندوہ

---

[1] (ملاحظہ ہو صفحہ آیندہ)

اور ندویت کی پوری ۹۰ سالہ تحریک و تاریخ کی سید الطائفہ نظر آتی ہے، ماضی مین تو ظاہر ہے کہ "ندویت" کے نام و کام مین اس مقام تک رسائی کسی نے نہین پائی مستقبل مین بھی امید بخش آثار و علائم نہین، زبانِ خلق کا "خدائی نقارہ" ہی معلوم ہوتا ہے کہ مطلق "علامہ ندوی" یا "مولانا ندوی" سے **ندویت** کا یہ فرد فرید "سید الطائفہ" مراد و مفہوم ہوتا رہے گا، بظاہر آیندہ ندوہ مین "سلیمان" کے نقش ثانی کے اُبھرنے کی توقع نہین[۱]، والغیب عند اللہ

اسلام کی علمی و قلمی خدمات کا سب سے عظیم الشان و عالی مقام کارنامہ سید صاحب کا بالکل بجا طور پر سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قرار دیا جاتا ہے لیکن حضور کی سیرت کیا خود حضور کے دشمنون نے بزعم خود بڑی سے بڑی داد تحقیق کے ساتھ نہین لکھی، دشمنون کو جانے دیجئے، دوستون یا مسلمانون کے متعلق سوال ہے کہ دین کی کوئی چھوٹی بڑی خدمت اگر دل کے اخلاص اور ایمان کے قلبی داعیات و محرکات کے ساتھ انجام نہ دی گئی ہو، تو اسلام کے ترازو مین اس کا کیا وزن ہوگا؟ وہان تو ہر چھوٹے بڑے عمل کی قیمت اُسی حساب سے لگے گی جس حساب سے وہ کفر و شرک ہی نہین، ریا و نفاق، مال و دولت، جاہ و شہرت کی گندگیون اور آلایشون سے پاک دل و دماغ سے کیا گیا ہوگا، خود اسلام کی کتاب نے حصر کے ساتھ اسی کا تو مطالبہ کیا، ہی کہ اللہ تعالیٰ کے ہان قبول صرف

(حاشیہ ص گزشتہ) [۱] لطیفہ یاد آگیا، دار المصنفین کی کسی صحبت مین "سید الطائفہ" کے جوڑ پر مولانا مسعود علی صاحب کے لئے "شیخ الطائفہ" کا خطاب تجویز ہوا تو قدرۃً "ایک تیسرے رکن رکین کے لئے اس وزن کی فکر ہوئی، مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "مطلق طائفہ"!

[۱] مولانا علی میان سلمہ کی غیر معمولی للّٰہیت کی بدولت دار العلوم (ندوہ) ان کے خاص رنگ و حال کے ایک "دار المبلغین" مین تبدیل ہو رہا ہے، اور تبلیغ کی خدمت بجائے خود دین کی ساری علمی و عملی خدمات کا مرکزی مقصد ہی نہین بلکہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا واحد مقصد ہے، اور ندوہ کے خاص مقصد کے لئے اگر ایک ادارہ کی ضرورت ہی تو اس کے لئے سیکڑون کی تاہم اگر ندوہ کی خصوصی تحریک بھی وقت کی کوئی قابل لحاظ دینی خدمت تھی یا ہے، تو دونون ایک ہی مرکز مین مخلوط کر دینے سے طلبہ و اساتذہ سب مین ایک ذہنی خلط و انتشار زیادہ مشاہدہ مین آرہا ہے والعلم عند اللہ

اس کو نصیب ہوگا، جو اس کی رضا و جزا یا آخرت کی فوز و فلاح کے سوا نام و نمود و مال و منال وغیرہ تمام ناپاکیوں سے پاک و صاف دل لے کر حاضر ہوگا، اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ۔

تصوف کے نام کو بہت سے اچھے خاصے اہل علم افراد و جماعتوں نے محض کسی خاص تعصب و توہم یا فرط خشکی و تصلب کی بنا پر اپنی جرح بنالی ہے، "ندویت" بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، حالانکہ تصوف کے اسم و عنوان کا مسمیٰ و معنون قلب کو "قلب سلیم" بنانے یعنی اُس کی صحت و سلامتی یا باطنی رذائل سے صفائی کے سوا کیا ہے، قلب کے اسی تصفیہ و تزکیہ سے تقویٰ کی زندگی اور اللہ تعالیٰ سے احسانی نسبت پیدا ہوجاتی ہے، جب تک قلب دنیا کی ہوا و ہوس کا بت خانہ بنا ہوا ہے، اس وقت تک، سچ یہ ہے کہ کفر و شرک ہی نے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا، اخلاقی و باطنی رذائل اکثر کفر و شرک ہی کے چھپے ہوئے شعبے ہوتے ہیں، آخر خود قرآن ہی نے "ھوا" کو بھی "الٰہ" یا معبود کہا ہے، مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ — تو ہوا پرستی کے ساتھ خدا پرستی کیسے جمع ہوسکتی ہے، اگر ریا و نفاق کا روزہ نماز، روزہ نماز ہی نہیں تو تحریر و تقریر، تالیف و تصنیف کی نام نہاد دینی خدمات کی تہ میں بھی خدانخواستہ جاہ و جلال یا نفس و نفسانیت کے جذبات شریک ہوں، تو خدا و رسول کی راہ میں یہ شرک کے سوا کیا ہوگا؟

دین کے معروف و مسلم خدمت گذاروں تک کو دیکھا جاتا ہے کہ جب اُن کا قلم کسی مسئلہ و معاملہ میں ایک دوسرے کی تردید و تنقید پر چلتا ہے، تو شاید ہی کوئی قلم باہمی بغض و حسد میں تنقیص و تحقیر کی ذاتیات تک نہ اتر آتا ہو، بلکہ اس نمک مرچ کے بغیر قلم میں زور ہی نہیں آتا، حال ہی میں دیکھا کہ ایک دینی ہی جماعت کی کسی کتاب میں دوسری جماعت کی خدمات کا ذکر و اعتراف نہ تھا، اس پر قلم میدان میں آگیا، کیسی چھوٹی اور اوچھی بات! دور و نزدیک سے بہت سے نئے پرانے اہل قلم کو جاننے پہچاننے کا موقع ملتا رہا، مگر اس طرح کی نفس و نفسانیت کے مظاہر سے پاک ایک مثال بھی ذہن میں نہیں، تھوڑی بہت اگر ہے تو اُنہی کی جنھوں نے ع

"پیش مرد کاملے پامال شو"

کی تھوڑی بہت ہمت پائی، ورنہ عام طور پر تو خالص دینی مقاصد کے نام پر رسالے نکالنے والوں، مضامین لکھنے والوں

اور کتابین تصنیف کرنے والون کے دل مین تو یہ سوال بھی شاید پیدا ہوتا ہوگا کہ کسی خدمت وعمل کے دینی یا مقبول ہونے کی پہلی شرط مقصد و ارادہ یا قلب و نیت کی سلامتی وصحت ہی، صحیح نیت کے بغیر دین کی نگاہ مین کسی عمل کا اعتبار درجہ نہین، انما الاعمال بالنیات" بخاری شریف کی پہلی حدیث ہے،

قلم والون کا بڑا دعویٰ اپنے علم وفہم کا ہوتا ہے لیکن دین کی فہم بھی تقویٰ ہی سے پیدا ہوتی ہے، اور تقویٰ کا سرچشمہ قلب ہی ہے، حضور نے قلب ہی کی طرف اشارہ فرما کر تکرار و اصرار کے ساتھ فرمایا کہ تقویٰ یہان ہے تقویٰ یہان ہی، التقویٰ ھٰھنا التقویٰ ھٰھنا، خود قرآن مجید نے اپنے سے ہدایت یابی کی، وہی صحیح فہم قرآن ہے، شرط پہلے قدم ہی پر جو لگائی وہ نہ علم کا مرد میدان ہونا نہ کتابون کا حامل ہوتا، بلکہ متقی ہونا هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ،

ایک طرف اپنے علم و نظر کی حد تک ایک "اتقی الناس" اور اس کے علم وعمل، فہم و فراست کو سالہا سال دیکھ کر یہ حقیقت دل مین بیٹھ چکی تھی کہ دین خالی کتاب وقلم سے ہرگز نہین پیدا ہوتا، نہ علم مین نہ عمل مین، دوسری طرف اس مرض کا شدید مریض ہون کہ کسی شے یا شخص کی کوئی خرابی وخامی چھوٹی ہو یا بڑی دیکھی نہین جاتی، راستہ مین اگر کوئی نل کھلا اور پانی ضائع ہوتا دیکھتا ہون، تو جب تک اس کو بند نہ کرون، قدم آگے بڑھایا نہین جاتا، تو پھر گھر باہر عزیزون دوستون، ملنے جلنے والون مین دین و دنیا کی کوئی کمی وکوتاہی دیکھ کر کیسے رہا جاسکتا ہے، خود علم و عمل، ظاہر و باطن ہر طرح کے نقائص و ذمائم کا مجسمہ ہون، اور ان کی دینی و دنیوی مضرتون کو دن رات محسوس کرتا رہتا ہون، اسلئے اور بھی ہمدردی کا احساس تیز ہوگیا ہے، بالکل جس طرح دمہ کا کم وبیش چالیس سال سے مریض ہون، اور اس کی تکلیف مین راستہ چلتے بھی کسی کو مبتلا دیکھ لیتا ہون تو یہان تک ہوا کہ گھر لوٹ آیا اور عارضی افاقہ کی جو مشہور و مجرب دوائین ہمیشہ پاس رہتی ہین اسے جاکر پہلے کھلا دیا جب چین پڑا،

اپنا یہ مرض اس لئے عرض کردینے کی ضرورت پڑی کہ سید صاحب کے علمی وقلمی کمالات ہی نہین، بہت سے فطری وہبی اخلاقی وقلبی فضائل کا زندگی کے مختلف حالات ومعاملات مین جو تجربہ سالہا سال ہوتا رہا تھا، ان مین بس ایک ہی آنچ کی کسر نظر آتی کہ کسی مرد کامل صاحب نظر تک پہنچ جائین، ایسے صاحب علم وفضل کے لئے

نظر اشرف "صرف تھانہ بھون میں نظر آئی، اور آخر اپنے اسی مرض "خیر خواہی"[1] سے مضطر ہو کر دھیرے دھیرے ادھر متوجہ کرنا شروع ہی کر دیا، ابتداءً غالباً تھانہ بھون ہی کی کسی حاضری کے دوران میں ہوئی، ذہن میں یہ تقاضا قلب میں تیز ہوجاتا تھا کہ میرے جیسے بے علموں سے زیادہ اور بہت زیادہ یہ آستانہ سید صاحب جیسے اکابر علم وقلم کے استفادہ کا ہے کہ ان کے افادات کا سونا یہاں کی ایک آنچ میں انشاء اللہ کندن ہو جائے گا، الحمد للہ ایسا ہی ہوا،

بہتوں کو حیرانی رہی کہ مرحوم نے ایک ہی جست میں ندوہ "سے" دیوبند "تک کا فاصلہ کیسے طے فرمایا، راز سننے سنانے اور سبق لینے کا ہے، سید صاحب ماشاء اللہ صوفی پیدا ہی ہوئے تھے، خدا رسی سے مانع، کفر کے بعد، بلکہ کفر کی بھی جڑ کبر ہے، ابلیس کو ابلیس اباء واستکبار ہی نے بنایا "اَبیٰ وَ اسْتَکْبَرَ وَکَانَ مِنَ الْکَافِرِیْن، خصوصاً جو کبر علم" اور اس سے بڑھ کر قلم کے زعم سے پیدا ہوتا ہے، اس کے "حجاب اکبر" کی مثالیں ایسی ایسی خود مشاہدہ میں آئیں کہ بس اللہ ایسے علم وقلم سے پناہ میں رکھے، اسی سے سمجھ میں آتا ہے کہ حضرات صوفیہ کے یہاں اس شیطانی خودی وخودرائی کے مٹانے پر اتنا زور کیوں ہے، حضرت حکیم الامت ہی فرمایا کرتے تھے کہ اس راہ کا حاصل بس خود کو مٹا دینا ہے۔ خدا وبندہ کے درمیان سب سے بڑا حجاب "خودی" ہے،

ع تو خود حجاب خودی حافظ از میان برخیز

مرحوم معصوم نہ تھے، لیکن ان کی زندگی کا جو رخ طالب علمی سے لے کر آخر تک کم وبیش ہر فروغ کے سابقہ میں سب سے زیادہ معصوم نظر آیا وہ یہی کہ خودرائی وخودپسندی دور دور نظر نہیں آئی، طالب علمی میں اُن کا شمار ممتاز اور آگے چل کر ممتاز ترین طلبہ میں رہا، لیکن نچے نچے درجہ کے طالب علموں کیا تھ بھی کسی برتاؤ میں کوئی امتیاز ظاہر نہ ہوتا، عام طور پر دوسرے طلبہ ہم چشموں میں کچھ بھی امتیاز رکھتے، تو اس کے دبانہ سکتے، چندہ کے وفدوں میں بارہا ساتھ ہوا، رئیس وفد سید صاحب ہی ہوتے، اگر یاد نہیں کہ کسی موقع پر کسی طور وطریق سے بھی دوسرے رفقا پر اپنا رئیس ہونا ظاہر ہونے دیتے،

---

[1] ظاہر وباطن کے اس سراپا مریض میں اس مرض کی تشخیص بھی حضرت علیہ الرحمۃ ہی کی تھی،

طالب علم سے جب استاد ہوئے تو خود اپنا ایک ایسا تجربہ سناتا ہوں کہ آج بھی اس کی شرم سے گڑ جاتا ہوں، ایک سبق میری جماعت کا بھی اُن سے متعلق ہوا، اب میرا شمار بھی کچھ اچھے طلبہ میں تھا، غالباً اسی کا غرور تھا کہ اس سبق میں جانا چھوڑ دیا کہ کل تک جس سے طالب علمانہ ہمسری کا دعویٰ تھا آج اس کی استادانہ برتری کیسے قبول کروں، سید صاحب اس کم ظرفی کے جواب میں ضابطہ سے کام لیتے تو سزا دلوا سکتے تھے، سرکشی سے باز نہ آتا تو مدرسہ سے نکلوا دیسکتے مگر اُن کی عالی ظرفی نے اس سب کے بجائے کس طرح کہوں کہ کیا کیا، نئے استاد نہیں پرانے طالب علم بھائی بن کر اُلٹے خود ہی سمجھا بجھا کر کسی طرح منا لیا، مرحوم کی شفقت و محبت کا یہ پہلا بیج تھا، جو دل میں پڑا، پھر آخر تک بحمداللہ پھلتا پھولتا ہی رہا، دخل اس میں اُن ہی کی بے نفسی کو زیادہ رہا،

آگے چل کر دار المصنفین اور دار العلوم ندوہ کے جب تک وہ ناظم و معتمد رہے، اور میری رکنیت یا ضابطہ کا کچھ تعلق رہا، ایک موقع بھی خیال میں نہیں کہ اپنے مزاج و مذاق کے خلاف بات کو بھی پوری توجہ سے نہ سنا ہو اور سمجھ میں آتے ہی بے تامل قبول نہ فرما لیا ہو، حالانکہ بعض دوسرے احباب جو ہر طرح مرحوم کے خورد نہیں احقر سے بھی عمر میں بہت کم، اُن کے مقابلہ میں کوئی بات میری ماننا چاہتے، تو دیکھا کہ کبھی کبھی میرے ساتھ اُن کو بھی سختی سے اور بگڑ کر جواب دیتے، بعض بڑے صاحب اور بہت کم عمر دوستوں بلکہ کبھی کے شاگردوں تک کا یہ تجربہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو کوئی علمی و قلمی یا اجتماعی و تحریکی بڑائی عطا فرما دی، تو اپنی رائے و رنگ کے خلاف بات کا قبول کرنا کیا سننا بھی توجہ سے گوارا نہیں کرتے،

## جواب جاہلان باشد خموشی

کا زبان حال سے اعلان کرتے ہیں، باقی اپنی کسی رائے سے خوشدلی سے رجوع کرتے، یا کسی کوتاہی کا برملا اعتراف و اعتذار اس کا تجربہ تو آج کے مشاہیر علم و قلم سے شاذ ہی ہوتا ہے،

لیکن سید صاحب کی روح ایسے مواقع پر کیسی بے چین ہو جاتی تھی، اس زیر تحریر مضمون ہی کے لئے اُن کے کچھ پرانے محفوظ خطوط دیکھنے لگا، اُن میں ایک ایسا "معذرت نامہ" ملا کہ آج اُن کی روح عالم آب و گل میں مل جاتی

تو بے تابانہ قدموں میں گر جانے کا جی چاہتا تھا، غالباً دارالمصنفین ہی کے کسی معاملہ میں میری نسبت کچھ غلط فہمیاں اُن کو پیدا ہو گئیں، اُن سے ایسا متاثر ہوئے کہ خود مدعی علیہ کو صفائی کا موقع دیئے بغیر ایک بڑا طویل شکایات نامہ تحریر فرما دیا، فوری تاثر کے بعد نظر ثانی پر واللہ اعلم کیا محسوس فرمایا، اور کتنے بے قرار ہوئے کہ میرے جواب کا انتظار بھی نہ فرما سکے، "معذرت نامہ" نہیں اُن کی اخلاقی کرامت کا یہ بڑا یادگار "کرامت نامہ" ہے،

"پرسوں ترسوں میں نے آپ کو ایک طویل خط لکھا تھا، مقصود یہ تھا کہ مدت سے میرے دل پر ایک بوجھ تھا، وہ ہلکا ہو جائے، مگر دیکھتا ہوں کہ اس خط کے لکھنے کے بعد دوسرے قسم کا بوجھ پڑھ گیا، میں نے رات اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ میرے دل میں کسی مسلمان کی طرف سے غبار نہ پیدا ہو، بایں ہمہ جو کچھ میں نے لکھا تھا، اس کو ایک راز سربستہ کی طرح دفن فرما دیجئے، اور مجھ معاف کیجئے کہ میں گو اپنے جانتے صرف اخلاص سے اور آئندہ کے لئے حسن معاونت کی خاطر لکھا تھا، مگر میرا دل مجھے ملامت کرتا ہے کہ مجھ سے آخر صبر نہ ہوسکا، اب اس کی تلافی یہی ہے کہ آپ مجھے معاف کر دیں، اور میری اس تحریر کو بھی میرے گذشتہ اعمال بد کا ایک جزو ہی سمجھ لیں، اس وقت مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں، اس وقت کا احساس یہی ہے، کوشش کروں گا، اور اللہ تعالیٰ سے دعا کروں گا کہ میرا یہی احساس قائم رہے"۔

اس "محی آرم اعترافِ گناہ نبودہ" کے بعد بھی "سید القلوب" کو چین نہ آیا، آگے فرماتے ہیں کہ

"میں بے چینی سے آپ کے لطف آمیز و محبت آمیز خط کا انتظار کروں گا، آپ کا یہ بڑا بھائی کم ہمت ہے، اپنی کم ہمتی سے ایسا کر گذرا ہے، اور شاید عمر میں اس کا پہلا قصور ہے، آپ کا بڑا احسان ہوگا، اگر آپ اس تحریر کو نسیاً منسیا سمجھیں،...... آپ کا مجھ پر بڑا کرم ہوگا"۔

اب یاد کیا آسکتا ہے کہ اس سراپا "کرامت نامہ" کا جواب کیا عرض کیا، مگر اپنے نفس کو ٹٹولتا ہوں تو اس کی موٹائی سے خیال یہی ہوتا ہے کہ بہت زور لگانے اور تکلف و تصنع سے کام لینے پر بھی جواب میں ان کی

"بے نفسی" کا مقابلہ ہرگز نہ ہوسکا ہوگا، اپنی نالائقیون اور کوتاہیون کی معافیان اُن سے اور دوسرون سے مانگنے کی توفیق الحمدللہ بارہا ملی، اور ملتی رہتی ہی لیکن شکستگی اور فروتنی کے اس بلند مقام تک رسائی چھوٹون کیا کسی بڑے کے مقابلہ مین بھی یاد نہین، سن و سال، علم و فضل، جاہ و مرتبت ہر لحاظ سے بڑے سے بڑے، اور استاد تک ہو کر اپنے "کم ہمت بڑا بھائی" ہونے کا جس طرح اظہار فرمایا ہے، ذرا کوئی چھوٹا سے چھوٹا بھی یہ ہمت کر کے دیکھے، تو حضرت مرحوم کی قدر و کرامت معلوم ہو!

سید صاحب کی "بے نفسی" کا یہی وہ فطری جوہر تھا جس نے اس راقم "بے بساط" جیسے کی توجہ دلانے پر علم و فضل کی ساری "ندوی" شہرت و عظمت کو ایک "خانقاہ نشین" دیوبندی کے قدمون پر بے تکلف نثار کر دیا، کچھ غیبی کشش پہلے سے بھی تھی جس کا ایک والا نامہ مین اس طرح اظہار فرمایا کہ

> "مولینا گیلانی نے مجھے لکھا ہو کہ سُنا آپنے بھی ایک دیوبندی کے ہاتھ مین ہاتھ دے دیا ہو؟
> مین لکھنے والا تھا کہ ہاتھ گو اب بھی دیا ہو نہ دیا ہو مگر دل تو اس کو دس بارہ برس پہلے دے چکا تھا'
> پھر مجھے فخر یہ ہے کہ آپ لوگون نے مولانا تھانوی کو اپنی طرف کھینچا اور مجھے خود مولانا تھانوی نے بار بار
> اپنی طرف کھینچا۔ (بعالیم ردیا)"

اس بیعت وارادت کی نہ خود حکیم الامت کے ہان کوئی خاص اہمیت تھی، نہ مین نے کبھی "صلاح نیک" کے سلسلہ مین اس کی طرف کوئی اشارہ کیا، اشارہ و تصریح دو ہی باتون کی باربار کرتا رہا، ایک تو یہ کہ فہم دین بھی محض کتابی تعلیم و تعلم سے پیدا نہین ہوتی، دوسرے یہ کہ بظاہر بڑی سے بڑی خدمت دین کا بھی صحیح معنی مین خدمت دین یا عنداللہ مقبول ہونا قلب و نیت کی سلامتی کے بغیر مشتبہ ہی رہتا ہے، اور تزکیہ باطن کی یہ دولت کسی "مزکّی" کی صحبت و تربیت کے بغیر میسر آنا الشاذ کالمعدوم ہے۔

سید صاحب ماشاء اللہ علمی و نظری طور پر اس حقیقت کی تصریح و تفصیل کے محتاج نہ تھے، منقولہ بالا والانامہ ہی مین ہے کہ

"مین آپ کا ممنون ہون کہ مجھے ہر وقت صلاحِ نیک دیتے رہے، آخر وہ وقت آیا کہ دس بارہ برس سے جو چیز نظری طور سے سمجھ میں نہ آتی تھی، وہ عملاً سمجھ مین آگئی، اور اب تلافی مافات مین مصروف ہون، لعل اللّٰہ یرزقنی صلاحاً"

اس دوراز صلاح کی "صلاح نیک" کا تعلق زیادہ تر عملی قدم اٹھانے ہی کی طرف ملتفت کرنے سے رہا تھا تھانہ بھون کے دوران حاضری مین قدرۃً اس کا خیال زیادہ ہوتا، جولائی و اگست ۱۹۴۳ء کی حاضری مین کچھ طویل قیام کی سعادت حاصل تھی، تو ذرا کھل کر اور اصرار سے لکھا کہ بس اب میری اس حاضری کے زمانہ مین ہمت فرما کر آہی جائین، اصرار کی وجہ خصوصیت کے ساتھ یہ تھی کہ حضرت علیہ الرحمۃ کا سلسلۂ علالت طول پکڑتا جارہا تھا، ڈر تھا کہ کہین یہ آفتابِ ارشاد و تربیت لبِ بام نہو، مقامی اور برانے علاج اور معالجون سے کوئی نمایان نفع نہ ہو رہا تھا، بالآخر علاج کی غرض سے لکھنؤ آنا طے پایا، ۱۰ر اگست کو تھانہ بھون سے روانہ ہو کر رات کو سہارنپور مین قیام فرمایا، اور دوسرے دن لکھنؤ تشریف فرما ہو گئے، زندگی مین پہلی اور آخری دفعہ ریل کے ایک ہی ڈبہ بلکہ ایک ہی بنچ پر معیت سفر کی سعادت بھی نصیب ہوگئی، آدابِ نو کے کتنے اور کیسے کیسے سبق ملے!

سید صاحب کی خدمت مین اس دفعہ میرا عریضہ خاص طور پر تفصیل و اصرار کا ضرور تھا، پھر بھی قبول کی امید کم تھی، لیکن قلوب جس کے ہاتھ مین ہین، اس کو پلٹتے کیا دیر لگتی ہے، تھانہ بھون پہونچ ہی گئے، البتہ ایک دن بعد ذوقِ طلب کو کچھ اور تیز ہونا تھا،

وعدۂ وصل چون شود نزدیک آتشِ عشق تیز تر گردد

میرے عریضہ کا جواب بھی تھانہ بھون ہوتا ہوا لکھنؤ مین ملا کہ

"لفافہ ملا۔ مین آپ کے حرف حرف سے متفق ہون، کل صبح انشاء اللہ علی گڈھ کے لئے روانہ ہوتا ہون، خوشی ہوئی کہ آپ ۲۵ر اگست تک وہان (تھانہ بھون) مین ہین گے، مین انشاء اللہ شاہدرہ لائن ریلوے سے ۱۱ر اگست کی شام کو پہنچتا ہون، دو روز ٹھہرونگا اور بقدر ظرف فائدہ

اٹھاؤں گا"

تھانہ بھون میں "مطلوب" کو نہ پاکر سیدھے لکھنؤ کی راہ لی، ایک ہی آنچ کی تو کسر تھی، چار ہی دن میں رُخ پلٹ گیا، واپسی پر تحریر فرمایا کہ

"لکھنؤ میں چار ہی روز صحبت رہی، مگر مولٰنا کی شفقت میری عقیدت کو بڑھاتی رہی، اور آخر اُن کی ہدایت کے بموجب، اور آپ کا مشورہ تو پہلے سے یہی تھا، باب مکاتبت وا ہے، اور اب تو وہی وہ ہیں،

ع آتے ہیں نگاہوں میں خیالوں میں دلوں میں

معاینہ سے بڑھ کر تصور میں مکالمہ تک نوبت آتی ہے،

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

"بہرحال اب اپنی طرف سے سفر شروع کر دیا ہے، منزل پر پہنچانا جس کا کام ہے وہ پہنچائے گا دعا کیجئے ......"

مولانا کے مواعظ ورسائل پڑھتا ہوں، اکثر علمی مسائل بھی اپنے ہی مذاق کے مطابق پائے،" "احوال وکیفیات میں اُن سے نئی نئی گرہیں کھلتی ہیں، افسوس کہ اتنے دنوں کیوں غافل ومحروم رہا" زیادہ تر یہی افسوس راقم کو بھی اپنے خوردانہ حدود سے تجاوز کر کے بار بار عرض واصرار کا باعث ہوتا رہا، یہ بے علم وعمل نامہ سیاہ جو ہر تنکے کا سہارا ڈھونڈھتا ہے، اپنے حق میں اس کو رحمتِ حق کا ایک بڑا سہارا جانتا ہے کہ حضرت مرحوم کی زندگی بھر کی خدمات علم وعمل کو مقبول ومقبول تر بنانے والا انشاء اللہ اُن کی زندگی کے قلبی انقلاب کا یہی آخری دور یا حسن خاتم ثابت ہوگا،

صد کتاب و صد ورق در نار کن — جان و دل را جانب دلدار کن

کے عالم میں ایک اور مکتوب میں فرماتے ہیں،

"برادر مکرم! میری عمر اب ساٹھ کے قریب آگئی، میں دنیا کو نہ چھوڑوں، دنیا خود مجھے چھوڑ رہی ہے، اب نہ دارالمصنفین سے زیادہ دلچسپی ہے نہ ندوہ سے اور نہ علمی مقالات و تصانیف سے، چونکہ میری روزی قلم سے وابستہ ہے، اور گھر میں اثاثہ بھی نہیں، اس لئے ناچار پڑا پھرتا ہوں، خدا تعالیٰ ہمت دے کہ ترک تعلق کر سکوں، آپ بھی میرے لئے دعا فرمائیں"

دارالمصنفین میں تو فکر لوگوں کو اب خالی مصنف بنانے کی ہیں، احقر کی اس بارے میں ایک درخواست کے جواب میں ارقام ہوا کہ

"میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ رفقا میں وہ فضا پیدا ہو جس کی تمنا آپ کو ہے، مگر ظاہر ہے کہ مجھی میں کیا ہے، جو دوسروں پر اثر ہو حضرت کی باتیں اُن کو سناتا ہوں، اور اُن کی تصنیفات کی طرف متوجہ کرتا ہوں"

ہر بہانہ سے حضرت علیہ الرحمۃ کی کتابوں کی طرف رفقاء کو مائل فرمانا چاہتے ہیں، ایک ذرا آزاد مزاج رفیق قدیم کا ذوق حضرت کی ادبیت کا ذائقہ چکھا کر اس طرح بدلنا چاہتے ہیں کہ اب وہ ادبیت کی تلاش میں اُن (حضرت) کی تصنیفات پڑھیں گے، اور ممکن نہیں کہ یہ بالواسطہ مطالعہ اُن کے دل کے اندر گھر نہ کر لے گا کیسے درد دل کی آواز ہے!

"برادرم! صمیم قلب سے دعا کیجئے کہ دارالمصنفین کی یہ چھوٹی سی برادری صراط مستقیم کو پا کر اس پر قائم رہے، اور ہم لوگوں کی عمر بھر کی محنت ہمارے لئے وبال آخرت بننے کے بجائے باعث برکات و خیرات ہو"!

"یہ چھوٹی سی برادری" حضرت مرحوم کی پوری وفاداری کا حق جب ہی ادا کر سکتی ہے کہ اُن کی سب سے بڑی زندہ یادگار دارالمصنفین میں ایمان و اخلاص کی وہی روح اپنے تمام تر تعلقات اور ادارہ کی خدمات میں پیدا کرے جس کے خود حضرت مرحوم اپنے وہاں کے آخری دور قیام میں ساعی و متمنی تھے، قلب و باطن کی صلاح و سلامتی کی روح کے بغیر جب خالص دینی اعمال تک جاہ و مال، ریا و نفاق وغیرہ سے آلودہ ہو کر خالص دنیا طلبی سے زیادہ ناپاک ہو جاتے ہیں، تو پھر علم و قلم کی بظاہر اونچی سے اونچی خدمات بھی اس روح کے بغیر محض دین کی چھاپ لگا دینے سے "وبال آخرت" کے سوا کیا بن سکتی ہیں،

اعاذنا اللہ منہ،

الحمد للہ کہ سید صاحب رحمہ اللہ کے اس انقلاب حال کی برکت سے دارالمصنفین کے بہت سے حضرات نظری طور پر قلب و قالب دونوں کی صلاح و فلاح کی اہمیت سے خوب آشنا ہو چکے ہیں، لیکن عملی طور پر نفس و شیطان سے زندگی کی آخری سانس تک بھی مامون و مطمئن نہ ہونا چاہیے، یہ غفلت انتہائی ہلاکت تک پہنچا دے سکتی ہے، ہر عمل و حرکت میں قلب کی نگرانی مرتے دم تک جاری رہنا ضروری ہے، پھر علم و قلم کی خدمت تالیف و تصنیف سے لے کر طباعت و اشاعت تک کے ہر چھوٹے بڑے خادم کے لئے "وبال آخرت" کے بجائے انشاء اللہ تمام تر "باعث خیر و برکت" ہی ہوگی، اور خود حضرت مرحوم کی ایسی خیر جاری یادگار جو اُن کی روح کے لئے ابدی سرور و سکون کا سرمایہ ہوگی،

سید صاحب "نسبی سید" ہی نہیں ماشاء اللہ بڑے "باطنی سعید" تھے، بظاہر اُن کی روزی "قلم سے وابستہ" ضرور رہی تاہم انھوں نے خالص روزگار بنا کر قلم شاید ہی کبھی چلایا ہو، باطنی سعادت ہی کی بدولت علمی کبر و غرور کا بھی کوئی شائبہ اُن میں مشکل ہی سے نظر آتا تھا، انتہا یہ کہ راقم الحروف کی علمی خصوصاً علوم دین کی بے بضاعتی سے ناواقف نہ تھے، پھر فن سیرت میں کسی فنی و علمی بصیرت سے اور بھی محروم ہی رہا، چہ جائیکہ خود سید صاحب جیسے اس فن کے مسلّم ماہر و محقق کے سامنے، مگر سیرت کی پانچویں جلد نکلنے پر خصوصیت کے ساتھ کیا تحریر فرمایا کہ

"آپنے سیرت کی پانچویں جلد پڑھی بھی، آپ لوگوں سے اس لئے نہیں پوچھتا کہ تحسین مقصود ہے،
بلکہ اس لئے کہ میں محسوس کروں کہ غلط نہیں چل رہا ہوں، سہارا چاہتا ہوں، تعریف نہیں"،

جب تھانوی علم و عمل کی روشنی میں اس بے علم و عمل کی آنکھوں پر سے بھی "جہل مرکب" کے کچھ پردے ہٹے تو نہ صرف ظاہری و باطنی گوناگوں علمی و اخلاقی بیماریاں علاج طلب نظر آئیں، بلکہ "ندویت" اور "روشن خیالی" کے عہد کا ایمانی و اعتقادی اضمحلال بھی سامنے آیا، تو بعض ایسی تحریریں جن کا تعلق کچھ دینی مباحث سے تھا، حضرت علیہ الرحمۃ کی خدمت میں اس درخواست کے ساتھ خود ہی پیش کر دیں کہ ضلال و اضلال دونوں کی ممکن تلافی و تدارک کی ہدایت فرمائی جائے، سیرت ہی کی تیسری جلد میں معجزات پر میرا ایک مضمون شریک تھا، جس میں کوئی بات حضرت کو اصلاح و رجوع کی نظر آئی،

اور اس کے اعلان کا ایما فرمایا، میرے نفس نے تو خود الحمدللہ مطلق کشمکش نہین کی، اور معارف مین اشاعت کے لئے سید صاحب کو ایک تحریر بھیج دی،

وہی ایک آنچ کی کسر اپنی اس علمی بےنفسی کے باوجود جس کا اپنا ہی تجربہ ابھی اوپر ہی عرض کر چکا ہون، اس کے شائع کرنے مین لیت و لعل فرماتے رہے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دار المصنفین خصوصاً سیرت کے علمی و تصنیفی وقار کا اس مین استخفاف محسوس فرما رہے ہین، بالآخر میرے اصرار پہ فرمایا کہ ایسا ہی ہے، تو دوسرے اڈیشن مین نظر ثانی کر لینا مین نے عرض کیا کہ اس کی نوبت خدا جانے کب آئے، اور حضرت کا منشا فوری اصلاح و اعلان کا معلوم ہوتا ہے، تب بادلِ ناخواستہ وہ بھی میری خاطر سے شائع فرمایا،

حضرت کے ہان اہلِ قلم کا یہ ایک بڑا امتحان ہوا کرتا تھا کہ اپنی قلمی غلطیون یا لغزشون کے اظہار مین نام نہاد علمی وقار شان تو مانع نہین ہوتی، نیز شیخ کے مقابلہ مین، اپنی رائے کے فنا کرنے پر کہان تک آمادگی ہے آج کل کلام مجید کی تحریفی تفسیرون کی جیسی گرم بازاری ہے، خصوصاً سیاست اور معاشیات کے مسائل مین، ایک ایسے ہی شیخ التفسیر اور تفسیری مصنف جو اپنی تربیت و اصلاح کے لئے مکاتبت شروع بھی کر چکے تھے، اس امتحان ہی کے سلسلہ مین نکل بھاگے، عام طور پر تو فنا کو آخر مقام کہا جاتا ہے لیکن حکیم الامت کی حکیمانہ رائے مین فنا ہی اول مقام تھا، اور تائید مین عارف روم کا یہ شعر پڑھا کرتے،

ہیچ کس را تا نہ گردد او فنا　　　　نیست رہ در بارگاہِ کبریا

کوئی عقلمند مریض طبیب معالج کی تشخیص و تجویز کے مقابلہ مین اپنی رائے لگانا اور چلانا چاہے تو اس کا علاج شروع ہی کیسے ہو سکتا ہے، اور "آخر مقام فنا" ہونے کی حکیمانہ توجیہ یہ فرماتے تھے، کہ اس سے مراد باطنی امراض کا فنا ہونا ہے کہ وہ علاج کے بعد آخر ہی مین فنا ہوتے ہین، بہرحال حضرت کے ہان اس راہ مین مجنون ہونا شرطِ اول قدم تھا،

سید صاحب ایک تو فطری طور پر خودرائی سے بہت دُور تھے، دوسرے اس حقیقت کو خوب سمجھ لیا تھا کہ

شیخ کا مقام نبی کے "وارث" و "قائم مقام" کا ہے، گو وہ نبی کی طرح معصوم نہیں ہوتا، تاہم اگر علم و عمل، زہد و تقویٰ، فہم و فراست، خوف و خشیت میں اس کا درجہ طالب سے بلند اور بہت بلند ہے، تو لازماً طالب کے مقابلہ میں خطا و لغزش سے محفوظ بھی زیادہ اور بہت زیادہ ہوگا،

جب کسی کو ہم نے اپنے سے اعلم اور اتقیٰ و اصلح جان اور مان لیا، تو پھر اس کی رائے کو اس وقت تک نہ ماننا جب تک خود ہماری رائے کے موافق نہ ہو خود اپنی ہی رائے پر اصرار کے سوا کیا ہے، اسی کا نام خود رائی ہے، ورنہ پھر مذموم "خود رائی" کا مصداق ہی کیا رہتا ہے، حضرت کے نزدیک تو اس خود رائی کا "رائی بھر" بھی باقی رہنا راہ کا پہاڑ تھا، پھر دین کے مسائل و معاملات کا تعلق تو بواسطہ یا بلا واسطہ تمام تر عالم غیب کے غیبیات سے ہے، دنیا کے معاملات جن کا تعلق اسی عالم شہادت کے مشاہدات و تجربات سے ہے، ان میں بھی اگر زیادہ علم و بصیرت والے کے مقابلہ میں آدمی کو اپنی ہی رائے پر اڑا رہنے کا حق دے دیا جائے، تو عملاً زندگی کا سارا کارخانہ معطل اور نظم و ضبط درہم برہم ہو کر رہ جائے،

اس ذرا طویل جملہ معترضہ کا مدعا یہ ہے کہ سید صاحب رحمۃ اللہ میں قلب و باطن کے تزکیہ و ترقی کا بڑا قیمتی فطری جوہر ان کی یہی خوبی یہی تھی کہ بڑوں کیا چھوٹوں کی بات کو بھی قبول کرنے کی آمادگی میں جتنا ان کے ظرف کو عالی پایا، اتنا کم ہی کسی کے ظرف کو پایا، بڑی حد تک اسی استعدادی کمال نے ان کو کہنا چاہئے کہ مرید ہوتے ہی پیر بنا دیا، اجازت و خلافت کے لئے ان کے پیر کا مسلک یہ تھا کہ خاص صورتوں میں بالفعل کمال کے بجائے متوقع کمال یا قوی استعداد ہی کو کافی تصور فرماتے تھے، اس راہ میں قدم رکھتے ہی حضرت مرحوم جو اس تیزی سے چل پڑے، اس کا بڑا راز یہی تھا کہ شیخ کے مقابلہ میں ان کو خود رائی یا انانیت کی ایک ٹھوکر بھی شاید ہی لگی ہو،

اندازہ فرمائیے کہ کہاں تو سیرت میں خاکسار کے صرف ایک ضمنی باب کی صرف چند سطروں کے رد و بدل و ترمیم و تصحیح میں جھجک تھی، اور کہاں مرشد تھانوی تک پہنچتے ہی ایسے بدلے کہ حضرت کے اشارہ ہی سے اپنی

تصنیفات کے ہزاروں صفحات کی نظرثانی پر تل گئے، ۱۱ رمضان المبارک ۶۳ھ کے والانامہ میں فرماتے ہیں،

"ادھر جب سے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کا ایما ہوا تھا جس سے متعلق اشعار معارف میں چھاپ دیئے ہیں یہ خیال غالب رہا ہو کہ اپنی تصنیفات پر نظرثانی کرکے رکھ جاؤں، پھر جب چھپیں، چنانچہ سیرت جلد اوّل پر نظرثانی آدھی سے زیادہ ہوگئی ہے اور وہ چھپ بھی رہی ہے"،

اس سے بڑھ کر یہ کہ سیرت کا وہی حصہ جس کی چند سطروں کے تغیر و تبدل میں تامل تھا، اب اس گرامی نامہ میں اس کی نظرثانی کی کتنی تاکید پر تاکید ہے اور کیوں نہ ہو کہ اب تقویٰ کی نظر مصنف اور امت دونوں کی آخرت پر ہے!

"اسی سلسلہ میں سیرت کی تیسری جلد معجزات والی بھی آتی ہے، اس میں جو حصہ آپ کا ہے اس کو آپ کے پاس بھیجتا ہوں، زبانی بھی کہہ چکا ہوں ............ آپ مہربانی فرماکر اس پر نظر ثانی فرماکر بھیج دیں، لیت و لعل یا حوالہ غفلت نہ کریں"،

آگے یاد رکھنے کی بات اس غفلت سے بچانے کی وجہ ہے کہ "اس میں آپ کا فائدہ ہے، اور امت کا بھی" وہی آخرت پر نظر کہ مصنف خدانخواستہ اپنے اور امت کے ضلال و اضلال کا باعث نہ بنا رہے،

یہ امت کے سید المصنفین کی خاص تصنیفی و علمی کایا پلٹ کی ایک جھلک تھی، کچھ عام قلبی انقلاب کا بھی نظارہ ہو جائے

---

۱؎ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ "مرشد کے ارشاد سے برملا بہت سے معتقدات سے رجوع کیا، اور ایسی خود سپردگی سے کیا کہ سنا جاتا ہے حضرت تھانوی سید صاحب کے اس والہانہ انداز عقیدت پر وجد کیا کرتے تھے"،

یہ شہادت صاحب "برہان" مولانا عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی مہتمم نے تازہ برہان (رجب ۶۳ھ) میں ادا فرمائی، "راقم ہذا کے علم میں نہ تھی"، آگے مولف سلمہ خود اپنی نسبت لکھتے ہیں کہ "حضرت سید صاحب کی جگہ میں ہوتا تو شاید اتنے بڑے ایثار کے لئے تیار نہ ہوتا" وہ کیا کسی کے لئے بھی اپنے زعم علم سے ایسی دست برداری آسان نہیں! اسی سے تو مرشد تھانوی کے ہاں اس کی اتنی قدر و قیمت تھی!

باطنی انقلاب نمایشی نہیں ہوا کرتا، اس کا اثر سب سے زیادہ ذاتی و خانگی زندگی پر پڑا کرتا ہے، ..... اچھے اچھے خاندانی علما و مشائخ کو دیکھا کہ اپنی اولاد کے معاملات میں دنیا کے سامنے دین کو بے تکلف نظرانداز کر جاتے ہیں، لڑکی لڑکوں کا رشتہ تلاش کرنے میں بھی نظر دین سے زیادہ کیا کہنا چاہئے کہ تمام تر دنیا ہی پر رہتی ہے لیکن حضرت مرحوم کا دل بدلنے کے ساتھ نظر بھی ایسی بدلی کہ اپنی صاحبزادی سلمہا کی نسبت کی خبر دیتے ہوئے سب سے پہلی خوشخبری یہ سناتے ہیں کہ "آپ یہ سُن کر خوش ہوں گے کہ میں اپنی منجھلی لڑکی کی نسبت ایک ایسے نوجوان صالح سے کر رہا ہوں جو حضرت مولانا تھانوی کے متوسلین میں ہیں"، پھر اس سلسلہ میں نکاح و رخصتی وغیرہ سے فراغت اور وطن (دسنہ) سے اعظم گڈھ واپسی کے ارادہ پر ارقام ہے،

"تھانہ بھون کا بھی قصد ہے، حضرت میرے ہر معاملہ حتّٰی کہ ذاتی معاملہ سے بھی خبردار ہیں، یہ میرا جوشِ محبت ہے کہ والد شفیق کی طرح اُن کو ہر معاملہ لکھے بغیر چین نہیں ملتا،"

حرف حرف راقم نالائق کی ترجمانی فرما دی، اس کا بھی حضرت کی زندگی بھر یہی حال رہا کہ ذاتی و خانگی معاملات کی چھوٹی سے چھوٹی ..... باتوں کی بھی اطلاع دیئے بغیر رہا نہیں جاتا تھا، حد یہ کہ ایک مرتبہ مہترانی نے اسٹرائیک کر دی تو وہ بھی لکھ بھیجا! پھر جس معاملہ میں جو ایما یا ارشاد ہوتا تھا، اس کے خلاف الحمد للہ کہ قدم اٹھانے کا جی ہی نہ چاہتا، پورے انشراح کے ساتھ اتباع کی توفیق ملتی، اس کا راز بھی سیرۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رازشناس سے معلوم کریں،

"میرا مذاق یہ ہے کہ شیخ وقت قائم مقام نبی ہے، ان امور میں جو مختص بالنبوۃ نہیں"

سیرتِ نبویؐ کے مسلم محقق و ماہر اور رازشناس سے بڑھ کر وقت کے "قائم مقام نبی" کو پہچاننے کا دعویٰ کون کر سکتا ہے، یاد رہے کہ مرحوم صرف اپنا شیخ نہیں، شیخ وقت فرما رہے ہیں، پھر تمام ذاتی و خانگی امور تک میں جو اتباعی و جنی وابستگی ہے، اس کی وجہ بیان فرماتے ہیں کہ

"جس طرح نبی کی یہ شان ہے کہ لا یومن احدکم حتّٰی اکون احب الیہ من

والدہ وولدہ ونفسہ[1] (او کما قال) اس کا عکس شیخ کے ساتھ معاملہ میں بھی ہونا چاہیے

آپ نے حضرت عمرؓ والی روایت خوب لکھی، آپنے کہاں دیکھی[2]،

اس گرامی نامہ کی پشت پر اپنے اس حال کا کچھ تازہ قال دو غزلیں بھی نقل فرمائی ہیں، ایک کا عنوان "فراق شیخ" ہے، اور دوسری کا "انتظار جواب" اہل ذوق شریک کیف ہوں،

دل میں کیا کیا آرزوئے دید ہے — مومنوں کو انتظار عید ہے

میکدہ، مسجد میں یاد آیا کیا — روز افزوں نشۂ توحید ہے

حضرت "جامع المجددین" علیہ الرحمۃ کی تجدیدی جامعیت تو ایک دن دوپہر کا واقعہ ہے آج بھی جو چاہے حضرت کے کارناموں کو کتابی صورت میں مطالعہ کرکے خود معلوم کر سکتا ہے، پھر بھی بعض قلوب پر "جامع المجددین" کا عنوان گراں تھا، وہ حضرت سید صاحب جیسے دین کے دیدہ ور کی زبان سے اسی غزل میں "خاتم المجددین" ہونے کی شہادت سن لیں،

اس سے پایا روئے ملت نے فروغ — ختم اس پر دورۂ تجدید ہے"

"انتظار جواب" کا پورا لطف اُن کو آئے گا جن کو "خاتم المجددین" کی خدمت میں مکاتبت کی کچھ سعادت حاصل رہی ہے،

دن گنے جاتے ہیں قاصد کیلئے — انتظار نامۂ محبوب ہے،

شعر کی شعریت تو شعر و شاعری والے جانیں، لیکن واقعہ کی واقعیت کا اگلا شعر لفظ لفظ دکھاتا ہے، مشکل ہی سے کوئی علمی وعملی اشکال یا ظاہری و باطنی مرض کا سوال ہوتا ہوگا، جس کا جواب تیر بہدف یا نسخۂ اکسیر

---

[1] کوئی شخص تم سے ایمان (کا حق ادا کرنے والا) نہ ہوگا جب تک وہ مجھ کو اپنے والد اولاد اور خود اپنی ذات سے زیادہ دوست ومحبوب نہ رکھے،

[2] یاد نہیں آرہا، کیا روایت تھی، شاید اس کا تعلق نبی کی اتباع ومحبت ہی سے رہا ہوگا،

ثابت نہ ہوتا"

نسخۂ اکسیر و دارو ے شفا تیرے ہاتھوں کا لکھا مکتوب ہے

بقول مولانا دریابادی سلمہ کے بس جی چاہتا تھا کہ لکھنے والے کی انگلیاں چوم لے، ایک اور شعر "اشرف المجالس" کے بادہ خواروں کے لئے،

مہر ہو یا قہر ہو جو کچھ بھی ہو ہر ادا محبوب کی محبوب ہے

سب سے آخر کے شعر "من کوئی سالک ہے" کے نیچے اس بدنام کا نام سوالیہ نشان کے ساتھ تحریر ہے،

اندرون حلقۂ پیر مغاں کوئی سالک ہے کوئی مجذوب ہے
(کیا عبدالباری؟)

۲۸ مارچ کو اس میخانہ (تھانہ بھون) میں ایک عشرہ کی سرمستیوں کے بعد واپسی کی اطلاع ایک کارڈ پر صرف اس شعر سے فرمائی،

نہ من تنہا دریں میخانہ مستم جنید و شبلی و عطار شد مست

راقم احقر کو "علامہ ندوی" نہیں بلکہ "جنید و شبلی" کے "یارمیخانہ" کی "مستی" کے کچھ یادگار سبق سنا دینا زیادہ مدنظر تھا، یہ نشہ ان کی علمی و تصنیفی زندگی سے لے کر خانگی و ذاتی معاملات تک پر بھی جس درجہ چھا گیا تھا، اس کا ہر سبق مستقل درس ہے، اور سب سے بڑھ کر بڑا درس علم و قلم والوں کے لئے،

"علامہ ندوی" نہ صرف عام علوم دین کے علامہ بلکہ فن سیرت کے خاص طور پر وقت کے سب سے بڑے علامہ تھے جن کی "سیرۃ النبی" کا کوئی جواب تو کیا ہوتا، اس کے بعد سے سید الاولین والآخرین علیہ التحیۃ والتسلیم کا کوئی چھوٹا بڑا سیرت نگار اس سے مستغنی نہیں رہ سکا، اور نہ آئندہ رہ سکتا ہے، پھر سوچنے کی بات ہے کہ جنید و شبلی والے میخانہ میں پہنچ کر کوئی تو بات اُن کو ایسی ملی کہ اپنے سارے تصنیفی دفتر کے ساتھ اس سیرت تک کو نظر ثانی سے مستغنی نہ پا سکے،

باقی نج کی زندگی مین تو اس مستی کا رنگ یہان تک دیکھا کہ ایک رفیق کی سالہا سال رفاقت مین لباس اور رہن سہن مین کچھ تکلف و تنعم آگیا تھا، وہ بھی اب اتنا ختم ہوگیا تھا کہ لاہور مین ایک بڑی محبت والے عزیز شاگرد دوست نے میری دعوت کی، سید صاحب بھی لاہور مین موجود تھے، میری ہی وساطت سے اُن سے درخواست کی، پہلے کی اُن سے کوئی بے تکلفی کیا شاید شناسائی تک نہ تھی، مگر جب وہ لینے آئے، تو جس طرح محض کرتے ٹوپی مین بیٹھے تھے، اسی طرح بے تکلف ساتھ ہولیے، ورنہ عادۃً ایسے مواقع پر صافہ و شیروانی پہن لیا کرتے تھے، اور بھی کراچی و لاہور وغیرہ مین اس سے بھی زیادہ تکلف کے مواقع جلسون وغیرہ تک مین اُن کی ذاتی زندگی نمود و نمایش، آرایش و زیبایش سے دُور و نفور ہو چکی تھی، بلکہ بعض دوسرے علم و دین کا نام لینے والون مین جاہی و نمایشی عادات و تکلفات دیکھ کر بہت متاسف ہوتے تھے کہ بناؤ سنگار علم کی شان ہے نہ دین کی، پاکستان مین بہت سے شروع شروع مین پہنچ جانے والون کو جہان ملازمت اور معاشی کاروبار وغیرہ کے اموال غنیمت ہاتھ آئے، وہان بعض مولاناؤن کو "لیڈری" کی دولت ہاتھ لگی، ایسے ہی ایک "مولانا لیڈر" کا بر سبیل تذکرہ کسی سفر مین رفاقت کا خود اپنا یہ تجربہ نہایت تاسف کے ساتھ بیان فرمایا کہ ریل مین پہلے صبح صبح بعد غسل روزانہ نیا لباس تبدیل کر لیتے، تب اسٹیشن پر منتظر استقبال و مشتاق دید مجمع مین نمودار ہوتے، علم و دین کا نام لگا کر دا قعاً یہ خفیف الحرکاتی، بڑی شرمناک معلوم ہوتی ہے، علماء کو تو طالب علمانہ وضع ہی زیب دیتی ہے،

بات وہی ہے کہ نفس کا تزکیہ، وَيُزَكِّيهِمْ، کتابی تعلیم و تعلّم پر بھی مقدم ہے، اور یہ کسی ایسے اور "مزکّی" و "مربّی وارثِ نبی" کی صحبت و تربیت کے بغیر عملاً ناممکن ہے، جو خود "مزکّٰی" یا تربیت یافتہ نہ ہو، بلا ایسی صحبت و تربیت کے نفس و نفسیات کی بیماریون کا علاج کیا ہوگا، ان کو بیماریان سمجھنے والے ہی نام نہاد علماء و مشائخ تک مین کتنے ہوتے ہین، اور تعجب کی بات درحقیقت نفس و نفسانیات کا نابابی عموم نہین، بلکہ تزکیہ و تربیت سے غفلت کا عوام مین نہین خواص تک مین عموم ہے، خالص علمی و دینی ہی نہین، دنیوی و سیاسی خدمت گذارون کے لیے بھی دوسرون کی مذمت سے پہلے اور ساتھ ساتھ خود اپنی اصلاح اور تزکیۂ نفس کی فکر ناگزیر ہے، دن رات کا مشاہدہ ہے کہ

دین و دنیا دونون کے "غیر صالح" مصلحین کے ہاتھون اصلاح سے کہین زیادہ افساد کی خدمات انجام پا رہی ہین،

دین کی بنیادی حقیقت "یوم دین" یا آخرت کا ایمان و یقین ہے، آخرت کو پیش نظر رکھے بغیر علم و عمل کے کسی انفرادی کمال یا اصلاحی خدمت کا دین کی میزان مین قطعاً کوئی وزن نہین، "وہان" پوچھ نہ تہذیب و تمدن کی ترقیون کی ہوگی، نہ حکومت و سیاست کی ہنگامہ آرائیون کی، نہ علوم و فنون کے کارنامون کی، نہ خطابت و مقرری کی زبان آوریون کی، نہ انشا و قلم کی زور آزمائیون کی اور نہ تصنیف و تالیف کے انبارون کی، وہان تو ہر ہر فرد کے ظاہر و باطن کے ہر ہر قول و عمل، ہر ہر فکر و نظر، ہر ہر ارادہ و نیت کے متعلق سب سے پہلے پوچھا، اور دیکھا یہ جائے گا کہ اس مین خدا کی رضا و آخرت کا کیا اور کتنا حصہ تھا، وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَۃَ وَسَعٰی لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا۔"

علامہ "سلیمان" کو آخر آخر مین جس فکر و نظر نے "حضرت سلیمان" بنایا، وہ "یہان" کی نہین "وہان" کی فکر تھی، حقیقت دین کی یہی یافت اُن کی ساری علمی و عملی یادگارون کو قابل یاد بنا سکتی ہے، اس کو بھول بھلا کر اُن کی ہر یادگار اُن کو یاد کرنا نہین "بھلانا" ہوگا، اس یافت کو خود اُن ہی کے اس "یادگار انقلاب" کے سیدھے سادے دو مصرعون مین یاد رکھین،

ہم ایسے رہے یا کہ ویسے رہے،
"وہان" دیکھنا ہے کہ کیسے رہے،

"وہان" کے ساتھ "یہان" کے لئے بھی جو بات سب سے زیادہ یاد رکھنے کی ہے، آگے ہی وہ بھی سُن لین "کُن فی الدّنیا کانک غریب"

حیاتِ دو روزہ کا کیا عیش و غم — سفر کا بھی کیا جیسے تیسے رہے

بس اللہ تعالیٰ اُن کے اس حال و قال کو اُمت کے عوام و خواص کا بھی حال و قال بنا دین، اسی مین دین و دنیا دونون کا بناؤ ہے، اور یہی اُن کی علمی و عملی زندگی کے آخری انقلاب کا سب سے گرانقدر

سبق ہے،

حال کے کسی صدق مین صاحب صدق "نے ایک بڑی سچی بات کہہ ڈالی تلخ ہو یا شیرین لیکن ہے یہ حقیقت ہی کہ ادھر دس بارہ سال سے سید صاحب "خالص ندوی" نہ رہے تھے، مگر اس "نالائق ندوی" کی سمجھ مین تو ان ہی ۱۰ ۱۲ سال مین سید صاحب "پورے ندوی" بنے، ندوہ کے اصل بانیون نے علوم دین کا ایک نیا دار العلوم اس لیے ہرگز نہین کھڑا کیا تھا کہ اس کے علمار کی تقریر و تحریر خطابت، وصحافت مین زور و کمال پیدا ہو کر ایمان وعمل صالح کی ظاہری و باطنی زندگی مین ضعف واضمحلال پیدا ہو جائے، اور دین کا سارا نور سمٹ سمٹا کر زبان و قلم مین آ جائے بلکہ ان کا مقصد علم کے ساتھ اعمال کی تحسین بھی تھا،

مرحوم نے اپنی زندگی کے آخری ۱۰، ۱۲ سال مین "ندویت" کی اس خلا و خامی کی تلافی و تدارک فرمایا "ندوی برادری" بھی اگر اپنے سب سے بڑے "فخر ندویت" بھائی کے اس یادگار انقلاب باطن سے سبق لے، تو اس کے علم و قلم کی داد مخلوق سے ملے یا نہ ملے لیکن خالق سے انشاء اللہ بھر پور مل کر رہے گی، دین نام ہی اس باطنی انقلاب کا ہے کہ ہر چھوٹے بڑے علمی و عملی انفرادی و اجتماعی کام مین نظر مخلوق و دنیا سے ہٹ کر خالق و آخرت پر ہو جائے، ندوہ کے "سید الطائفہ" نے یہ نظر پیدا کر کے "ندویت" ہی کی تکمیل نہین فرمائی، بلکہ دین کا نام لے کر سارے قلم چلانے والون کو سب سے بڑا سبق دے کر گئے ہین، اسلام اپنی تعلیمات کی خالی زبان و قلم سے داد لینے نہین آیا، زبان سے بڑھ کر دلون کو بدلنے یا قالب سے زیادہ قلب کے انقلاب کی دعوت لیکر آیا ہے، الہ آباد کے عارف اکبر نے زبان و قلم کی اس بیداد پر اپنے رنگ مین کس لطف و خوبی کے ساتھ متنبہ فرمایا ہے،

داد قرآن کی نہ دو بھائی عمل اس پر کرو

پیش درگاہ خدا داد کی حاجت نہین

زبان و قلم سے تو اپنی فاسد تعلیمات کی داد دینے مین اہل باطل بھی، خصوصاً آج کل کے، ہم سے پیچھے نہین

آگے اور اتنے آگے ہین کہ اس محاذ پر اُن سے بازی لے جانا ممکن ہی ہے "اسلام کا اصل محاذ عمل صالح کی زبان ہے جس کے سامنے قلم کی زبان کا کوئی طلسم نہیں ٹھہر سکتا، اور عمل "صالح" جب ہی ہوتا ہے جب کہ اس کا سرچشمہ قلب باطن کی طہارت ہو، اگر قلب صالح و درست نہیں تو پھر عمل صالح کی ہر سعی و سرگرمی فساد ہی فساد ثابت ہوتی ہے، اذا فسد فسد الجسد کلہ" دلون کے اس فساد کا آج سے بڑھ کر ہمہ گیر فسادات کی صورت مین دنیا کی تاریخ نے شاید ہی پہلے کبھی ثبوت فراہم کیا ہو،

تسلیم دل بزور سخن نمی شود

این فتح بے شکست میسر نمی شود

---

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کا حکم تھا کہ مرحوم کی سیرت کے سلسلہ مین اُن کی طالب علمی کے رنگ روش کی تفصیل خصوصیت کے ساتھ کرون، اپنی نالائقی اس معاملہ مین ادپر ابتدا ہی مین عرض کر چکا ہون اتفاق سے اسی زمانہ مین مولوی جواد علی خان صاحب عالی راقم الحروف کے قریب ہی ٹھہرے ہوئے تھے، وہ سید صاحب کے نہ صرف ہم مدرسہ بلکہ بہت بے تکلف ہم درس اور ہم سبق رہے ہین، قلم مین بھی کچھ قدم ساتھ چلے، پھر:

او بہ حرا رفت و ما در کوچہ رسوا شدیم

بہرحال مولانا دریابادی کی فرمایش مین نے اپنے پورے اصرار کے ساتھ "خان عالی" کی طرف منتقل کردی کہ وہ پورا حق ادا کر سکین گے، مگر جواب ان کا بھی اس مضمون کے ختم ہونے پر اس عذر ہی کا آیا کہ مرحوم و مغفور کے متعلق حافظہ کی معذوری سے سوچ بچار کے باوجود کوئی مواد حاصل نہ کر سکا، بجز ان معمولی باتون کے کہ

"اگر کوئی ہم سبق کبھی سختی سے گفتگو کرتا، تو اس کا جواب نرم الفاظ مین دیتے اور خاموش ہوجاتے، کبھی سخت کلام یا لب ولہجہ سخت نہ ہوتا، درسی کتابون کی تکرار مین لب ولہجہ زوردار البتہ ہوتا تھا اور بیان کی قوت و روانی سے شرکا کے دل پر متکلم کا رعب بیٹھ جاتا،

"متانت ہر انداز پر غالب رہتی کبھی ٹھٹھا مار کر ہنستے نہ تھے، بے تکلفی میں ظرافت سے باز نہ آتے، اس میں بھی متانت قائم رہتی، کوئی ناگواری ہوتی تو اس کی غمازی چشم و ابرو ضرور کرتے، مگر زبان پر قابو رہتا"

آپ نے دیکھا کہ نوجوانی اور طالب علمی کے اس چند سطری آئینہ میں خد و خال کی وہی جھلک موجود ہے جو آگے چل کر پوری سیرت کے قدآدم آئینہ میں اُبھر کر گھر باہر اپنے پرائے سب کے سامنے جلوت و خلوت میں آتی رہی، اللّٰھم صلّ علیٰ سیّدنا محمد و من اٰلہٖ علیٰ سیّدنا سلیمان بارک وسلّم۔

# گنجِ گرانمایہ

از

پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی

"رشید صاحب نے اس مضمون کا کوئی عنوان نہیں لکھا تھا، اور اس کو میری رائے پر چھوڑ دیا تھا، مجھے اُن کے مجموعہ مضامین گنجہائے گرانمایہ کی مناسبت سے جو انھوں نے وفیات پر لکھے ہیں، گنج گرانمایہ زیادہ مناسب معلوم ہوا" (م)

سید صاحب سے پہلے پہل اعظم گڈھ میں ملاقات ہوئی تھی، مولینا سہیل کی معرفت، بہت دن ہوئے، شاید ۳۰، ۳۲ برس، تعطیلوں میں تفریحاً مولانا اور دوسرے عزیزوں دوستوں سے ملنے اعظم گڈھ گیا تھا، سہیل صاحب کو علامہ شبلی مرحوم سے بڑا شغف ہے، شبلی کے سامنے وہ سب کو بے حقیقت سمجھتے ہیں، حد یہ ہے کہ کبھی کبھی اپنے آپ کو بھی! "کبھی کبھی" یوں کہ اس بارۂ خاص میں مولانا کے بیانات میں اکثر تضاد رہا ہے!

فرمایا چلو تم کو حضرت مرحوم کے جانشین سے ملالاؤں، میں نے کہا مولانا آپ کے ہوتے کون جانشین ہوگیا، یہ آپ کی عالی ظرفی ہے کہ آپ کسی اور کو مرحوم کا جانشین مانتے ہیں، آپ اپنے حاشیہ نشینوں کا ایمان کیوں برکھتے ہیں، جو آپ کو حضرت مرحوم کا صدق دل سے جانشین سمجھتے آئے ہیں، اور اس پر یقین رکھتے ہیں کہ آپ کے بعد نہ حضرت مرحوم کا کوئی جانشین رہے گا، اور نہ خود آپ کا!

مولانا اس پر مسکرائے اس طور پر کہ پان کی پیک جو دہن کے گوشہ سے باہر سرک آئی تھی، اس کو ہاتھ سے

اس طرح پوچھا کہ اُس کی سُرخی کچھ ڈاڑھی مونچھون پر رہ گئی، اور کچھ ہتھیلی پر آئی، اور وہان سے اس بچہ کے کرتے پر منتقل ہوئی جو پہلو مین بیٹھا ہوا تھا، لوگون نے شور مچایا، تو بولے ارے یہ کہان سے آگیا مین تو سمجھ رہا تھا کہ منشی جی مقدمہ کے کاغذات رکھ گئے ہین!

شام کو مولانا کے ہمراہ شبلی منزل گیا، سید صاحب سے ملاقات ہوئی، سہیل صاحب نے تعارف کرایا، شبلی منزل کے اور احباب و بزرگون سے بھی ملاقات ہوئی، سید صاحب بڑی شفقت سے ملے، ابھی لطف و رحمت کی باتین ختم نہین کی تھین کہ سہیل صاحب نے کوئی ادبی یا فقہی مسئلہ چھیڑ دیا، جسے معارف کے اوراق مین کبھی دیکھ چکے تھے" سید صاحب نے ہان نہین مین بات ٹال دی، شبلی منزل مین کسی اور کی ہمت نہ ہوئی کہ مولانا سے الجھے، مولانا کو دلائل سے زیر کرنا ناممکن تھا، طالب علمی مین ہم سب کا طریقہ یہ تھا کہ بحث کی آخری منزل پر پہنچتے پہنچتے مولانا سے زبردستی کچھ قرض لے کر چل دیئے، اور مولٰنا کسی اور سے بحثنے کسی اور طرف چلے گئے!

اس دن کے بعد سے آخر زمانہ تک جب وہ پاکستان تشریف لے گئے، اور پھر جوارِ رحمت مین پہنچ گئے، سید صاحب سے ملنے اور اُن کی محبت و مروت سے بہرہ مند ہونے کے بے شمار مواقع ملے، علی گڈھ آنا ہوتا، تو ہمیشہ میرے ہان قیام کرتے، میرا، میرے بچون کا، میرے عزیزون دوستون کا بڑا خیال کرتے تھے، اتنا خیال کہ کبھی کبھی مین اپنے سے شرمندہ ہونے لگتا، یونیورسٹی کورٹ کا معرکہ کا کوئی جلسہ ہونے والا ہوتا تو عمائدِ قوم کا اچھا خاصہ اجتماع ہوجاتا، ایسے مواقع پر یونیورسٹی کے طلبہ، یونین مین کوئی مباحثہ یا مشاعرہ منعقد کرتے، علی گڑھ مین اکابر شعراء مجتمع ہوجاتے، وہ ایک دن بڑی رونق کے گذرتے، میرے ہان مختلف الخیال حضرات یکجا ہوجاتے مثلاً سید صاحب، اصغر صاحب، ذاکر صاحب، مولٰنا عبدالماجد صاحب، سید الطاف حسین صاحب، ان مین کچھ ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم کی حمایت مین تشریف لاتے تھے، کچھ ذاکر صاحب کا ساتھ دینے کے لئے۔

میرے ہان وہ مسائل نہین چھیڑے جاتے تھے، جو کورٹ مین پیش ہونے والے ہوتے، اس لئے کہ شریک ہونے والون مین کوئی ایسا نہ تھا، جو پہلے سے رائے قائم نہ کرچکا ہوتا تھا، اُس وقت کورٹ کا یہی رنگ تھا، اور

وہ دو مختلف گروہوں میں بٹ گئی تھی، البتہ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب کا کوئی عزیز قریب یا حکومت کا کوئی بڑا عہدہ دار زیادہ سرگرمی دکھانے کے لئے مرحوم کی حمایت میں بحث کرنے آجاتا، یہ موقع بڑا پرلطف ہوتا تھا ذاکر صاحب بھی موجود ہوتے تھے، اور ڈاکٹر صاحب کے حامیوں کے دلائل اس سنجیدگی اور ہمدردی سے سنتے، اور کہیں کہیں ہمت افزائی کے طور پر ایسا لقمہ دے جاتے کہ بولنے والا اور بڑھ بڑھ کر باتیں کرنے لگتا، ڈاکٹر صاحب مرحوم کے سمجھدار ساتھی بڑی دقت میں مبتلا ہو جاتے، اور چاہتے کہ یہ بحث کسی نہ کسی طرح ختم ہو جائے،

سید صاحب کا مسلم یونیورسٹی سے بڑا پرانا اور گہرا تعلق رہا، جہاں تک میرا خیال ہے مرحوم ۲۳،۲۴ء سے علیگڈھ آنے جانے لگے تھے، کورٹ کے مسلسل ممبر رہنے کے علاوہ مرحوم ان کمیٹیوں اور شعبوں کے ممبر منتخب یا مقرر ہوتے رہے جو علوم مشرقیہ یا مذہبی اور ادبی مسائل سے متعلق ہوتے، یہ سلسلہ تقسیم ملک تک قائم رہا، تقسیم کے پہلے یونیورسٹی پر طرح طرح کے دور آئے، سید صاحب کسی نہ کسی حیثیت سے برابر ارباب یونیورسٹی کے شریک کار رہے، اور اکثر اہم مواقع پر سید صاحب کی اصابت رائے سے یونیورسٹی کو بڑا فائدہ پہنچا،

سید صاحب اور مولانا سلیمان اشرف صاحب ہم وطن تھے، دونوں کے سیاسی معتقدات جداگانہ تھے بعض مذہبی امور میں بھی ذہنی یگانگت نہ تھی، مولانا سلیمان اشرف صاحب بڑے طنطنے کے آدمی تھے جس کے بارہ میں جو خیال رکھتے تھے، اس کا اظہار برملا کرتے تھے، اور کوئی جھگڑا آن پڑے تو مزاحمت کرنے پر مشکل ہی سے آمادہ کئے جاسکتے تھے، علامہ شبلی مرحوم کے کچھ زیادہ قائل نہ تھے، دارالمصنفین کے بھی کچھ ایسے معترف نہ تھے جس کسی کو اپنی طبیعت کا نہیں پاتے تھے، نہ اس کے قریب جاتے تھے، نہ اسے قریب آنے دیتے تھے،

لیکن سید صاحب جب کبھی علی گڈھ آتے تو مولانا سلیمان اشرف صاحب کے ہاں ضرور جاتے، دونوں ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوتے، اور نہایت خلوص اور بے تکلفی سے گفتگو کرتے، اور میں جانتا ہوں کہ اس میں اس کا مطلق کوئی دخل نہ تھا کہ سید صاحب سلیمان اشرف کے ہم وطن یا دارالمصنفین کے کرتا دھرتا تھے یا ملک میں اُن کی بڑی مان دان تھی، ان دونوں بزرگوں کے باہمی خوشگوار تعلقات کا موجب ایک طرح پر مولانا

ابوبکر محمد شیث فاروقی صاحب جونپوری ناظم دینیات تھے جن کے سید سلیمان صاحب سے بڑے پرانے اور مخلصانہ تعلقات تھے، اور خود مولٰنا سلیمان اشرف صاحب مولٰنا ابوبکر صاحب کی بڑی عزت کرتے تھے، اور اُن سے بڑی محبت سے پیش آتے تھے،

سید صاحب کا مزاج مولٰنا سلیمان اشرف کے مزاج سے بالکل مختلف تھا، سید صاحب کو کوئی مشتعل نہین کرسکتا تھا، وہ کسی حال مین برہم یا بے اختیار نہین ہوتے تھے، سید صاحب خود علامہ شبلی سے طبعًا مختلف تھے، مین نے علامہ شبلی مرحوم کو نہین دیکھا، لیکن اُن کی تصانیف پڑھی ہین، جن لوگون نے ان کو قریب سے دیکھا تھا، ان سے ملا ہون، خود شبلی پر جو کچھ لکھا گیا، اُس سے بھی تھوڑا بہت آشنا ہون، علامہ شبلی جتنے ذہین اور جذباتی تھے (ذہین اکثر جذباتی ہوتے ہین) شعر کہنے اور پرکھنے کا جیسا ملکہ ان مین تھا، اُن کی شاعری، اُن کی نثر اُن کے خطوط سب مین "حسن طبیعت" اور "سوز درون" کی جیسی دل آویز مثالین ملتی ہین، اور دنیوی معاملات مین جس سوجھ بوجھ سے وہ کام لیتے پائے سکتے تھے، سید صاحب ان سب سے عاری تھے،

سید صاحب کی جس بات کا مین گرویدہ تھا، وہ ان کا علمی تبحر ہی نہین، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ علمی دیانت بھی تھی، وہ کبھی علم کو کسی ادنیٰ مقصد کے حصول کے لیے کام مین نہین لاتے تھے، علم نہایت ہی خطرناک چیز ہے کم ذی علم ایسے پائے گئے ہین جنھون نے علم سے لوگون کو فائدہ پہنچانے کے ساتھ ہی نقصان نہ پہنچایا ہو، جس کی ایک مثال مذہب کا غلط استعمال ہے، مین بطور کلیہ تو کچھ نہین کہہ سکتا، لیکن اپنی ہوش کی زندگی مین اب تک یہی دیکھتا آیا ہون کہ جہان کہین لوگون کو اپنے ادنیٰ مقاصد مین کامیابی نظر نہ آئی، انھون نے مذہب کو آڑ بنا لیا، اور پھر جو آفتین نازل ہوتی ہین، وہ سب جانتے ہین، میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ علم، مذہب اور آزادی باوجود بہترین نعمت ہونے کے نااہل سوسائٹی مین بڑے خطرناک عناصر ہین،

بات کہان پہنچی کہنا یہ شروع کیا تھا کہ سید صاحب کا علم کیا تھا، اور کیسا تھا، وہ علم ہی سے واقف نہ تھے، علم کی برگزیدگی کا بھی احساس رکھتے تھے، اور اس کو کبھی ہاتھ سے نہ دیتے، اکثر ایسے عالم دیکھے گئے ہین، جو صرف

علم کا بیوپار یا بیوپار کرنا جانتے ہین، علم کا مفہوم میرے نزدیک جاننا پہچاننا ہی نہین، جاننے پہچاننے کی ذمہ داری
بھی ہے، جب تک کوئی متعلم علم کی برگزیدگی کو ماننے اور منوانے کی اہلیت نہ رکھتا ہو، اس کو علم کا کاروبار نہ
کرنا چاہیئے، آج کل دنیا مین جو ہلچل، افراتفری یا بے دلی، اور بیزاری پھیلی ہوئی ہے، اس کا ایک بڑا سبب میرے
نزدیک یہ بھی ہے کہ علوم اور ان علوم کو پھیلانے کے وسائل تو بہت بڑھ گئے ہین لیکن اچھے معلّم تقریباً ناپید ہین
جس کی وجہ سے علم اور زیادہ خطرناک بن گیا ہے، دنیا مین ہر مرض کی تیر بہدف دوائین کیون نہ ایجاد کر دیجائین
اگر اچھے اطبّا میسّر نہ ہون تو یہ دوائین خطرہ کا موجب بن سکتی ہین، یہی حال علوم کا ہے !

سید صاحب جن علوم سے بہرہ مند تھے، اُن پر اُن کی نظر پیشہ ورانہ نہ تھی محرمانہ تھی، وہ محض فنّی اصول پر کسی
مسئلہ کو ناپ تول کر ختم نہین کر دیتے تھے، بلکہ اس کی کوشش کرتے تھے کہ اس مسئلہ کے رد یا قبول مین دماغ اور دل
دونون متفق ہو جائین، سید صاحب نے اسلامی عقائد اور اسلامی مسائل سے (خواہ وہ معاش سے متعلق ہون یا معاد
سے) طرح طرح سے بحث کی ہے لیکن مجھے کوئی ایسا موقع نہ ملا، جہان یہ محسوس ہوا ہو کہ مصنّف نے اپنی بات
دھوکے دھڑی سے یا خطابت اور شاعری کے زور سے یا منطق اور فلسفہ کا چکر دے کر یا جلی کٹی سنا کر یا رو پیٹ کر
منوانے کی کوشش کی ہو جیسا کہ بعض نام کے مولوی اور اشترا کی بالعموم کیا کرتے ہین، سید صاحب نے ہمیشہ بات متانت
اور دیانت سے کہی پتی تلی کہی، اور اس طرح کہی اور اس لئے کہی کہ اُن کو ایک بیش بہا بات معلوم ہوئی تھی جس پر
انھون نے بڑی محنت، قابلیت اور وقت صرف کیا تھا، اور چاہتے تھے کہ اسے ان لوگون تک پہنچائین، جو اس سے
فائدہ اٹھا سکتے تھے، علم کا معلّم سے یہی تقاضا ہے !

سید صاحب کی تصانیف میں سے جس تصنیف نے مجھے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ اُن کے
خطبات مدراس ہین، میرا خیال ہے کہ شاید سب سے پہلے مین نے ہی سید صاحب کی خدمت مین یہ تجویز پیش کی تھی کہ ان
خطبات کا اچھی انگریزی مین ترجمہ ہو جائے، تو بہت مفید ہوگا، سید صاحب نے اس تجویز کو پسند کیا تھا بعض
عزیزون نے اس پر کچھ کام کرنا شروع بھی کر دیا تھا، لیکن پھر کیا ہوا مجھے اس کا علم نہین، مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے

کہ اسلامی عقائد اور شعائر سے متعلق اتنی اچھی اور مختصر کتاب شاید اسلامی ممالک میں بھی نہیں لکھی گئی یہی نہیں بلکہ اکثر یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ اسلام اور اسلامیات سے متعلق جتنی مفید اور معیاری تصانیف ہندوستان کے مسلمان ارباب فکر و نظر نے پیش کی ہیں، اسلامی ممالک میں اس پایہ کی کتابیں شاید نہیں تصنیف ہوئیں، دور جانے کی ضرورت نہیں، صرف دار المصنفین اعظم گڈھ کی گذشتہ چالیس سال کی مطبوعات کا جائزہ لیا جائے، تو اس بات کا آسانی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے! یہ گمان اور قوی ہو جاتا ہے، جب ہم اس امر کو بھی مد نظر رکھیں کہ دار المصنفین جیسے چھوٹے بڑے ادارے ہندوستان میں اور بھی ہیں!

یہاں ایک واقعہ یاد آگیا۔ دس بارہ سال ہوئے یا شاید اس سے بھی زیادہ، ایک بار سید صاحب سے اس مسئلہ پر گفتگو آئی کہ مذہبی، اخلاقی اور ذہنی اعتبار سے ہندوستان کے مسلمانوں کا ہندوستان سے باہر کے مسلمانوں سے موازنہ کیا جائے، تو کیا نتیجہ نکلے گا، سید صاحب نے بتایا کہ تینوں اعتبار سے ہندوستان کے مسلمانوں کا پایہ باہر کے مسلمانوں سے بلند ملے گا، اثنائے گفتگو میں یہ بھی فرمایا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہئے، باہر کے مسلمانوں کی عام حالت بحیثیت مجموعی ایسی نہیں ہے جس پر یہاں کے مسلمان بھروسہ یا اُن کے رہن سہن اور طور طریقوں کی تقلید کریں۔

خیام کے بارے میں مغربی مصنفین نے جو کچھ لکھا تھا اور اُن کی دیکھا دیکھی یا سُنی سنائی ہم ہندوستانی جو کچھ کہنے لگے تھے، وہ میرے پیش نظر تھا، لیکن خیام پر سید صاحب کی تصنیف سامنے آئی تو دل باغ باغ ہو گیا کہ معرکہ کی ایک تصنیف اردو میں دیکھنے میں آئی جو کسی زبان کے بڑے سے بڑے تحقیقی کارناموں کے ساتھ رکھی جا سکتی ہے، اس کتاب کی تصنیف میں سید صاحب کے حیرت انگیز طالب علمانہ شغف، مورخانہ ژرف نگاہی، ادبی پرکھ اور عالمانہ بصیرت کا پورے طور پر اندازہ کیا جا سکتا ہے، معمولی سے معمولی دعوی کو مستند سے مستند ماخذوں سے مستحکم کیا ہے، ماخذات کے لئے کس کس بے کنار سرو سنسان اور دشوار گذار جنگل اور گھاٹیوں سے گذرنا پڑا ہوگا تب کہیں جا کر کسی رہرو کے نقش قدم ملے ہوں گے، اور جادۂ و منزل کے متعین کرنے کا امکان پیدا ہوا ہوگا معلوم نہیں

اس تصنیف پر سید صاحب کو کیا داد ملی حکومت سے، قوم سے یا کسی اکیڈمی سے؟ میں سمجھتا ہوں کہ کسی ملک کی بڑی سے بڑی یونیورسٹی یا اکیڈمی سید صاحب کو اس کتاب پر بڑے فخر اور خوشی سے اعلیٰ علمی ڈگری دے سکتی ہے۔

سید صاحب کو اپنے استاد علامہ شبلی مرحوم سے بڑی عقیدت تھی، سیرت شبلی لکھ کر سید صاحب نے اس کا حق بھی ادا کر دیا ہے، اس کتاب میں جہاں کوئی کمی ملتی ہے، وہ سید صاحب کے فنی شعور کی کوتاہی کے سبب اتنی نہیں ہے جتنی اس شغف کے بنا پر ہے، جو ایک نہایت درجہ شریف اور سعید شاگرد کو اپنے شفیق اور محترم استاد سے ہو سکتا ہے، یہ وہ مقام ہے جہاں مصنف اپنے ہیرو میں کوئی خامی دیکھنا نہیں چاہتا، یہ بات ٹھیک ہے یا نہیں سمجھ میں آسانی سے آجاتی ہے!

باوصف اس عقیدت کے سید صاحب کی شخصیت اور ان کا "اسلوب تحریر" بھی شبلی سے مختلف ہے، شبلی کے قلم میں بڑی رعنائی اور برنائی ہے تخئیل میں رنگینی اور جذبہ میں حرارت اور تلملاہٹ ملتی ہے، جذباتی اور تخئیلی فنون کا کے یہ خاص صفات ہیں، یہ صفات فنون لطیفہ کے لئے جتنے کارآمد ہو سکتے ہیں، تاریخ تحقیق یا تنقید کے لئے نہیں، شبلی کی طرح سید صاحب کو بھی تاریخ سے بڑا لگاؤ تھا، بہت زیادہ لگاؤ، کوئی مسئلہ ہو سید صاحب اس کے موجود کو اس کے ماضی میں تلاش کئے اور پرکھے بغیر نہیں رہتے تھے، سید صاحب کی کسی قسم کی تحریر ہو تاریخ کے حوالے اس میں ضرور ملیں گے، اور شاید یہ اسی کا فیضان تھا کہ واقعہ کچھ ہو شخصیت کسی کی ہو سید صاحب کا قلم اکثر و بیشتر چلتا تھا، اپنے ہی راستہ پر، اور اپنی ہی رفتار سے! جس میں ثابت قدمی اور ہمواری ملتی ہے"

سید صاحب تاریخی دیانت و امانت کا اس درجہ لحاظ کرتے تھے کہ ان کو اپنی تصانیف میں شاعری کرنے کی بہت کم فرصت یا مواقع ملتے تھے، اور وہ تحقیق اور تنقید میں جتنی احتیاط برتتے تھے، اور محنت کرتے تھے، اتنی ہی مطالعہ کرنے والے کے جذبات یا تخئیل کو بے ضرورت مہمیز کرنے سے پرہیز کرتے تھے، تصانیف میں شبلی کا انداز مشرقی ہے، سید صاحب کا مغربی، دونوں کی ادبی شخصیت میں بھی یہ امتیاز نمایاں ہے بحیثیت طالب علم میں شبلی سے متاثر ہوا، اور بحیثیت معلم سید صاحب سے!

یہان سید صاحب کی تصانیف اور مقالات پر تبصرہ مقصود نہین ہے ، یہ کام بڑا طویل اور مشکل ہے اور ایک آدمی کے بس کا ہے بھی نہین ، کہنا یہ ہے کہ علمی تدقیقات کے جدید طور طریقون سے نا آشنا ہونے کے باوجود اس کے آداب سید صاحب اپنی تصانیف مین بڑی خوبی اور پابندی سے ملحوظ رکھتے تھے ، کیتنے مستند حوالے کہان کہان سے فراہم کرتے تھے ، اور تقسیم ابواب اور ترتیب مضامین مین کس سلیقہ سے کام لیتے تھے کہ معمولی سے معمولی طالب علم بھی پوری تحقیقات سے پورے طور پر آشنا ہو جاتا تھا ،

سید صاحب کا حافظہ بڑا قوی اور ذہن بڑا مرتب تھا ، اُن کے ذہن مین تنقیحات بڑی واضح اور مکمل ہوتی تھین ، کام کی باتین ضخیم سے ضخیم کتاب اور پیچیدہ سے پیچیدہ بحث سے بہت جلد اخذ کر لیتے تھے ، اور اُن کو اُن کا صحیح مقام دینے مین خاص ملکہ رکھتے تھے ، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنے ذخیرہ معلومات کی ذہنی فہرست اتنی ہی واضح اور مکمل رکھتے ہون ، جتنی کسی اچھی لائبریری کی فہرست کتب جو جدید ترین اصولون پر مرتب کی گئی ہو ، مین نے سید صاحب کو مطالعہ کرتے یا کتاب لکھتے نہین دیکھا ہے لیکن اُن کی تصانیف پڑھنے اور اُن سے بعض مسائل پر گفتگو کرنے سے جن باتون کا اندازہ لگا سکا ہون ، وہ بیان کر دی ہین ، ممکن ہے استنباط نتائج مین مجھ سے غلطی سرزد ہوئی ہو !

حسب نسب ، علم و فضل ، اخلاق و عادات ، خدمت ملک و ملت کے اعتبار سے سید صاحب کا درجہ بہت اونچا اور پورے طور پر مسلم ہے ، جہان تک میری معلومات ہین ، سید صاحب کی تعلیم و تربیت پرانے طریقون پر پرانے استادون ، اور بزرگون کے سایۂ شفقت اور پرانی فضاؤن مین ہوئی تھی ، جدید علوم و فنون سے براہ راست انھون نے کسی سے استفادہ نہین کیا تھا ، لیکن نئے افکار اور نئے طور طریقون سے انھون نے اپنے آپ کو اس خوبی اور خاموشی سے آشنا کر لیا تھا کہ وہ کہین اجنبی نہین معلوم ہوتے تھے ، چاہے وہ اہلِ علم کا حلقہ ہو ، چاہے ارباب سیاست کی مجلس ، خواہ طالب علمون کی جماعت ہو ، خواہ عامۃ الناس کا اجتماع ، جدید افکار ، اور رجحانات سے کوئی کتنا ہی آشنا کیون نہ ہوتا ، سید صاحب سے تبادلۂ خیال کرنے مین اُسے کبھی یہ محسوس نہ ہوتا

کہ وہ ایک ایسے شخص سے گفتگو کر رہا ہے جس کی معلومات روایتی ہین یا جس کا ذہن بندھے ٹکے خانون مین اسیر ہو یا جس کے فکر و نظر کا دائرہ تنگ ہے. علی گڑھ مین جدید ترین افکار و اطوار سے مسلح اور مرصع نوجوانون کو مین نے دیکھا کہ خالص علمی اور ذہنی سطح پر مولانا کی ہمسری نہ کر سکتے تھے، اور ہمیشہ یہ ہوا کہ وہ سید صاحب سے کچھ سیکھ کر ہی واپس گئے،

نوجوانون کے ذہنی رجحانات کے بارہ مین ایک بار سید صاحب سے مفصل گفتگو آئی تھی، فرماتے تھے کہ عربی فارسی ماخذات پر عام نوجوان طالب علمون کو عبور نہین، ان ماخذات سے متفرق نامکمل باتین جو یورپین تصانیف مین نظر آجاتی ہین، وہ اُن کو غلط راستہ پر لگا دیتی ہین یہ نوجوان ذہین اور اپنے افکار کے اعتبار سے مخلص ہوتے ہین، یہ قیاس صحیح نہین ہے کہ وہ طبعاً دین کی باتون سے بیزار اور تاریخ و روایات سے بیگانہ ہوتے ہین، لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ ان کو صحیح ماخذ، صحیح مفہوم اور صحیح سیاق و سباق بتانے والا کوئی نہین، بات کچھ اور آگے بڑھی تو فرمانے لگے، اس صورتِ حال کی ذمہ دار ایک تاریخی حقیقت بھی ہے،

بات یہ ہے کہ صلیبی محاربات نے مغرب مین مسلمانون کے خلاف ہر طرح کی قوتون کو ابھارا، سیاسی، اقتصادی اور اخلاقی اعتبار سے یورپ مین تاحالی مسلمانون کو جس جس طرح مطعون و مغلوب کیا گیا، وہ کوئی چھپی ہوئی بات نہین ہے، اس کے ساتھ ساتھ یورپ کے اہل فکر و نظر بالخصوص وہ جن کی ذہنی افتاد مذہبی تھی، انھون نے اسلامی تصانیف سے جہان تہان سے ایسے اقتباسات لئے جو اُن کے تبلیغی تصنیفی پروگرام کے لئے مفید تھے، ہر ملک مین علوم کی ابتدائی تاریخ تقریباً یکسان رہی ہے، یعنی مذہبی طبقہ تصنیف و تبلیغ کا اجارہ دار رہا ہے، اور دینی مصنفین کا یہ طبقہ اکثر دانستہ اور کبھی کبھی نادانستہ طور پر اپنی غرض کو زیادہ پیش نظر رکھتا ہے حقیقت کو کم! پھر کچھ نہ پوچھئے رہے کہ کس طرح کے اقتباسات کہان سے لے کر کس طرح کے فتنے اٹھائے جا سکتے ہین، یا اٹھائے گئے ہین، انگریزی سلطنت اور انگریزی زبان کے عروج کے ساتھ یہ غلط بیانیان کہان کہان پہنچین، اور کیا رنگ لائین،

ایک بار کسی کمیٹی یا شعبہ کی میٹنگ مین شرکت کرنے تشریف لائے تھے، یونیورسٹی اسٹاف کلب کے ممبرون نے

سید صاحب سے درخواست کی کہ موصوف کلب مین تشریف لاکر کسی موضوع پر تقریر فرمائین، اسٹاف کلب اس طرح کی فرمایش کسی سے بہت کم کرتا ہے، تقریر کا موضوع غالباً فن تاریخ پر مسلمانون کا احسان یا اس سے ملتا جلتا کوئی اور موضوع تھا، سید صاحب نے سوا گھنٹے سے اوپر تقریر فرمائی، وہ لوگ جن کو اس موضوع سے خاص ذوق تھا، بیان کرتے تھے کہ سید صاحب کی نظر اس موضوع پر جتنی وسیع اور واضح ہے، اور جتنے متنوع اور مستند ماخذ سید صاحب کے علم مین ہین، اتنے شاید ہی کسی اور کے علم مین ہون، جس طرح بچے آٹوگراف لینے مشاہیر پر گرتے ہین، اسی طرح سید صاحب سے لوگون نے ماخذات نوٹ کئے ؛

سید صاحب تقریر کرنے مین چہرہ باندھنے یعنی تمہید اٹھانے یا کسی نہ کسی معذوری کے بیان کرنے مین مطلق وقت نہ صرف کرتے جیسا کہ عام طور پر پیشہ ور مقررون کا دستور ہے، کچھ گلے اور سینے کی تکالیف، کچھ سفر کی صعوبت، کچھ ملک وملت کی ابتری یا اپنی نااہلی کا تذکرہ کیا، اس کے بعد تقریر شروع کی. سید صاحب کبھی اس طرح کی باتین نہ کرتے، اپنی جگہ سے اٹھے تقریر کرنے کی جگہ پر آکھڑے ہوئے، سلام علیکم کہا مذہبی موضوع ہوا تو بسم اللہ پڑھی، کلام پاک کی کوئی آیت نہایت سادگی اور احترام سے تلاوت فرمائی، اور تقریر شروع کردی،

آواز مین اتار چڑھاؤ نہ ہوتا، چہرے پر جذبات کی دھوپ چھاؤن نہ طاری ہونے دیتے، ہاتھ پاؤن نہ پٹکتے، نہ پھینکتے، کوئی بلند یا بلیغ فقرہ کہکر اس کے متوقع نہ رہتے کہ حاضرین سے شور تحسین اٹھے، جیسا کہ اکثر لوگ کرتے ہین، باتین بڑی واضح کہتے، الفاظ وعبارت کی دھوم دھام نہ ہوتی. البتہ کبھی کبھی ایک آدھ فقرے رعایت لفظی کے ساتھ کہہ جاتے لیکن یہ رعایت لفظی صرف تفریحی نہ ہوتی، بلکہ اس کے پیچھے کوئی بھید ہوتا، سید صاحب جس بات کو چھپا کر اجاگر کرنا چاہتے تھے، یا اجاگر کو چھپا کر کہنا چاہتے تھے. وہان اس طرح کی مناسبات لفظی سے کام لیتے، سید صاحب کو رعایت لفظی سے تفریح ضرور ہوتی، بے تکلف اور مخلص لوگون کی صحبت مین تھوڑی دیر تک ضلع جگت کا التزام رہتا، یہ مشغلہ رعایات اور مناسبات سے بھی بڑھنے لگتا، تو اور زیادہ محظوظ ہوتے!

سید صاحب تقریر کرنے مین کہین اٹکتے نہ تھے، اچھے سے اچھے مقرر بھی کبھی کبھی جملہ مین مبتدا اور خبر کو مربوط نہین کر پاتے تو ذرا دیر اٹکتے الجھتے ہین، سید صاحب کی تقریرون مین شاید کبھی کوئی ایسا موقع آیا ہو، ایسا معلوم ہوتا جیسے پوری تقریر قلم بند ہو جسے وہ اطمینان و اعتماد سے دہراتے جا رہے ہون، کوئی نہین کہہ سکتا کہ سید صاحب کی تقریر کب ختم ہوگی کسی قدر لمبی تقریر کرتے تھے، تقریر کے کچھ ایسے ماہر بھی نہ تھے لیکن تعجب یہ ہے کہ اُن کی تقریر سے دل اکتاتا نہ تھا، ہر مجمع مین کچھ نہ کچھ ایسے بے تشکرے ضرور ہوتے ہین، جو زیادہ دیر تک خاموش اور سنجیدہ نہین بیٹھ سکتے، کوئی جادو بیان مقرر ہو اور موضوع دلچسپ تو مجمع دیر تک خاموش رہ سکتا ہے، اور لطف اندوز بھی ہوتا ہے لیکن سید صاحب یقیناً مقررون کے اس زمرہ مین نہین آتے تھے جن کو جادو بیان تو کیا غیر معمولی بھی کہا جا سکے، وہ تقریر کے فن و فسون سے بے نیاز تھے لیکن اُن کی باتون مین اثر ہوتا تھا، اور ذہن کے کسی نہ کسی حصہ مین اتر جاتی تھین۔

ان تقریرون مین بڑا خلوص بڑا وزن اور بڑی سادگی ہوتی تھی، سننے والون کو اس پر اعتماد ہوتا کہ سید صاحب کوئی ایسی بات نہ کہین گے جس کے ثبوت مین قوی سے قوی سند نہ پیش کر سکتے ہون، سید صاحب سے اختلاف کرنا بڑا مشکل تھا خواہ معاملہ ہو، علمی یا اجتماعی ہو، وہ بڑی جچی تلی، اور محققانہ رائے دیتے تھے، مجھے تقریر سننے کا بالکل شوق نہین لیکن بعض لوگون کی تقریر ضرور سنتا ہون اس لئے کہ اس کا یقین ہوتا ہے کہ یہ کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور کہین گے جس سے مین فائدہ اٹھا سکونگا ان مین سے سید صاحب ایک تھے،!

مذہب کی بات ہو یا سیاست کی، علمی مسائل ہون، یا کوئی اور بحث، سید صاحب بڑی سنجیدگی سے اظہار خیال کرتے تھے، اور دوسرون کا نقطۂ نظر سننے مین بڑے تحمل سے کام لیتے تھے، بحث مین وہ کبھی جز بز نہ ہوتے، بلند آواز سے گفتگو نہ کرتے، کسی کی بات نہین کاٹتے تھے، کوئی پھبتی فقرہ یا دل آزاری کی بات نہ کہتے، گفتگو مین کوئی کتنا ہی ناواجب لب و لہجہ کیون نہ اختیار کرتا، سید صاحب کے رکھ رکھاؤ مین ذرا فرق نہ آتا تھا،

سید صاحب کا تعلق دار المصنفین سے تقریباً ۳۰-۳۲ سال تک رہا، ان کی قیادت مین اس ادارہ کا یہ زمانہ نمایانی اور کارگذاری کے اعتبار سے بڑا شاندار رہا، مجھے یقین نہین ہے کہ مستقبل قریب مین دار المصنفین کو یہ درجہ حاصل ہو سکے گا، معلوم نہین

کیوں اور کیسے سید صاحب نے کچھ دنوں کے لئے دار المصنفین سے علیحدہ ہوکر بھوپال میں ملازمت کرلی، جو بات سید صاحب خود ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے، اس کو اُن کے سامنے میں کسی شکل میں نہیں چھیڑتا تھا، نہ اس ٹوہ میں رہتا کہ کیا ہوا، کیوں ہوا، اور یہ رویہ سید صاحب ہی کے ساتھ نہیں اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ بھی تمام عمر رہا تا وقتیکہ مجھے اس کا یقین نہ ہوجاتا کہ وہ اپنی دشواری میرے سامنے اس لئے نہیں پیش کرتے تھے کہ اُن کے خیال میں اس سے میرے ترددات میں اضافہ ہونے کا امکان تھا، ایسی صورت میں اُن کے فکر و پریشانی کا پتہ لگانے کی ضرور کوشش کرتا ہوں۔

سید صاحب بھوپال تشریف لے گئے تو وہاں سے ایک خط لکھا جس میں اس کا بالکل تذکرہ نہیں کیا تھا کہ انھوں نے دار المصنفین کیوں چھوڑا، اور بھوپال کی ملازمت اختیار کرنے کا باعث کیا ہوا، بلکہ کچھ اس طرح کی باتیں تھیں کہ بھوپال میں وقت کس طرح کٹتا تھا، کام کرنے کے امکانات کیا تھے، آیندہ کا پروگرام کیا ہوگا وغیرہ البتہ یہ بات ظاہر ہوتی تھی کہ بھوپال میں زیادہ دن قیام کرنے کا ارادہ نہ تھا۔

عرصہ ہوا میں نے ایک بار سید صاحب سے عرض کیا تھا کہ وہ کسی طرح علی گڈھ آجائیں جہاں اُن کی بڑی ضرورت تھی، پھر جب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب وائس چانسلر ہوکر علی گڑھ تشریف لائے تو موصوف بھی اس کے خواہاں ہوئے کہ سید صاحب علی گڑھ آجائیں، لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب سید صاحب ارادہ کرچکے تھے کہ وہ پاکستان ضرور جائیں گے۔ بھوپال کے قیام کے دوران میں میں نے عرض کیا تھا کہ جس طرح یا جس لئے سید صاحب نے اپنی پوری زندگی دار المصنفین کے لئے وقف کردی تھی، وہ مسلم ہے لیکن مسلم یونیورسٹی میں رہ کر کام کرنا اور اس کی شہرت میں اضافہ کرنا، اس نصب العین کے خلاف نہ تھا، جو اُن کے سامنے تھا، کام کی نوعیت دونوں جگہ تقریباً یکساں تھی، علی گڑھ میں قیام کا مزید فائدہ یہ تھا کہ نوجوان طلبہ اُن کی تصنیف ہی سے نہیں اُن کی شخصیت سے بھی بہرہ مند ہوتے۔

ملک کی فضا ان دنوں کچھ ایسی ہورہی تھی کہ سید صاحب کا بھوپال میں زیادہ دنوں تک قیام نہیں رہ سکتا تھا، میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ جب "میکدہ چھٹا" تو پھر ہرج کیا ہے، مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو، لیکن سید صاحب نہ مانے، یوں تو ہوتا وہی ہے جو اللہ کی مرضی ہوتی ہے لیکن یہ بات دل میں بار بار آتی رہی کہ سید صاحب مستقلاً [illegible]

آگئے ہوتے تو بحیثیت مجموعی اس سے بہتر ہوتا جو بعد میں پیش آیا!

سید صاحب بڑے سمجھدار شریف اور محبت کرنے والے انسان تھے، اُن کی خدمت و خاطر کرنے میں مجھے بڑی لذت اور بڑائی محسوس ہوتی تھی، کسی ذاتی معاملہ میں میرا ان کا کبھی سابقہ نہ ہوا، ہوتا تو مجھے اپنے اوپر تو اعتماد نہیں لیکن سید صاحب کے بارہ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ میری خاطر وہ سب کر ڈالتے جو شاید اپنے لئے نہ کرتے، سید صاحب اپنی بڑائی اشارۃً یا صراحۃً کبھی نہیں بیان کرتے تھے، اور دل کھول کر کسی اور کی بڑائی بھی کم ہی کرتے تھے!

فطرۃً سید صاحب خاموش، قناعت پسند اور عافیت جو تھے، وہ اپنے بچوں اور ساتھیوں کے ساتھ ہنس بول لینے میں زندگی کی تفریح پا لیتے تھے، اور خوش ہونے کے لئے کسی بڑی تقریب کے منتظر رہتے تھے، چھوٹی خوشیوں میں بڑی خوشیاں ڈھونڈھ لیتے اور پا لیتے، یہ بہت بڑی صفت اور نعمت ہے، اور بہت کم لوگوں کے حصہ میں آتی ہے،

میں نے اکثر یہ بھی محسوس کیا جیسے سید صاحب کسی قدر حزیں رہتے ہوں، کیوں اور کیسے یہ نہیں بتا سکتا، یہ میں نے کبھی اُن سے پوچھا بھی نہیں لیکن یہ حزن ان میں طبعی نہ تھا، اس لئے کہ جب کبھی ملول نہ ہوتے تو صاف معلوم ہوتا کہ طبعاً شگفتہ مزاج ہیں، سید صاحب کے ہنسنے کا انداز ایسا تھا اور اس آسانی سے وہ ہنس پڑتے تھے کہ اُن کو کوئی الم پرست، خشک مزاج، یا کم آمیز نہیں کہہ سکتا تھا، ممکن ہو یہ زندگی کے آخری دور کے تغیرات کا نتیجہ ہو،

مذہب کا جو پاس کرنے والوں سے میں ذرا کم ہی یا واسطہ رکھتا ہوں، ایسے لوگوں کو میں نے بالعموم احساس کمتری کا شکار پایا، اور یہ احساس انسان کے خصائل کو ایسا مسخ و ماؤف کر دیتا ہے، کہ شرافت و شجاعت، درگذر، دردمندی اور اس طرح کی دوسری انسانی صفات جو مذہب و اخلاق کی روح ہیں اکثر ان لوگوں میں نہیں پائی جاتی ہیں، جو اپنے آپ کو مذہب کا اجارہ دار بتاتے ہیں، اور ان اخلاقی خرابیوں میں ان کو مبتلا پایا، جن سے مذہب نے روکا ہے،

میرے ذہن میں اکثر یہ بات آتی ہے کہ مذہب بالخصوص اسلام جیسے مذہب کی پیروی کے لئے جس احساس ذمہ داری اور احترام انسانیت کی ضرورت ہے وہ ایسے لوگ کیسے پورا کر سکتے ہیں جو زندگی کی نہایت درجہ معمولی

ذمہ داریوں کو بھی سمجھنے اور نباہنے کی توفیق نہیں رکھتے، دنیا و عقبیٰ زمان و مکان کے اعتبار سے کتنے ہی مختلف ہوں لیکن یہ دونوں انسانی زندگی ہی کے دو رُخ ہیں اور انسان کے نتائج اعمال ہی کا نام عقبیٰ ہے، اسی لئے ایک مسلمان کے لئے دنیا کا مرحلہ عقبیٰ سے بھی زیادہ سخت ہے، اور جو شخص دنیاوی ذمہ داریوں سے خوش اسلوبی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا، وہ عقبیٰ میں بھی کامیاب نہیں ہو سکتا،

اس بحث کو میں پھیلانا نہیں چاہتا کہنا صرف یہ چاہتا تھا کہ ادھر کچھ عرصہ سے ہمارے طبقہ میں جس نااہل کو نفع یا نمود کی کہیں گنجایش نہیں نکلتی وہ اس مقصد کے لئے مذہب کو آلہ بنا کر ملک و ملت کا محسن بن جاتا ہے، سید صاحب کس درجہ مذہبی آدمی تھے لیکن کس طرح ان باتوں سے دور تھے، اس کا خیال کرتا ہوں تو اُن کی یاد سے دل تر و تازہ اور روح بالیدہ ہو جاتی ہے،

مذہب کے معاملہ میں سید صاحب کا رویہ نہایت شریفانہ، دانشمندانہ اور عالمانہ ہوتا، اُن کی ذاتی قومی تصنیفی، مذہبی زندگی اس پر گواہ ہے، کہ انھوں نے اسلام اور اسلامی زندگی کی حفاظت و حرمت میں اپنی بہترین صلاحیتیں بے دریغ صرف کیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے جہاں تک بن پڑا، مذہب کو خود غرض لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا بننے نہیں دیا، مجھے جس بات پر سب سے زیادہ حیرت ہوتی ہے، اور اسی اعتبار سے سید صاحب کی وقعت بڑھ جاتی ہے، وہ یہ کہ باوجود اس کے کہ سید صاحب کی تعلیم و تربیت کسی ماڈرن یونیورسٹی میں نہیں ہوئی تھی، بلکہ کلیتہً قدیم طور طریقوں پر ہوئی تھی مگر وہ یونیورسٹی کے مقصد، معیار اور وقار کا کتنا احترام کرتے تھے[1] تفصیلات میں جانا نزاکت سے خالی نہیں لیکن اتنا کہنے میں مضائقہ بھی نہیں کہ انھوں نے اکثر مواقع پر یونیورسٹی اور اس کے خدمت گذاروں کی آبرو بڑی دلیری اور قابلیت سے بچائی!

یونیورسٹی میں نارہ بس جانے کے سبب میں نے مسلمانوں کی گذشتہ ۲۰-۲۵ سال کی سیاسی اور مذہبی سرگرمیوں کا مشاہدہ بڑے اطمینان سے کیا ہے، اطمینان سے یوں کہ مجھے ازل سے ایمان عقل آرٹ وغیرہ

---

[1] دارالمصنفین تشریف لانے سے پہلے سید صاحب دکن کالج پونا میں پروفیسر تھے،

کا جو حصہ ارزانی ہوا تھا، وہ ذرا واجبی ہی تھا، اس لیے کوئی تحریک یا تہلکہ کہیں اٹھتا کیا ہی اٹھتا، میں اپنے اس بہرہ کو بچائے رکھنے کی فکر کرتا تھا، یعنی نہ ان تحریکوں اور تہلکوں سے کبھی آنکھ مچولی کی، نہ زور آزمائی، نتیجہ یہ ہوا کہ عقل، صحت، آبرو سب بحال رہے، میرا خیال یہ ہے کہ قومی تحریکوں میں بیشتر سیاست دانوں نے عوام علماء اور طالب علموں کو آنکھ بند کر کے اور جی کھول کر اپنے اغراض کے لیے استعمال کیا، پھر یہ ہوا کہ پانسہ پلٹا اور عوام علما، اور طالب علموں کے بھی دن پھرے، اب انھوں نے سیاست دانوں کی خبر لینی شروع کر دی ہے، کہیں اور کا مجھے علم نہیں لیکن ہندوستان اور پاکستان میں یہی دیکھنے میں آ رہا ہے کہیں کم کہیں زیادہ،

سید صاحب نے شروع سے سیاست میں حصہ لیا، اور جنگ بلقان سے لیکر تقسیم ہندوستان تک ہر طرح کی سیاسی اور قومی تحریکوں کی نیچ اونچ میں شریک رہے، کم خوش نصیب ایسے ہوں گے جنھوں نے سید صاحب کی طرح سیاست میں مسلسل حصہ لیا ہو، اور سیاست کی آلائشوں سے پاک رہے ہوں، سیاست کے وسیلے سے کسی منصب پر پہنچنے کے کبھی درپے نہ ہوئے، انھوں نے اپنے جو مسلک پہلے دن اختیار کر لی تھی، اسی پر اخیر دم تک قائم رہے، یہ سید صاحب کا بہت بڑا کارنامہ ہے، انھوں نے تمام عمر رائے عامہ کو صحیح تربیت دینے میں صرف کی، معمولی طریق پر نہیں، بلکہ اپنی بلند پایہ تصانیف اور تقریروں سے اور اپنی سیرت کی پختگی اور پاکیزگی سے، سید صاحب ہماری قومی زندگی میں کس درجہ دخیل رہے ہیں، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے، اس کے ساتھ ساتھ یہ کتنی بڑی بات ہے کہ اس تحریک سے تعلق رکھتے ہوئے جس سے وہ تعلق رکھتے تھے، سید صاحب کی تحریر و تقریر یا تصنیف سے کوئی فتنہ نہیں کھڑا ہوا،

کچھ عرصہ سے سید صاحب نے وفیات کے عنوان سے معارف کے صفحات پر اہم شناسا شخصیتوں کی وفات کا تذکرہ تفصیل سے لکھنا شروع کر دیا تھا، یہ مضامین ہر اعتبار سے بڑے مفید اور اہم ہوتے تھے، اور ہر حلقہ میں بڑی وقعت کی نظر سے دیکھے گئے، سید صاحب کو تاریخ اور سیرت میں جیسی بصیرت تھی، اس کی بڑی اچھی جھلک ان تحریروں میں ملتی ہے، کس حسن ترتیب اور تفصیل سے ان مرحومین کی زندگی کے واضح نقوش ان صفحات پر کھنچ جاتے

نظر آتے ہین!

ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مرنے والون کے سوانح زندگی کو سید صاحب کسی بیاض مین بڑی پابندی اور احتیاط سے قلم بند کرتے رہے ہون، اور وقت آنے پر اُن کو معارف مین نقل کر دیتے ہون، سید صاحب مین یہ بات مجھے نہایت غیر معمولی نظر آئی، یعنی اُن کا حافظہ کتنا قوی اور کس درجہ مرتب تھا کہ ۳۰-۴۰ سال کے واقعات بقید سال و ماہ و مقام بے تکلف اس طرح لکھتے جاتے، جیسے اُن کے سامنے وقوع مین آ رہے ہون، مین اسلئے کہہ رہا ہون کہ مجھے اس کا یقین ہے کہ مرنے والے کا وہ بہی کھاتہ نہ رکھتے ہون گے، بلکہ ساری باتین اُن کے حافظے مین جیتی جاگتی محفوظ ہون گی!

ان مضامین کے لکھنے مین سید صاحب بہت زیادہ احتیاط ملحوظ رکھتے تھے، بہت کم ایسا ہوا ہے جہان وہ مورخانہ حدود سے بے اختیارانہ تاثرات کے حدود مین چلے گئے ہون، ان مضامین کے بارہ مین یہ کہہ سکتے ہین کہ ان مین سید صاحب وہ فضا نہین پیدا کر سکے، یا پیدا نہین ہونے دیتے تھے، جس کے بغیر یہ مضامین اتنے مؤثر نہین ہوتے، جتنا ہونا چاہیئے، اور جس کا اس طرح کے مضامین تقاضا بھی کرتے ہین، اس نوعیت کے مضامین کی حیثیت تاریخی دستاویز کی اتنی نہین ہوتی، جتنی ایک طرح کی نذر عقیدت کی، تاریخی دستاویز مین ذاتی تاثرات کا دخل نہ ہونا چاہیئے، لیکن جہان ایک اعتبار سے نذر عقیدت پیش کی جا رہی ہو، وہان ذاتی تاثرات کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے، ان مضامین کو جہان تاریخی دستاویز ہو کر نہ رہ جانا چاہیئے، وہان خالص شاعری یا زبین ویکا بھی نہ ہونا چاہیئے، یہ تاریخ اور شاعری کے درمیان کی ایک چیز ہے، جو تاریخ نہ ہونے کے باوجود تاریخ کی جگہ لے سکتی ہے، اور شاعری نہ ہونے کے باوجود شاعری کے تقاضے پورا کرتی ہے،

یہان مین ایک بار پھر اپنی عقیدت کا اظہار کرنا چاہتا ہون کہ سید صاحب کا حافظہ کتنا قوی ذہن کتنا مرتب تاریخی احساس کتنا بیدار اپنے اور بے گانون سے تعلقات کتنے شریفانہ اور ان کی شخصیت انسانیت کا کیسا اچھا نمونہ تھی کہ وہ اتنے پاکیزہ اور متوازن مضامین وفیات کے تحت لکھتے تھے!

ایک زمانہ سید صاحب پر ایسا آیا، جب ان پر واماندگی سی طاری رہنے لگی تھی، ذہنی اور جسمانی دونون اس زمانہ مین علی گڈھ بہت کم تشریف لائے، علی گڈھ سے باہر بھی کبھی ملاقات ہوئی، تو مین نے ان کو تھکا ہارا ہی پایا، غالباً یہی دور تھا جب وہ حضرت مولٰنا اشرف علی صاحب مرحوم و مغفور کے آستانہ مبارک پر اکثر حاضر ہوتے تھے، حضرت مرحوم سے شیفتگی بے اندازہ بڑھ گئی تھی، زیادہ وقت اوراد و وظائف اور عزلت مین گزرنے لگا تھا، ممکن ہے یہی یا اس کے آس پاس کا وہ زمانہ بھی رہا ہو جب سید صاحب کو دل کی کچھ تکلیف ہوئی تھی، یہ بھی یاد آتا ہے کہ یہ زمانہ مسلمانون کی اجتماعی زندگی مین بڑے انتشار کا تھا، مجھے سید صاحب کے اس رجحان سے بڑا تردد ہوا، مین نے ایک موقع پر سید صاحب کو غالباً انہی کا ایک فقرہ یاد دلایا تھا کہ آپ کیا کر رہے ہین، جب جہاد کی صف کو مرتب اور مضبوط کرنے کا وقت آیا تو آپ خانقاہ کی آبادی بڑھانے لگے،

سید صاحب میرے اس طرح کے فقرون یا خطوط کا جواب نہین دیتے تھے، دوستون اور عزیزون سے اُن کی خیریت دریافت کرتا تو یہی معلوم ہوتا کہ بے دلی اور افسردگی کا وہی عالم ہے، پھر خط لکھتا، کبھی کبھی لہجہ خشن بھی ہو جاتا، لیکن سید صاحب کے ہان سے کوئی جواب نہ آتا، ایک دفعہ علی گڈھ آگئے، طبیعت بحال تھی، میرا جی نہ چاہا کہ اپنے پچھلے خطوط کی یاد دلاؤن، سید صاحب نے خود اس قصہ کو چھیڑا، مین نے اپنے رویہ کی معافی مانگی، کہنے لگے نہین نہین، باتین سب ٹھیک تھین، لیکن آپ کو کیا معلوم کہ مجھ پر کیا عالم گذرا، پھر مسکرا کر فرمایا

"دیوانگی ہم عالمے دارد"!

مین بھی ہنس پڑا اور سید صاحب کو کسی قدر شگفتہ پا کر عرض کیا، سید صاحب ایک بات آپ سے کہے بغیر نہ رہون گا وہ یہ کہ جو لوگ آپ کے منصب کو پہنچ چکے ہین، اُن پر کچھ ہی کیون نہ گذر جائے، وہ کسی حال مین ابھی پسپائی کا اظہار یا اعلان میرے جیسے گئے گذرے لوگون کی طرح اور اُن کے سامنے نہین کر سکتے آپ کو تو اسی جگہ کھڑا رہنا ہے جہان آپ کی اُمت آپ کو کھڑا دیکھنا چاہتی ہے! سوال یہ نہین ہے کہ آپ پر کیا گذرے گی، سوال یہ ہے کہ آپ کی امت کدھر جائے گی، سید صاحب نے بات ہنسی مین ٹال دی،

شکل صورت، وضع قطع، چال ڈھال، بات چیت ہر اعتبار سے سید صاحب کی شخصیت بڑی دل آویز اور قابلِ احترام تھی، اُن کو دیکھ اور پاکر ایک طرح کی تقویت محسوس ہوتی تھی کہ وہ شفقت کریں گے، رسوا نہ کریں گے اور جب تک ساتھ رہیں گے، زندگی میں بڑائی اور حلاوت محسوس ہوگی، جیسے وہ اپنی طرح طرح کی ذمہ داریوں کا احساس رکھتے ہیں، اپنی ہی نہیں، ہماری ذمہ داریوں کا بھی احساس، وہ ہمیشہ صاف ستھرے رہتے تھے، ظاہری اور باطنی دونوں اعتبار سے،

لباس، بستر، سازوسامان صاف ستھرا، اور سجل رکھتے تھے، اور ہر ایک میں کوئی نہ کوئی نفاست بھی ہوتی، بستربند کٹا پھٹا، میلا کچیلا، تڑا مڑا نہ ہوتا، ہینڈ بیگ چمڑے کا پرانا لیکن ستھرا اور پالش کیا ہوا، تکیہ کا غلاف اور چادر نہایت صاف، اوڑھنے بچھانے کا سامان آرام دہ اور خوشنما، لوٹا گلاس، ناشتہ دان صابون دان سب منجا ہوا، تولیہ لمبا چوڑا دبیز اور بہت صاف دھلا ہوا، سفر کتنا ہی مختصر ہو، بکس میں پہننے اوڑھنے بچھانے کھانے کا سامان رکھتے تھے، کلام پاک اور اوراد و وظائف کی کتاب بڑے ستھرے اور خوبصورت جزدان میں ہوتی، عبادت ہمیشہ چھپ کر کرتے، جس کے مہمان ہوتے، اس کے لئے تحفہ ضرور لیجاتے، تشریف لاتے تو نام بنام سب کی خیریت پوچھتے، اور چونکہ وہ میرے ہی دیار سے آئے ہوتے، اس لئے میرے تمام دوستوں، عزیزوں اور بزرگوں کی خیریت سناتے، کسی کا پیغام سناتے، کسی کا تحفہ اور کسی کی فرمائش پہنچاتے، فرمائش ساتھ کر دیجاتی، تو بڑی خوشی کے ساتھ لیجاتے، اور بڑی حفاظت سے پہنچا دیتے!

سفر میں نوکر ہمراہ نہ ہوتا، ہر کام خود کر لیا کرتے تھے، جہاں ٹھہرتے وہاں ہر شخص ہر خدمت کے لئے حاضر رہتا، میں نے یا تو ہمیشہ سپید عمامہ میں دیکھا، یانج کی صحبت میں سفید دو پلیہ ٹوپی میں جو مجھے سید صاحب پر خاص طور سے بڑی دلکش نظر آتی، کپڑا ہمیشہ بہت اچھا سلا ہوا پہنتے، اور دوسرے ہی دن شاید بدل دیتے تھے، اس لئے کہ میں نے سید صاحب کے جسم پر میلا تو درکنار کبھی ملگجا لباس بھی نہیں دیکھا، وہ بالعموم پہنتے، جو ہمیشہ صاف ستھرا ہوتا، رومال نہایت صاف رکھتے تھے، اور بہت جلد بدل دیتے تھے،

کھانا بڑے سلیقہ سے کھاتے تھے، اور دسترخوان کے آداب اس خوبی اور نفاست سے برتتے تھے کہ دل خوش ہو جاتا تھا، جو چیز جتنی چمچے میں آجاتی، اتنی ہی پلیٹ میں رکھ لیتے، کھانا کتنا ہی لذیذ یا ان کا مرغوب کیوں نہ ہوتا، لیتے تھوڑا ہی، جی چاہتا تو تھوڑا سا دوسری بار بھی لے لیتے، جو چیز پسند آجاتی اس کی بڑے شگفتہ اور شریفانہ انداز سے تعریف کرتے، دسترخوان پر زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو مخاطب کرکے نرم لہجہ میں لطف و محبت کی باتیں کرتے، جن دوستوں نے شبلی منزل کی صحبتیں اور وہاں کی مہمان نوازی دیکھی ہے، وہ جانتے ہوں گے کہ دسترخوان پر سید صاحب کا رکھ رکھاؤ کوئی نئی یا تعجب کی بات نہ تھی!

سید صاحب میں ایک خوبی ایسی تھی جس کی میں دل سے قدر کرتا ہوں یعنی مہمان ہو کر وہ میزبان کے فرائض غصب کرکے اپنی ضیافت و حکم برداری میں نہیں لے لیتے تھے، جیسا کہ اکثر نہایت درجہ سرگرم اور مخلص مہمان کیا کرتے ہیں، یعنی خود ہر کھانا میزبان کے سامنے پیش کرنا، اور اصرار کرنا کہ وہ ضرور کھائے اور نہ کھائے تو وجہ بتائے اور وجہ بتائے تو یہ تعزیت کا رزولیشن پاس کریں، یا کوئی چورن تجویز کریں!

اس طرح کی باتیں بیان کرنا ضروری نہ تھا، لیکن میں کسی آدمی کی سیرت اور شخصیت کا اس سے بھی اندازہ لگاتا ہوں کہ وہ میزبان یا مہمان کی ذمہ داریوں سے کس طرح عہدہ برآ ہوتا ہے اور کس حد تک دسترخوان کے آداب ملحوظ رکھتا ہے، میں اپنے مہمانوں سے خواہ ان میں محترم خواتین ہی کیوں نہ ہوں، حتی الوسع اصرار نہیں کرتا کہ وہ فلاں چیز ضرور کھائیں، یا کتنی کھائیں، کھانا سامنے ہے، اور انہی کے لئے ہے، بڑے شوق، اور اخلاص سے پیش کیا جا رہا ہے، اب اگر وہ اس درجہ شرمیلے، شاندار اور سادہ لوح واقع ہوئے ہیں کہ بغیر قول قسم یا منت سماجت کے کچھ نہیں کھانا چاہتے، تو ذمہ داری اُن کی ہے، میری نہیں، میں مہمان کا خیر مقدم کرتا ہوں، اس لئے کہ میں اُس کی طرح طرح سے خدمت اور خاطر کروں گا، اور اپنے طور پر اپنے لئے خوش ہونگا اس لئے کہ مہمان کو کھانا کھلانے سے ثواب ملتا ہے، اور عاقبت سنورتی ہے!

میں سمجھتا ہوں کہ ہم میں بہت کم لوگ ایسے ہیں خواہ وہ کتنے ہی پڑھے لکھے یا ملک و ملت میں مقتدر کیوں

نہ ہون جو دسترخوان کے آداب سے واقف ہون اور اُن کو برت سکتے ہون، کھانے پر کھانے سے یا کھانے والون کے ساتھ تبختر بے جا تکلف یا بے تکلفی برتنا بڑی کم سمجھی کی بات ہے جس کو لوگ بے تکلفی سمجھتے ہین، وہ بڑا نازک مرحلہ ہے، اس نزاکت کو سمجھنا اور نباہنا بڑا مشکل کام ہے، بے تکلفی کا تعلق فن سے نہین تہذیب سے ہے! کھیل مین کھانے پر اور سفر مین ہر شخص کا عیب و ہنر کھل جاتا ہے، خواہ وہ اس کے چھپانے کی کتنی ہی کوشش کیون نہ کرے، مین نے سید صاحب کو میزبان اور مہمان دونون حیثیتون سے برتا ہے، اور دونون اعتبار سے وہ میری میزان پر پورے اُترے ہین، سید صاحب کی جو بڑائی میرے دل مین ہے اس مین سید صاحب کی اس خوبی کا خاصہ اونچا درجہ ہے!

سید صاحب نے دار المصنفین کا کام غالباً ۱۹۱۵ء مین سنبھالا، اس وقت سے لیکر تقسیم ملک تک کم و بیش ۳۲ سال وہ اس ادارہ مین یا یہ ادارہ سید صاحب مین اس طرح گھلے ملے رہے کہ دونون کو ایک دوسرے سے تمیز کرنا مشکل تھا، دار المصنفین کا خیال کیجئے تو ذہن فی الفور سید صاحب کی طرف منتقل ہوتا تھا، اور سید صاحب کو دیکھئے تو دار المصنفین سامنے آجاتا تھا، کسی ادارہ کی روایت و شخصیت اسی طرح وجود مین آتی اور برگ و بار لاتی ہے!

شبلی منزل ایک خالص علمی ادارہ ہونے کے علاوہ زندگی کی بہت سی دوسری اعلیٰ و صحت مند سرگرمیون کا بھی گہوارہ تھا، کتنے دانایانِ سیاست، اربابِ فضیلت، اور شیدائیانِ شعر و ادب یہان سے نسبت رکھنا اپنے لئے ایک امتیاز سمجھتے تھے، جن دوستون کو شبلی منزل مین قیام کا اتفاق ہوا ہے، اور جنھون نے وہان کی مدارات و مہمان نوازی رفقا کا آپس کا میل محبت اور کام کرنے کا شغف دیکھا ہے، وہ بتا سکین گے کہ اعظم گڈھ کا یہ مختصر ساخطہ جو کسی طرح ایک اوسط درجہ کے باغ کے رقبہ سے زیادہ نہین ہے، شمالی ہند کی روایتی تہذیب و دانش و بینش کی نہ صرف نمایندگی کرتا رہا، بلکہ اس مین خاطر خواہ اضافے کرتا رہا!

کوئی مہمان عزیز آجاتا تو دار المصنفین کے سارے لوگ ایک دسترخوان پر کھانا کھاتے، کھانے متنوع اور بہت اچھے پکے ہوئے نیچے پایہ کی ہموار اور یکسان چوکیون پر نہایت تکلف سے اعلیٰ درجہ کا سفید دسترخوان بچھایا جاتا جس پر بڑے خوبصورت اور ستھرے برتنون مین یہ کھانے چنے جاتے، لوگ حسب مراتب قالین اور چاندنی پر

چوکیون کے گرد بیٹھ جاتے، سید صاحب میزبانی کے فرائض انجام دیتے، یہ تقریب اور اس طرح کی تقریب محض کھانے پینے کی نہ ہوتی، بلکہ اس سے آدمی کی بہت سی ذہنی گتھیاں سلجھ جاتین، اور زندگی کی جدوجہد مین حصّہ لینے کا حوصلہ پیدا ہو جاتا!

مل جل کر بیٹھنے کھانے پینے اور بات چیت کرنے کے فوائد کا اندازہ بہت کم لوگ کر سکتے ہین، علی گڈہ کی جن خصوصیات اور خوبیون کو متفقہ طور پر سراہا گیا ہی، ان کو بروے کار لانے مین علی گڈہ کی اس روایت کو بڑا دخل ہی کہ یہان ساتھ کھانا کھانے اور دسترخوان کے پورے آداب برتنے کا خاص طور پر التزام رکھا جاتا ہے!

رات مین میرے ہان جب کھانا ختم ہو لیتا اور سید صاحب کے متقدین اپنے گھرون کو چلے جاتے تو بعض مسائل پر اطمینان سے دیر تک گفتگو ہوتی، کوئی اور نہ ہوتا، اس لئے سید صاحب سے بات کرنے مین مین ذرا بے تکلفی، اور بے باکی کو بھی دخل دے جاتا، سید صاحب بڑی توجہ سے تمام باتین سنتے، کبھی کبھی کوئی فقرہ بڑے لطف کا، اور کبھی ایک آدھ بڑی حسرت سے کہہ جاتے!

ایک رات زیادہ دیر تک اسی طرح کے مسائل پر گفتگو ہوتی رہی، سید صاحب نے ان تمام تعلیمی طریقون کا ذکر کیا، جو گذشتہ عہد کے مسلمانون مین رائج تھے، پھر موجودہ حالات پر تبصرہ کرتے رہے، سید صاحب کی اس رات کی گفتگو بڑی عالمانہ اور دلنشین تھی، وہ رہ رہ کر اس پر زور دیتے کہ جب تک تعلیم بطور شرف وسعادت حاصل نہ کی جائے گی، معاشرہ کا قوام اعتدال پر نہ آئے گا، محض روٹی کمانے یا دولت جمع کرنے کی نیت سے تعلیم دینا یا تعلیم حاصل کرنا ہمیشہ بے برکتی کا موجب ہوگا،

مین نے عرض کیا سید صاحب آج کل معمولی سے معمولی کام بھی مخصوص تعلیم و تربیت حاصل کئے بغیر اختیار نہین کیا جا سکتا، اور دنیا میں کامون کی نوعیت اتنی بڑھ گئی ہے، اور تیزی سے بڑھتی جا رہی ہو کہ اب محض تعلیم کی خاطر تعلیم کون حاصل کرے، یہ تو نہ ممکن ہو نہ مناسب، سید صاحب نے، اس سے اتفاق کیا، لیکن فرمایا کہ ان کا مطلب تعلیم کے ابتدائی مدارج سے تھا: مثلاً آٹھوین نوین جماعت تک جہان پہنچ کر بچون کی اخلاقی بنیاد ایک حد تک

استوار ہو جاتی ہے، پھر فرمانے لگے ہمارے ہاں بچوں کو تعلیم دینے اور ان کا اخلاق سدھارنے کا کام یا تو ماسٹر کے سپرد ہے یا مُلا کے، اور دونوں ایسی معاشی زبون حالی اور اس کے عواقب میں مبتلا ہوتے ہیں کہ وہ ایسی اہم خدمات ٹھکانے سے انجام نہیں دے سکتے، جہاں سب سے زیادہ ذمہ داری کا کام سب سے معذور ہاتھوں میں دیا جائے گا، وہاں صلاح و فلاح کی کیا صورت نکل سکتی ہے،

یہ رات مجھے خاص طور پر یاد رہ گئی ہے، وقت زیادہ گذر گیا تھا، اور سید صاحب تہجد کی تیاری کرنا چاہتے تھے، میں اٹھ کھڑا ہوا، تو فرمانے لگے،

"رشید صاحب! شب آخر گشت و افسانہ از افسانہ می خیزد" زندگی کا بھی عجیب ڈھنگ ہے جب کچھ باتیں قابو میں آنے لگتی ہیں، اور حوصلہ ہوتا ہے کہ اب انھیں پیش کریں گے تو رخصت ہونے کا پیغام آجاتا ہے جس شوق اور محنت سے جو کچھ دیکھا سیکھا، پڑھا تھا اب وہ برگ و بار لانے والا تھا کہ عمر کا آفتاب غروب ہونے لگا، اس برگ و بار کا کیا ہوگا، جب سے تمدن کا آغاز ہوا، اور جب تک دنیا کا کارخانہ قائم رہے گا، اس طرح کے کتنے حسرتناک سانحے پیش آتے رہے ہیں، اور آتے رہیں گے،!!

میں گھبرا سا گیا، سید صاحب کے اس موڈ (کیفیت ذہنی) سے میں خود بچنا چاہتا تھا، اور سید صاحب کو بھی بچانا چاہتا تھا، میں نے کہا سید صاحب آپ کے دل میں جو بات آئی ہے کون ایسا شریف اور صاحب علم و فن ہے جس کے دل میں نہ آئی ہو گی، عظیم شخصیت اور عظیم فن کار اس کیفیت میں مبتلا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، لیکن آپ تو اللہ کی مشیت و مصلحت کے مجھ سے زیادہ قائل ہیں، یہی نہیں بلکہ مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ آپ بہتوں سے زیادہ اس کے مقرب بندوں میں ہیں، آپ اس کا غم کیوں کریں کہ آپ جتنا دیکھنے تھے وہ دے نہ سکے، غم اسے ہو جس نے ایسا ہونے نہ دیا!

جب تک ارادہ اور عمل آپکے بس میں رہا، آپ نے فرائض کے ادا کرنے میں کوتاہی نہ کی، بلکہ فرض سے زیادہ کر دکھانے کے آرزو مند رہے، جب آپ کو یا مجھے کار آمد کارآفریں رکھنے کے بجائے معطل و معزول کر دیا گیا (موت

واقع ہوئی) تو ہمارا کیا قصور، اور جب ہمارا قصور نہیں تو انجام کچھ ہی ہو، زندگی کی مہم میں فتح ہماری ہی رہی، !

سید صاحب مسکرائے لیکن یہ مسکرانا کسی اور سبب سے اتنا نہ تھا، جتنا شاید میرے اظہار قابلیت یا طلاقت لسانی پر، لیکن میں بھی نہ جھجکا، بلکہ دل ہی دل میں کسی قدر جھنجلا کر بولا، سید صاحب مایوسی اور مصائب کا علاج منطق فلسفہ الٰہیات وغیرہ میں ڈھونڈنے سے علامہ لوگوں کو مل جاتا ہو، تو مل جاتا ہو اس خاکسار کو تو آج تک نہیں ملا،

سید صاحب نے میرے لہجے کی تلخی یا بے باکی کو غالباً محسوس کر لیا تھا، مسکرا کر بولے، اور کیوں جناب آپنے "علامۂ دور" خاکسار میں کوئی خاص رعایت تو مدِ نظر نہیں رکھی ہے، ! مجھے بے اختیار ہنسی آگئی، میں نے کہا سید صاحب جب تک آپ کا ذہن ایسے موقعوں آپ کا ساتھ دیتا رہے گا، آپ کو اپنی طرف سے اطمینان ہو یا نہیں، مجھے آپکی طرف سے اطمینان رہے گا، !

پھر میں نے کہا سید صاحب آپنے جو بات کہی وہ مجھ سے اٹھائے تو نہیں اٹھتی لیکن مجھے تو اس مسلمان جنرل کی ادا پسند آئی جس نے یہ عہد کر لیا تھا کہ جہاں تک خشکی ملے گی، وہ خدا کے نام پر فتح کرتا چلا جائے گا، فتح کرتے کرتے خشکی کا حصہ ختم ہو کر سمندر آگیا، تو اُس نے گھوڑے کو پانی میں ڈال دیا، اور کہا بار خدایا خشکی ختم ہوگئی، میرا عہد بھی ختم ہوتا ہے، تو سید صاحب اللہ کے ساتھ اس کے سپاہیوں کا یہی معاہدہ ہوتا ہے، اس کے بعد نام اللہ کا، !

سید صاحب پھر مسکرائے اور فرمایا، اب جا کر آرام کیجئے، آج بڑی دیر ہوگئی !

بالآخر یہ ہوا کہ سید صاحب پاکستان تشریف لے گئے، میں یہ جانتا تھا کہ سید صاحب جائیں گے ضرور گو معلوم نہیں، کیوں یہ بھی محسوس کرتا تھا کہ سید صاحب وہاں خوش نہ رہیں گے، تقسیم ملک کے بعد سید صاحب سے ایک بار کسی قدر اطمینان کی ملاقات ہوئی، اثنائے گفتگو میں فرمایا، رشید صاحب عجب بے بسی کا عالم ہے، بن بیاہی لڑکیاں اور بوڑھے ماں باپ تو یہاں رہ گئے نوجوان پاکستان چلے گئے، کیا کیا جائے کیا ہوگا، اس طرح کی بعض دوسری مصیبتوں کا ذکر بھی بڑی مایوسی سے کیا، سید صاحب کی اس گفتگو سے میرا دل بھر آیا، اس لئے اور کہ سید صاحب اس طرح کی باتیں اکثر نہیں کرتے تھے، معلوم نہیں کیوں اور کیسے، میرے دل میں وسوسہ سا پیدا ہوا کہ دیکھئے آئندہ

سید صاحب پر کیا گذرتی ہے،

سید صاحب پاکستان گئے تو ، دنون خبر نہ آئی ایک دن اخبار مین پڑھا کہ اُردو کے مسئلہ پر تقریر کرنے کے دوران مین ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبہ نے سید صاحب کو تکلیف پہنچائی، بڑا قلق ہوا، سید صاحب کے لئے یون کہ کس منزلت کا آدمی کہان جاکر کس بنا پر رسوا ہوا، اور طلبہ کے لئے یون کہ طالب علم بالخصوص یونیورسٹی کے طالب علم سے بڑھ کر قیمتی متاع کسی قوم اور ملک کی کیا ہوگی، اس نے یہ سلوک سید صاحب سے کیا، جن کی علمی، مذہبی، قومی، تہذیبی خدمات اس صدی مین اتنی زیادہ اور اتنی گرانمایہ تھین کہ کسی ایک شخص کی نہ تھین، پھر علماء کی رسوائی سلاطین کے ہاتھون تو سنی تھی، طلبہ کے ہاتھون کبھی سننے مین نہین آئی تھی،

اگر ایک عالِم کی موت عالَم کی موت ہے تو ایک عالم کی بے حرمتی کیا ہوتی ہوگی !

# استاذ مرحوم

## (نقوش و تاثرات)

از مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم

"دنیا کی بے ثباتی اور ناپائداری کا یہ منظر بھی کس قدر عبرت آموز ہے کہ شفیق و محبوب استاذ کی یادگار میں ایک عزیز اور سعادتمند شاگرد کا مضمون اس وقت شائع ہو رہا ہے، جب وہ خود دوسروں کے لئے یادگار بن چکا ہے، جب یہ مضمون لکھا گیا ہے اس وقت کس کو یہ گمان ہو سکتا تھا کہ اس کی اشاعت سے پہلے ہی شاگرد خود استاذ کے حضور میں پہنچ جائے گا،" "م"

ٹھیک ٹھیک یاد نہیں پڑتا کہ پہلے پہل نام کب سُنا؟ حافظہ پر زور دینے سے اتنا خیال آتا ہے کہ ایک مرتبہ اپنی طالب علمی کے آغاز میں۔ غالبًا گیارہ بارہ سال سے زیادہ عمر نہ ہوگی۔ ایک ہم سبق دوست محمد شمیم[۱] دسنوی کے گھر پہنچا تو دیکھا وہ ایک اردو کتاب پڑھ رہے ہیں، پوچھا کیا پڑھتے ہو؟ بولے تم نہیں جانتے؟ مولوی سلیمان صاحب کی سیرۃ النبی ہے" یہ ۲۲ء کا ذکر ہے، اس کے کچھ ہی دن بعد ہمارے مدرسہ[۲] میں اردو اخبارات اور رسالوں کا چرچا ہونے لگا، ایک انجمن قائم ہوئی اور رسالے اور اخبار جاری کرائے گئے، اسی سلسلہ میں پہلی مرتبہ رسالہ المعارف کا نام سننے میں آیا، بڑی رد و کد کے بعد جاری ہوا، تو وہ المعارف کے بجائے معارف نکلا، سب سے پہلا پرچہ جو ہماری نگاہ سے گزرا وہ نومبر ۲۵ء کا شمارہ تھا، اس کا سپید غلاف اب تک نگاہوں کے سامنے ہے، اس میں ایک مقالہ (استاذی

---

[۱] ڈاکٹر سید محمد شمیم ام، بی، ایس [۲] مدرسہ عزیزیہ بہار شریف پٹنہ،

عز اسمہ پر ایک اجمالی مگر غائر نظر) تھا، جو گو ہم نے پڑھا، مگر پلّے کچھ نہ پڑا، ایک مضمون شاید مولانا عبدالعزیز میمن کا بھی تھا، وہ بھی ہماری استعداد سے بلند تھا، مگر اس کے باوجود بڑے ذوق وشوق سے رسالے کا حرف حرف پڑھا گیا، اڈیٹر کی وقعت وعزت دل میں گھر کرتی گئی، اور وہ چار نمبروں کے بعد تو اُن کے علم کا سکہ دلوں پر بیٹھ گیا، یہ تاثر راقم اور اس کے اکثر احباب کا تھا،

اس کے بعد معارف کے علاوہ مدیر معارف کی ایک دو کتابیں اور پڑھیں، ان میں خطبات مدراس کی یاد تازہ ہے، بڑے ذوق وشوق اور عقیدت کے ساتھ پڑھی گئی، اور مصنف سے ملنے کا خیال دل میں چٹکیاں لینے لگا، پھر قدرت کا کرنا کچھ ایسا ہوا کہ ۲۷ء کے اکتوبر میں مصر کے کچھ عربی رسالے نظر سے گذرے اور ایک دوست[1] کی عنایت سے الہلال (مصر) کی متعدد جلدیں مل گئیں، راقم بے سوچے سمجھے اُن کی تلاوت میں لگ گیا، اُن دنوں الہلال میں طٰہٰ حسین کے مضامین اکثر شائع ہوتے تھے، یہ نا آشنائے کوچۂ ادب پہلے پہل اُن سے بہت متاثر ہوا اور جی میں آنے لگا کہ "مصر چل کر ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیجئے"

اس خام خیالی میں ایک اور دوست[2] بھی ہم نوا تھے، انھوں نے تو راست خط وکتابت بھی شروع کردی، راقم نے مولانا سید سلیمان ندوی (یہ اس وقت کی زبان نقل کر رہا ہوں) سے مراسلت کی طرح ڈالی، پہلا خط گھنٹوں کی محنت کے بعد ٹوٹی پھوٹی عربی میں غالباً میری زندگی کا یہ پہلا عربی خط تھا، اعظم گڈھ کے پتہ پر لکھا، اتفاق سے مولانا رمضان گذارنے کے لئے دیسنہ آئے ہوئے تھے، جواب وہیں سے ملا، اور بہت حوصلہ افزا، مصری درسگاہوں کے متعلق استفسار کے جواب میں ارشاد ہوا، "بہتر ہوگا کہ تم سال دو سال کے لئے ندوہ میں داخلہ لے لو" جواب سلیس اور سادہ عربی میں تھا، زبان دل کو لگ گئی، پڑھتے پڑھاتے خط ازبر ہوگیا، اب کیوں چوکتا؟ دوسرا خط فوراً ہی دیسنہ کے پتہ پر حاضر کیا، اس کا جواب بھی بروقت ملا، اس میں حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ طٰہٰ حسین اور اس کی ذریات پر سخت تنقید بھی تھی، غالباً راقم نے خط میں اس کی ثنا خوانی کی تھی، ساتھ ہی ساتھ یہ خوشخبری بھی تھی" میں دوسری

---

[1] حکیم حافظ قاری یوسف حسن خان صاحب، بہار شریف (پٹنہ) [2] جوان مرگ ابو یوسف ندوی مرحوم (ف ۱۹۳۲ء)

شوال کو اعظم گڈھ جا رہا ہوں"۔ بس، پھر کیا تھا، دن گننے لگا، روانگی تو بہر حال بہار شریف ہی کے اسٹیشن سے ہوگی، یہ موقع کیوں ضائع کیا جائے؟ یہ دوسرا مکتوب بھی اُسی سہل ممتنع زبان میں تھا، یہ بھی دوستوں کو پڑھتے پڑھاتے یاد ہو گیا اور آج ۲۶ سال گذرنے کے بعد بھی یہ دونوں خط اب تک حرف بحرف یاد ہیں، نوجوانی کا شوق اسی کو کہتے ہیں۔

یہ مارچ ۲۸ء (رمضان ۴۶ھ) کا ذکر ہے،

۲ر شوال ۴۶ھ کو وقت سے پہلے اسٹیشن پہنچ گیا، ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو ایک وجیہ نورانی چہرہ نظر آیا، سفید براق عمامہ، قاعدے کی سلی ہوئی شیروانی، ہاتھ میں ایک خوبصورت چھڑی، اور پاؤں میں گوہ کے چمڑے کا سادہ لیکن نفیس جوتہ، ہو نہ ہو، یہی علامہ سید سلیمان ندوی ہیں یقین تھا، پر کسی سے تصدیق کرلوں تو آگے بڑھوں، حسنِ اتفاق سے قریب ہی پٹنہ کے شہر کے طبیب حکیم عبدالقیوم صاحب ڈیانوی پر نظر پڑ گئی، اُن سے ڈرتے ڈرتے اپنے خیال کی تصدیق کی، پھر آگے بڑھ کر سلام و مصافحہ کی سعادت حاصل کی، فرمایا "میں نے تمھیں نہیں پہچانا"۔ عرض کیا: خاکسار کا یہ پہلا موقع ہے"۔ پھر اپنے خطوط کا ذکر کیا، دریافت کیا "کیا پڑھتے ہو، اور کس سے پڑھتے ہو؟" پھر ارشاد ہوا: "درسی کتابوں کے علاوہ کیا پڑھتے ہو"۔ الہلال اور دار الہلال کے ہفتہ وار اخباروں کا نام سُن کر فرمایا "یہ کیا پڑھنے کی چیزیں ہیں؟ مقدمہ ابن خلدون اور المثل السائر (ابن اثیر) پڑھا کرو"۔ مقدمہ ابن خلدون اور المثل السائر تو اس وقت میرے بس کی نہیں تھیں، پر الہلال کے متعلق مولانا کا ارشاد نہیں بھولا،

دوسرے دن مدرسہ پہنچا، تو اپنے ہم چشموں کو انٹرویو کی داستان مزہ لے لے کر سنائی، ہمارے مدرسہ کے ادیب مولانا انوار الحق منوی اعظمی مرحوم، دیوبند کے فارغ اور بڑے ذہین آدمی تھے، جدید مصری ادب میں الہلال کا ان پر گہرا اثر تھا، میں نے جب علامہ ندوی کی رائے سنائی تو وہ جھنجھلا کر بولے: "معارف میں بھی الہلال کے ترجمے کے سوا کیا ہوتا ہے؟ ایک تو علامہ کا علمی رعب، دوسرے معارف پر اپنے استاد کی ناروا تنقید نے مجھے اُن سے بدگمان کر دیا، "آخر تین سال سے میں بھی معارف پڑھتا ہوں، الہلال کا ترجمہ کہاں ہوتا ہے؟ مولوی صاحب یقینی تعصب سے کام لے رہے ہیں"۔ یہ خیال میرے دل میں جاگزین ہوگیا، رسالہ الزہرا بھی قاہرہ سے آنے لگا تھا۔

"لوگ اس سے (میری طرف اشارہ کرتے ہوئے) مٹھائی مانگ رہے ہیں، یہ اپنی جماعت میں اول آیا ہے"

ان فقروں سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی توجہ ہوئی، اور عجیب اتفاق کہ مولانا فراہی کی مجلس میں یہ میری پہلی اور آخری حاضری تھی، مگر اس کی یاد اب تک باقی ہے،

ستمبر ۱۹۲۹ء اور اس کے بعد کا ذکر ہے، اب میں درجۂ تکمیل ادب کا طالب علم ہوں، یوں تو تکمیل کے پہلے سال میرے باقاعدہ استاذ مولانا عبدالکلیم صدیقی، (استاذ تفسیر و ادب دار العلوم ندوۃ العلماء) تھے لیکن مشورہ سید صاحب سے ضرور کرتا، اور مراسلت بھی ہوتی، مگر بسا اوقات جواب زبانی ملتا، یہ تحریر لکھنے بیٹھا ہوں تو اس زمانے کی بھولی بسری باتیں یاد آرہی ہیں، ایک آدھ بات تو بیان کرہی دی جائے، راقم اور محمد ناظم صاحب[۱] (جو اس وقت چھٹی جماعت میں پڑھتے تھے، مگر ادبی استعداد بہت بلند تھی) کو عربی کا جنون تھا، ندوہ میں بعض طلبہ ہماری اصطلاح میں شعوبی یعنی عربی کے مخالف تھے، وہ اردو میں کمال پیدا کرنا ہی اپنا منتہائے نظر سمجھتے تھے، ہماری ان کی کشمکش رہتی تھی، محمد ناظم صاحب اپنی ذہانت اور اعلیٰ استعداد کے باوجود عزم کے کمزور ہیں، ان پر کبھی کبھی "شعوبیوں" کے طعنے کا اثر ہوجاتا، ایک شام کو ہم لوگ سید صاحب قبلہ کے ساتھ لال باغ[۲] سے موتی محل کے پل کی طرف آرہے تھے کہ محمد ناظم صاحب نے کہا:-

"عربی پڑھتے تو ہیں مگر یہاں اس سکے کی کیا قیمت؟"

سید صاحب نے یہ سن کر بڑی تسلی دی اور فرمایا:

"میرا بھی یہی خیال تھا، مگر جب وفد خلافت میں یورپ جانا ہوا، تو یہ عربی کام آئی، اور اس وقت دار العلوم کی ابتدائی مشق کا فائدہ معلوم ہوا، مولانا محمد علی نہ عربی بول سکتے تھے، نہ فرنچ، اور عرب ملکوں کے وفود عربی بول سکتے تھے، یا فرنچ — ایسے تمام اہم موقعوں پر میری عربی کام آئی،

---

[۱] مولانا محمد ناظم ندوی، شیخ الجامعہ، جامعہ عباسیہ، بہاولپور [۲] لال باغ لکھنؤ کا ایک محلہ ہے، جہاں نواب علی حسن خاں صاحب مرحوم کی کوٹھی تھی،

"پھر دوسری مرتبہ موتمر اسلامی مکہ مکرمہ مین اس مشتی نے پورے ہندوستان کی لاج رکھ لی،

گھبراؤ نہین، جوہر ضائع نہین ہوتا"

کس قدر صائب رائے اور کتنی دوربین نظر تھی؟ آج ندوہ کے وہ طالب علم جو عربی لکھنے بولنے پر پوری قدرت رکھتے ہین، ہاتھون ہاتھ لئے جا رہے ہین، خود محمد ناظم صاحب کو اس کا عملی تجربہ ہو رہا ہے، اس سال کا ایک اہم واقعہ طلبۂ ندوہ کی اسٹرائک تھی، (مئی ۳۰ئہ)۔ بات معمولی تھی، بڑھ گئی، سید صاحب قبلہؒ نے بڑی کوشش کی، مگر نوعمر اور پرجوش طالب علمون نے ایک نہ مانی، اسٹرائک ناکام رہی، اور جولائی ۳۰ئہ مین دارالعلوم کھلتے ہی دھڑا دھڑ معافیان داخل ہونے لگین، چھ طالب علم (جن پر قیادت کا الزام تھا) خارج کئے گئے، اور ندوہ کی اصطلاح مین "ممنوع الادخال" قرار پائے، ان مین ایک راقم بھی تھا، گو میری حیثیت عام طالب علم کی نہین رہی تھی، لیکن یہ واقعہ ہے کہ دار کونسل یا مجلس عمل کا ممبر مین بھی تھا، اس نئے میرے باب مین اساتذہ کی رائے مختلف تھی، اور اسی اختلاف سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سید صاحب قبلہ نے میرا اخراج منسوخ کرا دیا، باقی دوسرے پانچ قائدین کے داخلہ سے بھی حضرۃ الاستاذ کو اختلاف نہین تھا، اور نواب صاحب بھی تیار تھے، مگر ندوہ کی مجلس انتظامی کے ایک ندوی رکن نے سید صاحب کی نہ چلنے دی، حالانکہ استاذ مرحوم معتمد تعلیم تھے، وہ چاہتے تو اپنے اختیار خاص سے بعض معاف کر دیتے، مگر سید صاحب قبلہ لڑنا نہین جانتے تھے، اور ان کے بعض رفیقون نے اُن کی اس نرم مزاجی سے ہمیشہ ناروا فائدہ اٹھایا، جس کا اُن کی صحت پر بھی اثر پڑتا رہا —

تکمیل ادب کے دوسرے سال ہماری زندگی بدل گئی، ندوہ مین بہار کا موسم آیا، یعنی اگست ۳۰ئہ مین استاذ محترم شیخ تقی الدین محمد بن عبدالقادر الہلالی المغربی تشریف لائے، ندوہ کی تاریخ مین یہ پہلا موقع تھا کہ ایک چوٹی کے عرب ادیب و زبان دان نے کرسی تدریس کو زینت دی، — بس پھر کیا تھا، سارے مشاغل بالائے طاق رکھ کر زبان و ادب کی تحصیل مین لگ گیا، علی میاں[۵۱] (جنھین خلیل عرب[۵۲] صاحب کی صحبت مین زبان کا خاصا ذوق

---

[۵۱] مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی (معتمد تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء) [۵۲] شیخ خلیل بن محمد بن حسین ندوی (یمنی الاصل)

پیدا ہو چکا تھا اور اب زیادہ تر حدیث کے درس مین مشغول رہا کرتے تھے ) بھی از سر نو نحو و ادب کی تجدید و تکمیل مین لگ گئے ، اکثر ہم لوگون کا ساتھ رہتا ، ہلالی صاحب بھی ہم لوگون سے بہت خوش تھے ، ہمارے علاوہ محمد ناظم صاحب اور ابو اللیث[1] صاحب کا بھی ، ہلالی صاحب کے خاص شاگردون مین شمار تھا ، سید صاحب قبلہ جب بھی تشریف لاتے ، ہلالی صاحب سے ملتے ، اور ان کا بڑا احترام کرتے ، ہلالی صاحب ہم لوگون کی بہت تعریف کرتے ، اور بار بار زور دیتے " ان لوگون سے ندوہ مین تدریس کا کام لیا جائے "

باتین بہت ہین ، اس دوران مین ایک اور دلچسپ بات عرض کر دی جائے ، تو اچھا ہو ، ہلالی صاحب کی آمد سے پہلے راقم یکسو نہین تھا ، طب کی تحصیل کا خیال بھی بار بار آتا ، علی گڑھ سے دستور العمل منگوا کر تیاری بھی شروع کر دی تھی ، سید صاحب قبلہ سے مشورہ کیا ، تو کچھ دیر خاموش رہے ، پھر فرمایا ،

" جو چاہو کرو ، مگر طالب علمی کو پیشہ نہ بنانا "

( ۴ )

ستمبر ۳۱ء مین تکمیل ادب کا امتحان ہوا ، تاثیر الاسلام فی الشعر العربی ( اسلام کے اثرات عربی شاعری پر ) اطروحہ ( Thesis ) کا عنوان تھا ، اطروحہ منظور ہوا ، اور راقم نے وطن کی راہ لی ، اور انگریزی زبان کی تحصیل و تکمیل مین لگ گیا ، ادھر ہلالی صاحب نے سید صاحب کو ایک عربی ماہنامہ نکالنے کی ترغیب دی اور راقم کا نام ادارت کے لئے پیش کیا ، تجویز طے پا گئی ، اور علی میان نے فرحا مسرت سے فوراً اطلاع دی ، اور راقم انگریزی پروگرام کی بساط الٹ ، لکھنؤ پہنچ گیا ، ( مارچ ۳۲ء ) - مئی ۳۲ء ( محرم الحرام ۱۳۵۱ھ ) سے " الضیاء " کا اجراء عمل مین آیا ، عام طور پر زبان کی تصحیح ہلالی صاحب کرتے اور دوسرے امور کے متعلق سید صاحب قبلہ ہدایتین دیتے ، یہ پہلا موقع تھا کہ حضرۃ الاستاذ کی راست نگرانی ، اور سرپرستی مین کام کرنے کا موقع ملا ، یہ سلسلہ تقریباً چار برس جاری رہا ، پہلے دو سال ہلالی صاحب مدظلہ کے مشورے بھی رہنمائی کرتے تھے ، ہلالی صاحب کے چلے جانے کے بعد

---

[1] مولانا ابو اللیث ندوی اصلاحی اعظمی ، امیر جماعت اسلامی ہند ( رام پور )

دو برس، صرف سید صاحب قبلہ کی نگرانی اور مشورے اس ناتجربہ کار اڈیٹر کے لئے مشعل راہ بنے رہے، ان چار سالوں میں بہت کچھ سیکھا، اور جس چیز کو زندگی کا تجربہ کہتے ہیں، وہ پہلی مرتبہ حاصل ہو رہا تھا، سید صاحب قدم قدم پر ٹوکتے معمولی زبان کی غلطیوں کی نشان دہی فرماتے، کتابت کے متعلق بھی مشورے دیتے، مضامین کی سطحیت پر تنبیہ کرتے، اور ساتھ ساتھ کبھی حوصلہ افزائی بھی فرماتے، اور اپنے مخصوص انداز میں — اسی دوران میں راقم نے عربی اخباروں میں اسلامی ہند کی سیاسیات پر لکھنا شروع کیا، اس پر کبھی ٹوکتے، کبھی خاموش رہتے، اور کبھی حوصلہ افزائی فرماتے، یہ تاکید ہمیشہ رہتی کہ شہرت کے پیچھے نہ دوڑو، کبھی لکھتے تمھیں عربی لکھنا آگئی، مگر یہ نہیں معلوم، کیا لکھیں؟ "الضیاء" کا پہلا افتتاحیہ خود اپنے قلم سے لکھا تھا، اور خوب تھا، آج بھی پڑھا جا سکتا ہے، ہم لوگوں کو حیرت تھی کہ بیس برس کے بعد بھی حضرۃ الاستاذ کی عربی انشاء میں بانکپن باقی ہے، اپنا عربی کلام بھی اشاعت کے لئے دیتے،

تعلقات بڑھے تو چھٹیوں میں ایک آدھ بار دیسنہ بھی ضرور حاضر ہوتا، استاذ مرحوم عام طور پر گرمیوں کے دن وطن ہی میں گذارتے، ندوہ میں بھی چھٹیاں ہوتیں، راقم جب بھی دیسنہ حاضر ہوتا، ایک دو مقامی دوست یا ندوہ کے کوئی پردیسی[51] طالب علم ضرور ساتھ ہوتے، ۳۲ء کی گرمیوں کا ذکر ہے، ندوہ کے ایک طالب علم محمد حسن مالدہی کو لے کر دیسنہ حاضر ہوا، طعام و کلام کے سلسلہ کے بعد دوپہر کو اوپر کی منزل میں (جو برادرم ابو سہیل[52] صاحب کا کمرہ تھا،) آرام کرنے کا حکم ہوا، راقم دن کو سونے کا عادی نہیں، بستر پر پڑا رہا، نماز ظہر کے وقت خود حضرۃ الاستاذ تشریف لائے، سلمان[53] میاں گود میں تھے، کمرے میں سہیل صاحب کی انگریزی ٹوپی (ہیٹ) لٹکی ہوئی تھی، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑے تاثر کے ساتھ بولے "دیکھا آب زمزم میں شراب کی آمیزش" پھر ننھے سلمان

---

[51] ندوہ کی روایات میں داخل تھا کہ دور دراز کے طالب علم لمبی چھٹیوں میں اپنے دوستوں کے ساتھ اُن کے گھر جاتے اور گھر کے افراد کی طرح وہیں چھٹیاں گذارتے [52] حضرۃ الاستاذ کے بڑے صاحبزادے سید ابو سہیل عظیم آبادی، بی اے (علیگ)

[53] چھوٹے صاحبزادے سلمان میاں سلمہ اللہ،

کی طرف متوجہ ہو کر فرمانے لگے "دیکھو بیٹا!! صرف میرے نام کے نقطے نہ مٹایا کرنا"۔ اس لطیف فقرے کے بعد مجھ سے فرمایا "کچھ سمجھے"؟ عرض کیا: جی ہاں!! اللہ انھیں علمی میراث بھی عطا کرے"۔

یہ ۱۹۳۳ء کی گرمیوں کا ذکر تھا، اس سے چھ ماہ پہلے (دسمبر ۱۹۳۲ء - جنوری ۱۹۳۳ء) دارالمصنفین بھی حاضری ہوئی تھی، اور رمضان المبارک کا پورا مہینہ وہیں گذرا تھا، باضابطہ شاگردی کا موقع بھی یہیں نصیب ہوا، محمد ناظم صاحب اور ابواللیث صاحب بھی ساتھ تھے، ہم تینوں قرآن مجید اور حجۃ اللہ البالغہ کا درس لیتے، غالباً سورہ بقرہ کا ایک ربع ہو سکا، اس کے نوٹ اب تک حسن اتفاق سے محفوظ ہیں، حجۃ اللہ کے ابتدائی ۲۵، ۳۰ صفحے ہو سکے تھے"

دس بجے صبح کو سید صاحب کے کمرے میں درس ہوتا، اسی وقت ڈاک بھی آتی، اور بڑے لطیفے رہتے، ایک مرتبہ ایک انگریزی خط آیا، مجھے پڑھنے کا حکم ہوا، میں نے ساتھ ساتھ ترجمہ بھی شروع کر دیا، فرمانے لگے "میں انگریزی سمجھتا ہوں، صرف اس خط کا عادی نہیں" بڑی ندامت ہوئی، ایک روز دفتر کا ملازم ایک پرزہ دے گیا، در سات آٹھ روپے، پہلے تو جیب میں رکھ لئے، پھر پرزہ اور روپے نکال کر کہنے لگے:

> "تم لوگ خیال کرتے ہوگے کہ میں بہت کچھ کماتا ہوں گا، بس میرا حصہ اسی قدر ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے انتظامات ہیں، اپنے بندے کے ہاتھ سے خرچ کراتا ہے، ملازموں عزیزوں، اور دوسروں کو ان کا اپنا رزق ملتا ہے، میرے حصہ کے یہی چند روپے ہیں، اسے اچھی طرح سمجھ لو، تم لوگ بھی اس منزل سے گذرنے والے ہو"۔

اسی دور میں ندوہ میں پھر ایک ہنگامہ ہوا، (۱۹۳۵ء) طلبہ کی معاونت کا الزام ایسے تین افراد پر بھی تھا، جو کسی نہ کسی حد تک اسٹاف میں شمار کئے جاتے تھے، ان میں سب سے کمزور ابواللیث صاحب تو فوراً الگ کر دیئے گئے، مفتی محمد سعید صاحب اور راقم کو دارالعلوم سے باہر رہنے کا حکم ہوا، حالانکہ ابواللیث صاحب میرے مقابلے میں بہت نرم، بے زبان، اور مرنجان مرنج آدمی تھے، راقم کے متعلق مشہور تھا کہ اسے سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہت مانتے ہیں، اور غالباً اسی لئے مجھ پر سخت وار کرنے کی ہمت نہیں پڑی، ورنہ ہنگامے میں میرا رویہ

حد درجہ غیر محتاط تھا، مفتی محمد سعید صاحب کا تکیہ بھی ایک بڑے ستون پر تھا، اور وہ بھی بال بال بچ گئے، اسی زمانہ مین استاذ مرحوم کا ایک بڑا مفصل خط آیا، جس مین ذرا تند لہجے مین نصیحت کی گئی تھی، وہ خط آج بھی حکمت و موعظت سے لبریز نظر آتا ہے، نیز دار العلوم تشریف لائے، تو ابو اللیث صاحب اور خاکسار کو الگ برآمدے مین کھڑے کھڑے بڑی دردمندی اور دلسوزی کے ساتھ نصیحتین کین، حضرۃ الاستاذؒ، ابو اللیث صاحب کو بہت مانتے تھے، یہ نام (ابو اللیث) بھی انھی کا رکھا ہوا تھا، (ان کا اصل نام شیر محمد تھا) اور ندوہ کے لئے انھین مغتنم سمجھتے تھے، مگر جب ابو اللیث صاحب رخصت ہونے گئے، تو ان کی آنکھون مین بے بسی کے آنسو تھے، بولے، تو صرف اس قدر.... صاحب سے صفائی کرلو" سید صاحبؒ صدمے سہنے کے خوگر تھے، اپنے اختیارات استعمال کرنا یا عام زبان مین اپنے کو assert کرنا جانتے ہی نہین تھے، ___ اس واقعہ کے ہفتہ عشرہ بعد ہی ان پر امراض قلب کا وہ شدید حملہ ہوا جس سے مہینون ذی فراش رہے، اور ہفتون موت و حیات کی کشمکش رہی، اور پہلی سی صحت تو پھر نصیب ہی نہین ہوئی،

"الضیاء" بھی اسی علالت کے دنون مین بند کرنا پڑا، اور راقم کے ذمہ صرف تدریس کی خدمت رہ گئی، فارغ وقت مین علمی تحقیق و مطالعہ کا شوق پیدا ہوا، اور اس کے لئے سید صاحب قبلہ سے برابر مشورہ کیا کرتا، مراسلت کے ذریعہ اور زبانی بھی، اسی زمانے مین لغاتِ جدیدہ کی تکمیل کی، اور آغاز مین جدید اسالیب بیان پر ایک مفصل مقدمہ کا اضافہ کیا، حضرۃ الاستاذؒ بہت خوش ہوئے، اور دریافت فرمایا:

"اپنی محنت کا معاوضہ کیا چاہتے ہو؟ نام یا دام؟"

خادم نے عرض کیا: "صرف استاذ کی خوشنودی مزاج" ___ کتاب کے سات نسخے مرحمت ہوئے" "ٹائٹل پر مع اضافہ جدیدہ از مسعود عالم ندوی" کا اضافہ ہوا، نیز دیباچہ مین ایک حوصلہ افزا نوٹ مزید تحریک عمل کے لئے ثبت ہوا، ابھی ابھی سال دو سال ہوئے، پھر مزید اضافہ کا حکم ہوا تھا، تعمیلِ ارشاد مین کافی اضافہ ہو چکا ہے، اور ہو رہا ہے، مگر آہ! کہ یہ کوشش استاذؒ کی نگاہ ذرہ نواز سے محروم رہی، اور رہے گی،

اسی دوران مین راقم نے بے اجازت مدینہ (بجنور) کے شعبۂ ادارت کی رکنیت قبول کرلی تھی، عتاب ہوا اور حسب الحکم ڈیڑھ ماہ کے بعد ندوہ واپس آگیا (اگست ۳۷ء)

(۵)

دسمبر ۳۷ء مین حضرۃ الاستاذؒ کی تحریک اور مخدومی مولانا محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ کی کوشش و تائید سے خدا بخش اورنٹیل لائبریری مین میرا تقرر ہوگیا، اس علمی ماحول مین بھی میرا مرجع اعظم گڑھ ہی رہا، جو کچھ بھی لکھتا، پہلے حضرۃ الاستاذؒ سے مشورہ لیتا، ادھر عربی سے تعلق کچھ کم ہوا، تو معارف مین لکھنا شروع کیا، بہت ڈرتے ڈرتے ہمت ہوئی، مگر سید صاحب قبلہ کی حوصلہ افزائی نے یہ مرحلہ آسان کردیا، ۳۸ء سے ۴۴ء تک معارف کے لئے کچھ نہ کچھ لکھتا رہا، سید صاحب پٹنہ اکثر تشریف لاتے، مختلف سرکاری کمیٹیون مین اُن کی شرکت ضروری خیال کی جاتی، مخدومی مولانا ریاض حسن خان صاحب خیال کی کوٹھی پر قیام ہوتا، استاذ مرحومؒ کے تشریف لاتے ہی مولانا کا ملازم اطلاع کرجاتا، اور جب تک سید صاحب قیام فرما ہوتے، راقم روزانہ حاضر ہوتا، دو دو گھنٹون وہان نشست رہتی، پٹنہ مین یہی ایک رئیس کا گھر تھا، جہان یہ فقیر بے تکلف کھانے پینے مین شریک ہوتا، مولانا ریاض حسن خان خیال استاذ الاستاذ مولانا شبلی کے ملنے والون مین تھے، سید صاحبؒ بھی ان کا احترام کرتے، اور ہم وابستگان سید و شبلیؒ کو تو وہ اپنا عزیز ہی سمجھتے، مولانا ریاض حسن خان صاحب اور اُن کے بڑے بھائی مرحوم مولانا اعجاز حسن خان صاحب خوب آدمی تھے، ہماری پچھلی تہذیب اور شائستگی کے زندہ نمونہ،

پٹنہ مین خاکسار تقریباً سات سال رہا، (دسمبر ۳۷ء تا ستمبر ۴۴ء) اس دوران مین بیسیون ملاقاتین ہوئین کبھی کبھی ندوہ مین بھی اجتماع کے موقع ملے، ایک آدھ بار شبلی منزل بھی حاضر ہوا، دیسنہ تو بار بار جانا ہوا، باتین بہت ہین مگر اس تحریر کی محدود گنجائش مین کیا کیا بیان کیا جائے؟ بہرحال دو چار ضروری باتین تو بیان کرنا ہی پڑین گی،

۴۰ء تک سید صاحب قبلہؒ سے کبھی کسی مسئلہ مین اختلاف نہین ہوا تھا، مگر اس کے بعد اُن کے افکار و

رجحان میں کچھ تبدیلی ہونے لگی جس سے پہلے پہل میرے بنے بنائے افکار و خیالات کو سخت جھٹکا لگا، سید صاحب کو خود بھی اس کا احساس تھا، پہلے تو یہ کہکر تسلی دی: کہ "میں نے بیعت میں فقہی مسلک کو آزاد رکھا ہے" مگر اندازِ فکر بتا رہا تھا کہ فقہی مسلک میں بھی تبدیلی ہو رہی ہے، مگر بہت آہستہ، اس لئے قدرۃً سنہ ۳۰ء اور اس کے بعد ایک عرصہ تک گفتگو اور خط و کتابت جو کچھ بھی ہوتی، وہ تصوف پر، فقہی مسلک کو نہیں چھیڑتے، اس لئے کہ ذہنی طور پر وہ اپنے مسلکِ تحقیق پر قائم تھے، راقم گفتگو میں تو کیا جرأت کرتا، مگر خطوط میں خوب دل کھول کر لکھتا، وہ بڑے صبر و تحمل سے جواب دیتے، اس سلسلہ میں حضرۃ الاستاذؒ نے دو چار ایسے جامع اور مفصل خط لکھے ہیں، جو بعض حیثیتوں سے تصوف کی بڑی تصنیفات پر بھاری ہیں، ایک مرتبہ گفتگو اس حد تک پہنچی کہ "دلائل کا جواب دو یا بات مانو" میں نے عرض کیا: "جواب تو دے نہیں سکتا، مگر دل میں بات نہیں اترتی"۔

فقہی مسلک کا ذکر آیا ہے تو چند لطیفے سن لیجئے، راقم شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ کی سیرت لکھ رہا تھا اس کا پہلا باب معارف میں نمونہ کے طور پر تازہ تازہ شائع ہوا تھا، (مئی۔جون سنہ ۴۱ء) اتفاق سے انہی دنوں سید صاحبؒ پٹنہ تشریف لائے، دیکھتے ہی فرمایا "آج کل تمھیں نجدیات سے بڑا تعلق ہو گیا ہے" میں کیا عرض کرتا، نگاہیں نیچی کر لیں، پھر میری داڑھی کی طرف دیکھ کر فرمانے لگے "خیر، اب داڑھی تو بڑھ رہی ہے

اس سے تقریباً ایک برس پہلے (سنہ ۴۰ء) کا ذکر ہے، مدرسہ اکزامینیشن بورڈ (بہار) کی مجلس تھی، سید صاحب صدر نشین تھے، موضوع اصلاح نصاب تھا، صوبہ کے تمام مشہور علما، موجود تھے، مخدومی مولانا محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ، مولانا مناظر احسن گیلانی، حاجی معین الدین ندوی مرحوم ان میں زیادہ نمایاں تھے، راقم بھی ایک ممبر کی حیثیت سے حاضر تھا، اسی دن شام کو پٹنہ سیٹی (پٹنہ کی قدیم آبادی۔عظیم آباد) میں انجمن محمدیہ کے زیر اہتمام تبلیغی جلسہ تھا، مولانا سجادؒ نے سید صاحبؒ اور مولانا گیلانی کو دعوت دے دی، اور خاکسار کو بھی ان کی معیت میں آنے کا حکم ہوا، وہاں پہنچے، تو مولانا ابوالقاسم بنارسی سے ملاقات ہوئی، سب لوگ ڈائس کے قریب بیٹھ گئے، راقم وہیں مولانا بنارسی سے الگ باتیں کرنے لگا، سید صاحبؒ نے تعجب سے فرمایا، تمھارا ان سے کیا

تعلق؟ میں نے عرض کیا: "ہمارے اُن کے خاندانی تعلقات ہیں"، بولے (اور میری داڑھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو اس وقت چھوٹی تھی) "جی ہاں! اب تو داڑھی منڈے بھی اہل حدیث ہوتے ہیں"، مولانا ابوالقاسم صاحب اس سے بہت متاثر ہوئے، اور پھر دونوں زمانے کے انقلاب کا شکوہ کرنے لگے،

سیرت ابن عبدالوہاب کی تالیف میں بھی حضرۃ الاستاذ ہی سے مشورہ لیتا، چونکہ یہ میری پہلی علمی تصنیف تھی اسلئے بڑی تمناؤں کے ساتھ سید صاحب کے نام معنون کرنے کی جرأت کی،

## انتساب

"اپنے استاذ، مربی اور مخدوم حضرت مولٰنا سید سلیمان ندوی مدظلہ العالی

کے نام

جن کے مفید مشوروں نے مجھ میں لکھنے پڑھنے کا مذاق پیدا کیا، اور جن کی پدرانہ شفقت میری زندگی کے اُتار چڑھاؤ کی نگہبان رہی ہے، اور اپنی طالب علمی کے گذشتہ بارہ تیرہ سالوں میں جن کے مشوروں کا یکسر پابند رہا ہوں،

اپنی اس حقیر علمی کوشش کو معنون کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں،

گر قبول افتد زہے عز و شرف

خاکسار

مسعود عالم ندوی"

---

[1] والد صاحب قبلہ کے پھوپھی زاد بھائی اور استاذ مولانا سید عبدالکبیر بہاری عمر بھر بنارس ہی میں مولانا ابوالقاسم کے والد مولانا محمد سعید کنجاہی بنارسی کے دست راست کی حیثیت سے کام کرتے رہے، مولانا سعید کے تمام صاحبزادوں نے انہی سے تعلیم پائی، اور انھیں "چچا" کہتے تھے، اور مولانا عبدالکبیر صاحب کے صاحبزادے برادر محترم حافظ عبدالقدیر صاحب مولٰنا ابوالقاسم کو بڑے بھائی کہتے تھے،

اور عجب شومیٔ قسمت کہ یہ سفرنامہ اپنے وقت پر استاذ مرحوم کے ملاحظہ مین نہ آیا، یہ راز بھی کئی سال کے بعد مدینہ منورہ مین کھلا، ایک شام کو سید صاحبؒ سلمان میان کے ساتھ غربت کدہ پر تشریف لائے، (محرم ۱۳۶۹ھ نومبر ۱۹۴۹ء) دورانِ گفتگو مین دریافت فرمایا: "تمھاری محمد بن عبدالوہاب یہان ہے؟" کتاب نکال کر پیش کی، سفرنامہ پر نگاہ ٹھٹک گئی، بہت متاثر ہوے اور آنکھون مین دو آبدار موتی چمکتے نظر آئے، اور پھر بڑی محبت سے فرمایا، "اب یہ جنسِ وفا عنقا ہے" وہ منظر اب تک نہین بھولتا، اور نہ بھولنے کی چیز ہے۔ —— عرب ملکون مین امیر شکیب ارسلان (ف ۱۹۴۶ء) "امام الاوفیاء" کہے جاتے ہین، سید رشید رضا مرحوم (ف ۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۴ء) نے بھی اپنے استاذ محمد عبدہ کے ساتھ "حق وفا" کو خوب نباہا، ہمارے ملک مین یہ جنسِ گران بہت نایاب ہے، حضرت سید صاحبؒ اسلامی ہند کے "امام الاوفیاء" کہے جا سکتے ہین، استاذ کی رفاقت واطاعت سے لے کر استاذ کے ہم نشینون اور دوستون تک سے جس ذاتِ گرامی نے عہدِ وفا کو نباہا، وہ وفا شعارون کا قافلہ سالار نہ ہو تو کون ہو؟ اب دیکھین کہ اس کے خوانِ علم کے زلہ ربا اس عہد وفا کو کس طرح نباہتے ہین؟

تصوف اور فقہی مسلک کے علاوہ ایک دوسرا مسئلہ بھی اس دور مین ہمارے لئے پریشانی کا موجب رہا، ۱۹۳۷ء ہی سے اسلامی ہند مین ایک نئی فکر بیدار ہو رہی تھی، جس نے ۱۹۴۱ء (۱۳۶۰ھ) مین ایک منظم دعوت وتحریک کی صورت اختیار کر لی، اور راقم بھی پورے ذوق وشوق اور انشراح صدر کے ساتھ اس مین شریک ہو گیا اصولی اتفاق کے باوجود حضرت سید صاحبؒ کو اس کے متعلق کچھ شکوک وشبہات تھے، جس کو ہم عقیدتمندون کے لئے بڑی مشکل کا سامنا تھا، بہرحال اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے، کہ یہ مشکل سدِ راہ نہ بنی اور جہان تک استاذ مرحوم کی محبت وعقیدت اور ان کی طرف سے شفقت ومحبت کا تعلق ہے اس مین بھی کوئی فرق نہ آیا، اور راقم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتا رہا، اس سلسلہ مین سب سے بڑا مرحلہ ملازمت چھوڑ کر دارالاسلام پٹھان کوٹ جانے کا تھا، پہلے والد ماجد مدظلہ سے اجازت لی، اس کے بعد سید صاحب قبلہؒ سے اجازت کا سوال تھا، اتفاق سے سفر کے وقت لکھنؤ مین ملاقات کا پروگرام بن گیا، (اکتوبر ۱۹۴۲ء) شاہ معین الدین صاحب بھی اتفاق سے

وہیں موجود تھے، وہ اور دوسرے دوست سید صاحب سے کہتے "اُسے جانے نہ دیں"، وہ فرماتے: "میں کس طرح روکوں؟" اور میں خاموش اُن کے چہرے کی طرف دیکھا کرتا: "کہیں آزردہ تو نہیں؟" محبت اور فرض کی کشمکش بڑی سخت ہوتی ہے، آخر الوداع کی ساعت آگئی، ہاتھوں میں ہاتھ لے کر فرمانے لگے "اب میں وہی ترکیب کروں گا، جو مولانا الیاس صاحب نے علی میاں کے لئے کی تھی" میں نے کہا: "وہ کیا؟" فرمایا "الالتجاء الی اللہ" عرض کیا: "اس کو کون روک سکتا ہے؟" فرمایا "اگر دعا قبول ہوگئی" تو عرض کیا: "تو پھر کیا؟ خود بخود واپس چلا آؤں گا" — ان لطیف جملوں کے بعد دیدۂ پرنم کے ساتھ رخصت فرمایا، اور میں نے اسے اپنی بڑی کامیابی خیال کی۔ (۵ ر اکتوبر ۴۲ء)

— اس کے بعد ایک مدت تک اس سلسلہ میں خط و کتابت ہوتی رہی، موضوع زیادہ تر تصوف ہوتا، اور کبھی کبھی "جماعت اسلامی" کے اخبارات اور بعض لکھنے والوں پر تنقید، خاکسار اپنی بساط بھر اس خلیج کے پاٹنے کی کوشش کرتا رہتا، اور کون کہہ سکتا ہے کہ بالکل ناکام رہا؟

سید صاحبؒ قبلہ میں مہمان نوازی بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، اس کا صحیح اندازہ مدینہ پہنچ کر ہوتا، شبلی منزل میں وہ مصروف رہتے، مدینہ میں نسبتہً فرصت ہوتی، وہاں وہ اپنے شاگردوں اور چھوٹوں کی بھی بڑی آؤ بھگت کرتے، حضرت الاستاذؒ کو آموں کا بہت شوق تھا، بڑے شوق سے اپنا باغ بھی لگایا تھا، ایک مرتبہ آموں کے موسم میں مدینہ حاضری ہوئی، تقی الدین نعمانی میرے پٹنہ کے رفیق بھی ساتھ تھے، سید صاحب اپنے ہاتھ سے ایک ایک قاش کاٹ کر تقسیم فرماتے، ایک مرتبہ سید صاحب قبلہ کے ہاتھوں میں گٹھلی رہ گئی، تقی صاحب نے ازراہ تواضع گٹھلی طلب کی، فرمایا "آموں کے باب میں یہ تواضع نہیں"،

پٹنہ میں حضرۃ الاستاذؒ نے ایک مرتبہ راقم کے غربت کدہ پر بھی قیام فرمایا، (۴۳ء) اپنی تنگ دامانی اور استاذ مرحوم کے معمولات کے پیش نظر کبھی اس تحریک کی خود جرأت نہ ہوئی، مگر اب کی سید صاحب قبلہ نے خود ہی اطلاع دی، مدرسہ اگزامنیشن بورڈ کی مجلس منعقد ہو رہی تھی، گرمیوں کا موسم تھا، راقم کا مستقر اجتماع گاہ سے بہت قریب تھا، شاید اسی وجہ سے غربت کدہ کا انتخاب ہوا ہو، بہرحال جونہی اطلاع ملی بڑی خوشی ہوئی

مگر ساتھ ساتھ فکر بھی دامنگیر ہو گئی کہین تکلیف نہ ہو، بہرحال اپنی سی ہر ممکن کوشش کی، مگر سچ یہ ہے کہ آرام و آسائش کا خاطر خواہ انتظام نہ ہو سکا، اسی موقع پر ایک دن ظہر کی نماز کے بعد کا ذکر ہے، ـــــ سید صاحب قبلہ اوراد و وظائف مین مشغول تھے، خاکسار اُن کے قریب گیا، فرمایا "ٹھہرو، تم بہت نکتہ چینی کیا کرتے ہو، یہ (اذکار کی) کتاب دیکھو اس مین کونسی چیز خلاف سنت ہے؟" "الامر فوق الادب" عاجز نے چھوٹی سی مختصر کتاب (جس پر غالباً مناجات مقبول نام درج تھا) ہاتھ مین لی، اور درمیان سے ورق الٹا، تو ایک منظوم شجرہ پر نظر جم کر رہ گئی جس کی ردیف "کے واسطے" تھی اس گستاخ نے فوراً انگلی رکھ دی "یہ ہے توسل بالاموات" فرمایا کوئی اور چیز بتاؤ، عرض کیا "میری کیا مجال کہ خوردہ گیری کرون؟ یہ تو صرف تعمیل ارشاد کی گئی"،

اس حکایت کے بیان کرنے سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ حضرۃ الاستاذ کس قدر روادار تھے؟ مسلک و رجحان فکر کی تبدیلی کے باوجود اُن کے علم نے کبھی ان کا ساتھ نہ چھوڑا،

اسی طرح کا، لیکن اس سے بالکل الگ ایک واقعہ مکہ معظمہ مین پیش آیا، راقم ایک دن رباط بھوپال حاضر ہوا، خاص قسم کی مجلس تھی، اور مجذوب صاحب کی غزل پڑھی جا رہی تھی، مین بھی بیٹھ گیا، کچھ دیر کے بعد سید صاحب نے فرمایا "تمھین بھی شعر و شاعری کا ذوق ہے؟" عرض کیا اور ذرا جرأت کے ساتھ: "ذوق تو آپ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے، مگر خادم تو کسی اور چیز کی طلب مین حاضر ہوا کرتا ہے" اس پر مین نے طواف سے متعلق ایک سوال کیا، جس مین مدتون سے الجھا ہوا تھا، اور حنفی مسلک کی تائید حدیث سے نہین ہوتی تھی، سید صاحب قبلہ کچھ دیر غور فرماتے رہے، پھر مختلف کتابون کی مراجعت کا مشورہ دیا، نیز مولانا عبدالوہاب دہلوی سے پوچھنے کو کہا، اتنے مین وہ صاحب جو ابھی ابھی غزل سنا رہے تھے، بولے "تم تو حنفی ہو، فقہائے حنفیہ کا مسلک معلوم ہو جانے کے بعد اتنی چھان بین کی کیا ضرورت؟" میرا جی جل گیا، اور عرض کیا "معاف کیجئے گا مین حنفی نہین ہون"، سید صاحب قبلہ مسکرائے اور اشارون مین بے اس ٹھیٹھ وہابیانہ جواب کی داد دی،

غزل خوانی کا ذکر چھڑ گیا ہے تو ایک واقعہ مدینہ منورہ کا بھی سنا دون، شاید اس کم سواد تحریر مین حرمین

کے تذکرے سے کچھ آب و تاب پیدا ہو جائے، مدینہ منورہ میں بھی استاذ علیہ الرحمۃ کا قیام رباط بھوپال میں تھا، ایک دن نو بجے صبح کو (اپنے ہاں کے وقت سے) حاضر ہوا، تو کیا دیکھتا ہوں، غزل خوانی ہو رہی ہے، اور کلام خود استاذ کا ہے، دلچسپی سے سننے لگا، اتنے میں کسی صاحب نے دریافت کیا، یہ کلام کس دور کا ہے؟ سید صاحب قبلہ میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے: "یہ نہیں بتاؤں گا، میرے بعض عزیز ایک خاص دور کے بعد کا میرا کلام قبول نہیں کرتے" اس پر وہ صاحب بولے، "پھر تو آپ نے بتا ہی دیا" کلام کی مناسبت سے واقعات کی تاریخی ترتیب قائم نہیں رہ سکی، اور نہ اس تحریر میں اس اہتمام کی خاص ضرورت تھی،

اکتوبر ۱۹۴۴ء میں پنجاب آ گیا تھا، دو تین ماہ چکر لگانے کے بعد جالندھر کی آب و ہوا، سازگار نظر آئی اور وہیں اپنے کام کی طرح ڈال دی، اس دوران میں خط و کتابت برابر جاری رہی، شرف نیاز صرف ایک مرتبہ لکھنؤ میں حاصل ہوا، (جولائی ۱۹۴۵ء) راقم گھر جاتے ہوئے، مہینہ ڈیڑھ مہینہ کے لئے ندوہ ٹھہر گیا تھا، کچھ خیال یہ بھی تھا کہ عربی لٹریچر کی تیاری کا کام یہیں رہ کر کیا جائے، پورے برصغیر پاک و ہند میں عربی زبان کا کام کرنے کے لئے ندوہ سے اچھا ماحول اور بیش قیمت کتاب خانہ نہیں مل سکتا، سید صاحب نے مستقل قیام کی اجازت بھی دے دی تھی، مگر پھر ارادہ بدل گیا، اور تقسیم کے بعد تو اس کا کوئی امکان ہی نہیں رہا۔

(۶)

تقسیم کے بعد مدتوں حالات سے بے خبری رہی، اعزا و احباب میری زندگی سے مایوس ہو چکے تھے، عرصہ کے بعد استاذ محترم کو میری سلامتی کی خبر ملی، اور مراسلت شروع ہوئی، اس دور کے خطوط میں زیادہ تر نئی مملکت اور اس کی ہمسایہ ریاست کا حال پوچھتے، خاص طور پر ہر خط میں برادرم سید مظفر حسین ندوی اور ان کے اعزا و اقربا کی خیریت دریافت کرتے، بعض بعض خطوط کا انداز بیان بڑا لطیف ہوتا تھا ان کے جواب بھی رمز و کنایہ کی زبان میں جاتے تھے،

اللہ تعالیٰ کی شان کریمی کے قربان جائیے چار سال کے بعد مفاجات ہوئی تو ارض حرم میں جہاں پہلے سے کوئی

خبر بھی نہیں تھی، راقم عراق و نجد کا چکر لگا کر مکہ مکرمہ پہنچا، (ذی قعدہ ۱۳۶۸ھ) تو ہمارے معلم شیخ عبدالرحمن مظہر نے سب سے پہلے خوشخبری سید صاحبؒ کی سنائی اُن کے ایک معاون نے اس پر دریافت کیا "ندوی کسی خاندان کا نام ہے؟" میں نے کہا جی ہاں! بہت بڑا خاندان ہے" دوسرے ہی روز علی الصباح رباط بھوپال حاضر ہوا، اور دیار حرم کی اس ملاقات سے بڑی مسرت ہوئی، پھر تو برابر حاضری ہوتی،

وہیں معلوم ہوا کہ سید صاحب کو پاکستان بلایا جا رہا ہے، پوچھنے والا ہی تھا کہ ایک روز خاص طور پر مجھے الگ بٹھا کر کچھ سرکاری کاغذات دکھائے، یہ حکومت پاکستان کی طرف سے تعلیمات اسلامی بورڈ کی صدارت قبول کرنے کی دعوت تھی، اس کے بعد میری رائے دریافت کی، عرض کیا: "ذاتی طور پر تو مجھے بہرحال آپ کی آمد سے خوشی ہوگی لیکن ڈر لگتا ہے کہیں آپ کے انتقالِ مکان سے ندوہ اور دار المصنفین کو نقصان نہ پہنچ جائے" اس پر وہ سوچ میں پڑ گئے پھر فرمانے لگے "تمہاری جماعت کا رویہ کیا ہوگا"؟ اس کا جواب میرے لئے بہت مشکل تھا، بہرحال اچھی طرح غور کرنے کے بعد عرض کیا "جماعت کی پالیسی تو امیر اور اس کی شوریٰ کے ہاتھ میں ہے لیکن جہاں تک میں جماعت کے موقف کو سمجھا ہوں اسے آپ کی آمد اور صدارت قبول کرنے سے خوشی ہی ہوگی، اس طرح پر بورڈ کے اندر بھی ایک صحیح مسلک کی توضیح ہو سکے گی، اور حکومت کو من مانی کارروائیاں کرنے کا موقع نہیں مل سکے گا۔ — البتہ اگر آپ کی صدارت میں بورڈ نے کہیں کوئی ایسی سفارش کی جو جماعت کی نگاہ میں قابلِ قبول نہ ہوئی تو پھر ظاہر ہے کہ جماعت مخالفت کرے گی، آپ کی شخصی نہیں، بلکہ بورڈ کے فیصلے کی" کوئی نصف گھنٹہ گفتگو رہی اور رازداری کا عہد لے کر اجازت دی، اور یہ پہلا موقع ہے کہ یہ گفتگو کھول کر بیان کر رہا ہوں،

اتفاق سے اسی سال (۱۳۶۸ھ / ۱۹۴۹ء) خواجہ شہاب الدین صاحب وزیر داخلہ (حال گورنر صوبہ سرحد) بھی حج کو آئے ہوئے تھے، وہ نمازِ عشاء سے پہلے اور بعد حنفی مصلّے کے پاس سید صاحبؒ کے پہلو میں بیٹھتے، اور دونوں میں روزانہ گفتگو ہوتی، خواجہ صاحب اوراد و اذکار قسم کی خالص مذہبی باتیں پوچھتے، اور حضرۃ الاستاذ امور مملکت اور زندگی کے دوسرے مسائل چھیڑتے یہ شستہ اور مہذب مناظرہ دونوں کے درمیان برابر جاری رہا، سید صاحب قبلہ

کا اپنا تاثر یہ تھا کہ "یہ لوگ معذور ہیں، اور اپنی مخصوص تعلیم و تربیت کی وجہ سے سمجھ نہیں سکتے کہ دین ایک نظامِ زندگی کا نام ہے" خواجہ صاحب چاہتے تھے کہ مجلس تعلیمات اسلامی کی صدارت قبول کرنے پر انھیں راضی کرلیں، سید صاحب نے انکار تو نہ کیا، مگر خواجہ شہاب الدین جیسا ہوشیار انسان بھی سید صاحب سے زبان نہ لے سکا، یا عام زبان میں کوئی ( Commitment ) نہ کرا سکا، ہمارے بعض احباب حضرۃ الاستاذؒ کو سادہ لوح سمجھتے تھے، یہ خیال خود سادہ لوحی پر مبنی تھا، اُن کی سب سے بڑی خوبی یا کمزوری صرف اُن کی حد سے بڑھی ہوئی شرافت اور مروت تھی، معاملہ فہمی میں وہ کسی بڑے ذہین سے ذہین اور تجربہ کار سے تجربہ کار آدمی سے کسی طرح کم نہیں تھے،

یہ پاکستان آنے کی تمہید تھی حُسنِ اتفاق کہ جس دن حضرت سید صاحب قبلہؒ دہلی سے لاہور تشریف لائے ہیں، راقم لاہور میں موجود تھا لیکن ان کے اس پروگرام سے بالکل بے خبر۔ مولانا مودودی، اور اُن کے رفقاء مولانا امین احسن اصلاحی اور میاں طفیل محمد صاحب بیس ماہ کی نظر بندی کے بعد تازہ تازہ رہا ہوئے تھے، (اواخر مئی ۱۹۵۰ء) اور جماعت کی مجلس شوریٰ منعقد ہو رہی تھی، (جون ۱۹۵۰ء / اواخر شعبان ۱۳۶۹ھ) ——

انہی دنوں ایک روز مغرب کے بعد ہم لوگ دفتر جماعت اسلامی (مرکز) کے باہر کھلے صحن میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ دفتر کوثر سے فون پر اطلاع ملی، "مولانا سید سلیمان آئے ہوئے ہیں، اور کل صبح مولانا مودودی، مولانا اصلاحی اور مسعود عالم سے ملنے کے لئے آئیں گے،" خبر پاکر جو مسرت ہوئی، اس کا کیا پوچھنا؟ مگر فکر یہ ہوئی کہ کسی طرح اُڑ کر دفتر کوثر پہنچ جاؤں، مگر رات کو چار میل کی مسافت کس طرح طے کی جائے؟ آخر علی الصباح اپنے ایک رفیق رانا اللہ داد خان کی موٹر پر مولانا اصلاحی کو اُن کے گھر سے لیتے ہوئے، دفتر کوثر پہنچے، سید صاحب قبلہ ابھی چائے سے فارغ ہوئے تھے، اور انتظار ہی کر رہے تھے، تھوڑی دیر میں اچھرہ واپس آگئے، مولانا مودودی کے دفتر میں نشست ہوئی، اندر صرف ہم چار آدمی تھے[1]، اور تمام ارکان شوریٰ اور رفقاء مرکز باہر برآمدے میں بیٹھے رہے، باتیں دیر تک ہوتی رہیں، سید صاحبؒ نے مولانا مودودی کو عرصہ کے بعد دیکھا تھا،" کہنے لگے، اب تو ماشاء اللہ

---

[1] سید صاحب قبلہ، مولانا مودودی، مولانا اصلاحی اور خاکسار،

آپ کی داڑھی خوب بڑھ گئی ہے" پھر نعیم صاحب کو دریافت کیا، وہ بلائے گئے، اور اُن کی پیٹھ ٹھونکی، اور دینی خدمات کی انجام دہی پر مبارکباد دی، اتنے میں رفقاء کا تقاضا ہوا کہ باہر تشریف لائیں، تاکہ سب لوگ نیاز حاصل کرسکیں، باہر برآمدے میں بھی دیر تک نشست رہی، وہاں سید نقی علی صاحب علوی (جو ان دنوں "تسنیم" کے اسٹاف رپوٹر مقرر ہوئے تھے، اور آج کل سنٹرل جیل میں نو سال کی قید کاٹ رہے ہیں) نے کچھ سوالات کئے، اور تسنیم کے لئے اچھا خاصا انٹرویو تیار کرلیا،

اس وقت تو سید صاحب قبلہ خیرسگالی کے وفد میں آئے تھے، واپسی کا عزم مصمم تھا، مگر کراچی جاکر کچھ ایسی صورتِ حال پیدا ہوئی، یا کردی گئی کہ وطن مالوف کو نہ لوٹ سکے،

پاکستان نے حضرت الاستاذ کی آؤ بھگت میں کمی نہیں کی، سرکاری اور غیر سرکاری، ہر حلقہ میں ہاتھوں ہاتھ لئے گئے، حکومت کی ہر ایسی چھوٹی بڑی کمیٹی جس میں اسلامی نگاہ کی نمایندگی مطلوب ہوتی، اس کی رکنیت اُن کو پیش کی جاتی، اور وہ اس میں شریک ہوتے، اپنے مفید مشوروں اور تجربوں سے کمیٹی کی مدد کرتے، دستور ساز اسمبلی کی مجلس تعلیماتِ اسلامی سے پہلے تو الگ رہے، لیاقت علی خان مرحوم نے بہت ترغیب دی، مگر سید صاحب ضمانت (Assurance.) چاہتے تھے کہ بورڈ کے مشورے قبول کئے جائیں گے، مگر حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ بورڈ کی صدارت قبول کرلی، اور ہمارے نقطۂ نظر سے بھی ان کا قبول کرنا اچھا رہا، "ہمارے نقطۂ نظر" سے مراد پاکستان میں اسلامی دستور کیلئے جدوجہد کرنے والوں کا نقطۂ نظر ہے،

سید صاحب کبھی کبھی پنڈی بھی تشریف لاتے، دو مرتبہ دارالعروبہ کی بھی عزت افزائی ہوئی، ایک مرتبہ استاذ محترم ڈاکٹر تقی الدین ہلالی (حال پروفیسر بون یونیورسٹی جرمنی) کی موجودگی میں، جب کہ وہ عراق سے کچھ دنوں تفریح کے لئے پاکستان تشریف لائے تھے، (اگست ۱۹۵۱ء)

میرا بھی کبھی کبھی کراچی جانا ہوتا، اور سید صاحب کے دولت کدہ پر دلچسپ صحبتیں رہتیں، اس موقع پر فروری ۱۹۵۱ء

---

ل ہلالی صاحب کا مستقل قیام بغداد میں ہے، دس سال بون یونیورسٹی نے عراقی حکومت سے ان کی خدمات مستعار لی ہیں،

کی ایک دعوت نہین بھولتی، بہار کی قبولی اور سیخ کباب کا مزا کبھی بھولنے ہی کا نہین، حکیم نصیر الدین صاحب ندوی اور خاکسار نے خاص طور پر کبابون ہی پر اپنی توجہ مرکوز رکھی، حضرۃ الاستاذؒ ہماری اس بے تکلفی اور طفلانہ حرکت سے بہت محظوظ ہوئے،

مارچ ۵۳ء مین اس گنہگار کو بھی بے گناہون کے ساتھ سرکاری مہمان خانہ کی ضیافت نصیب ہوئی، حضرۃ الاستاذ پر اس کا بہت اثر ہوا، بار بار عزیزی محمد عاصم صاحب رفیق دار العروبہ سے خیریت دریافت کرتے، جیل مین بھی دو والانامے ملے، جن سے بڑی مسرت اور طمانیت حاصل ہوئی، پر افسوس کہ رہائی کے بعد (اگست ۵۳ء) پھر نیاز نہ حاصل ہو سکا، اور اس سے زیادہ افسوس یہ کہ آخری دنون مین حضرۃ الاستاذ کی علالت سے بھی بے خبر رہا، اسے قسمت کی ستم ظریفی کے سوا اور کیا کہا جائے کہ جیل مین اچھا خاصا رہا، مگر رہائی کے بعد مرض (دمہ) کے مسلسل اور سخت حملے ہونے لگے، اور نومبر (۵۳ء) کے آغاز مین تو ایسا حملہ ہوا کہ اپنی بیماری کی پچیس سالہ زندگی مین کبھی ایسا حملہ نہین ہوا تھا، دو تین ماہ ذی فراش رہا، ایک دوست کو کراچی لکھا کہ استاذ محترم کی خدمت مین حاضر ہو کر دعا کی درخواست کیجئے، (۱۳ر نومبر ۵۳ء) مگر ہونا کچھ اور لکھا تھا، مین بستر علالت پر روزانہ کراچی سے جواب کی راہ دیکھ رہا تھا کہ ۲۲ر نومبر کی شب (۱۴ر ربیع الاول ۷۳ء) کو ۸½ بجے ایک اخباری نمایندے نے آکر وفات حسرت آیات کی اطلاع دی، انا للہ و انا الیہ راجعون،

اَیّتھُا النّفس اجملی جزعاً      اِنّ ما تحذرینَ قد وقعاً

تعزیت کے لئے بھی کراچی نہ جا سکتا تھا، چلنے پھرنے کی سکت بھی نہین تھی، کئی ہفتون کے بعد جا کر سفر کے قابل ہوا، دسمبر کی ۱۶ر کو کراچی پہنچا، اور برادرم ابو عاصم صاحب اور سلمان میان سلمہ اللہ کی معیت مین اس قطعۂ ارض کی زیارت کی، جہان استاذ مرحوم کا جسد خاکی مصروفِ استراحت ہے، اللہ تعالیٰ اُن کی تربت پر رحمت کے پھول برسائے اور انھین اعلیٰ علیین مین جگہ دے،

اب ہمارے نصیبون مین ماتم ہی ماتم ہے، جو جگہ خالی ہوتی ہے، وہ پر نہین ہوتی، ہائے شبلی منزل کی

وہ دو گز زمین جسے استاذ مرحوم نے اپنی آرام گاہ کے لئے پسند فرمایا تھا، وہ اپنے استاذ کے پہلو میں استراحت کرنا چاہتے تھے، مگر قدرت انھیں ایسی جگہ لے آئی، جہاں ساحل عرب کی ٹھنڈی ہوائیں، صبح و شام آیا کرتی ہیں شاید اُن کے تحت الشعور میں کوئی ایسی آرزو رہی ہو،

"یہ نقوش اور تاثرات" نہایت عجلت میں اور قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں، اس سے اپنی تعریف مقصود نہیں دلوں کا حال، اللہ بہتر جانتا ہے، مطلوب یہ ہے کہ غلطیوں اور فروگذاشتوں سے درگذر کیا جائے، اس تحریر میں جو سنین اور تاریخیں درج کی گئی ہیں، یا جو واقعات بیان کئے گئے ہیں، وہ سب اپنے کمزور حافظے کے سہارے ان میں غلطی کا بہت کچھ امکان ہے، اگر کسی دوست کو ایسی فروگذاشت محسوس ہو، تو ضرور مطلع کریں، عنایت ہوگی، اسی طرح جہاں جہاں حضرۃ الاستاذ کے اقوال نقل کئے گئے ہیں وہ اکثر و بیشتر روایت بالمعنی ہیں اصلی الفاظ یاد رکھنا میرے بس سے باہر تھا، البتہ واقعات و اقوال کی صحت کا پورا اطمینان ہے،

و اٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین،

دلفگار

"مسعود عالم ندوی"

# مولانا سید سلیمان ندوی میری نظر میں

از

جناب مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی ایم اے پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت یہ کہنا کہ وہ ایک بہت بڑے محقق، نامور مصنف، بلند پایہ عالم، اور صاحب طرز انشاپرداز تھے، ایک عام اور معمولی پیرایۂ بیان ہے جس سے مولانا کا اصل مقام، اور مرتبہ متعین نہیں ہوتا، اور نہ اُن کا صحیح حق ادا ہوتا ہے حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی میں ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی کے ذہن و فکر، اور یہاں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں خواہ وہ طرز قدیم کا ہو، یا طرز جدید کا، نصف صدی کے اندر اندر مذاق تصنیف و تالیف، طریق فکر و استدلال اور تہذیب امیال و عواطف کے اعتبار سے جو عظیم الشان انقلاب ہوا ہے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اور اُن کے علمی و عملی کارناموں کو اس میں بڑا دخل ہے، اور یہ انقلاب جس طرح پیدا ہوا، اور اُس نے ذہنی و فکری دنیا میں قدیم تعلیم یافتہ طبقہ کو جو سیادت بخشی ہے، اس کی نظیر آج پورے عالم اسلام میں کہیں نظر نہیں آئے گی، اس کی اصل حقیقت معلوم کرنے کے لئے ضروری یہ ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کے علمی و تصنیفی حالات پر ایک نگاہ ڈال لی جائے،

مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے نامور استاد مولانا شبلی کے زیرِ سایۂ عاطفت جب تصنیف و تالیف کا قلم سنبھالا، تو یہ وہ زمانہ تھا جب کہ تعلیم یافتہ مسلمان دو طبقوں میں بٹے ہوئے تھے، ایک قدیم تعلیم یافتہ یعنی علماء اور دوسرا جدید انگریزی تعلیم یافتہ گروہ، دونوں کا دائرۂ عمل ایک دوسرے سے الگ تھا، اور صرف اتنا ہی نہیں

بلکہ دونون مین رقابت تھی، ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو شک وشبہہ کی نظر سے دیکھتا تھا، علماء کی علمی کوششون اور تحریری وتصنیفی سرگرمیون کا دائرہ چند فروعی اور جزئیاتی مسائل، یا متون درسیہ کے شروح و حواشی تک محدود تھا، تصنیف وتالیف کی زبان صاف، دلچسپ اور روان نہین تھی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ تعلیم یافتہ طبقہ کو اُن کے ساتھ نہ کوئی دلچسپی تھی، اور نہ اس کی نگاہ مین ان مسائل ومباحث کی کوئی اہمیت تھی، مغربی علوم وفنون اور انگریزی تعلیم نے اسلامی مسائل سے متعلق طرق فکر وبحث مین جو تبدیلی پیدا کردی تھی، علماء کو نہ اس تبدیلی کا احساس تھا، نہ اس تبدیلی کے اسباب سے ان کو واقفیت تھی، اور نہ ان کی زبان وقلم وقت کے جدید طرز سخن سے آشنا تھی،

دوسری جانب انگریزی تعلیم یافتہ گروہ کا حال یہ تھا کہ وہ چونکہ سرسید کی آخری عمر کی پالیسی جو مسٹر بیک پرنسپل مدرسۃ العلوم علی گڈھ کے زیر اثر تھی، اوس سے کافی متاثر تھا، اس بنا پر اس کے دل ودماغ پر انگریزون کی نقالی اور ان کی تہذیبی وتمدنی تقلید کی دھن سوار تھی، اس جنون مین اوس کو نہ مذہب سے لگاؤ تھا، نہ دینی اور قومی روایات سے دلچسپی تھی، اور نہ قومی تہذیب اور کلچر کی اس کے دل مین عظمت تھی، مسلمانون کی تاریخ سے متعلق اگر اسے تھوڑی بہت کچھ واقفیت تھی بھی، تو اس کی معلومات کا ذریعہ خود مسلمان مصنفین کی کتابون کے بجائے یورپ کے مشنری مصنفین یا مستشرقین کی تصنیفات تھین، جو علمی تحقیق اور ریسرچ کے پردہ مین اسلام کی روایات حسنہ کو بھی اسی طرح پیش کرتے تھے کہ ایک مسلمان اسے پڑھکر شرم سے گردن جھکا لیتا تھا، اور خود اس کے دل مین اپنی تاریخ سے نفرت پیدا ہوجاتی تھی، اس طرح دونون گروہون کی راہ منزل مقصود اور سمت ایک دوسرے سے بالکل الگ تھی، ایک دوسرے کا مذاق اڑاتا تھا، طنز وتعریض کرتا تھا، اور دونون مین اختلاف وافتراق کی ایسی وسیع خلیج حائل تھی جس کا دور کرنا آسان نہین تھا،

وقت کی ملی اور قومی ضرورتون کا تقاضا تھا کہ دونون طبقون کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے، اُن مین صلح کرا کے مصافحہ کرایا جائے، تاکہ دونون باہمی اشتراکِ عمل سے وقت کے جدید تقاضون کو پورا کرسکین،

اس کی صورت بجز اس کے کچھ اور نہین ہو سکتی تھی کہ ایک طرف تعلیم قدیم کے نصاب مین تغیر و تبدل کر کے ایسے علما پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی، جو صرف فروعی اور جزئیاتی مسائل مین ہی وقت صرف کرنے کو دین کی سب سے بڑی خدمت نہ سمجھتے ہون، بلکہ تعلیم جدید نے اسلام اور اسکی تعلیمات و روایات سے متعلق جو صدہا نئے قسم کے سوالات و مباحث پیدا کر دیئے تھے، اون پر وقت کی زبان مین گفتگو کر سکتے، اور اسلام کے نمایندہ کی حیثیت سے بزم نو کے ارکان کو خطاب کر سکتے ہون، اور دوسری طرف ضرورت تھی کہ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے دل و دماغ پر مغربی علوم و فنون اور انگریزی تعلیم سے جو مرعوبیت چھائی ہوئی تھی، اور جس کے باعث وہ خود اپنی تاریخ، کلچر، تہذیب و تمدن اور روایات سے متعلق احساس کمتری مین مبتلا تھا، اوس کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی، اس سلسلہ مین کرنے کے اصل کام دو تھے ایک یہ کہ علی گڈہ کے نصاب تعلیم مین عربی فارسی اردو، اسلامی تاریخ، اسلامی فلسفہ، دینیات، یہ مضامین بھی شامل کرائے جاتے، اور دوسرا کام یہ تھا کہ صاف ستھرے، اور دلچسپ و دلنشین انداز بیان و زبان مین مغربی مذاق تحقیق و تصنیف کے مطابق اسلامی مسائل و مباحث اور اسلامی تاریخ و تمدن پر کتابین لکھ کر شائع کی جاتین تاکہ یہ انگریزی تعلیم یافتہ گروہ بھی ان کو پڑھ کر فائدہ حاصل کر سکتا،

مولانا شبلی جو قدرت کی طرف سے ایک بڑا حساس دل اور بیدار دماغ لے کر پیدا ہوے تھے، انھون نے ان دوگونہ ضرورتون کو محسوس کیا، اور علی گڈہ کو خیرباد کہکر ہمہ تن اس کام مین لگ گئے، تقاضاے وقت کے مطابق علما پیدا کرنے کی غرض سے وہ ندوۃ العلما، سے وابستہ ہوگئے، جو خاص اسی غرض سے قائم ہوا تھا، اور تربیت یافتگان سرسید کی خصوصاً اور عام مسلمانون کی عموماً ذہنی اصلاح کے لئے انھون نے تاریخ و فلسفۂ اسلام کو اپنا خاص موضوع بنا کر کتابین لکھنی شروع کین اس سلسلہ مین اور سب چیزون سے قطع نظر: مولانا نے اردو پر جو احسان عظیم کیا ہے، وہ کبھی فراموش نہین کیا جا سکتا، جو زبان اب تک صرف شعر و شاعری یا افسانہ خوانی و داستان طرازی کی زبان تھی، اس کو ایک نہایت باوقار مگر ساتھ ہی دلچسپ و شگفتہ علمی زبان بنا دیا، اور بحث و تحقیق، تنقید، اور جمع و ترتیب معلومات کے اعتبار سے اردو اب تک جس جدید مغربی انداز تصنیف سے نا آشنا تھی،

مولانا نے اوس کو اس سے مالا مال کر دیا،

مولانا شبلی نے جو پودا لگایا اور جس درخت کا بیج بویا تھا، اگرچہ ان کی زندگی میں برگ و بار لانے لگا، اور اس کے ثمرات ظاہر ہونے لگے تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس پودے کو ایک تناور درخت بنانے میں سب سے بڑا دخل انہی کے جانشین و تلمیذ خاص مولانا سید سلیمان ندوی کا ہے، انھوں نے جس طرح اس تحریک کو چلایا، اوس کو کامیاب بنانے کے لئے جو راہ (مصنوعی طور پر نہیں بلکہ فطری اور طبعی طور پر) اختیار کی، سچ یہ ہے کہ وہ مولانا شبلی کے بس کی بات بھی نہیں تھی،

اس میں شبہ نہیں کہ مولانا شبلی کی شخصیت بڑی جامع اور ہمہ گیر تھی، انھوں نے مجتہدانہ طور پر علمی کام بھی کئے، اور عملی بھی، انھوں نے نثر کے میدان میں بھی گوہر لٹائے، اور نظم کے سبزہ زار میں حسن تخیل، لطافت بیان اور جذبات و اثر کے پھول کھلائے، انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی معاشرتی یہاں تک کہ سیاسی اور تعلیمی زندگی کے ہر پہلو اور ہر گوشہ کو متاثر کیا، اور سب پر کچھ نہ کچھ اپنا نقش چھوڑا، اور آج ہم واضح طور پر ان وسیع اثرات و نقوش کو ہر جگہ محسوس کر سکتے ہیں، لیکن بہرحال یہ ماننا پڑے گا کہ بعض خاص اسباب کی بنا پر جن میں سے بعض کا تعلق ضرور مولانا کی اپنی طبیعت اور افتاد مزاج سے تھا، مولانا شبلی کو نہ قدیم الخیال علما کا پورا اعتماد حاصل ہو سکا، اور نہ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کا، مولانا نے الکلام، علم الکلام اور سیرت النبی میں بعض خاص بحثیں اپنے نقطۂ نظر سے لکھی تھیں، علما کا طبقہ ان کو برداشت نہ کر سکا، یہاں تک کہ خود ان کے سب سے بڑے قدردان اور مداح نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی بھی اُن کی تحریک ندوہ کے مخالفوں میں ہو گئے[1]، اور اس پر جو طوفان برپا ہوا، اور مولانا پر جس طرح اس طبقہ کی طرف سے حملے ہوئے وہ باخبر اصحاب سے پوشیدہ نہیں ہیں،

رہا تعلیم جدید کا گروہ، تو چونکہ یہ گروہ سرسید کے زیر اثر تھا، اور مولانا شبلی سرسید کی سیاسی بلکہ ایک حد تک تعلیمی پالیسی کے مخالف تھے، اور اس مخالفت کا برملا اظہار بھی کرتے تھے، اس بنا پر ظاہر ہے کہ مولانا

[1] معارف مولانا شروانی کے متعلق یہ بیان صحیح نہیں ہے، سیرت تو اس وقت چھپی بھی نہیں تھی،

اس طبقہ کا پیدا اعتماد حاصل نہیں ہو سکتا تھا، علاوہ بریں بعض کوتاہ نظروں نے خواہ مخواہ مولانا شبلی کو خواجہ حالی سے ٹکرا دیا، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم جدید کے لوگوں میں ایک مستقل گروہ ایسا پیدا ہو گیا جس کا سب سے محبوب ادبی مشغلہ خواجہ حالی کی جا و بیجا مدح سرائی اور منقبت کرنا، اور ساتھ ہی مولانا شبلی پر مختلف دروازوں سے حملہ کرتے رہنا تھا، چنانچہ تنقید شعر العجم عطیہ فیضی کے نام مولانا شبلی کے خطوط وغیرہ کتابوں اور ان جیسے مضامین و مقالات کی اشاعت اسی طبقہ کی اندرونی کوششوں اور سرگرمیوں کی رہین منت ہے:

ان حالات اور اس ماحول میں مولانا شبلی کی سب سے بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ اُن کو مولانا سید سلیمان ندوی کی شکل میں ایک ایسا شاگرد مل گیا جو وسعتِ مطالعہ، ذوقِ تحقیق، دقیقہ رسی، اور علم و فضل میں استاد کا صحیح جانشین تھا، اور ساتھ ہی اپنے اندر بہت سی ایسی خوبیاں اور کمالات رکھتا تھا، جو اسی کا اپنا حصہ تھے، اس کا قلم بجائے گرم مزاج ہونے کے نرم رو اور سبک خرام تھا، جو تنقید کے نازک سے نازک موقع پر بھی جادۂ احتیاط و اعتدال سے منحرف نہیں ہوتا تھا، اس کی طبیعت میں متانت و سنجیدگی اور حلم و بردباری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، جس کی وجہ سے اس کے خامۂ گوہر فشاں کی پیشانی پر کبھی بھی جھنجھلاہٹ اور غیظ و غضب کے تیور ظاہر نہیں ہوتے تھے، تشرع، تدین، بلکہ تقشف اس کی قبائے علم کا تکمۂ زریں تھا، جس کے باعث کسی مسئلہ میں اختلاف کے باوجود جماعتِ علماء کو بھی اس پر نکتہ چینی کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی، پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے مزاج میں استقلال، طبیعت میں صلح پسندی، مزاج میں مسکنت تھی، فکر پر بجائے عقلیت اور تفلسف کے اشعریت بلکہ سلفیت غالب تھی، ان خداداد اوصاف و کمالات کے باعث وہ جس محفل میں بھی بیٹھا، صدرِ بزم ہو کر رہا، جس انجمن میں بھی شرکت کی، شمع انجمن کہلایا،

مولانا سید سلیمان ندوی کے یہ وہ ذاتی اوصاف و کمالات تھے جن کے باعث جہاں مولانا شبلی کامیاب نہ ہو سکے، وہ کامیاب ہوئے، اور جو عام اور ہمہ گیر اعتماد ان کو حاصل ہوا، وہ ان کے استاد کو حاصل نہیں ہو سکا تھا، علماء نے ان پر اپنے اعتماد کلی کا اظہار اس طرح کیا کہ وہ جمعیۃ علمائے ہند کے

سالانہ اجلاس منعقدہ کلکتہ کے صدر منتخب ہوئے، ایک عرصہ تک اوس کی مجلس عاملہ کے سربرآوردہ ممبر رہے، جمعیۃ علمائے ہند کے زیرِ اہتمام دلی میں آل انڈیا فلسطین کانفرنس ہوئی تو اس کے صدر بھی وہی ہوئے، خود ندوۃ العلماء کی وہ سرزمین جو مولانا شبلی پر تنگ ہوگئی تھی، مولانا سید سلیمان ندوی کے لئے اُس نے عزت واحترام کے ساتھ اپنی آغوش کھول دی، پھر علماء خواہ کسی مسلک خیال کے ہوں مولانا کا ہر ایک مسلک کے علماء میں بڑا وقار اور درجہ تھا، اور سب دل سے مولانا کے علم وفضل کے مدّاح ہونے کے ساتھ اُن کے اخلاق وفضائل کے قدردان تھے، دوسری طرف جس علی گڈھ کو مولانا شبلی نے حالات سے تنگ اور مجبور ہوکر خیرباد کہا تھا، اُسی نے مولانا سید سلیمان ندوی کی علمی اور اسلامی خدمات کا اعتراف اس طرح کیا کہ مولانا کو ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری دینے پر فخر کیا، علاوہ بریں وہ مسلم یونیورسٹی کی کورٹ کے اور اس کی بعض اور مجلسوں کے رکن رکین ایک مدّت تک رہے، انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کو مولانا کی ذات کے ساتھ جو عقیدت وارادت تھی، اس کا اظہار مولانا محمد علی اور ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہما کے ان خطوط سے بھی ہوتا ہے، جو ان دونوں بزرگوں نے مولانا کو لکھے ہیں، مولانا محمد علی کے خطوط میں تو خیر نری عقیدت اور جوشِ ارادت کا ہی اظہار ہے لیکن ڈاکٹر اقبال کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی مسائل ومباحث پر غور کرتے وقت انھیں جب کبھی کوئی الجھن اور دقت پیش آتی تھی، تو وہ فوراً مولانا کی طرف رجوع کرتے تھے، ڈاکٹر صاحب مرحوم کو مولانا کے ساتھ جو گہری عقیدت تھی، اس کا عملی اظہار انھوں نے اس طرح بھی کیا کہ ادارۂ معارف اسلامیہ جس کے بانی خود ڈاکٹر صاحب تھے، اس کے اجلاس منعقدہ لاہور کی صدارت انھوں نے مولانا کو پیش کی، اور پھر صدارت کی تحریک کرتے ہوئے انھوں نے جو الفاظ مولانا کی نسبت کہے تھے وہ اُن کے دلی جذباتِ ارادت کے آئینہ دار تھے، انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے اعتماد کا ایک اور واضح ثبوت یہ ہے کہ خلافت کا وفد انگلستان گیا تو مولانا اوس کے رکن تھے، حجاز کی موتمر عالم اسلامی میں شرکت کرنے کے لئے ہندوستان سے خلافت کا جو وفد گیا تھا جس میں مولانا محمد علی، شوکت علی، شعیب قریشی جیسے لوگ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے

نمائندے تھے، مولانا اس وفد کے رئیس و امیر تھے، اُن کے علاوہ ہندوستان کی اور دوسری یونیورسٹیاں اور ان یونیورسٹیوں کے مختلف علمی اور ادبی ادارے مولانا کو برابر بلاتے رہتے، اور اُن کے چشمۂ علم وفضل سے سیراب ہوتے رہتے تھے،

اس اعتماد کے باعث مولانا کی تصنیفات و تالیفات، مضامین و مقالات، تقریرین اور خطبات دونون تعلیم یافتہ طبقون میں مقبول و پسندیدہ تھے، ہر ایک اُن کی قدر کرتا، اور اُن سے فائدہ اٹھاتا تھا، اس طرح مولانا شبلی کی تحریک کا جو اصل مقصد تھا، وہ باحسن وجوہ تکمیل کو پہنچا یعنی ایک طرف علماء کرام نے کتبِ درسیہ کے متون و حواشی اور منہیات و شروح کے دائرہ سے باہر نکل کر علماء سلف کے علمی کارنامون کا جائزہ لینا شروع کیا، ان مین ذوقِ تحقیق و جستجو پیدا ہوا، تاریخ جس کو انھون نے اپنے لئے شجرِ ممنوعہ بنا رکھا تھا، اور اگر اس کی طرف توجہ بھی ہوتی، تو اس کا دار و مدار علامہ جلال الدین سیوطی کی تاریخ الخلفا پر تھا، اسکی طرف متوجہ ہوتے، فلسفہ، تاریخ کا ذوق بڑھا، واقعات کی تحقیق و تنقید کا جذبہ ابھرا، اسلامی علوم و فنون کے بہت سے گوشے تھے، جن کی طرف اب تک توجہ نہین کی گئی تھی، اُن کی طرف بھی رجحان ہوا، اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وقت کی زبان مین گفتگو کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی، دوسری جانب انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کو اسلامیات سے دلچسپی ہوئی، قومی روایات کا احترام اور اُن کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا، مغربی مصنفین کی غلط بیانیون نے اسلامی تاریخ و ثقافت سے متعلق جو نقوش بد ان کے دل و دماغ مین جما دیئے تھے، وہ مٹنے لگے، اور اب خود ان مین مستند ذرائع معلومات کی روشنی مین اسلامیات پر ریسرچ کرنے کا ولولہ پیدا ہوا اور اس طرح انھون نے استادانِ مغرب کی اندھی پیروی سے نجات پائی، آج ہم مین کتنے ملکی اور غیر ملکی یونیورسٹیون کے اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات ہین، جن کا موضوعِ تحقیق و تصنیف، اسلامی علوم و فنون، اسلامی دینیات اور اسلامی ادبیات ہین، کون کہہ سکتا ہے کہ اس عام فضا کے پیدا کرنے مین مولانا سید سلیمان ندوی کے علمی اور اسلامی کارنامون کو بہت بڑا دخل نہین ہے،

اس بنا پر کوئی شبہ نہیں کہ مولانا کے احسانات دونوں طبقوں پر ہیں، اور چونکہ ان دونوں کو مولانا نے ایک دوسرے سے قریب کر دیا، اور ان میں علمی و دینی ارتباط و اتفاق پیدا کر کے انھیں اس قابل بنا دیا کہ وہ دونوں باہمی اشتراک و تعاون سے اسلام کی اور مسلمانوں کی بیش از بیش مفید تر خدمات انجام دے سکیں، اس بنا پر مولانا کا احسان تمام مسلمانوں پر بھی ہے، اس عام فیضان و احسان کے علاوہ اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ مولانا طرز قدیم کے تعلیم یافتہ تھے، انھوں نے یونیورسٹیوں کے ایوانوں کے بجائے مدرسہ کی چٹائیوں پر بیٹھ کر علم حاصل کیا تھا، اور وہ اپنی وضع قطع شکل و صورت، لباس اور عادات و اطوار ہر لحاظ سے کٹر قسم کے تعلیم قدیم کے فرد تھے، اور اُن کو اس میں اتنا غلو تھا کہ تعلیم جدید کے حضرات کی بڑی بڑی انجمنوں میں بیٹھ کر بھی اپنی مولویت کو چھپاتے نہیں، بلکہ اس پر فخر کرتے تھے، جب کبھی موقع ملتا تھا، ایک مخصوص لطیف پیرائے میں چٹکیاں بھی لے لیا کرتے تھے، چنانچہ راقم الحروف کو یاد ہے ندوۃ العلما کا سالانہ جلسہ (غالباً ۲۸ء میں) امرتسر میں منعقد ہو رہا تھا، میں اس زمانہ میں طالب علم تھا، اور لاہور میں مقیم تھا، لاہور سے میں اور ڈاکٹر محمد عبد اللہ چغتائی جو ڈاکٹر اقبال مرحوم سے خاص تقرب رکھتے، اور اُن کے ایڈیکانگ کی حیثیت سے رہتے تھے، اس اجلاس میں شرکت کرنے کے لئے امرتسر پہنچے، ڈاکٹر صاحب مرحوم کسی عذر کی بنا پر اس میں شرکت نہیں کر سکتے تھے، میں اور چغتائی صاحب مغرب کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی کی قیامگاہ پر حاضر ہو کر مولانا سے ملے، تو مولانا نے علیک سلیک کے بعد چغتائی صاحب سے خطاب کر کے پوچھا، کیوں ماسٹر صاحب! ڈاکٹر صاحب (ڈاکٹر اقبال) تشریف نہیں لائیں گے، چغتائی صاحب نے ڈاکٹر صاحب کی طرف سے عذر بیان کیا، تو مولانا نے فوراً اپنے خاص انداز میں مسکراتے ہوئے فرمایا، اگر ڈاکٹر صاحب تشریف لے ہی آتے تو اچھا ہوتا، یہاں سب علما جمع ہوں گے اُن کو سنانے کا اس سے بہتر اور کیا موقع ہو سکتا، چغتائی صاحب معلوم نہیں سمجھے یا نہیں لیکن دہلی اور لکھنؤ کے جو حضرات اس وقت وہاں موجود تھے، انھوں نے مولانا کے اس فقرہ سے بڑا لطف لیا،

غالباً ۳۹ء یا ۴۰ء کی بات ہے، ایک مرتبہ دہلی میں تشریف فرما تھے، اسی اثناء میں حسب معمول

ازراہِ شفقت بزرگانہ ندوۃ المصنفین دہلی کے دفتر واقع قرول باغ مین ایک دن شام کے وقت تشریف لائے، ہم سب بیٹھے چائے پی رہے تھے، اور مولانا کی شفقت آمیز باتون اور مشورون سے مستفید ہو رہے تھے کہ اتنے مین ملک کے ایک مشہور صاحبِ قلم جن کا رجحان تجدد کی طرف تھا، اور جن کا ایک مقالہ "برزخ" کی بحث پر حال مین ایک علمی مجلہ مین شائع ہو چکا تھا، اچانک دفتر برہان مین آنکلے، مولانا نے انہین دیکھا تو نیم استادہ ہو کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا، اور مسکراتے ہوئے فرمایا "السلام علیکم یا اہل البرزخ" وہ تو یہ سن کر کچھ جھینپ سے گئے، لیکن مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی کے اس فقرہ نے کہا کہ دنیا مین جنت کہان ہے؟ فضا کو صاف کر دیا، اسی مجلس مین مولانا نے اپنی سیرت النبی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ بعض لوگ پوچھتے ہین کہ سیرت پہلی، اور دوسری جلد مین ختم ہو گئی، اب سیرت کہان ہے؟ یہ تو سب اسلامی تعلیمات ہین جن پر باقی جلدون مین بحث ہوئی ہے، تو بھئی اصل بات یہ ہے کہ انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کسی ایسی کتاب کو پڑھتے ہی نہین جس مین خالص دینی اور مذہبی بحثین ہون، وہ صرف تاریخ اور سیرت سے مانوس ہین، اس لئے مین نے در اصل عنوان سیرت کا ہی رکھا ہے، اور اس بہانہ چاہتا ہون کہ ان حضرات کو اسلام کی تمام دینی اور اخلاقی تعلیمات اور ان کے احکام و مسائل سے واقف کر دون، اس طرح گویا مین نے بچون کی طرح اپنے اصل مقصد کے چہرہ پر ایک مٹی کا مصنوعی چہرہ لگا لیا ہے تاکہ ان حضرات کو توحش نہ ہو، اور وہ سیرت محمدیہ کے ساتھ ساتھ شریعت محمدیہ سے بھی واقف ہو جائین۔

بہرحال اس گذارش کا مقصد یہ ہے کہ مولانا علماً و عملاً صورۃً و شکلاً ظاہراً و باطناً ایک عالم دین تھے، انہون نے جو کچھ کیا، اسی حیثیت سے کیا، اور اپنے عالمانہ وقار کو ہر جگہ اور ہر موقع پر برقرار رکھا، اس بنا پر طبقہ علماء کو ان کا خاص طور پر ممنون و شکر گذار ہونا چاہئے کہ ان کے ایک فرد فرید نے یونیورسٹیون کی علمی مجلسون ہسٹاریکل کانگرس کے اجلاسون اور ادبی و تحقیقاتی ادارون کے جلسون کی صدارت کر کے اور اسلامی علوم و فنون کے علاوہ دوسرے علمی، ادبی، تاریخی، اور سیاسی مسائل و مباحث پر محققانہ تصنیفات و مقالات لکھ کر صرف اپنے آپ کو سرفراز و سربلند نہین کیا، بلکہ تعلیم جدید کے حضرات کے دل و دماغ پر پورے طبقہ علماء اور مدارس عربیہ کی علمی و تحقیقی سیادت

کا نقش بھی ثبت کر دیا، ورنہ ظاہر ہے ان علمی مجلسون مین علما کا گذر ہی کہان تھا!

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی عظیم الشان خدمات علم و دین کا ایک بڑا روشن و تابناک پہلو یہ ہے کہ انھون نے جو کچھ کیا خود ہی نہین کیا، بلکہ ان ہی مدارس عربیہ کے پڑھے ہوئے اور بوریہ نشین علما رین سے ایک ایسی جماعت تیار کر دی، جو ارباب قلم بھی ہین، اور علم و تحقیق کے میدان کے شہسوار بھی، اسلامیات کے مبصر بھی ہین، اور ادبی مسائل و معاملات کے نکتہ دان و نکتہ سنج بھی، واقعہ یہ ہے کہ خود مصنف اور محقق ہونا اس قدر مشکل نہین ہے جتنا کہ مصنف گر اور محقق ساز ہونا ہے، مولانا شبلی کی طرح مولانا سید سلیمان ندوی کو بھی قدرت نے اس کا خاص ذوق اور ملکہ عطا فرمایا تھا، اور اُن مین دوسرون کی علمی نگرانی و رہنمائی کا بڑا جذبہ تھا، دار المصنفین، مولانا جس کے ناظم اعلیٰ اور سرخیل و امام تھے، اس کا تو خیر قیام ہی اسی مقصد کے لئے ہوا تھا کہ ارباب قلم علما، اور محقق مصنفین پیدا ہون، اس بنا پر اس ادارہ کے ارکان و رفقا رکو تو مولانا کے فیضان تعلیم و تربیت سے بلاواسطہ اور براہ راست بہرہ مند ہونے کا شرف حاصل تھا ہی، لیکن اس ادارہ سے باہر ملک کے دور دراز گوشون مین جو نوجوان علمی ذوق رکھتے تھے، اور اس سلسلہ مین مولانا سے استفادہ کرنا چاہتے تھے، مولانا نے کبھی اُن کی امداد و اعانت مین دریغ نہین فرمایا، اور بڑی خوشی سے جو علمی رہنمائی بھی وہ کر سکتے تھے، وہ کرتے تھے، خود راقم الحروف کو یاد ہے غالباً سنہ ۲۷ء مین جب کہ مین دار العلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے والا تھا، مین نے مولانا کو ایک خط لکھا کہ مین کچھ تصنیف و تالیف کا ذوق رکھتا ہون اور چاہتا ہون کہ دو تین سال دار المصنفین مین آپ کے زیر تربیت رہکر اپنے اس ذوق کی تکمیل کرون تو کیا یہ صورت ممکن ہے؟ مولانا نے بڑی شفقت اور محبت کے ساتھ دار المصنفین کے قواعد و ضوابط کی ایک کاپی ارسال کر دی، اور افسوس کے ساتھ تحریر فرمایا کہ بالفعل کسی معاوضہ پر یہان قیام کی کوئی صورت نہین ہے، "ولعل اللہ یحدث بعد ذالک امراً" اس کے بعد لکھا کہ بہرحال آپ کو یہان آنے کی ضرورت نہین ہے، آپ مجھ سے جو فائدہ یہان رہکر حاصل کرنا چاہتے ہین، اپنی جگہ پر رہتے ہوے بھی کر سکتے ہین، آپ جس عنوان پر لکھنا چاہین، مجھکو اس سے مطلع کر دین، مین بتا دون گا کہ اس عنوان سے متعلق مواد کہان

گمان نے گا، اسے کس طرح جمع اور کس طرح مرتب کرنا چاہیئے اور پھر جب آپ مقالہ تیار کرلیں، تو میرے پاس بھیج دیجئے میں اس میں اصلاح کردیا کروں گا۔"

اس واقعہ کے دو تین سال بعد کا ذکر ہے اس زمانہ میں میرے ازان قسم کے مضامین و مقالات پنجاب کے بعض ادبی رسالوں میں شائع ہوتے تھے لیکن مجلہ معارف کی جو عظمت میرے دل میں تھی، اس کی وجہ سے شوق تھا کہ کبھی معارف میں بھی میرے نام سے کوئی چیز شائع ہو اس معیار کا کوئی مقالہ تو لکھا نہیں گیا" ایک نظم لکھی تھی جو بعد میں پنجاب کے ایک ادبی رسالہ میں شائع ہوگئی تھی، اس نظم کی نسبت خیال ہوا کہ معارف کے معیار کے مطابق ہے، فوراً مولانا کی خدمت میں ارسال کردی، مولانا نے یہ نظم واپس کرتے ہوئے بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ تحریر فرمایا، "آپ اس نظم نویسی کے چکر میں کہاں پڑ گئے ہیں آپکے مرتبہ سے گری ہوئی چیز ہے، کچھ محنت کیجئے، اور مقالہ نویسی پر توجہ کیجئے، قوم کو آپ سے اسی کی توقع ہوسکتی ہے، اور یہی ہونی چاہیئے، مولانا کے اس گرامی نامہ کا میرے دل پر خاص اثر ہوا، اور مجھے اب تک یاد ہے کہ میں نے مولانا کے اس مکتوب گرامی کے جواب میں یہ شعر لکھا تھا،

کون ہوں کیا ہوں کہاں ہوں سب حقیقت کھل گئی
تو نے وہ ٹھوکر لگائی چشم علت کھل گئی

بہرحال حق یہ ہے کہ ارباب قلم و تحقیق علماء کی ایک جماعت پیدا کرکے مولینا نے ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی میں جو انقلاب پیدا کیا ہے وہ آج پورے عالم اسلام میں اپنی نظیر آپ ہے، ورنہ عہد حاضر کے ترکی، مصر، ایران، شام و بیروت، اور افغانستان پر نگاہ ڈالیے، تو معلوم ہوگا کہ مغربی طرز پر تحقیق و تصنیف کا جو کام بھی ہو رہا ہے، اسے جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہی انجام دے رہا ہے، طرز قدیم کی تعلیم کے حامل جو حضرات ہیں وہ اب تک اپنی اسی پرانی ڈگر پر چلے جا رہے ہیں اور درسیات و دینیات کے عولت کدوں سے باہر نکل کر نئی دنیا کی آب و ہوا سے زیادہ آشنا نہیں، اس کا

نتیجہ یہ ہے کہ ان ملکوں کے جدید تعلیم یافتہ حضرات پر اسلامی تہذیب و ثقافت اور تمدن و معاشرت کا رنگ اتنا گہرا نہیں ہے، جتنا کہ ہندوستان کے اس طبقہ پر ہے، وہاں جدید و قدیم کا فرق و امتیاز اُن کی باہمی رقابت اور کشمکش اب تک قائم ہے، مصر میں جامعۂ ازہر اور جامعہ فوا د دونوں ایک دوسرے کے حریف ہیں لیکن یہاں دیوبند علی گڈھ ندوۃ العلماء اور جامعہ ملیہ سب ایک دوسرے کے حلیف شریک اور متعاون ہیں، غور کیجئے اس انقلاب عظیم کا سرچشمہ کہاں ہے؟ اس میں شک نہیں کہ اس میں خلافت کی تحریک اور بعد میں کانگریس کی سیاسی جدوجہد کو بھی دخل ہے، لیکن جہاں تک اس انقلاب کے علمی پہلو کا تعلق ہے، کوئی شبہ نہیں، وہ بڑی حد تک سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کوششوں کا رہون ہے۔

اب ایک اور پہلو سے دیکھئے خالص علمی اور تحقیقی کام اور پبلک لائف دونوں میں بڑا بیر ہے، دونوں کو نباہنا جام و سندان باختن سے کم مشکل نہیں ہے لیکن مولانا کو قدرت نے جو عجیب ہمہ گیر اور جامع طبیعت عطا فرمائی تھی، اس کی وجہ سے انھوں نے اس راہ کو بھی اپنے لئے آسان کر لیا تھا، تحریک خلافت اور اسکے بعد تحریک آزادی کے زمانہ میں وہ ان دونوں تحریکوں کے سرگرم زعما کے دوش بدوش چلتے رہے، ملک کے دور دراز گوشوں کے اور ملک سے باہر بھی سفر ہو رہے ہیں، جلسوں میں تقریریں ہو رہی ہیں، اجلاس کا خطبۂ صدارت پڑھا جا رہا ہے، مشاورتی کونسلوں میں شرکت ہو رہی ہے، قومی کارکنوں کی علمی نگرانی کی جا رہی ہے غرض کہ مسلمانوں کی قومی زندگی کا کوئی گوشہ تعلیمی ہو، یا سیاسی، مذہبی ہو یا معاشرتی، ادبی ہو یا علمی' ایسا نہیں ہے جس میں مولانا عملاً شریک نہ رہے ہوں اور اس کی سرگرمیوں میں حضور قلب و دماغ کے ساتھ حصہ نہ لیتے ہوں، اس بنا پر مولانا کی شہرت اور اُن کی شخصیت کی عظمت کا احساس صرف طبقۂ خواص تک محدود نہیں رہا بلکہ عام مسلمانوں اور ابنائے وطن نے بھی اُن کی بزرگی اور زعامت کے سامنے سر نیاز مندی خم کر دیا۔

علم، فضل کمال و ہنر اور عروج و ارتقا کے یہ تمام منازل و مراحل طے کرنے کے بعد آخر وہ وقت بھی آگیا جب کہ علم کے حجابات ظاہری بھی اٹھ گئے، اور شاہد حقیقی کا جمال معنوی بلا کسی واسطہ و وسیلہ کے

پرتو فگن ہونے لگا، بعض کوتاہ نظر خواہ کچھ کہیں، لیکن حق یہ ہے کہ آخر عمر میں مولانا کو جو روحانی مقام حاصل ہوا، اور جس کی وجہ سے وہ علمی اور تحقیقی کاموں سے کنارہ کش ہو گئے تھے، وہ قرب و اتصالِ الٰہی کا ایک بلند مقام، اور ایک انسان کے کمال کی معراج ہے، عشق کی فغان سنجی یا زمزمہ پیرائی ہجر و فراق کی مدت کے دراز ہونے تک باقی رہتی ہے لیکن جب حسن خود بے نقاب ہو کر سامنے آجائے، اور اپنی جلوہ طرازیوں سے عشق کی کائناتِ زندگی پر مستولی اور غالب ہو جائے تو عشق کی زبان گنگ ہو جاتی ہے، وہ مسحور و بے خود ہو کر قوتِ گفتار سے محروم ہو جاتا ہے، اور تجلیات میں گم ہو کر حیرت کی تصویر بن کر رہ جاتا ہے، علم کی مثال اس نقشِ پا کی سی ہے، جس کے ذریعہ محبوب تک پہونچنے کی کوشش کی جائے لیکن جب محبوب خود سامنے آجائے تو اس وقت بھی اس نقشِ پا کی پیروی کرنا اور اسی کے اشاروں پر چلنا خود منزلِ مقصود سے دور ہونا نہیں تو اور کیا ہے؟ یہی وہ حقیقت ہے جس کو "العلم حجاب اکبر" میں بیان کیا گیا ہے،

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

حضرت سید صاحب کا آخر عمر میں روحانی لطائف و مزایا کی طرف مائل ہو جانا، اور اس میں غلو کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اب تک وہ جو کام کرتے رہے تھے، اس کو انھوں نے تکمیل کے آخری درجہ تک پہنچا دیا تھا، مولانا کی تخصیص نہیں بلکہ ہر صاحب کمال کا حال یہی ہوتا ہے کہ جب اس کا کمال عروج و ارتقا کے آخری نقطہ تک پہنچ جاتا ہے، تو اب اس کو اس میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی، اور وہ اس سے منہ موڑ کر ایک ایسے سبزہ زار میں جا نکلتا ہے، جو زمان و مکان، این و آن اور زوال و فنا کے خرخشوں اور حد بندیوں سے ورا الورا ہوتا ہے، اور جہاں کسب کمال کی تشنگی کبھی نہیں بجھتی، خوب سے خوب تر تلاش کرنے والی نگاہ کو کبھی سیری نہیں ہوتی؛ جہاں دامانِ طلب کبھی پر نہیں ہوتا، جہاں قرب و اتصال کی ٹھنڈک شوق و اشتیاق کی آگ کو سرد نہیں کرتی، بلکہ اُسے اور مشتعل کرتی ہے، آئزک نیوٹن جس نے عالم طبعیات میں ایک انقلاب عظیم

پیدا کر دیا، جب وہ سب کچھ کر چکا تو خود اس سے منحرف ہو کر گرجا سے وابستہ ہو گیا، اور اس کے قلب و روح کو سکون وہین ملا، حضرتنا الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ الکشمیریؒ کا حال بھی یہی تھا، عمر بھر علم و تحقیق کے میدان میں کونہ کونہ کی خاک چھانتے پھرے، اور ہزارون کو اپنے فیوض علیہ سے باکمال بنا گئے، لیکن خود آخر عمر مین ذکر و شغل اور مراقبہ و مناجات کی طرف حد سے زیادہ مائل ہو گئے تھے، اور فرماتے تھے کہ افسوس! ہم علم کے پیچھے لگے رہے لیکن اصل کام جو کرنے کا تھا وہ نہ کیا !!

جس طرح آئزک نیوٹن اپنی لافانی تحقیقات و اکتشافات سے بیزار ہو کر ایک گوشہ مین جا بیٹھا لیکن دنیا آج تک اس سے فائدہ اٹھا رہی ہے، اور اٹھاتی رہے گی، اسی طرح اگرچہ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ خود آخر مین اپنے عمر بھر کے کامون سے، ایک بلند تر و اعلیٰ تر مقصد کی خاطر، کنارہ کش ہو گئے تھے لیکن یہ انھون نے اس وقت کیا تھا، جب کہ اُن کی کوششون کا لگایا ہوا پودا پورے طور پر بار آور ہو چکا تھا، اور اُن کو یقین تھا کہ اس سلسلہ مین انھین خود جو کام کرنا تھا، وہ اسے پورا کر چکے تھے، اور اب ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی تھی، جو اُن کے نقش قدم پر چل کر اس کام کو برابر جاری رکھے گی، اور فروغ دے گی، اس بنا پر اب یا آیندہ اس راہ مین جو کام بھی ہو گا، وہ مولانا کی منت کشی احسان سے آزاد نہین ہو سکتا،

جیسا کہ مین نے اوپر کہا مجکو مولانا سے براہ راست تلمذ و استفادہ کا شرف حاصل نہین ہو سکا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ مین اپنے تئین مولانا کا تلمیذ معنوی سمجھتا ہون، کیونکہ مین نے مولانا شبلی، اور مولانا سید سلیمان ندوی دونون کی کتابون سے کافی استفادہ کیا ہے، مجکو ان دونون بزرگون کی کتابین اور بالالتزام مجلہ معارف پڑھنے کا شوق اُس وقت سے تھا، جب کہ مین پورے طور پر ان کے مضامین سمجھنے کی استعداد بھی نہین رکھتا تھا،

دارالعلوم دیوبند کی طالب علمی کے زمانہ مین مین اپنی اس خصوصیت کے اعتبار سے مشہور تھا، چنانچہ ایک مرتبہ حضرت شاہ صاحب (مولانا سید محمد انور شاہ) کو یاجوج و ماجوج سے متعلق ایک بحث کا مطالعہ کرنے کے سلسلہ مین ارض القرآن کو دیکھنے کا خیال پیدا ہوا تو ایک دن عشاء کی نماز کے بعد مسجد سے کمرہ کی طرف واپس

جاتے ہوتے، سیدھے میرے کمرہ میں تشریف لائے، اور کتاب طلب کی، جب میں نے افسوس کے ساتھ عرض کیا کہ کتاب ہو گمر یہاں نہیں آگرہ میں ہو تو فرمایا، بس جب کتاب یہاں تمھارے پاس بھی نہیں تو اور کس کے پاس ہوگی، دارالمصنفین کی کتابیں یہاں اور پڑھتا کون ہو!"

تلمذ روحانی کی اس نسبت کی وجہ سے مجکو سید صاحب کی ذات اور شخصیت کے ساتھ نہ صرف ایک رسمی عقیدت تھی، بلکہ محبت بھی تھی، اور مجکو یہ کہنے میں مسرت اور فخر دونوں محسوس ہوتے ہیں کہ حضرت سیّد صاحب بھی مجکو اسی بزرگانہ شفقت و کرم سے دیکھتے، اور اسی کے مطابق برتاؤ کرتے تھے، دلی جب کبھی آتے تو ناممکن تھا کہ شرف ملاقات عنایت فرمائے بغیر واپس چلے جاتے، ایک مرتبہ میں نے برہان کے نظرات میں اسلامی تعلیم گاہوں کی خصوصیات بتاتے ہوئے ندوۃ العلمار کی نسبت "دینی گمر دنیوی" کا فقرہ لکھدیا، پرچہ حضرت سید صاحب کی نظر سے گذرا تو بڑا ملال ہوا، اسی اثنا میں کسی سفر میں کہیں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور سید صاحب کی ملاقات ہوگئی، سیّد صاحب نے مولانا حفظ الرحمٰن سے فرمایا، ہم لوگ تو مولوی سعید صاحب کو اپنا ہی آدمی سمجھتے تھے، لیکن اب اُن کے قلم سے ندوہ کی نسبت یہ الفاظ پڑھ کر سخت صدمہ اور ملال ہوا ہے" مولانا سیوہاروی نے دہلی پہونچ کر مجکو سید صاحب کی یہ شکایت پہنچادی تو مجکو خود اس کا بہت افسوس اور ملال ہوا، کچھ دنوں بعد لکھنؤ میں ایک جلسہ کے سلسلہ میں سید صاحب سے ملاقات ہوگئی تو میں نے اس واقعہ کا ذکر کرکے عرض کیا کہ دراصل مجھ سے تعبیر میں کوتاہی ہوگئی، مجکو ایک "بھی" کا لفظ اور لکھنا چاہیے تھا، یعنی دینی گمر دنیوی بھی، تو میرا مطلب زیادہ واضح ہوتا، کیونکہ ظاہر ہے دین کے ساتھ دنیا جمع کرنا عیب اور نقص نہیں، بلکہ ہنر و کمال ہے،

"دین و دنیا بہم آمیز کہ اکسیر اینست"

اور درحقیقت ندوہ کے قیام کی ایک غرض یہ بھی تھی کہ ایسے علما پیدا کئے جائیں جو علوم دینیہ کے ساتھ علوم دنیویہ میں بھی کوتاہ نہ ہوں، حضرت سید صاحب یہ سُن کر غایت شفقت سے مسکرا دیئے، اور فرمایا، کلآن

اصبت" اور بات رفت وگذشت ہوگئی،

اب وہ شفقت ومحبت اور کرم وتوجہ یاد کرتا ہوں تو دل تڑپکے رہجاتا ہی، گویا میر تقی میر سے معذرت کے ساتھ!

مصائب اور تھے پر اُن کا جانا    عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہی!

میر کے اصل شعر میں بجائے "اُن" کے "دل" ہے،

فرحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً وطاب ثراہ

# حضرۃ الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے دینی و علمی خدمات

## (اُن کی تصانیف کی روشنی مین)

از

شاہ معین الدین احمد ندوی

حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی جیسی جامع کمالات شخصیتین کہین صدیون مین پیدا ہوتی ہین، وہ اپنے کمالات مین ائمۂ سلف کی یادگار تھے، جملہ اسلامی علوم پراُن کی نظر نہایت گہری اور وسیع تھی، اور بعض علوم مین امامت واجتہاد کا درجہ حاصل تھا، اوراُن مین اپنی علمی و دینی بصیرت اور تلاش و تحقیق کی ایسی یادگارین چھوڑین جو مدتون علمی دنیا کی رہنمائی کا کام دیتی رہین گی، ان کا علمی درجہ اتنا بلند اور اُن کے علمی و دینی خدمات کا دائرہ اتنا وسیع اور گوناگون اور اتنا متنوع ہے کہ اس کی تفصیل کے لئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے، ایک مضمون مین اس کو سمیٹنا دریا کو کوزہ مین بند کرنے کی سعی لاحاصل کرنا ہے، اس لئے اس مضمون مین صرف اُن کی اہم تصانیف کی روشنی مین اُن کے علمی کمالات پر اجمالی تبصرہ کیا جائے گا، اوراُن کی تصنیفی خصوصیات دکھانے کی کوشش کیجائے گی جس سے اُن کے علمی درجہ اوران کے دینی وعلمی خدمات کا سرسری اندازہ ہوسکے،

اُن کے علمی و دینی خدمات کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے اس کے پس منظر سے واقفیت ضروری ہے اس کے بغیر اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہین ہوسکتا، اٹھارہوین خصوصًا انیسوین صدی مین مسلمانون کے سیاسی زوال کے ساتھ پوری اسلامی دنیا کے ہر شعبۂ زندگی مین ایک عام جمود و انحطاط طاری ہو گیا تھا، اور حکومت کیساتھ

دین و ملت علم و اخلاق اور تہذیب و روایات بھی رخصت ہو رہے تھے، مغربی قومون کی یلغار ایک طرف اسلامی حکومتون کو ختم کر رہی تھی، دوسری طرف ان کے علوم و فنون اور نظر فریب تہذیب مسلمانون کے مذہب و اخلاق اور تہذیب و تمدن کے قلعون کو مسمار کر رہے تھے، اور مسلمان یورپ کی سیاسی غلامی کے ساتھ ساتھ اس کی ذہنی غلامی مین بھی مبتلا ہوتے جا رہے تھے، جو سیاسی غلامی سے بھی زیادہ سخت تھی،

یہی حال ہندوستان کے مسلمانون کا بھی تھا خصوصاً ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد وہ اور بھی پست و پامال ہو کر رہ گئے تھے، عوام کو اس کا احساس نہین تھا، اونچا طبقہ اس وقت بھی تعیش مین مبتلا اور خواب غفلت مین مدہوش تھا، علمائے کرام کا بڑا طبقہ اس انقلاب کے نتائج سے بے خبر پرانی بے روح درسی تعلیم فقہی جزئیات کی ردو قدح اور فروعی مسائل مین جنگ و مناظرے مین مشغول تھا، تاہم اُن مین کچھ نفوس ایسے ضرور تھے جن مین مسلمانون کی اس زبون حالی کا احساس اور اُن کی سیاسی و مذہبی تجدید و اصلاح کا جذبہ موجود تھا، اور ان مین مجاہدانہ روح بھی تھی، مگر وہ بھی نئے حالات اور اس کے مقابلہ کے اسباب و ذرائع سے واقف نہ تھے اور صرف مذہبی تعلیم اور مذہبی اصلاح کو مسلمانون کی دینی اور دنیوی فلاح کا ذریعہ سمجھتے تھے، اور ان کی ساری کوششین اسی دائرے کے اندر محدود رہین، ان مین سے بعض مجاہدین قوت کے ذریعہ نئی حکومت کا تختہ الٹنا چاہتے تھے، مگر اس مین کامیابی کا کوئی امکان نہین تھا،

اس کے مقابلہ مین ایک نیا گروہ تھا، اس کا مقصد بھی مسلمانون کی فلاح تھا، وہ نئے حالات اور اس کے مقابلہ کے وسائل سے بھی واقف تھا، مگر نئی حکومت اس کے علوم و فنون اور اس کی تہذیب سے اس قدر مرعوب تھا کہ وہ محض جدید تعلیم اور مغربی تہذیب کی نقل و تقلید ہی کو مسلمانون کی نجات کا ذریعہ سمجھتا تھا، اس لئے اس کی کوششین زیادہ تر اسی دائرہ کے اندر محدود رہین، اور ان دونون کوششون سے مسلمانون کو فائدہ پہنچا، اگر علماء کا طبقہ نہ ہوتا، تو ہندوستان سے دینی علوم اور دینی روح کا خاتمہ ہو جاتا، اور نئے طبقہ کی کوششین نہ ہوتین تو دنیاوی حیثیت سے مسلمانون کا وجود ختم ہو جاتا، اس لئے ان دونون کی کوششیں امت کے شکریہ کی مستحق ہین،

ان حالات مین سب سے سخت مرحلہ مسلمانون کے مذہب اور اُن کی تہذیب و روایات کی مدافعت اور اُن کے تحفظ کا تھا، جن پر دو سمتون سے حملے ہو رہے تھے، ایک عیسائی مشنریون کا تبلیغی حملہ، دوسرے علم و تحقیق کی راہ سے، مشنریون کا طریقہ تو پرانے بحث و مناظرے کا تھا، اس لئے اس دور کے علماء اور بعض نئے تعلیم یافتہ لوگون نے اس کا پوری کامیابی سے مقابلہ کیا، اور اُن کے خطرات کو بڑی حد تک روک دیا، مگر مشنریون سے کہین زیادہ خطرناک، اور ضرر رسان مستشرقین اور فضلاے مغرب کی جماعت تھی، جس نے پرانے طرز کے اعتراضات اور بحث و مناظرے کے بجائے جن کی اس عقل و دانش کے زمانہ مین کوئی قدر و قیمت نہ رہ گئی تھی، ایک نیا علمی اور سائینٹفک طریقہ اختیار کیا، انھون نے عربی زبان سیکھی، اور اس کی نادر و نایاب کتابین تلاش کرکے بڑی محنت سے تصحیح و تحشیہ کے ساتھ ان کو شائع کیا، اور خود مسلمانون کی کتابون سے غلط اور غیر معتبر واقعات و روایات ڈھونڈ کر، اور صحیح روایات مین تدلیس و ملمع سازی کرکے علم و تحقیق کے رنگ مین مذہب اسلام اور اسلامی تاریخ و تہذیب پر اعتراضات شروع کر دیئے، اور اُن کو ایسی بدنما شکل مین پیش کیا، کہ انھین پڑھکر خود مسلمانون کو شرم آنے لگی، ان مستشرقین مین ایسے بھی ہین جو مذہب اسلام اور اسلامی تہذیب کے بڑے مدّاح ہین، اور انھون نے بڑی کشادہ دلی سے اسلام کی خوبیون اور ساری دنیا خصوصاً یورپ پر مسلمانون کے علمی و تمدنی احسانات کا اعتراف کیا ہے، اور اس پر مستقل کتابین لکھی ہین، لیکن ایسے کم ہین جن کا دامن بالکل پاک ہو، اور انھون نے کسی نہ کسی پہلو سے کوئی نہ کوئی زہر چکانی نہ کی ہو،

اس قسم کی تحریرون کا اثر نہ صرف دوسری قومون بلکہ ان تعلیم یافتہ مسلمانون پر بھی جو اپنے مذہب اور اپنی تاریخ سے واقفیت نہین رکھتے، بُرا اثر پڑتا تھا، اور اسلام کے متعلق ایک عام غلط فہمی پھیل رہی تھی، اس حملہ کے مقابلہ کے لئے دینی علوم مین پوری مہارت اور دینی بصارت کے ساتھ اسلامی تاریخ مین وسعت نظر، تلاش و تحقیق کے جدید طریقون، مغربی زبانون، جدید افکار و تصورات، اور نئے رجحانات سے واقفیت ضروری تھی، اور ان تمام باتون کا اجتماع نہ پرانے علماء مین تھا، اور نہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ مین، علماء کا بڑا طبقہ سرے سے ان حالات ہی سے بے خبر تھا، نیا طبقہ

جو باخبر تھا، اس مین صحیح دینی روح نہ تھی تاہم سب سے پہلے اسی طبقہ کے فضلاء مین سر سید احمد خان، اور مولوی چراغ علی وغیرہ نے اپنی بساط کے مطابق اس فرض کو انجام دیا، اور مستشرقین کے اعتراضون کے جواب مین مضامین اور کتابین لکھین، مگر یہ لوگ دینی علوم کے ماہر نہ تھے، اور نہ صحیح دینی بصیرت رکھتے تھے، اس کے علاوہ وہ مغربی علوم اور مغربی تہذیب سے اس قدر مرعوب تھے کہ ہر چیز مین اسی کو رد و قبول کا معیار سمجھتے تھے، اس لئے حسن نیت کے باوجود انھون نے بھی وہی غلطی کی جو اسلام کی ابتدائی صدیون مین یونانی فلسفہ کے اعتراضات کے جواب مین متکلمین فلاسفہ معتزلہ اور باطنی کر چکے تھے، یعنی معترضین کے تمام اعتراضات کو صحیح مان کر اُن کے جوابات دینے کی کوشش کی گو انکے بعض جوابات محققانہ بھی تھے لیکن جن اعتراضات کا جواب نہ بن پڑا ان مین خود اسلامی عقائد و تعلیمات مین ایسی تاویلین کین جن کو حقیقت سے کوئی علاقہ نہ تھا، تاہم انھون نے حسن نیت سے اپنے مقدور بھر اس فرض کو انجام دیا، اور اس سے ایک طبقہ کو فائدہ بھی پہنچا،

علماء کی جماعت مین مولانا شبلی پہلے شخص ہین جن مین یورپین فضلاء کے اس علمی حملہ کے مقابلہ کے شرائط بڑی حد تک موجود تھے، وہ اسلامی علوم کے بھی ماہر تھے، اسلامی تاریخ پر بھی اُن کی نظر بہت وسیع تھی، نئے خیالات و رجحانات اور مستشرقین کے اعتراضات سے بھی ان کو ایک حد تک واقفیت تھی، اس لئے اُن کی نظر اس فتنہ کے تمام گوشون تک پہنچی، اور ہر گوشہ سے انھون نے اس کو روکنے کی کوشش کی، اور ان کے زمانہ مین جن اعتراضات کا زیادہ شہرہ تھا، اُن کے نہایت محققانہ جوابات دئے، الجزیہ، کتب خانہ اسکندریہ، اورنگ زیب عالمگیر اور الانتقاد علی التمدن الاسلامی وغیرہ اس سلسلہ کے معرکۃ الآراء مضامین ہین،

اس سلسلہ مین اُن کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ متفرق اعتراضات کے جواب کے ساتھ انھون نے مذہب اسلام، اسلامی تاریخ اور اسلامی تہذیب کو ایسے محققانہ اور دلنشین انداز مین پیش کرنے کا سلسلہ شروع کیا جس مین اعتراض کی گنجایش باقی نہ رہے، اور معترضین بھی اُن کی عظمت ماننے پر مجبور ہو جائین، اور اس سلسلہ مین بکثرت مضامین اور مستقل کتابین لکھین، یہ مضامین مقالات شبلی مین موجود ہین، اور اُن کی بیشتر تصانیف اسی سلسلہ کی

کڑیاں ہیں، اور اُن کی ساری تصانیف کا مرکز و محور ایک ہی نقطہ ہے، خواہ وہ کسی موضوع سے تعلق رکھتی ہوں، اس سے ایک نیا علم کلام پیدا ہوا جس کی بنیاد پرانے فلسفہ اور منطق کے بجائے عقل و درایت اور تنقید و تاریخ پر ہے، اور اس سلسلہ کی سب سے اہم کتاب سیرۃ النبی ہے،

بعض مستشرقین نے اسلام کے خلاف سب سے بڑا حربہ یہ اختیار کیا تھا کہ نعوذ باللہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہی کو اعتراضات کا نشانہ بنا کر مجروح کر دیا جائے، اس سے خود بخود اسلام کی پوری عمارت منہدم ہو جائے گی، چنانچہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر مختلف قسم کے اعتراضات کا سلسلہ شروع کیا، علامہ شبلی مرحوم نے ان متفرق اعتراضات کا جواب دینے کے ساتھ ساتھ سیرۃ النبی پر ایک مبسوط کتاب لکھنے کا ارادہ کیا جس میں سوانح نبوی کے ساتھ اسلام کے عقائد و احکام و اعمال کی بھی تفصیل آجائے، اور وہ سیرت پاک اور اسلام کا ایسا صحیح اور دلکش مرقع ہو، جس میں کسی اعتراض کی گنجائش ہی باقی نہ رہے، اور جسے دیکھ کر مخالفین کو بھی آنحضرت صلعم، اور آپ کے لائے ہوئے مذہب کی حقانیت و صداقت اور عظمت و جلالت کا یقین ہو جائے، چنانچہ بڑے سر و سامان سے اس کتاب کی تالیف شروع کی، مگر ابھی اس کی دو جلدیں لکھی تھیں، اور وہ شائع بھی نہ ہوئی تھیں کہ اُن کا وقت آخر ہو گیا، اور وہ اس کام کی تکمیل اپنے لائق شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی کے سپرد کر گئے، جنھوں نے نہ صرف اس عظیم الشان کام کو مکمل کیا، بلکہ اسلامی علوم و فنون میں تلاش و تحقیق اور اس کی تعبیر و ترجمانی کی نئی نئی راہیں نکالیں، اور اس کی مختلف شاخوں میں اپنے علم و نظر کی وسعت اور تحقیق و تلاش کے بے مثال نمونے چھوڑ گئے،

اُن کے علمی و دینی خدمات کا دائرہ نہایت وسیع ہے، مگر ان سب کی غرض و غایت تقریباً ایک ہے یعنی اسلامی احکام و تعلیمات کی صحیح اور دلنشین تعبیر و ترجمانی، اور اسلامی علوم و فنون، اسلامی تاریخ، اسلامی تہذیب و ثقافت اور مسلمانوں کے علمی و تمدنی کارناموں کی محققانہ مرقع نگاری، یہ موضوع اتنا وسیع ہے کہ اس میں پوری اسلامی تاریخ آجاتی ہے، اور اُن کی بیشتر بلکہ تقریباً کل تصانیف اور مضامین کا محور و مرکز یہی نقطہ ہے، گو اُن کے ہمہ گیر علم و قلم کی عنان کبھی کبھی خالص علم و ادب کی جانب بھی مڑ جاتی تھی، اگرچہ بہت کم مضامین ایسے نکلیں گے، جو کسی نہ کسی حیثیت

سے اصل مرکزی مقصد سے تعلق نہ رکھتے ہوں، ان کی نظر تمام اسلامی علوم پر یکساں تھی، مگر قرآن مجید، قدیم و جدید علم کلام، اور اسلامی تاریخ اُن کا خاص موضوع تھے، اور اُن کے بیشتر مضامین و تصانیف اسی سے تعلق رکھتے ہیں، ان میں سیرۃ النبی شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے، اس میں اُن کے خاص فنون کا اجتماع ہے، اور اُن کے علم و تحقیق کی تمام شانیں نمایاں نظر آتی ہیں،

## سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

یہ کتاب اپنی خصوصیات میں سیرۃ کے سارے ذخیرۂ کتب میں خواہ وہ کسی زبان میں لکھی گئی ہوں منفرد حیثیت رکھتی ہے، حتی کہ عربی میں بھی اس نوعیت کی ایسی جامع کوئی سیرت نہیں لکھی گئی، سیرۃ النبی کی تالیف سے پہلے اردو میں سیرۃ نبوی پر جس قدر کتابیں لکھی گئیں، وہ زیادہ تر مغازی اخلاق و شمائل نبوی پر مشتمل ہیں، اور اُن میں روایات کی صحت اور تحقیق و تنقید کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا اور وہ ہر قسم کی رطب و یابس روایات کا مجموعہ ہیں صرف بعض کتابیں مثلاً قاضی سلیمان صاحب منصور پوری کی رحمۃ للعالمین، اور اس قسم کی چند کتابیں اس سے مستثنیٰ تھیں مگر ان کا نقطۂ نظر بھی دارالمصنفین کی سیرۃ النبی سے مختلف تھا، اور وہ صرف دیندار مسلمان کے ذوق کی تھیں، ان میں مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات اور جدید ذوق و رجحان کی تشفی کا کوئی سامان نہ تھا، اس لحاظ سے اردو میں یہ پہلی سیرت ہے جس میں ان تمام ضروریات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے، اور جس میں سوانح اور شمائل نبوی اور اسلام کی تعلیمات کو ایسے محققانہ اور دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے جس سے منکرین و مخالفین بھی اُن کی صداقت و عظمت ماننے پر مجبور ہو جائیں، اس کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ وہ تنہا سوانح نبوی نہیں ہے بلکہ اس میں اسلام کے عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق کا خلاصہ آگیا ہے، اور اس حیثیت سے وہ اسلامی تعلیمات کی دائرۃ المعارف کہی جا سکتی ہے، دوسری خصوصیت یہ ہے کہ روایات کے رد و قبول میں بڑی احتیاط برتی گئی ہے، اور اُن کی تحقیق میں نقد و جرح اور روایت و درایت کے تمام محدثانہ اور تحقیقی اصولوں کو کام میں لایا گیا ہے، اور صرف معتبر اور مستند روایتیں لی گئی ہیں، اس سلسلہ میں سیرۃ النبی کا مقدمہ جس میں سیرت نبوی کے عربی ماخذوں اور روایت و درایت کے اصولوں پر بحث کی گئی ہے

نہایت اہم چیز ہے، تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ان تمام اعتراضوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے جو مخالفین کرتے ہیں اور مناظرانہ بحث و مباحثہ اور اعتراض و جواب میں پڑنے کے بجائے نفس واقعہ کو ایسے محققانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ اعتراض خود بخود اٹھ جاتا ہے، اور جو اعتراضات غیر معتبر روایات پر مبنی ہیں، وہ ان کی تنقید ہی سے رد ہو جاتے ہیں، اسی کے ساتھ جدید دور کے سیرت نگاروں اور متکلمین کی غلطیوں سے پورا احتراز کیا گیا ہے، اور محض اعتراض سے بچنے کے لئے نہ کسی صحیح واقعہ کا انکار کیا گیا ہے، اور نہ غلط تاویل کی گئی ہے، بلکہ اعتراض سے بے پروا ہو کر محققانہ نگاہ ڈالی گئی ہے، جو اعتراضات غلط فہمی یا قصورِ نظر کا نتیجہ ہیں ان میں غلط فہمی کا ازالہ کیا گیا ہے، جو غیر معتبر روایات پر مبنی ہیں، ان پر تنقید کر کے ان کی بے اعتباری ظاہر کر دی گئی ہے، اور جو معترضین کے خود ساختہ نقطۂ نظر کا نتیجہ ہیں، ان میں نقطۂ نظر ہی کو غلط ثابت کیا گیا ہے، اور کسی مسئلہ میں صحیح اسلامی نقطۂ نظر سے قلم ہٹنے نہیں پایا ہے، اور سارے مسائل کو قرآن مجید اور احادیث نبوی کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے، اور کسی عقیدہ و خیال میں سلف صالحین کے عقیدہ سے انحراف نہیں کیا گیا ہے،

یہ کتاب چونکہ اسلامی تعلیمات کا بھی خلاصہ ہے، اس لئے اس میں مذہبی عقائد، شرعی قوانین، اخلاقی اصول اور تاریخی واقعات ہر قسم کے مسائل زیر بحث آئے ہیں، جن میں عالم غیب، وحی، ملائکہ، یوم آخرت، جزا و سزا، دلائل و معجزات وغیرہ جیسے مابعد الطبیعی نازک مسائل بھی ہیں، جن کو ایمانی ذوق اور وجدانِ سلیم کے بغیر تنہا عقل اور مادی حواس کی مدد سے سمجھنا مشکل ہے، اور ایسے موقعوں پر بڑے بڑوں سے چوک ہو جاتی ہے، مگر مصنف نے ادنی لغزش کے بغیر اس خوبی سے ان نازک مراحل کو طے کیا ہے کہ کہیں نقل و روایت اور کتاب و سنت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے، اور کسی صحیح عقیدہ کی غلط تاویل نہیں کی گئی ہے، دوسری طرف ہر بحث عقلی و درایتی حیثیت سے اس قدر مدلل، دلپذیر اور دلنشین ہے کہ عقل سلیم کے لئے اس میں کسی شک و شبہہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی، غرض سیرت نبوی علم و نظر کی وسعت، تحقیق و تنقید، دیدہ وری و نکتہ سنجی، دلائل کی دلنشینی اور اسلامی تعلیمات کی صحیح اور حکیمانہ تعبیر و ترجمانی کا ایسا شاہکار ہے اور اس میں مصنف کے علمی کمالات کے ایسے

گوناگون جلوے ہین، کہ اُن کی ایک جھلک بھی اس مضمون مین دکھانا ممکن نہین، اگر سیرۃ النبی کے مباحث کی صرف سرخیان نقل کیجائین تو بھی ایک ضخیم کتاب تیار ہوجائے گی، ایسی حالت مین ایک مختصر مضمون مین اس تبصرہ کی گنجایش کہان سے نکل سکتی ہے، اس لئے صرف ہر جلد کے موضوع اور اس کے مباحث کا اجمالی خاکہ پیش کرنے پر اکتفا کیجائے گی جس سے ان مباحث کی نوعیت کا اندازہ ہوسکے،

سیرۃ النبی چھ ضخیم مجلدات مین ہے، پہلے دو حصے علامہ شبلی کے قلم سے ہین، اور باقی چار مولانا سید سلیمان ندوی کی تالیف ہین، پہلے حصہ مین فن سیرت پر ایک مبسوط مقدمہ ہے جس مین سیرۃ نبوی کی اہمیت و ضرورت اور سیرت نگاری کی مختصر تاریخ ہے اور اس کے قدیم ماخذون کا محققانہ جائزہ لیا گیا ہے، اور سیرت سے متعلق حدیث، مغازی و سیرت اور تاریخ کی روایات کے رد و قبول کے بارہ مین محدثانہ اصول سے ناقدانہ بحث کی گئی ہے، اور آخر مین سیرت کے یورپین مصنفین اور اُن کی تصانیف پر مختصر تبصرہ کیا گیا ہے، یہ مقدمہ اپنے معلومات و مباحث کے لحاظ سے ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے، اس کے بعد دوسرے مقدمہ مین عرب کی قدیم سیاسی و مذہبی تاریخ ہے جس مین خانہ کعبہ کی تعمیر، حضرت اسمٰعیلؑ کے ذبیح ہونے کی بحث بھی آگئی ہے،

اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے، اس مین آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ولادت سے لے کر پہلے حج تک غزوات و سرایا کے مفصل اور محققانہ حالات ہین، اس مین اسلامی جہاد و غزوات نبوی، یہود خیبر کی جلا وطنی، اور بعض ازواج مطہرات سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کے متعلق جو اعتراضات کئے جاتے ہین، ان کا محققانہ جواب بھی دیا گیا ہے، آخر مین غزوات پر مجموعی تبصرہ ہے، جس سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ اسلام کا مقصود قتل و خونریزی اور ملک گیری نہین، بلکہ صرف اسلام کی پرامن تبلیغ اور عرب مین امن و امان کا قیام تھا، اور یہ لڑائیان محض کفار و مشرکین کی مزاحمت اور اُن کی زیادتیون کی وجہ سے پیش آئین، اس کے باوجود اسلام نے نہایت منصفانہ اصول جنگ اختیار کئے اور پرانے وحشیانہ طریقون کا خاتمہ کرکے اسلامی جہاد کو عبادت اور خیر بنا دیا،

دوسرے حصہ مین نبوت کی پرامن زندگی یعنی اسلام کی تبلیغ و اشاعت قبائل عرب کا قبول اسلام،

مدینہ میں اسلامی حکومت کی تاسیس اس کے سادہ نظام، مذہبی تعلیمی و تبلیغی انتظامات، شریعت کی تکمیل، اس کے اصولی عقائد، عبادات، معاملات حلال و حرام حجۃ الوداع، خطبۃ الوداع، وفات نبوی، آپ کے شمائل و معمولات اخلاق و سیرت، ازواج مطہرات، اولاد امجاد، اور اہل بیت کی زندگی کے حالات ہیں، اور ان تمام حالات و واقعات کو خواہ وہ تبلیغ اسلام سے تعلق رکھتے ہوں، یا میدان جنگ سے خانگی زندگی سے متعلق ہوں، یا پبلک زندگی سے، پیغمبر کی حیثیت سے ہوں، یا عام انسان کی حیثیت سے دشمنوں سے متعلق ہوں، یا دوستوں سے، غرض زندگی کے جس شعبہ سے بھی تعلق رکھتے ہوں، اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ جس سے آپ کی پیغمبرانہ صداقت، اور اخلاقی عظمت پوری طرح نمایاں ہو جاتی ہے، اور آپ کے خلق کریم کو دیکھ کر مخالف بھی آپ کی عظمت ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے،

جہاں تک خالص سیرت نبوی کا تعلق ہے، وہ ان دونوں حصوں پر ختم ہو جاتی ہے، مگر اس سیرت کی تالیف کا مقصد محمد الرسول اللہ کے سوانح کے ساتھ آپ کے لائے ہوئے مذہب کو بھی پیش کرنا تھا، اس لئے باقی حصوں میں اسلامی تعلیمات کی تفصیلات ہیں، اس میں سب سے اہم مسئلہ دلائل و معجزات کا ہے، اگرچہ معجزات اور خوارق عادات تمام مذاہب میں مشترک ہیں، مگر عقل پرستوں کی عقل کی سمائی سے سب سے زیادہ وہی باہر ہیں، اس لئے تیسری جلد خاص دلائل و معجزات پر ہے، اس میں پہلے نفس معجزہ کی حقیقت، اور قرآن مجید، قدیم و جدید فلسفہ اور علم کلام کی روشنی میں معجزہ کے امکان و وقوع پر بڑی مبسوط بحث کی گئی ہے، اور یہ دکھایا گیا ہے، کہ خود نوامیس فطرت کے لحاظ سے بھی خوارق عادت یا معجزہ میں کوئی عقلی استبعاد نہیں ہے، اس میں حسب ذیل بحثیں ہیں، دلائل و معجزات کی حقیقت، دلائل و معجزات اور فلسفہ قدیم و علم کلام، معجزات اور فلسفہ جدید، معجزات کا امکان اور اس کا استبعاد، معجزات کا یقین، اس کی غرض و غایت، آیات و دلائل اور قرآن مجید، ان مباحث کے بعد خصائص نبوت یعنی مکالمۂ الٰہی، نزول ملائکہ، رویا اور معراج و شرح صدر کا بیان ہے، پھر ان آیات و معجزات کا ذکر ہے، جو قرآن مجید اور معتبر روایات سے ثابت ہیں، اس کے بعد غیر معتبر روایات پر تنقید کی گئی ہے، پھر بعثت نبوی کی ان دونوں

کا تذکرہ ہے، جو قدیم الہامی صحیفوں میں ہیں، اور آخر میں خصائص محمدی کا ذکر ہے، ان مباحث میں اس جامعیت اور استقصار کے ساتھ معجزات پر بحث کی گئی ہے کہ اس کا کوئی گوشہ اور کوئی رُخ چھوٹنے نہیں پایا ہے، اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ معجزات کے صدور میں کوئی عقلی استحالہ نہیں ہے، اور نہ وہ نوامیس فطرت کے خلاف ہیں، دنیا میں بہت سے ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں، جن کی کوئی عقلی توجیہ نہیں ہو سکتی، اس لئے اگر خالق کائنات قادر مطلق کسی حق کے اثبات اور کسی پیغمبر کی تائید کے لئے خرق عادت کا ظہور کر دے تو اس میں کوئی عقلی استحالہ ہے، اور معجزات کا مقصد صرف عوام کی تشفی ہوتا ہے خواص کے لئے اس کی ضرورت نہیں ہوتی،

چوتھی جلد اسلام کے بنیادی عقائد پر ہے، اور اس میں نبوت، وحی، ملائکہ، قیامت، سزا و جزا، اور جنت و دوزخ وغیرہ جیسے ما بعد الطبیعی مسائل پر بحث ہے، اس لئے وہ تیسری جلد سے بھی زیادہ اہم ہے، اس میں پہلے منصب نبوت پر ایک مبسوط مقدمہ ہے، جس میں نبوت کی حقیقت، اس کی اہمیت و ضرورت پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور اس کے لوازم و شرائط بیان کئے گئے ہیں، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت دنیا کی تمام قوموں کی مذہبی حالت اور ان کی اخلاقی اور روحانی پستی کا نقشہ دکھایا گیا ہے خصوصاً عرب کے حالات زیادہ تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت، اور عربوں کی اصلاح میں آپ کو جو گوناگوں دشواریاں پیش آئیں، اور بالآخر اسلام نے جو عظیم الشان انقلاب پیدا کیا، اس کی تفصیل ہے، اس کے بعد اسلام کے بنیادی عقائد یعنی اللہ تعالیٰ پر ایمان، فرشتوں، انبیاء، رسل، اور کتب سماوی پر ایمان کی تفصیل ہے، پھر عالم برزخ، جزا و سزا، دوزخ و جنت اور قضا و قدر کے مباحث ہیں، اور آخر میں ایمان کے نتائج کا ذکر ہے، اور ان تمام نازک اور دقیق مسائل کو جن کا محض عقل و مادی حواس کے ذریعہ سمجھنا بہت دشوار ہے، ایسے حکیمانہ اور دلنشیں انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ قلب سلیم کی تشفی کے لئے بالکل کافی ہے

پانچواں حصہ عبادات پر ہے، اس میں پہلے اعمال صالحہ کی اہمیت دکھائی گئی ہے، اور اس کے اقسام بیان کئے گئے ہیں، جن میں سب سے زیادہ اہم عبادت ہے، اس کے بعد اسلامی عبادات کی خصوصیات اور اس کے ارکان

توازن پر روشنی ڈالی گئی ہے، پھر جسمانی عبادات یعنی نماز زکوٰۃ روزہ حج اور جہاد کی تفصیل اور ان کی حکمتوں اور مصلحتوں کی تشریح ہے، پھر قلبی عبادات جو جسمانی عبادات کی روح کی حیثیت رکھتی ہیں، مثلاً تقویٰ اخلاص، توکل، اور صبر شکر وغیرہ کی تفصیل، اور اُن کی ایسی حکیمانہ تشریح ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسانی اخلاق کے تزکیہ و تطہیر اور تعلق مع اللہ کا سب سے بہتر وسیلہ اسلامی عبادات ہیں، اس سلسلہ میں دوسرے مذاہب کی عبادات سے اسلامی عبادتوں کا موازنہ بھی آگیا ہے،

چھٹا حصہ اخلاق پر ہے، دنیا کا سارا نظام اور انسانیت کا سارا شرف اخلاق ہی سے وابستہ ہے، اس لئے تمام مذاہب میں اخلاق کی اہمیت ہے اور اس حیثیت سے کہ اُن کا تعلق زیادہ تر حقوق العباد سے ہے، وہ عبادات سے بھی زیادہ اہم ہیں، اور اسلام میں اُن کی سب سے زیادہ اہمیت ہے یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کا مقصد ہی مکارم اخلاق کی تکمیل تبلایا ہے، اس حیثیت سے یہ حصہ بھی نہایت اہم ہے، اور اس میں فلسفۂ اخلاق اور اسکی تمام جزئیات پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، اور اسلامی اخلاق کے امتیازی پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے، اس میں پہلے اسلام اور اخلاق حسنہ کا تعلق ظاہر کیا گیا ہے، اور اسلام میں اس کی اہمیت دکھائی گئی ہے، پھر دنیا کے تمام اخلاقی معلموں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز نمایاں کیا گیا ہے، پھر اسلام کے فلسفۂ اخلاق پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور دوسرے مذاہب کی اخلاقی تعلیمات کی خامیاں اور کمزوریاں اور اُن کے مقابلہ میں اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی جامعیت و کاملیت دکھلائی گئی ہے، پھر تعلیم اخلاق کے مختلف طریقوں کو تبلا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقۂ تعلیم کی خوبی ظاہر کی گئی ہے، پھر انسانوں کے باہمی حقوق و فرائض اور اخلاقِ فاضلہ اور اخلاقِ ذمیمہ کی تفصیل ہے، آخر میں آدابِ معاشرت کا اجمالی ذکر ہے، اس طرح یہ کتاب اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا مرقع ہے، اور اس سے اندازہ ہوتا ہے، کہ اسلام نے اخلاق کو کتنی اہمیت دی ہے، اور اس کی اخلاقی تعلیمات کس قدر جامع کامل اور حکیمانہ ہیں،

اسلام درحقیقت کوئی نیا مذہب نہیں ہے بلکہ قدیم الہامی مذاہب کی اصلاح شدہ ترقی یافتہ اور آخری تکمیلی

تشکیل ہے، ان مذاہب مین دو قسم کی خامیان تھین، ایک انسانون کی پیدا کردہ دوسری فطری، انسانون کا پیدا کردہ نقص یہ تھا کہ انھون نے ان مین اپنے حسب منشا تصرفات کرکے اُن کی شکل اس قدر بدل دی تھی، اور اُن مین اس قدر آمیزش کردی تھی کہ اصل شکل کا پہچاننا مشکل تھا، اور ان کا اصل مقصد ہی فوت ہوگیا تھا، اسلام نے اُن کو بیرونی آمیزش سے پاک کرکے اصلی شکل مین جلوہ گر کیا،

فطری نقص یہ تھا کہ مذاہب درحقیقت انسانیت کی تکمیل کا نصاب ہین، اور نصاب تعلیم کی ترقی کے ساتھ بدلتا رہتا ہے، اس لئے انسانی ارتقاء کے ساتھ مذاہب کی تعلیمات بھی بدلتی رہین، اور ہر دور کے انسانون کی عقل و دانش، اُن کے حالات و ضروریات کے مطابق ان مین تغیر اور ترقی ہوتی رہی، قدیم انسانون کی قوت ادراک و تعقل ادنی درجہ کی تھی، اور اُن کی ضروریات بھی سادہ اور محدود تھین، اور اُنکا دائرہ خاص خاص قومون تک محدود تھا، ان مین عالمگیریت نہ تھی، اسلئے اُنکے مذاہب بھی اسی کے مطابق تھے، پھر جیسے جیسے انسان عقل و شعور مین ترقی کرتا گیا، ضروریات بڑھتی گئین، اور انسانیت کا دائرہ پھیلتا گیا، اسی قدر اُن کے مذاہب مین بھی بلندی، وسعت، گہرائی اور عالمگیریت آتی گئی، اور پرانے مذاہب کی وہ تعلیمات جو ترقی یافتہ دور کے انسانون کے لئے موزون نہ رہ گئی تھین منسوخ ہوتی گئین، اور اُن کی جگہ نئی موزون تعلیمات آتی گئین، اور مذہب کا یہ ارتقا انسانی ارتقا کیساتھ برابر جاری رہا، تا آنکہ انسان عقل و دانش کے کمال تک پہنچ گیا، اور اس کے ساتھ اس کی ضرورتین بھی نہایت وسیع ہوگئین، ایسے ترقی یافتہ انسانون کے لئے ایسے جامع کامل عالمگیر اور دائمی مذہب کی ضرورت تھی، جو اس کی جملہ دینی و دنیوی ضروریات کا کفیل ہو، یہی آخری تکمیلی مذہب اسلام ہے، جو ایک مکمل نظام زندگی ہے، اور جسا کے دائرہ سے انسانی زندگی کا کوئی شعبہ بھی باہر نہین ہے، اور اس کی تعلیمات جملہ دینی و دنیوی اور مادی و روحانی ضروریات پر حاوی ہین، سیرۃ النبی مین اسلام کی اسی جامعیت و کاملیت اور اسکی تعلیمات کے حکم و مصالح کو اس طرح دکھایا گیا ہے کہ گذشتہ تمام مذاہب کے مقابلہ مین اسلام کا امتیاز نمایان ہوجاتا ہے، اور یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ انسانیت کی فلاح و سعادت کا آخری جامع و کامل اور دائمی عالمگیر مذہب اسلام ہی ہے، اس

اس لحاظ سے سیرۃ النبی جدید علم کلام کی بڑی معرکۃ الآرا کتاب ہے، اور اسلام کا ایسا کامل مرقع ہے جس مین اس کے سارے خط و خال نمایان ہین،

## خطباتِ مدراس

اس سلسلہ کی دوسری اہم کتاب خطباتِ مدراس ہے، یہ وہ خطبات ہین، جو مدراس کے بعض دیندار مسلمانون کی فرمایش پر اکتوبر ۱۹۲۵ء مین مدراس مین سیرۃ نبوی کے مختلف پہلوؤن پر دیئے گئے تھے جنھین بعد مین کتابی شکل مین شائع کر دیا گیا، یہ کل ڈیڑھ سو صفحون کی کتاب ہے، مگر اپنے معلومات کی وسعت، مباحث کی ندرت اور افادہ کے لحاظ سے سیرت کی ضخیم کتابون پر بھاری، اور تنہا یہ کتاب مصنف کے فخر کے لئے کافی ہے، اس مین ایک نئے نقطۂ نظر اور نئے اسلوب سے سیرۃ نبوی کے ان پہلوؤن پر بحث کی گئی ہے، جن کی جانب بہت کم توجہ کی گئی ہے، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخی حیثیت، آپ کی جامعیت و کاملیت، اور آپ کی زندگی کے عملی پہلو پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام مین ساری دنیا کے لئے دائمی نمونۂ عمل آپ ہی کی ذاتِ مقدس ہو سکتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جس قدر بھی انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے، وہ سب اپنے زمانہ کے پیغمبر برحق تھے، لیکن اُن کی بعثت کسی خاص قوم، خاص خطۂ زمین اور ایک محدود زمانہ تک اور ایک محدود مقصد کے لئے تھی، اس لئے ان کی تعلیمات کا دائرہ بھی محدود تھا، اور وہ ان کے زمانہ کے بعد منسوخ ہو گئین اس لئے انکے حالات اور ان کی تعلیم مین آیندہ زمانہ کے لئے تاریخی استناد اور جامعیت و کمال کی ضرورت ہی نہ تھی، اس لئے قدرت کی جانب سے بھی اس کا انتظام نہین کیا گیا، چنانچہ جن جن پیغمبرون کے نام معلوم ہین، اور جن کے مذاہب موجود ہین، ان مین سے کسی کے مستند تاریخی حالات نہین معلوم، بلکہ بعضون کی شخصیت تک مشتبہ ہے، اور جن کے حالات کچھ معلوم ہین وہ اتنے ناقص اور غیر معتبر ہین کہ اُن سے زندگی کے کسی شعبہ مین بھی رہنمائی نہین ہو سکتی، مگر خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی آنے والا نہین تھا، اور اسلام ساری دنیا کے لئے دائمی مذہب بنا کر بھیجا گیا تھا، اور آپ کی

ذات جامع کمالات بنائی گئی تھی، اس لئے آپکے حالات کی حفاظت کے لئے قدرت کی جانب سے یہ اہتمام کیا گیا کہ آج تیرہ صدیاں گذر جانے کے بعد بھی آپ کی پوری زندگی کا ایک ایک واقعہ اور ہر ہر پہلو اس تفصیل اور اس تاریخی اسناد کے ساتھ محفوظ ہے کہ دنیا کی کوئی تاریخ بھی صحت اسناد میں اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی خطبات مدراس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی تاریخیت، آپکے حالات کی جامعیت اور آپ کی تعلیمات کی کاملیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے،

پہلے خطبہ میں دکھایا گیا ہے کہ انسانیت کی تکمیل صرف انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں سے ہوسکتی ہے، اور تاریخی شواہد سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ وہ سلاطین و کشورکشا جنھوں نے دنیا کا نقشہ بدل دیا، وہ مدبرین و سیاستدان جنھوں نے قوموں کی قسمتیں پلٹ دیں، وہ مقننین جنھوں نے بڑی بڑی حکومتوں کے دستور بنائے، اور وہ حکماء و فلاسفہ جنھوں نے بہتر سے بہتر فلسفے پیدا کئے، انسانیت کے امراض کا مداوا اور دلوں کی دنیا منور نہ کرسکے، اور آج دنیا میں جہاں کہیں بھی اخلاق و روحانیت کا نور نظر آتا ہے، وہ صرف انبیاء علیہم السلام کا فیض ہے،

دوسرے خطبہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے دائمی اور عالمگیر نمونۂ عمل ہونے پر بحث کی گئی ہے، اور اس سلسلہ میں سیرت محمدی کے تاریخی و تکمیلی پہلوؤں اور اس کی جامعیت و عملیت پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور یہ دکھایا گیا ہے کہ آج ہم کو جن پیغمبروں کے نام معلوم ہیں، ان میں صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مستند تاریخی حالات کا علم ہے، اور اس جامعیت کے ساتھ کہ آپ کی پوری زندگی کا ہر پہلو پوری طرح محفوظ ہے، اور اس میں ہر شعبۂ زندگی کے لئے اسوۂ عمل موجود ہے، پھر آئندہ خطبات میں ان میں ہر ایک پہلو پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے،

تیسرے خطبہ میں سیرت نبوی کے تاریخی پہلو پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے، اور یہ دکھایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر جس قدر تاریخی مواد موجود ہے، اتنا مواد دنیا کے کسی بڑے سے بڑے انسان کے حالات میں نہیں مل سکتا، اور اس سلسلہ میں سیرت کے تمام ماخذوں قرآن مجید، کتب حدیث، مغازی و سیر،

تاریخ اور دلائل و شمائلِ نبوی کے پورے ذخیرہ کا جائزہ لیا گیا ہے، اس میں ان علوم کی اجمالی تاریخ آگئی ہے اور پھر محدثانہ اصول سے اس ذخیرہ پر بحث و تنقید کی گئی ہے، ان بحثوں سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر جتنا مستند ذخیرۂ معلومات موجود ہے اس کے عشر عشیر غیر مستند حالات بھی کسی پیغمبر کے نہیں مل سکتے۔

چوتھے اور پانچویں خطبہ میں آپ کی جامعیت و کاملیت پر بحث کی گئی ہے، یہ دونوں چیزیں درحقیقت ایک ہی چیز کے دو رُخ ہیں، کاملیت سے یہ مراد ہے کہ شروع زندگی سے وفاتِ نبوی تک آپ کی زندگی کا ہر واقعہ محفوظ ہے، مثلاً خاندان، آبا و اجداد، پیدائش، شیرخوارگی، بچپن، سنِ شعور، جوانی، اس زمانہ کے مشاغل، پیشہ، شادی، احباب قبل از نبوت، قریش کے معاہدہ میں شرکت، امین کا خطاب، آثارِ نبوت، تنہائی پسندی، غارِ حرا کی خلوت نشینی، اور چلہ کشی نبوت کا آغاز، وحی، اسلام کا ظہور، اس کی دعوت، اس راہ کے مشکلات و مصائب، ہجرت، قیامِ مدینہ، غزوات کے حالات، دعوتِ اسلام کے خطوط، اسلام کی اشاعت و تکمیل، حجۃ الوداع، اور وفات وغیرہ کے تمام حالات محفوظ و معلوم ہیں، اسی طریقہ سے زندگی تمام معمولات، و عادات و خصائل کے حالات شمائل کی کتابوں میں موجود ہیں، جن سے آپ کی زندگی کے جزئی سے جزئی واقعہ کا علم ہو سکتا ہے، حتیٰ کہ وہ واقعات بھی جن میں وحی کے ذریعہ آپ کو تنبیہ کی گئی ہے، اور ایسے واقعات بھی جن پر مخالفین اعتراض کرتے ہیں بجنسہ محفوظ ہیں، یہ سیرتِ نبوی کا تکمیلی پہلو ہے۔

اس کا دوسرا پہلو اس کی جامعیت ہے، یعنی مختلف انسانی طبقات اور اُن کی زندگی کے ہر پہلو اور ہر انسانی ضرورت کے متعلق آپ کی زندگی میں اسوۂ عمل موجود ہے، مثلاً شاہ و گدا، حاکم و محکوم، فاتح و مفتوح، امیر و غریب، تاجر و مزدور، عزیز اور دوست وغیرہ مختلف حالتوں اور حیثیتوں سے آپنے زندگی بسر کی ہے اسلئے ان سب کی حیثیت اور اُن کے تعلقات و فرائض کا سبق بھی ہم کو سیرتِ پاک سے مل سکتا ہے، پھر ہر انسان کے معمولاتِ زندگی اور روزانہ کے کاروبار مثلاً اٹھنے بیٹھنے کھانے پینے سونے جاگنے، ہنسنے بولنے، لین دین، تعلیم و تعلم، عبادت و ریاضت وغیرہ ان تمام معمولات و مشاغل کا سبق بھی جو روزانہ کی زندگی میں پیش آتے ہیں، ہم حیاتِ طیبہ سے سیکھ سکتے ہیں حتیٰ کہ انسانی اوصاف اور اُن کے ذہنی و جذباتی کیفیات و احوال مثلاً خوشی و رضامندی، غم

عفت، عزم و استقلال، صبر و توکل، شجاعت و شہامت، استغنا، و قناعت، جود و سخا، تواضع و انکسار وغیرہ تک کی تعلیم بھی ہم کو اسوۂ نبی سے ملتی ہے، غرض انسانی زندگی کے ہر شعبہ اور ہر حالت اور اس کے سارے مظاہر کا سبق ہم سیرت نبوی سے سیکھ سکتے ہین،

چھٹے خطبہ مین سیرت نبوی کے عملی پہلو کو دکھایا گیا ہے، یعنی آپنے جو اخلاقی تعلیمات دین، آپ خود اُن کا عملی نمونہ تھے، اس سلسلہ مین آپ کی زندگی سے ہر قسم کے اخلاق فاضلہ کے واقعات نقل کئے گئے ہین،

ساتوین خطبہ مین دوسرے مذاہب کے مقابلہ مین پیغام محمدی کی جامعیت و عالمگیریت اور اس کی پیدا کردہ اصلاحات اور دوسری انقلاب انگیز خصوصیات پر بحث کی گئی ہے، اور یہ دکھایا گیا ہے کہ جملہ مذاہب کی مشترک اور بنیادی تعلیمات یعنی ایمان و عمل صالح عقائد و عبادات اور اخلاق و معاملات وغیرہ کو اسلام ہی نے تکمیل تک پہنچایا، اور دوسرے مذاہب کی کتابین اور اُن کے صحیفے اس حیثیت سے بالکل ناقص ہین، چنانچہ توراۃ وانجیل مین عقائد و عبادات تک کی تعلیمات اتنی مبہم غیر واضح اور نامکمل ہین کہ ان سے عیسوی اور یہودی مذہب کے عقائد و عبادات کی تفصیل نہین معلوم ہو سکتی، توراۃ مین دنیاوی قوانین البتہ کسی قدر تفصیلی ہین، مگر اولاً وہ نہایت سخت ہین جس کا تحمل انسانی طاقت کے لئے دشوار ہے، دوسرے بعض حیثیتون سے ناقص بھی ہین، پھر اُن کا دائرہ بنی اسرائیل تک محدود ہے، اسلام نے ان کی سختی کو کم اور اُن کی خامیون کو دور کرکے اُن کو معتدل اور عالمگیر بنایا، اسی طرح اخلاق کے ناقص حصہ کی تکمیل کی اسلام سے پہلے انسان ہر اس قوت کے سامنے جس سے اس کے وہم مین ضرر کا اندیشہ یا فائدہ کی امید ہوتی، سربسجود ہو جاتا تھا، جس سے بے شمار دیوی اور دیوتا پیدا ہو گئے تھے، عیسائی اور یہودی مذہب مین اگرچہ اس قسم کے معبودان باطل کی پرستش نہین ہوتی تھی، مگر ان مین قسیسون اور رہبانون کو خدائی کا درجہ حاصل تھا، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیکر اس کی عظمت نمایان کی، اور یہ تبلایا کہ انسان کائنات کے لئے نہین پیدا کیا گیا ہے، بلکہ کائنات اس کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے، اس لئے دنیا کی کوئی چیز بھی اوس کی

پرستش کے لائق نہین ہے، توحید کا یہ پہلا سبق اسلام ہی نے پڑھایا، دنیا کے تقریباً تمام مذاہب نے انسان کو فطرةً خطاکار قرار دیا ہے جس سے نجات پانا دشوار ہے، اسی سے آریائی مذاہب مین تناسخ کا اور عیسائیون مین کفارہ کا عقیدہ پیدا ہوا، مگر اسلام نے انسان کو فطرةً معصوم اور گنہ گاری کو بُرے اعمال کا نتیجہ قرار دیا، انھون نے ہر انسان کے لیے نجات کی راہ کھلی رکھی، اسلام سے پہلے انسانیت نسلی اور جغرافی حدود مین بٹی ہوئی تھی، اسلام نے ان حدون کو توڑ کر عالمگیر انسانی برادری قائم کی، دوسرے تمام مذاہب مین درمیانی واسطون کے بغیر خدا تک نہین پہنچا جا سکتا تھا اسلام نے ان واسطون کو ختم کرکے براہ راست ہر انسان کا خدا سے تعلق قائم کیا، پیغمبرون اور صلحاء و اخیار کے ساتھ فرط عقیدت نے شرکت و بت پرستی کی شکل اختیار کر لی تھی، اسلام نے ان کا صحیح درجہ متعین کرکے شرک کے ایک بڑے وسیلہ کو ختم کیا،

آٹھوین خطبہ مین پیغام محمدیؐ کی بنیادی تعلیمات کو تبلایا اور یہ دکھایا گیا ہے کہ اسلام سے پہلے کسی مذہب مین بھی خالص توحید نہین تھی، جن مذاہب مین کسی حد تک تھی بھی تو وہ خدا اور بندہ کے تعلق کی تشبیہ و تمثیل اور اس کی ذات و صفات مین التباس و اشتباہ اور افعال خداوندی کی نیرنگیون کی غلط تعبیر کی وجہ سے شرک مین بدل گئی تھی، اسلام نے اس سارے التباس و اشتباہ کو دور کرکے شرک کا ہر دروازہ بند کر دیا، اور دنیا مین توحید خالص کو پہلی مرتبہ پیش کیا، اسی طرح عبادت کے غلط مفہوم یعنی ترکِ دنیا، رہبانیت، اور جسمانی اذیت کو مٹا کر اس کی صحیح شکل تبلائی، اور اس کا اصلی مقصد و منشاء واضح کیا،

اسلام سے پہلے انسانی جان کی کوئی قیمت نہ تھی، اور وہ دوسرون کی ملک کی سمجھی جاتی تھی، آقا غلام کو قتل کر سکتا تھا، دیوی اور دیوتاؤن پر انسانون کی قربانی عام تھی، عورت شوہر کی لاش کے ساتھ ستی ہو جاتی تھی، لڑکیون کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا، اسلام نے انسانی جان کا احترام قائم کیا، اور کسی انسان کو خود اپنی جان کا بھی مالک نہین بنایا، چنانچہ خودکشی تک حرام قرار دی، حسب و نسب کی تفریق کو مٹا کر تقوی کو معیار فضیلت اور اسلام کے عالمگیر تصور کے ماننے والون کو آپس مین بھائی بھائی قرار دیا، اور اس قبیل کی دوسری

اصلاحات کین،

یہ خطبات مدراس کے مباحث کا اجمالی خلاصہ ہے جس سے اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، درحقیقت یہ تنہا کتاب اسلام اور پیغمبر اسلام کی صداقت وعظمت اور دوسرے مذاہب پر اس کی برتری کے ثبوت کے لئے کافی ہے،

## سیرتِ عائشہؓ

سلسلۂ سیرت کی تیسری کتاب سیرت عائشہؓ ہے، اگرچہ وہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی سوانح عمری ہے لیکن ایک حیثیت سے وہ بھی سیرت نبوی کا ضمیمہ ہے، انسان کی زندگی مین اس کی رفیقۂ حیات کو بڑا دخل ہوتا ہے، خصوصًا اگر بیوی تعلیم یافتہ اور ہوشمند ہو تو شوہر کے کامون کی تکمیل مین اس سے بڑی مدد ملتی ہے، اور اس کے حالات سے شوہر کی زندگی کے مختلف رُخون پر روشنی پڑتی ہے، اس حیثیت سے ازواج مطہرات کے حالات بھی سوانح نبوی کا جزء ہین، یون تو بہت سی ازواج مطہرات تھین لیکن وہ بیویان جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج مین زیادہ دخل تھا، اور جنھون نے کسی نہ کسی حیثیت سے دین کی خدمت کی، اور جن سے اسلام کی تبلیغ واشاعت مین مدد ملی، دو تھین، حضرت خدیجہؓ اور حضرت عائشہؓ، حضرت خدیجہؓ نے سب سے پہلے آپ کی نبوت کی تصدیق اُس زمانہ مین آپ کی تشفی و دلدہی کی جب مکہ کا ذرہ ذرہ آپ کا دشمن ہو رہا تھا، اور ان کی دولت وجاہت سے اسلام کی ابتدائی تبلیغ واشاعت مین بڑی مدد ملی، مگر ان کا انتقال ہجرت نبوی سے کئی سال پہلے ہوگیا تھا اور اسلام کی ترقی کا زمانہ انھون نے نہین پایا، حضرت عائشہؓ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد مین آئین، اور وفات نبوی تک برابر ساتھ رہا، اور اس کے بعد تقریبًا نصف صدی تک زندہ رہین، اس لئے اسلام کے عروج وترقی کا پورا زمانہ انھون نے آنکھون سے دیکھا، اور اس زمانہ کے بعض واقعات وحوادث مین بھی انھون نے حصہ لیا، وہ اپنی ذاتی صلاحیتون اور گوناگون اوصاف وخصوصیات کے اعتبار سے اپنے دور کی نسوانی دنیا مین امتیازی درجہ رکھتی تھین، اور اسلام کی ابتدائی تاریخ مین مختلف حیثیتون سے ان کا نمایان حصہ رہا ہے،

وہ بڑی ذہین وذکی اور ابتداسے علم وتعلیم کی شائق تھین، اور اُن کے شعور کی آنکھین تعلیم وتربیت گاہِ نبوت مین کھلین، جہان ہر وقت دینی تعلیم کا چشمہ اُبلتا رہتا تھا، اس لئے حضرت عائشہؓ پوری طرح اس چشمہ سے سیراب ہوئین، اور تعلیم کے جو مواقع بھی ان کو ملے، اُن سے انھون نے پورا فائدہ اٹھایا، اور اُن کو سب سے زیادہ اس کے مواقع حاصل تھے، اس لئے اُن کے ذوق وشوق اور تعلیم نبوی نے ان کو اپنے زمانہ کی بڑی عالمہ بنا دیا اور تفسیر وحدیث، فقہ وفتاوی وغیرہ دینی علوم مین اُن کو بڑی دستگاہ حاصل تھی، اور تفقہ کلام وعقائد اور اسرارِ دین تک پر اُن کی نگاہ بڑی گہری اور مجتہدانہ تھی، جس کا اندازہ ان کی روایات اور اُن کے فقہی مسائل سے ہوتا ہے، ان علوم مین وہ نہ صرف عورتون بلکہ جماعتِ صحابہ مین امتیازی درجہ رکھتی تھین، اور بڑے بڑے صحابہ، محدثین، اور ائمہ اُن سے استفادہ کرتے تھے، وہ باقاعدہ دینی علوم کا درس دیتی تھین جن مین بڑے بڑے علما شریک ہوتے تھے۔ حج کے زمانہ مین جب مکہ مین ساری دنیائے اسلام کا اجتماع ہوتا تھا، اُن کا حلقۂ درس قائم ہوتا تھا، اُن کے پاس دور دراز سے فتاوی آتے تھے، خلفائے راشدین اور اکابر صحابہ تک ان مسائل مین جو اُنکے علم مین نہ ہوتے تھے، اُن کی جانب رجوع کرتے تھے، اگر اُن کے فتاوی کو جمع کیا جائے، تو کئی ضخیم جلدین مین آئین گے، اُن کے تلامذہ کی فہرست بڑی طویل ہے، غرض حضرت عائشہؓ کے ذریعہ دینی علوم کی بڑی اشاعت ہوئی خصوصاً عورتون سے متعلق بیشتر دینی احکام ومسائل انہی سے مروی ہین، دینی علوم کے علاوہ، وہ اس زمانہ کے دوسرے مروجہ علوم، انساب، شعر وادب اور تاریخ وغیرہ مین بھی مہارت رکھتی تھین،

انھون نے طویل عمر پائی، اور حضرت امیر معاویہ کے زمانہ تک زندہ رہین، حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جو انقلاب برپا ہوا، اور جس نے مسلمانون کی مرکزیت کا شیرازہ منتشر کر دیا، اور اُن کی تلوارین آپس ہی مین بے نیام ہو گئین تو اس نازک صورتِ حال کی اصلاح کے لئے حضرت عائشہؓ نے اس زمانہ کی سیاست مین بھی حصہ لیا، اور آخر آخر تک اصلاحِ حال کی کوشش کرتی رہین، مگر فریقین کے فتنہ انگیز عناصر کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکین جس شرکت کا انھیں بعد مین بڑا افسوس رہا،

غرض دینی علوم کی مسند سے لیکر رزمگاہ سیاست تک حضرت عائشہؓ کے نہایت نمایان کارنامے ہین، اور اسلام نے عورتون کو صالح ترقی کے جو حقوق عطا کئے ہین، حضرت عائشہؓ کی ذات اس کا عملی نمونہ تھی، انھون نے اپنی ذہانت وقابلیت سے جنس نسوانی کا درجہ بلند کر دیا، اور عملاً ثابت کر دکھایا کہ ایک مسلمان عورت نسوانی حدود مین رہ کر بھی علمی، اجتماعی اور سیاسی کامون اور دنیا کے دوسرے حقوق و فرائض کی ادائگی مین مردون کے دوش بدوش کام کر سکتی ہے، وہ عورت تھین، اس لیئے اسلام مین عورتون کے حقوق کی تعیین وتصریح اُن کے تحفظ اور عورتون کی عظمت و وقار قائم کرنے مین اُن کا بڑا حصہ ہے، اور ان امور سے متعلق اُن کی بکثرت روایتین اور واقعات حدیث کی کتابون مین موجود ہین، اس لئے سیرت نبویؐ کے اس پہلو کی وضاحت، اسلام مین جنس نسوانی کے حقوق کی تعیین، اس کے تحفظ ونگہداشت اور اس کی عملی مثال کی حیثیت سے سیرت نگار نبوی ہی کے قلم سے حضرت عائشہؓ کی سوانح نگاری کی ضرورت تھی، چنانچہ اسی نقطۂ نظر سے سیرت عائشہ لکھی گئی ہے، جس مین اُن کے حالات، اُن کے اوصاف وکمالات، اُن کے علمی و دینی اور سیاسی خدمات کو بڑی تفصیل سے دکھایا گیا ہے، اور ان کے اور حضرت علیؓ کے تعلقات اور جنگ جمل کے بارہ مین جو غلط واقعات مشہور ہین، اور اس سلسلہ مین بعض اسلامی فرقے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی کے متعلق مستشرقین جو اعتراضات کرتے ہین، اُن کی پوری تنقید وتردید کی گئی ہے، اس سوانح عمری سے یہ پوری طرح نمایان ہو جاتا ہے کہ اسلام نے عورتون کو کتنے حقوق عطا کئے ہین، اور اُن کا درجہ کتنا بلند کیا ہے، اور اس پہلو سے حضرت عائشہؓ نہ صرف اپنے زمانہ کے اعتبار سے بلکہ موجودہ دور کے نسوانی ترقی کے صحیح اسلامی تصور کے لحاظ سے بھی کتنے بلند درجہ پر فائز تھیں، اور آج بھی ایک مسلمان عورت اُن کی تقلید کے ذریعہ صحیح اور صالح ترقی کے بلند سے بلند مدارج تک پہنچ سکتی ہے،

## ارض القرآن

اس سلسلہ کی تیسری کتاب ارض القرآن ہے، اگرچہ اس کا موضوع سیرت سے جدا ہے، مگر

بقولِ مصنف اس کو سیرۃ النبی کا دیباچہ سمجھنا چاہئے، اس کا مقصد کلام مجید کے بعض تاریخی اور جغرافی بیانات پر مستشرقین کے اعتراضات کا جواب اور عرب کے قدیم جغرافیہ اور تاریخ کی تحقیق وتنقید ہے، اسلام سے پہلے عربون مین لکھنے پڑھنے کا رواج محض برائے نام تھا، اور اُن کی پرانی تاریخ کا دار و مدار زیادہ تر زبانی روایات اور قومی داستانون پر تھا جس مین غلط و صحیح کی آمیزش ناگزیر ہے، اس لئے ایک زمانہ تک عربون کی قدیم تاریخ پر پردہ پڑا رہا، اسلامی عہد مین جب تاریخ نگاری شروع ہوئی تو عربون کی زبانی روایات کی بنا پر عرب قبل اسلام کی تاریخ کے بارہ مین صحیح و غلط ہر قسم کے واقعات شامل ہوگئے؛

مستشرقین نے جب عربون کی تاریخ پر تحقیقات شروع کی، تو انھون نے قدیم یونانی اور رومی مورخین وجغرافیہ نویسون کے بیانات اور جدید اثری اکتشافات اور پرانے کتبات وغیرہ سے ایسی معلومات حاصل کئے جو عربون کی قدیم روایات کے خلاف تھے،

کلام مجید مین عبرت وبصیرت کے لئے عرب کی قدیم قومون، اُن کے انبیاء ورسل اور اُن کے اماکن و آبادیون کا ذکر کیا گیا ہے، جس کے بعض بیانات مستشرقین کی تحقیقات سے مطابقت نہین کرتے، اس پر مستزاد یہ ہوا کہ بے احتیاط مفسرین نے ان بیانات کی تفسیر مین عربون کی بہت سی زبانی روایات اور اسرائیلیات نقل کردین، اس سے مستشرقین کو یہ بھی اعتراض کا موقع مل گیا، جس سے اُن کے نزدیک قرآن مجید کی صداقت مشتبہ ہوجاتی تھی، ارض القرآن ان اعتراضات کے جوابات اور عرب کی قدیم تاریخ کی تحقیق مین لکھی گئی ہے، اگرچہ سیرۃ النبی کی طرح اس کا طرز بھی مناظرانہ کے بجائے تحقیقی وتنقیدی ہے، اس مین قدیم و جدید دونون ماخذون سے قدیم عرب کی محققانہ تاریخ اور اس کا جغرافیہ پیش کیا گیا ہے، کلام مجید کے بیان کردہ واقعات پر مستشرقین کے اعتراضات کی تنقید وتردید کا خصوصیت سے لحاظ رکھا گیا ہے، جس سے دونون مین مطابقت پیدا ہوجاتی ہے یا مستشرقین کی تحقیقات کی غلطی اور کلام مجید کے بیان کی صداقت ظاہر ہوجاتی ہے، اگرچہ مصنف کی ابتدائی تصنیف ہے مگر علم ونظر کی وسعت اور تحقیق وتنقید کے لحاظ سے وہ کمال کی تصانیف سے کم نہین ہے، اور اسکے شروع کا حصہ جسکا تعلق

کا مقدمہ سمجھنا چاہیئے، اور جس میں عرب کی تاریخ و جغرافیہ کے قدیم و جدید ماخذ یعنی قرآن مجید، تفسیری روایات، اسرائیلیات، کلام عرب، عرب قدیم کی تاریخ کے اسلامی مصنفین، ان کی تاریخوں، کتب جغرافیہ، انساب عرب، اسرائیلی لٹریچر، رومی و یونانی مصنفین کی کتابوں، عربوں کی قدیم روایات اور جدید اثری اکتشافات پر بحث و تنقید ہے، بڑا فاضلانہ اور محققانہ ہے، اور اس بحث و تنقید ہی سے اعتراضات کا میدان بہت تنگ ہو جاتا ہے۔

اس مقدمہ کے بعد عرب قدیم کا مفصل جغرافیہ، اس کی قدیم تاریخ، اور کلام مجید میں جن اقوام و قبائل اور مقامات کا ذکر ہے، ان کی تاریخی و اثری تحقیق ہے، اور دوسرے حصہ میں قرآن مجید، توراۃ، یونانی و رومی مصنفین کے بیانات اور اثری اکتشافات کی روشنی میں بنو ابراہیم کی تاریخ، عربوں کی قبل از اسلام تجارت، اور ان کے مذاہب پر تفصیل کے ساتھ بحث اور جدید ماخذوں سے کلام مجید کے بیانات کی تائید و توثیق کی گئی ہے اور مستشرقین کے بیانات کا رد کیا گیا ہے، اس طرح یہ کتاب گویا عرب کی قدیم اقوام و ملل اور اماکن و مقامات کے متعلق کلام مجید کے بیانات کی تاریخی جغرافی اور اثری تفسیر ہے، اور اس کی روشنی میں اس کے بہت سے تاریخی و جغرافی بیانات کی تائید و وضاحت ہو جاتی ہے،

## عرب و ہند کے تعلقات

مذکورۂ بالا علمی و مذہبی تصانیف کے علاوہ متعدد خالص علمی تصانیف بھی ہیں، مگر وہ بھی تکلماً مقصد سے خالی نہیں ہیں، ان میں عرب و ہند کے تعلقات اور خیام زیادہ اہم ہیں، اور اپنے معلومات کی وسعت اور تلاش و تحقیق میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں، اور ان کو یورپین زبانوں کی اعلیٰ سے اعلیٰ تصانیف کے مقابلہ میں بلاتکلف پیش کیا جا سکتا ہے۔

ان دونوں میں عرب و ہند کے تعلقات امتیازی حیثیت رکھتی ہے، یہ کتاب اگرچہ خالص علمی و تاریخی ہے، مگر اس کا مقصد ہندو مسلمانوں کے تعلقات کے متعلق بعض غلط فہمیوں کا ازالہ اور ان دونوں کے تعلقات کی قدامت اور اس کی خوشگواری دکھانا ہے، انگریزوں نے اپنے سیاسی مصالح کے لئے جو غلط فہمیاں پھیلائی ہیں ان میں

سے ایک یہ بھی ہے کہ ہندوؤن سے مسلمانون کا تعلق محض فاتحانہ اور حاکمانہ رہا ہے، اور وہ سندھ کی اسلامی حکومت کو چھوڑ کر ہندوستان سے مسلمانون کا تعلق غزنوی عہد سے شروع کرتے ہین، جن کا مقصد اُن کے نزدیک ہندوستان کی دولت کا سمیٹنا تھا اور اسی مقصد کے ماتحت بعد کے مسلمان حکمران خاندانون نے ہندوستان کو فتح کیا، مگر حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان سے عربون کا تعلق اس کی فتح بلکہ اسلام کے ظہور سے بھی صدیون پہلے سے تھا، عرب ایک تاجر قوم اور مشرق و مغرب کے درمیان تجارتی کڑی تھے، وہ مصر و افریقہ اور شام و عراق کا تجارتی سامان ہندوستان، سیلون، برہما، انڈونیشیا اور چین تک لیجاتے تھے، اور ان ملکون کی چیزین مذکورۂ بالا ملکون مین پہنچاتے تھے، پھر ظہورِ اسلام کے بعد ہندوستان مین اسلامی حکومت کے قیام سے بہت پہلے مسلمانون اور ہندوؤن کے درمیان علمی، مذہبی اور تمدنی ہر قسم کے تعلقات پیدا ہو گئے تھے، اور ہندوستان کے جنوبی ساحلی علاقون مین ان کی بڑی بڑی آبادیان قائم ہو گئی تھین، اور ان کے محاسن اخلاق کی وجہ سے ہندو راجہ ان کا بڑا لحاظ اور اُن کے ساتھ بڑی رعایت کرتے تھے، جہان اُن کی زیادہ آبادی تھی، وہان ان کا مستقل مذہبی نظام قائم تھا، اور اُن کے معاملات کے فیصلہ کے لئے قاضی مقرر تھے،

عرب و ہند کے تعلقات مین تعلقات کے ان تمام پہلوؤن کو بڑی تفصیل سے دکھایا گیا ہے، یہ کتاب پانچ ابواب مین منقسم ہے، پہلے باب مین ہندوستان سے عربون کے تعلقات کی ابتدا پر بحث کی گئی ہے، اور تجارتی تعلقات کی قدامت پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس سلسلہ مین یہ بھی ثابت کیا گیا ہے، کہ دنیا کی پہلی بحری تجارتی قوم فنیقین عرب تھے، جو شام کے ساحل پر بس گئے تھے، اور اُن کے علمی اثرات ظہورِ اسلام سے بہت پہلے ہندوستان پر پڑ چکے تھے اس کے بعد ہندوستان پر مسلمانون کے ابتدائی حملہ اور سندھ کی فتح کا مختصر تذکرہ ہے، پھر مسلمان جغرافیہ نویسون ابن خرداذبہ ۲۵۰ھ، سلیمان تاجر ۲۳۷ھ، ابوزید حسن سیرافی ۲۶۴ھ، ابودلف مسعر بن مہلہل ۳۳۱ھ، بزرگ بن شہریار ۳۰۰ھ، مسعودی ۳۰۳ھ، اصطخری ۳۴۰ھ، ابن حوقل ۳۳۱ھ، بشاری مقدسی ۳۷۵ھ، البیرونی ۴۰۰ھ، ابن بطوطہ ۷۷۹ھ وغیرہ کی کتابون سے جو خود ہندوستان آئے تھے، اور اپنی کتابون مین اس زمانہ کے ہندوستان کے حالات لکھے ہین، اور وہ ہند قدیم کی تاریخ کا سب سے بڑا ماخذ ہین، ہندوستان کے حالات نقل کئے ہین، اور یہ

دکھلا دیا ہے کہ تاریخی حیثیت سے ان جغرافیہ نویسوں نے ہندوستان کی کتنی بڑی خدمت انجام دی ہے، ان بیانات سے ہندوستان کے عام حالات کے ساتھ ہندو مسلمانوں کے تعلقات پر بھی روشنی پڑتی ہے، اس کے بعد ان جغرافیہ نویسوں اور مورخین کا تذکرہ ہے، جو خود تو ہندوستان نہیں آئے، مگر اپنی کتابوں میں اس کے حالات لکھے ہیں،

دوسرے باب میں تجارتی تعلقات پر بحث کی گئی ہے، اور اس سلسلہ میں ان تعلقات کی قدامت مشرق و مغرب کے درمیان عرب تاجروں کی اہمیت ان ملکوں کے درمیان تجارتی راستوں اُن کی درمیانی منزلوں اور بندرگاہوں کی تفصیل، ہندوستان میں دوسری بیرونی قوموں کی تجارت، ہندوستان کی پیداوار مصنوعات اور دوسرے سامان تجارت، تجارتی درآمد و برآمد عرب کے ہندو بیوپاریوں، بحرِ ہند میں چلنے والے جہازوں کی وسعت ہندوستان کی بحری تجارت اور دولت و ثروت وغیرہ پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے اور آخر میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ بحرِ روم کو چھوڑ کر افریقہ کی پشت سے بحرِ ہند میں آنے کے راستے کے انکشاف کا سہرا پرتگالیوں کے سر باندھا جاتا ہے، لیکن درحقیقت اس کے پہلے رہنما عرب تھے، اور پرتگالیوں کو ہندوستان پہنچانے والا ایک عرب بحری ابن ماجد تھا

تیسرا باب علمی تعلقات پر ہے، اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ مسلمانوں اور ہندوستان کے درمیان علمی تعلقات کا کچھ نہ کچھ سلسلہ بنی امیہ کے آخری دور ہی سے شروع ہو گیا تھا، مگر خود مسلمانوں کی اصل علمی تاریخ جب انھوں نے دوسری قوموں کے علوم کی جانب توجہ کی عباسیوں کے زمانہ سے شروع ہوتی ہے، اسی زمانہ سے مسلمانوں نے دوسری علمی قوموں کے علوم سے فائدہ اٹھانا شروع کیا، اور یونانی سریانی اور ایرانی علوم وغیرہ کی طرف توجہ کی تو اس سلسلہ میں انھوں نے ہندوستان سے بھی علمی روابط پیدا کئے، عباسی خلفاء خود بھی صاحب علم اور علم و فن کے بڑے قدردان اور سرپرست تھے لیکن عباسی دور کی علمی ترقیوں کا سہرا بڑی حد تک برمکی خاندان کے سر ہے، اس لئے اس کتاب میں ہندوستانیوں سے عربوں کے علمی تعلقات کے باب کا آغاز برامکہ کی تاریخ سے کیا گیا ہے، اُن کے متعلق عام شہرت تو یہی ہے، کہ وہ مجوسی تھے، مگر اس کتاب میں عقلی دلائل اور تاریخی شواہد سے ثابت کیا گیا ہے کہ برامکہ نسلاً ایرانی مگر مذہباً بدھسٹ تھے، یہ محققانہ بحث دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، اس رشتہ سے ہندوستان سے اُن کا مذہبی تعلق تھا اور ہندوستان

اس زمانہ مین بہت سے علوم کا مرکز تھا، اس لئے برامکہ نے یہان کے مختلف علوم کے فضلاء کو بڑے اعزاز واکرام سے بغداد بلایا، ان کی بڑی قدردانی کی اور اُن کے علوم سے پورا فائدہ اٹھایا، جس کا سلسلہ برامکہ کے زوال کے بعد مامون کے عہد مین بھی قائم رہا، بلکہ مامون کی علم نوازی کی وجہ سے اور زیادہ بڑھ گیا، اس بحث مین طب، نجوم، جوتش، ہیئت، ریاضی، بیطاری، موسیقی، جنگ و سیاست، منطق و کیمیا، جفر و رمل، قصص و حکایات، اور اخلاق وحکمت وغیرہ کی سنسکرت کی جو کتابین عربی مین ترجمہ ہوئین، اور ان ہندو علماء کا جنھون نے بغداد مین علمی خدمات انجام دین مفصل تذکرہ ہے، اس باب کا خاتمہ البیرونی کے حالات پر کیا گیا ہے جس نے قدیم ہندوستانی علوم اور اس کی تاریخ و تہذیب کی اتنی خدمت انجام دی، جو اس زمانہ کے کسی ہندو سے بھی نہین ہوسکی، اُس نے ہندوستانی علوم پر بہت سی کتابین لکھین، سنسکرت کی بعض کتابون کا عربی مین ترجمہ کیا، اس کی کتابین قدیم ہندوستانی علوم اور ہندوستانی کلچر کی تاریخ کا بہت بڑا ماخذ ہین،

چوتھا باب مذہبی تعلقات پر ہے، ہندو مسلمانون کے مذہبی تعلقات کے سلسلہ مین ہم کو انگریزون کا پڑھایا ہوا صرف یہ سبق یاد رہ گیا ہے، کہ مسلمان ہندوؤن کو کافر و مشرک سمجھتے تھے، اُن کو تلوار کے زور سے مسلمان بناتے تھے، اُن سے جزیہ وصول کرتے تھے، اُن کی عبادت گاہون کو ڈھاتے تھے، اور اس کے ثبوت مین ترک، افغان اور مغل سلاطین کے کچھ واقعات بھی مل جاتے ہین، اس لئے اس باب مین پہلے اس شہرت عام پر بحث و تنقید کی گئی ہے، اور یہ دکھایا گیا ہے کہ وسط ایشیا کے جن مسلمان خاندانون نے ہندوستان مین حکومت کی، ان کے بعض سلاطین اور عہدہ دارون کو چھوڑ کر وہ قوم کی مجموعی حیثیت سے اسلام کے صحیح نمائندے نہ تھے، اور نہ اُن کی حکومت کو اسلامی نظام حکومت سے کوئی علاقہ تھا، اور اُن کے افسرون کو جو زیادہ تر غیر مسلم یا بالکل جدید الاسلام تھے اسلام کے صلح و جنگ اور حاکمیت و محکومیت کے قوانین ہی سے واقفیت نہ تھی، اور جس زمانہ مین ان خاندانون نے حکومت کی، اُن کی قوم مسلمان بھی نہ ہوئی تھی، اور اس مین ہزارون غیر مسلم تھے، جو لوگ مسلمان بھی تھے، وہ بھی اسلامی روح سے محض بیگانہ، اور اپنی قومی خصوصیات پر قائم تھے، اور انھون نے جو کچھ بھی کیا، خواہ وہ مذہب کے نام پر

کیا ہو، مگر درحقیقت اس کو مذہب سے کوئی علاقہ نہ تھا، وہ محض سیاست کے لئے تھا، اس لئے اُن کے ذاتی اعمال کی ذمہ داری اسلام پر رکھنا اور پوری مسلمان قوم کو ان پر قیاس کرنا کسی حیثیت سے بھی صحیح نہیں ہے،

اسلام کے اصل نمایندے عرب تھے، وہ حکمرانی میں اسلام کے مقرر کئے ہوئے حدود سے آگے نہ بڑھتے تھے، ان کی حکومتوں میں محکوموں کے ساتھ زیادتی کی مثالیں شاذ ہی ملتی ہیں، جن سے دنیا کا کوئی حکمران خاندان بھی مستثنیٰ نہیں ہے، مذہب کے معاملہ میں وہ بڑے روادار تھے، جن جن قوموں پر انھوں نے حکومت کی اُن کے مذہبی عقائد و مذہبی نظام، بلکہ مذہبی رسم و رواج تک میں کوئی مداخلت نہیں کی، اور نہ اُن کی عبادت گاہوں میں ہاتھ لگایا، اور جزیہ اور خراج کے ٹیکس لینے کے بعد انکو تمام حقوق میں مسلمانوں کے برابر قرار دیا، خود سندھ میں عربوں کی حکومت اسی روش پر رہی، اور ہندوؤں کو شبہ اہل کتاب قرار دے کر اُن کی عورتوں سے شادی اور ان کے ہاتھ کا ذبیحہ کھانے کی ممانعت کے علاوہ ہر چیز میں اُن کو اہل کتاب کے برابر حقوق عطا کئے، مسلمانوں کے اس فیاضانہ سلوک کا یہ نتیجہ تھا کہ سندھ کے ہندو مسلمان حکمرانوں کے گرویدہ ہوگئے، اس سلسلہ میں اہل کتاب، شبہ اہل کتاب کا فرد مسلم اور جزیہ کے مسائل کی بحثیں بھی آگئی ہیں، جن سے ان امور کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں،

اس کے بعد اصل بحث مذہبی تعلقات کی شروع ہوتی ہے، اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ہندوستان کے ساتھ گوناگوں تعلقات کی بنا پر عربوں کو یہاں کے مذاہب کی تحقیقات کا شوق پیدا ہوا، اور انھوں نے بڑی محنت سے اس کی تلاش و تحقیق کر کے اپنی کتابوں میں اُن کے حالات لکھے، اور ان مسلمان سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں کے علاوہ جن کے نام اوپر گذر چکے ہیں، اور جنھوں نے اپنی کتابوں میں ہندوستان کے عام حالات کے ضمن میں یہاں کے مذاہب کا بھی حال لکھا ہے، دوسرے مسلمان علماء میں ابن ندیم، مطہر بن طاہر مقدسی، ابوالعباس ایرانشہری، عبدالکریم شہرستانی اور عبدالقاہر بغدادی نے خاص طور سے اپنی کتابوں میں ہندو مذاہب، اُن کے فرقوں، اُن کے عقائد اور مذہبی رسوم کے تفصیلی حالات تحریر کئے ہیں، اور ان بیانات کو نقل بھی کیا ہے، اس سلسلہ میں فرقہ سمنیہ پر جس کا عربی تاریخوں میں ذکر آتا ہے، بڑی محققانہ بحث کی گئی ہے، اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ وہ

بدھ تھے جنھین عرب سمنیہ کہتے تھے، ہندوستان مین ابتدائی اسلامی فتوحات کے زمانہ مین خصوصاً جن علاقون سے مسلمانون کا تعلق رہا زیادہ تر بدھ آباد تھے، اس لئے وہی عربون سے زیادہ متاثر ہوئے، اور اسلام کا اثر رفتہ رفتہ ہندوستان مین پھیلنے لگا، بعض ہندو راجہ بھی مسلمان ہوئے، اور آج سے ایک ہزار سال پہلے سندھ کے ایک راجہ نے قرآن مجید کا سندھی زبان مین ترجمہ کرایا، ہندوستان مین توحید خالص کا تصور بھی، اسلام کے اثرات کا نتیجہ ہے، گو ہندوؤن کے بعض فرقون مین ایک حد تک توحید پائی جاتی تھی، مگر تنزیہی اور کامل توحید اسلام کے اثرات کا نتیجہ ہے، اسی طریقہ سے مسلمان بھی ہندوؤن سے متاثر ہوئے اور اس بحث مین دونون پر ایک دوسرے کے اثرات دکھائے گئے ہین،

آخری اور پانچوان باب "ہندوستان مین اسلامی فتوحات سے پہلے یعنی غزنویون سے قبل مسلمانون کی آبادی" پر ہے، یہ باب درحقیقت گذشتہ ابواب و مباحث کا نتیجہ اور ان کا حاصل ہے، اس مین دکھایا گیا ہے کہ دکن اور جنوبی ہند مین جہان مسلمانون کی حکومت سب سے آخر مین قائم ہوئی، وہین مسلمان سب سے پہلے آباد ہوئے اور اس کا کوئی ساحلی علاقہ اور تجارتی شہر مسلمانون سے خالی نہ تھا، بعض بعض شہرون مین اُن کی تعداد کئی کئی ہزار تھی، اور یہان کے ہندو راجاؤن پر ان کا بڑا اخلاقی اثر تھا، اور وہ ان کا بڑا لحاظ کرتے تھے، ان کو ہر طرح کی سہولتین دے رکھی تھین، اُن کی تمام آبادیون مین مسجدین تھین، اور جہان اُن کی آبادی زیادہ تھی، وہان اُن کا مستقل مذہبی نظام قائم تھا، اور اُن کے معاملات کے فیصلے کیلئے ائمہ و قضاۃ مقرر تھے، ان مسلمانون کے اخلاقی اثر سے بعض ہندو راجہ مسلمان بھی ہوئے۔

اس بحث مین ان علاقون مین مسلمانون کی آمد کی تاریخ اُن کی بڑی اور مرکزی آبادیون، اور اُن کے حالات کی پوری تفصیل آگئی ہے، اور مالدیپ، سراندیپ، ملیبار، کولم (ٹراونکور) کارومنڈل، صیمور (چیمور) تھانہ (بمبئی) کھمبایت، کاٹھی، گندھار (بھڑوچ کے قریب) بیرم، گوگہ (بھاؤنگر کے پاس) چندا پور (گوا کے قریب) ہنور (احاطہ بمبئی) ملیبار مین ابی سرور، باکنور (موجودہ برکور) منگلور، ہیلی (کنانور کے قریب) جرپٹن (موجودہ سری کنداپورم) دہ پٹن، بدھ پٹن، پنڈارنی، کالی کٹ، چالیات، ستون، کاکولی، اور متمند، علاقہ کیسہ کا

قدیم پایۂ تخت) وغیرہ مین مسلمانون کی آمد، اُن کی آبادیون، اُن کے نظام ہندوون سے اُن کے تعلقات اور اس زمانہ کے ان علاقون کے مختلف حالات لکھے گئے ہین،

آخر مین سندھ وملتان مین مسلمانون کی تاریخ بیان کی گئی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد بن قاسم کے حملہ سے بھی پہلے یہان کئی سو مسلمان آباد تھے، سندھ کی فتح سے لیکر امویون کے خاتمہ بلکہ عباسیون کے ابتدائی زمانہ تک سندھ مین مسلمانون کی تاریخ بہت صاف ہے، مگر اس کے بعد سندھ کی طوائف الملوکی کے زمانہ کی تاریخ بڑی گنجلک اور پیچیدہ ہے، غزنویون اور غوریون سے پہلے یہان کئی مسلمان خانوادون نے حکومت کی، بلکہ ایک ایک وقت مین دو دو حکومتین رہی ہین جن کے حالات تاریخون مین بہت کم اور اتنے گنجلک ہین کہ ان خاندانون اور اُن کے حکمرانون کی تعیین مشکل ہے، اور بعض خاندانون کے متعلق یہ بھی نہین معلوم کہ اُن کی اصل ونسل کیا تھی، اور اُن کا زمانہ کونسا ہے، اس باب مین ان تمام خاندانون کی تحقیقات کر کے اس کی تعیین کی گئی ہے، اور ان کے حالات لکھے گئے ہین جس سے سندھ کے حکمرانون کا سلسلہ بڑی حد تک مکمل ہو جاتا ہے، یہ بحث بڑی محققانہ ہے، ان خاندانون کے حالات کے ساتھ ان کے زمانہ کے سندھ کے بڑے بڑے شہرون کے مختلف قسم کے حالات لکھے ہین، اور ان پرانے شہرون کے جائے وقوع کی جن کے اب صرف نام تاریخون مین باقی رہ گئے ہین تعیین کی گئی ہے، اور اس بحث پر یہ اہم کتاب ختم ہو جاتی ہے، ان مباحث سے اس کتاب کی قدر وقیمت کا اندازہ ہو سکتا ہے،

# خیّام

علمی سلسلہ کی دوسری اہم کتاب خیام ہے، اس نامور حکیم اور جلیل القدر فاضل کو اہل یورپ نے ایک عیاش اور بدمست رندلاابالی کی شکل مین پیش کیا ہے، جو ہمہ تن شاہد وشراب مین غرق رہتا تھا، اور جس کا مقصود زندگی رندی اور عیش پرستی کے سوا دوسرا کچھ نہ تھا، اور اس مشرب کا وہ بہت بڑا مبلغ بھی تھا، مگر اس تصویر کو حکیم عمر خیام کی اصل شکل سے کوئی علاقہ نہین ہے، وہ اپنے زمانہ کا ایک بڑا فلسفی، ہیئت، نجوم اور ریاضیات کا بہت بڑا

عالم اور فلسفی قسم کا صوفی تھا، مذہبی حیثیت سے وہ ایک دیندار مسلمان تھا، اور مذہبی علوم میں پوری دست گاہ رکھتا تھا، اس کی زندگی زاہدانہ تھی، مگر اہل یورپ کا مذاق خود رندانہ ہے، اس لئے رباعیات خیام کے ظاہری آئینہ میں اس کی جو تصویر دیکھی وہ ہم مشربی کی بنا پر بڑی دلکش نظر آئی، چنانچہ اسی کو اصل سمجھکر اس کی اتنی تشہیر کی کہ عمر خیام اور بدمست شرابی ہم معنی بن گئے، حالانکہ کسی شاعر کے کلام سے اس کی عملی زندگی کا قیاس صحیح نہیں ہے، خصوصاً مشرقی شاعری میں تو سراسر غلط ہے، بڑے بڑے مسلّم صوفی شعراء کا کلام بھی شراب و شاہد کے ذکر سے خالی نہیں ہے، مولانا روم، شمس تبریز، ابو سعید ابوالخیر جیسے بزرگوں کے کلام میں بھی شراب و شاہد کی رنگینیاں نظر آتی ہیں، اور خواجہ حافظ کا کلام تو پورا میخانہ ہے، ممکن ہے بعض ظاہر بین حافظ کی شراب کو بھی شراب ناب ہی محمول کریں، لیکن ان کے علاوہ اور بزرگوں کو کون رند شاہد باز کہہ سکتا ہے، اس کو فارسی شاعری کا عیب سمجھا جائے یا ہنر شراب و شاہد، چنگ و رباب، گل و بلبل، ہجر و وصال اس کے ایسے لوازم بن گئے ہیں کہ ان کے سہارے کے بغیر ایک قدم بھی شاعری کے میدان میں نہیں چلا جا سکتا، اور نہ ان کے بغیر اس میں حسن و دلکشی پیدا ہوتی ہے، اس لئے حکیم و فلسفی اور صوفی صافی شعراء بھی ان کنایات و استعارات کے استعمال پر مجبور رہتے، اور غالب نے تو صاف صاف کہدیا ہے کہ

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اس لئے خیام کے شاہد و شراب کو کیوں حقیقت پر محمول کیا جائے، اس کے علاوہ اس کی بہت سی رباعیاں فلسفیانہ اور اخلاقی بھی ہیں، ان کو کیوں نظر انداز کیا جائے، خصوصاً جب تاریخی حیثیت سے یہ معلوم و مسلّم ہو کہ وہ ایک بڑا عالم حکیم اور صوفی تھا جس پر اس کی تصانیف شاہد ہیں، مگر ظاہر پرست اہل یورپ نے اس کی رندانہ رباعیوں کے آئینہ میں اس کی ظاہری تصویر دیکھ کر اسی کو اصل سمجھ لیا، اگر انھوں نے رباعیوں کے بجائے تاریخ کے اوراق اور خود خیام کی فلسفیانہ تصانیف کے ذریعہ خیام کو سمجھنے کی کوشش کی ہوتی، تو اس کی اصلی شکل نظر پڑتی، کتاب خیام میں اس کی صحیح شکل پیش کی گئی ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ وہ رند شاہد باز نہیں

بلکہ بڑا عالم، حکیم اور فلسفی قسم کا صوفی تھا،

خیام پر مشرق سے زیادہ مغرب میں لکھا گیا ہے، مگر جس قدر لکھا گیا ہے، اسی قدر اس کے حالات و واقعاتِ زندگی میں مختلف قسم کی تاریخی پیچیدگیاں اور گتھیاں پیدا ہو گئی ہیں، مصنف نے اس کے سوانح کے تمام مشرقی و مغربی ماخذوں سے اُن پر تنقید کرکے ان گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے، اور نہ صرف اردو بلکہ دوسری زبانوں کے مقابلہ میں بھی پہلی مرتبہ اس بسط و شرح اور تحقیق و تنقید کے ساتھ خیام کے حالات لکھے گئے ہیں، اور اس کے علمی کمالات اور علمی کارناموں پر مفصل تبصرہ کرکے دکھایا ہے کہ عمر خیام اپنے زمانہ کا بہت بڑا فاضل، حکیم، ہیئت و نجوم اور ریاضیات کا بہت بڑا عالم اور صوفی مشرب فلسفی تھا، اور اس کے سوانح کے سلسلہ میں سلجوقیوں کے دور کے علمی اور خیام کے معاصر علماء کے حالات بھی آ گئے ہیں،

بعض دوسرے شعراء کے کلام کی طرح عمر خیام کی رباعیاں بھی دوسرے شعراء کی رباعیوں سے خلط ملط ہو گئی ہیں، اسلئے رباعیات کے مختلف قلمی اور مطبوعہ نسخوں کی مدد سے خیام کی رباعیات کی تعیین کی کوشش کی گئی ہے، اور رباعیات کے ایک قدیم اور صحیح قلمی نسخہ کی نقل بھی کتاب میں شامل کر دی گئی ہے، اس کے علاوہ خیام کے سات نادر فلسفیانہ رسالوں کو جن میں سے چھ عربی میں ہیں، اور ایک فارسی میں تصحیح و تحشیہ کے ساتھ مرتب کرکے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے، یہ اس کتاب کا اجمالی خاکہ ہے، مگر اس کے گوناگوں علمی مباحث، مختلف النوع تاریخی معلومات، اور مصنف کی وسعت و دقتِ نظر اور تحقیق کا اندازہ کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے،

## حیاتِ شبلی

ان کے علاوہ علمی سلسلہ کی دو اہم کتابیں اور ہیں، ایک حیاتِ شبلی اور دوسری عربوں کی جہاز رانی، ان میں حیاتِ شبلی مختلف حیثیتوں سے زیادہ اہم ہے، وہ ایک جلیل القدر اور شفیق استاذ کے حضور میں ایک فاضل شاگرد رشید کا نذرانۂ عقیدت ہے، اس لئے مصنف نے اس میں اپنا پورا تصنیفی کمال اور زورِ قلم صرف کر دیا ہے، علامہ شبلی

کی زندگی مین جب کسی نے ان کی سوانح عمری لکھنے کا خیال ظاہر کیا، تو وہ اس کو ٹال گئے، اور اسی قسم کی ایک فرمایش کے سلسلہ مین انھون نے ہونہار شاگرد کو لکھا تھا کہ "دوسرے لوگ میری سوانح عمری کیا لکھیں گے تم ہی جب کبھی دنیا کے اور کامون سے فرصت پانا تو اس کام کو انجام دینا" اس لئے حیاتِ شبلی کی تالیف ہمیشہ مصنف کے پیش نظر رہی، مگر یہ اتفاق ہے کہ ان کو اسی وقت اس کی تالیف کا موقع ملا، جب دنیا کے اور کامون سے بڑی حد تک فرصت مل چکی تھی، چنانچہ حیاتِ شبلی ان کی آخری تصنیف ہے اور اسی پر ان کی تصنیفی زندگی کا خاتمہ ہوگیا،

مولانا شبلی کی ذات جامعِ کمالات تھی، وہ قدیم مذہبی علوم کے عالم بھی تھے، اور جدید افکار و خیالات کے واقف کار بھی، قدیم علماء کی صحبت بھی اٹھائی تھی، اور جدید طبقہ کے شریک بزم بھی رہے تھے، وہ مفکر و محقق بھی تھے اور ادیب و شاعر بھی، انشا پرداز بھی تھے، اور خطیب بھی، مورخ بھی تھے، اور متکلم بھی، مصلح بھی تھے، اور ماہر تعلیم بھی، اور سیاست کا ذوق بھی رکھتے تھے، اور ان سب مین اُن کے بڑے کارنامے ہین، وہ محض پرانے طرز کے عالم نہ تھے، بلکہ زمانہ کے نئے حالات و ضروریات کی بنا پر بہت سے خیالات مین انقلابی تھے، اور قدیم بنیادون پر جدید قصرِ ملت کی تعمیر کرنا چاہتے تھے، اس لئے اُن کے خیالات پُرانے اور نئے دونون طبقون سے مختلف تھے، اور دونون ان سے کھٹکتے تھے، خصوصاً عربی تعلیم اور علماء کی مذہبی و تعلیمی اصلاح کے لئے انھون نے جو انقلابی قدم اٹھایا، وہ بالکل نیا تھا، وہ ان دونون کی اصلاح کرکے ان کو جدید دینی و ملی ضروریات کے مطابق بنانا چاہتے تھے، جس کا نمونہ دارالعلوم ندوۃ العلماء ہے، اور اسلامی علوم و معارف پر غور و فکر اس کی تعبیر و ترجمانی، اور علمی تلاش و تحقیق کا ایک نیا طریقہ اختیار کیا تھا جس کا نمونہ دارالمصنفین ہے، ان دونون باتون سے پُرانے علماء بالکل نامانوس تھے، اس لئے علامہ شبلی کو طرح طرح کی بدگمانیون کا شکار ہونا پڑا، لیکن بالآخر زمانہ کے حالات نے سب کو اس راستہ پر چلنے کے لئے مجبور کر دیا، اور جو اس سے الگ رہے، اُن کے ملی خدمات کا دائرہ محدود ہوکر رہ گیا، یہ علامہ شبلی کا بہت بڑا کارنامہ ہے، کہ انھون نے اپنی عاقبت اندیشی اور فراست سے دینی علوم اور علماء کا بھرم قائم کر دیا، ورنہ قدیم اور جدید کی کشمکش مین ان کا وقار قائم رہنا مشکل ہو جاتا

مگر اسی کے ساتھ وہ جدید تعلیم و تہذیب سے مرعوب نہ تھے، اور اس کے بعض محاسن کے اعتراف کے ساتھ اس کی خامیون کے ناقد بھی تھے، اور سیاسیات مین آزادانہ خیالات رکھتے تھے، اس لئے جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی ان سے مطمئن نہ تھا،

اس کے علاوہ مسلمانون کی جو تمام قومی و ملی تحریکین خواہ تعلیمی ہون یا اصلاحی علمی ہون یا سیاسی جو ان کے زمانہ مین اٹھین، ان سب مین ان کا نمایان حصہ رہا، اور بعض تحریکون کے وہ خود بانی اور رہنما تھے، اور ان مین سے کسی راہ مین وہ کسی کے مقلد نہ تھے، بلکہ خود مجتہد اور رہنما کی حیثیت رکھتے تھے، اسلئے اس زمانہ کے بعض اشخاص و جماعتون سے انکو اختلافات بھی پیش آئے، اس لئے ان کی سوانح کا اس طرح لکھنا کہ مولانا شبلی کے کمالات و کارنامے ان کی جدت و ندرت اور قائدانہ و مجتہدانہ حیثیت بھی نمایان ہو جائے، اور کسی آبگینہ کو ٹھیس بھی نہ لگنے پائے، بڑا نازک کام تھا، مگر مصنف نے بڑی خوبی سے ان نازک مراحل کو طے کیا ہے، اور مولانا شبلی کے کمالات اور ان کے کارنامون کا ایسا دلکش مرقع تیار کیا، جس مین ان کے سارے خط و خال نمایان اور وہ اپنے تمام معاصرین مین ممتاز نظر آتے ہین، اس کتاب مین ان کے ذاتی سوانح کے ساتھ ان کے علمی و تعلیمی، اصلاحی اور سیاسی کارنامون کی پوری تفصیل آگئی ہے، اور چونکہ انکی پوری زندگی قومی و ملی کامون مین گذری اور انھون نے مسلمانون کے گوناگون کام انجام دیئے، اور ان کی ہر تحریک مین سرگرم حصہ لیا، اس لئے ان کے سوانح کے سلسلہ مین ہندوستان کے مسلمانون کی پچاس سالہ ملی سرگذشت بھی آگئی ہے، اس کتاب کا مقدمہ نہایت فاضلانہ اور اپنی جگہ پر ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے، اس مین پرانے صوبے اودھ خصوصاً اس کے مشرقی اضلاع کی کئی صدیون کی علمی، دینی اور اخلاقی و روحانی تاریخ بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے جمع کی گئی ہے، جو کسی ایک کتاب مین اس طرح مرتب اور یکجا نہین مل سکتی، اس طرح یہ کتاب مولانا شبلی مرحوم کے حالات اور کارنامون کا مرقع بھی ہے، اور ہندوستان کے مسلمانون کی پچاس سالہ تاریخ بھی،

# عربوں کی جہازرانی

یہ ان خطبات کا مجموعہ ہے جو مارچ سنہ ۱۹۳۰ء میں اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن بمبئی کی فرمائش پر دیئے گئے تھے اور جنھیں کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا تھا، جیسا کہ اوپر عرب و ہند کے تعلقات پر تبصرہ کے سلسلہ میں لکھا جاچکا ہے کہ عرب قدیم الایام سے ایک تاجر قوم اور مشرق و مغرب کے درمیان تجارتی کڑی تھے، وہ مصر و افریقہ اور عرب و شام اور عراق کا تجارتی مال ہندوستان، سیلون، برما، انڈونیشیا اور چین لیجاتے تھے، اور ان ملکوں کا سامان مذکورہ ممالک میں پہنچاتے تھے، ظہور اسلام کے بہت پہلے سے اپنے زمانہ کے بڑے بحر پیما اور جہاز ران تھے، اس کے بعد جب اسلامی فتوحات کا سیلاب عرب سے نکل کر افریقہ اور یورپ کی طرف بڑھا، تو ان کے سمندر عربوں کے بحری بیڑوں کا جولانگاہ بن گئے، اور ایک صدی کے اندر وہ بحر عرب، خلیج فارس، بحیرۂ اسود، بحر قلزم اور بحر روم کے حکمران بن گئے، اور ان کی بحری حیثیت و اہمیت تقریباً وہی ہوگئی جو اس زمانہ میں برطانیہ کی ہے، اور اس سلسلہ میں انھوں نے علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے فن جہازرانی کو بڑی ترقی دی،

ملک گیری کے بعد جب دوسری صدی سے ان کی علمی ترقی کا دور شروع ہوا تو علم و فن کے دوسرے شعبوں کے ساتھ سمندروں کے متعلق تحقیقات اور جغرافی اکتشافات کے سلسلہ میں انھوں نے اس زمانہ کے معلوم سمندروں کا چپہ چپہ چھان مارا، بعض نئے سمندروں کا پتہ چلایا، مختلف سمندروں کے راستے دریافت کئے، نامعلوم جزیروں کا اکتشاف کیا، یورپ، ایشیا اور افریقہ کے نامعلوم خطوں سے واقفیت پیدا کی، فن جہازرانی کو ترقی دی، اس کے بہت سے آلات ایجاد کئے، سمندروں کے حالات اور جہازرانی پر کتابیں لکھیں، عربوں کی جہازرانی میں ان سب کی پوری تفصیل بیان کی گئی ہے۔

پہلے لغات عرب اور کلام مجید سے عربوں کی بحری واقفیت اور ان کی جہازرانی کا ثبوت دیا گیا ہے، اس کے بعد عہد رسالت میں عربوں کے بحری سفروں کا حال لکھا ہے، پھر خلافت راشدہ

مین جہازرانی کی ترقی کا ذکر ہے، اس کا آغاز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد سے ہوا تھا، اور امیر معاویہ نے شام کی گورنری کے زمانہ مین بحرِ روم کے متعدد جزائر فتح کئے تھے، اور اسلامی بیڑے کو اتنا طاقتور بنا دیا تھا کہ ۳۱ھ مین جب قیصرِ روم نے چھ سو جہازون کے ساتھ شام کے سواحل پر حملہ کیا، تو اسلامی بیڑے نے اس کو نہایت فاش شکست دی، لیکن عربون کی بحری ترقی کا اصل زمانہ اموی عہد ہے، اس زمانہ مین بحرِ روم اسلامی بیڑے کی ترک و تاز کا جولانگاہ بن گیا، اور مسلمانون نے چند دنون کے اندر سسلی اور اسپین کا پورا جزیرہ اور اٹلی کے بعض حصے فتح کر لئے، اور پرتگال فرانس تک بڑھتے چلے گئے،

ان فتوحات کے سلسلہ مین مختلف حیثیتون سے جہازرانی کو بڑی ترقی ہوئی، اور امویون کا بحری بیڑا اس زمانہ کا سب سے زیادہ طاقتور بن گیا، اس کے بعد بنی عباس کے زمانہ مین اگرچہ مشرقی خلافت مین بحری سرگرمی کم ہوگئی تھی مگر مغرب مین بنی امیہ اندلس اور فاطمیہ مصر کے یہان اس کا سلسلہ برابر جاری رہا، اور عباسیون کے عہد مین علمی و فنی حیثیت سے جہازرانی کو بڑی ترقی ہوئی، اس لئے ان دونون زمانون کی ترقی کا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھا گیا ہے، اور اس سلسلہ مین عرب اور عراق کی بیانی اور عربون کی قائم کردہ نئی بندرگاہون کا بھی ذکر کیا گیا ہے، اس کے بعد مشرقی ملکون مین عربون کی تجارت کے حالات ہین، اور اس سلسلہ مین مغربی ہند کی بندرگاہون سے لیکر سیلون، برہما، جاوا، سماٹرا، وغیرہ جزائر شرق الہند اور چین تک کی بندرگاہون، یہان عربون کی تجارت اور ان کے اثرات کی تفصیل ہے، پھر افریقہ کے سواحل یعنی بحرِ روم کے جزائر، اس کے ساحلی ملکون سسلی، اسپین، مصر اور شمالی افریقہ مین عربون کی جہازرانی اور اس کی بندرگاہون کے حالات ہین،

پھر بحر پیمائی اور فن جہازرانی کے متعلقات مین عربون کے علمی کارنامون اور ان کے ایجادات و اکتشافات کا ذکر ہے، اور اس سلسلہ مین سمندرون کے بارہ مین عربون کے علم، ان کی پیمائش، بحر بیرنگ سے ان کی واقفیت، عرب جہازرانون کی تحقیقات، بحر محیط، (اٹلانٹک) کے جزائر مین انگلینڈ، آئرلینڈ، دوبارا انگلستان، جزائر خالدات (فرچونیٹس آئرلینڈ) بحر چین اور بحر الکاہل مین جاوا، سماٹرا، جاپان، فلپائن، مڈگاسکر، اور کمورو سے ان کی واقفیت

اور اُن کی کتابون مین اُن کے بارہ مین اُن کے بیانات کی تفصیل ہے، اور یہ دکھایا گیا ہے کہ بحر روم اور بحر اٹلانٹک سے افریقہ کے سواحل پر گھوم کر بحر ہند مین آنے کا راستہ دریافت کرنے والا پہلا شخص ایک عرب ابن ماجد تھا، اور واسکو ڈی گاما اسی کے ذریعہ ہندوستان پہنچا تھا،

اس کے بعد عربون کے بنائے ہوئے بحری نقشون، ان کے تعمیر کردہ لائٹ ہاؤسز اور میل کے نشانات کا ذکر اور جہازرانون کے رہنما ستارون، سمندری ہواؤن اور اُن کے جغرافیہ پر عربون کی تصانیف کا حال ہے، پھر قطب نما کی ایجاد اور ترقی کی بحث اور عربون کے ایجاد کردہ اُن فلکی آلات کا ذکر ہے، جن سے جہازرانی مین مدد ملتی ہے پھر عربون کے قائم کردہ جہازرانی کے کارخانون، مصنوعی بحری لڑائیون، ڈوبے ہوئے جہازون کے نکالنے، جہازی عملہ، جہازسازون، جہازی سازوسامان وغیرہ جہاز کے مختلف متعلقات کی تفصیل، اور بحر ہند اور بحر عرب کے راستون کا تذکرہ ہے، اور مسلمانون کی بحری ترقی کے خاتمہ پر یہ داستان ختم کی گئی ہے، آخر مین عربون کی بحری تصانیف کا اجمالی تذکرہ ہے، یہ اس کتاب کے مباحث کا اجمالی خاکہ ہی، اور اس مین اس موضوع پر جو معلومات فراہم کئے گئے ہین، اُن کا صحیح اندازہ اصل کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہی ان کے علاوہ اور بھی متعدد چھوٹے چھوٹے رسالے ہین،

## مضامین، مقالات و خطبات

ان تصانیف کے علاوہ انھون نے مختلف موضوعون پر سیکڑون مضامین لکھے علم و ادب کا مشکل ہی سے کوئی گوشہ ایسا نکل سکتا ہی جو تشنۂ تحقیق رہا ہو، اور ان کی نظر سے چھوٹا ہو، انھون نے اسلامی علوم و فنون کے بہت سے مستور گوشے بے نقاب کئے، علمی و مذہبی مباحث پر لکھا، ادبی و لسانی مسائل پر بحث و تنقید کی مختلف اعتراضات کے جواب دیئے، تاریخی گتھیون کو سلجھایا، قومی و ملی مسائل پر اظہار خیال کیا، مسلمانون کے علمی و تمدنی کارنامون کو اس طرح پیش کیا کہ اسلامی تاریخ علم و فن اور تہذیب و تمدن کا تماشا گاہ نظر آنے لگی، غرض اسلامی علوم و ادب کی ہر شاخ، اور ہر پہلو پر معلومات کا ایک دفتر جمع کر دیا، اور جس موضوع پر قلم اٹھایا، اس کو

اس تحقیق وجامعیت کے ساتھ لکھا کہ پھر اس پر اضافہ کی گنجایش نہ چھوڑی،

صرف ایک موضوع اردو زبان وادب پر ان کے مضامین کی تعداد اتنی ہے کہ ان کا مجموعہ کئی سو صفحات مین نقوش سلیمانی کے نام سے شائع ہوا ہے، اس سے اُن کے دوسرے مضامین کی تعداد کا قیاس کیا جاسکتا ہے اگر ان سب کو جمع کیا جائے، تو ان کا مجموعہ کئی جلدون مین آئے گا، ان مین سے بعض مضامین اتنے طویل ہین کہ مستقل رسالون کی شکل مین شائع ہوئے، مثلاً رسالۂ اہل سنت والجماعت، بہادر خواتین اسلام، حیات مالک، اور خلافت اسلامیہ اور دنیائے اسلام، ان سب مضامین پر تبصرہ کے لئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے، اگر صرف ان کے نامون کی فہرست لکھی جائے، تو بھی کئی صفحون مین آئے گی، اس لئے مختلف موضوع ومسائل سے متعلق نمونۃً کچھ مضامین کا نام لکھا جاتا ہے، اس سے ان کی نوعیت اور اُن کے تنوع کا اندازہ ہوگا، مثلاً

محبت الٰہی اور اسلام، اسلام مین حیوانات کیساتھ سلوک، احکام القرآن، توکل صبر کا قرآنی مفہوم، مذہب کا قانونی حصہ، ارض مقدس کی داستان، ارض حرم، اور قرآنی احکام خلیل اللہ کی بشریت، ذبح عظیم قربانی کا اقتصادی پہلو، فن تصوف اور محدثین وصوفیہ مین تطبیق کی راہ، لفظ اللہ کے معنی، اور اسم اعظم کا تخیل، اسلام اور حرمت ربا، جبر وقدر، کیا خلقی معذورین کی پیدایش انصاف الٰہی کے خلاف ہے، اسلامی عقیدہ کے مطابق بچون کی پیدایش کے احوال کا اختلاف، امت مسلمہ کی بعثت تخلیق عالم کا مقصد، قرآن پاک کا تاریخی اعجاز، سنت، وحی، وحی اور ملکۂ نبوت، کیا قرآن پاک انسانی ذہن ودماغ سے ماخوذ ہے، حکومت الٰہیہ، اور مسلمانون کا مطمح نظر،

اسلامی تہذیب وتمدن، مسلمان عورتون کے حقوق کا مسئلہ، اسلام اور زنان ہند، تحفظ حقوق زوجین، احادیث وسیر کی تحریری تدوین، اسماء الرجال کا قدیم ذخیرہ، خلفائے اسلام کا انتذار، خلفائے راشدین کا طریق حکومت، موجودہ ہندوستان مین کاشتکارون کے حقوق، سیاسیات اسلام کے نظریے، مسلمانان ہند کی مذہبی تنظیم، دنیائے اسلام مین ذہنی انقلاب، عالم اسلام کی تنظیم کا مسئلہ، نظم ملت، اندراج نکاح وطلاق

و تقرر قضاۃ، مسلمانانِ ہند کا شرعی نظام،

ہندؤن کی علمی وتعلیمی ترقی مسلمانون کے عہد حکومت مین، مرہٹون کا فوجی نظام، عہدِ اسلام مین تعلیم نسوان کی درسگاہین، ہندوستان مین اسلام کی اشاعت کیونکر ہوئی، ہندوستان مین علم حدیث، مسلمان حکمار اور یونانی فلاسفہ، نظّام اور اُس کا فلسفہ، لاہور کا ایک فلکی آلات ساز خاندان، عربون کی بحری تصنیفات، رومن کیتھلک کی چند من گھڑت کہانیان، برک اور پرکھ، واقدی پھر واقدی، اصول تہنید، ہندستانی کی اصلیت اور اس کے کچھ اصول حجاز کے کتب خانے، انڈیا آفس لائبریری مین اردو کا ذخیرہ،

ان مضامین کے علاوہ ان مقالات کی بھی خاصی تعداد ہے، جو مختلف علمی مجالس مین پڑھے گئے، اور معارف مین شائع ہوئے، اس قسم کے بیشتر مقالات مضامین سے زیادہ اہم ہین، چنانچہ اُن کی متعدد اہم کتابین مثلاً عرب وہند کے تعلقات، خطبات مدراس، خیام اور عربون کی جہازرانی اصل مین مقالات ہی تھے، جو ترمیم واضافے کے بعد کتابی شکل مین شائع ہوئے، ان مین حسب ذیل مقالات زیادہ اہم ہین، "مسلمانون کی آئندہ تعلیم" یہ مقالہ جامعہ ملیہ مین پڑھا گیا، تاج محل اور لال قلعہ کے معمار، اور قنوج ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کے دو مختلف اجلاسون مین پڑھے گئے، اردو کیونکر پیدا ہوئی، ناگری پرچارنی سبھا کے لئے لکھا گیا تھا، ابوالبرکات بغدادی اور اس کی کتاب المعتبر دائرۃ المعارف حیدرآباد مین عربی مین پڑھا گیا تھا، اور اس کا اردو ترجمہ معارف مین شائع ہوا، عرب اور امریکہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک اجلاس مین پڑھا گیا تھا، اس کے علاوہ اور بھی مقالات ہین، مگر ان سب کا استقصا مقصود نہین،

انھون نے مجلس خلافت، جمعیۃ علمائے ہند، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد، دائرۃ المعارف حیدرآباد، آل انڈیا ہسٹری کانگریس وغیرہ مختلف علمی ودینی مجالس کے اجلاسون اور قومی وملی کانفرنسون کی صدارت کی، اور ان مین صدارتی خطبے پڑھے، ان مین سے جو خطبات تحریری تھے، وہ معارف مین شائع ہوئے، اس لئے وہ محفوظ ہین، وہ جملہ امور ومسائل مین خواہ وہ علمی، مذہبی

ہوں یا قومی و ملی ایک سوچی سمجھی ہوئی پختہ اور صائب رائے اور مستقل خیالات و نظریہ رکھتے تھے اور ان کا علمی ذوق استوار جامع اور ہمہ گیر تھا کہ ان کا کوئی خطبہ اور تقریر بھی خواہ وہ کسی موضوع پر ہو افکار و نظریات اور علمی و تاریخی معلومات سے خالی نہ ہوتی تھی علمی مجالس اور علمی اجتماعات کے خطبے معلومات کا خزانہ اور قومی و ملی کانفرنسوں اور جلسوں کے خطبات زیر بحث مسئلہ کے متعلق تفکر و تدبر فہم و بصیرت اور صحیح اور سلجھی ہوئی رائے کا درس ہوتے تھے، ان کا کوئی خطبہ بھی ان خصوصیات سے خالی نہیں ہے، علمی و تاریخی خطبات میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی پچاس سالہ جوبلی کے شعبۂ علوم و فنون اور اسی کانفرنس کے اجلاس کلکتہ کے شعبۂ اردو اور آل انڈیا ہسٹری کانگریس کے اجلاس مدراس کے شعبۂ تاریخ ہند از منۂ وسطیٰ کے خطبات صدارت علمی و تاریخی معلومات کے گنجینہ اور ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں، طب سے ان کو کوئی تعلق نہ تھا لیکن طبیہ اسکول پٹنہ کے جلسۂ تقسیم اسناد کا خطبۂ صدارت اسلامی طب کی پوری تاریخ ہے، ان خطبات کی بڑی تعداد ہے، مثالاً صرف چند خطبات کا تذکرہ کر دیا گیا،

ان کے علاوہ ان کے شذرات بھی نہایت اہم ہوتے تھے وہ مختلف النوع وقتی امور و مسائل اور کبھی کبھی مستقل معاملات پر شذرات میں اظہارِ خیال کرتے تھے، اس لئے ان کے شذرات مسائل و مباحث کے تنوع کی حیثیت سے دائرۃ المعارف کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ان سے گذشتہ تیس پینتیس سال کی قومی و ملی تحریکوں، مختلف خیالات و رجحانات اور دوسرے پیش آمدہ حالات و واقعات کی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے، اور ان کے متعلق مصنف کے خیالات معلوم کئے جا سکتے ہیں، ان کے شذرات غور و فکر، خیالات کی صحت و پختگی اور اصابت رائے کا نمونہ اور ایجاز و اختصار اور بلاغت کے لحاظ سے ادب و انشاء کا شاہکار ہیں،

مذکورۂ بالا تصانیف اور مضامین و خطبات کی فہرست پر سرسری نظر ڈالنے سے ان کی وسعت و دقتِ نظر، علمی جامعیت و ہمہ گیری کا کسی قدر اندازہ ہو جاتا ہے، اس دور میں وہ جامعیتِ علوم کی تنہا مثال تھے ان میں ابن رشد و ابن خلدون، ابن تیمیہ و ابن قیم، غزالی و رومی شاہ ولی اللہ و مجدد سرہندی کے علمی جلووں کی جھلک یکجا نظر آتی تھی، اسی لئے ان کی تحریروں سے مسلمانوں کو جس قدر فیض پہنچا اس کی مثال اس زمانہ میں کمتر

ے گی، صحیح العقیدہ، لیکن بے عمل مسلمانوں کو باعمل، طالبِ دین کو دیندار اور دیندار کو متقی بنا دینا بہت آسان ہے، لیکن پڑھے لکھے جنوں کو شیشہ میں اتارنا اور تعلیم یافتہ متشککین اور منکرین کو دین کی راہ پر لگانا بہت دشوار ہے، اور یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس دشوار کام کو سب سے زیادہ سید سلیمان کی تحریروں نے انجام دیا، اور جو لوگ اپنے مذہب اور اپنی تہذیب کے نام سے شرماتے تھے، وہ اس پر فخر کرنے لگے، اور ان میں اس کا ذوق اور اس کی طلب پیدا ہو گئی، اس طرح سید سلیمان ندوی نے ہزاروں گم کردہ راہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو راہِ راست پر لگایا۔

ان کا ایک بڑا علمی کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے اسلامی علوم و فنون پر تحقیقات کا ایک ایسا ادارہ قائم کر دیا، اور اس کو اس درجہ تک پہنچا دیا کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری اسلامی دنیا میں اس کی شہرت ہے، اور اس کے کاموں کو عزت و وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، اور اُن کی تربیت کردہ جماعت کے علاوہ، ان کی تصانیف اور مضامین نے بہت سے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں بھی سنجیدہ علمی و تحقیقی کاموں کا مذاق پیدا کر دیا، چنانچہ آج جن مسلمانوں میں بھی اس قسم کا ذوق نظر آتا ہے، اور ہندوستان میں جہاں بھی اس قسم کا کام ہو رہا ہے، اس میں سید سلیمان ندوی کی تصانیف کو بڑا دخل ہے، اس لئے وہ درحقیقت ایک علمی دور اور ایک خاص مکتبِ خیال کے بانی تھے، اور جب تک علمی دنیا قائم ہے، سید سلیمان کا یہ کارنامہ زندہ رہے گا۔

ان کا مزاج و مذاق اگرچہ ابتدا سے دینی تھا، اور اُن کی کسی دور کی تحریریں بھی دینی روح سے خالی نہیں ہیں، لیکن عمر کے ساتھ ساتھ دین کا رنگ اور زیادہ گہرا ہوتا گیا، اور آخر میں وہ صبغۃ اللہ میں بالکل رنگ گئے تھے، ومن احسن من اللہ صبغۃ، اور ان میں بڑا روحانی انقلاب ہو گیا تھا، اس دور میں اُن کے خیالات میں بھی بڑا تغیر پیدا ہو گیا، اور ان کی تقریروں اور تحریروں کا رنگ بھی بدل گیا، یہاں تک کہ اپنے بعض پرانے خیالات اور تحریروں سے رجوع کیا، اور ان کے نزدیک اُن کے قلم سے جو بھول چوک ہوئی تھی، اس کو "رجوع و اعتراف" کے نام سے معارف میں شائع کیا، یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے، اس کو بڑا آدمی ہی انجام دے سکتا تھا، اور یہ اُن کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل ہے،

اس روحانی انقلاب اور اس کے نتائج کے بارہ مین دو قسم کے خیالات ہین ایک جماعت اس کو پسندیدہ نظر سے نہین دیکھتی، اور اس کو اُن کی علمی عظمت کے منافی تصور کرتی ہے، اس مین اس کو اُن کے علمی مرتبہ کا استخفاف نظر آتا ہے، دوسری جماعت اس انقلاب اور اس کے بعد ہی کی زندگی کو ان کا سب سے بڑا کارنامہ اور حاصل زندگی سمجھتی ہے اور اس سے پہلے کے علمی کامون کو ناقابل اعتبار تصور کرتی ہے، یہ دونون رائین غلط اور افراط و تفریط پر مبنی ہین ان دونون زندگیون مین کوئی تضاد نہین ہے، بلکہ وہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہین، اور اس سے ان کا مرتبہ اور مقام اور زیادہ و بلند ہوگیا، اس سے نہ اُن کی علمی منزلت مین کوئی فرق آتا ہے، اور نہ ان کے علمی کامون کی اہمیت گھٹتی ہے، انکے علمی کامونکا مقصد بھی دین وملت اور اسلام ومسلمانون کی خدمت تھا، اس لئے مذہبی حیثیت سے بھی ان کی اہمیت پوری طرح قائم رہتی ہے، اور اُن کے روحانی انقلاب کو اتنی اہمیت نہین دیجاسکتی کہ اس کے مقابلہ مین اُن کے علمی کارنامون پر پانی پھیر دیا جائے، یہ دونون پہلو اپنی اپنی جگہ پر اہم ہین، اور ایک کو بڑھانے کے لئے دوسری کی اہمیت نہین گھٹائی جاسکتی، یہ کوئی غیر معمولی واقعہ یا نئی مثال نہین ہے، اس قسم کے واقعات دوسرے اکابر اسلام کی زندگی مین بھی پیش آچکے ہین، امام غزالی مولانا روم حتّٰی کہ امام رازی تک کو ان مراحل سے گذرنا پڑا ہے، لیکن آج کون صاحب علم و نظر اُن کے علمی کارنامون کی اہمیت کا انکار یا اس کی زندگی کے دونون رخون سے کسی کا استخفاف کرسکتا ہے، اس لئے اس سے سید صاحب کی بھی کسی حیثیت مین کوئی فرق نہین آتا،

درحقیقت یہ دونون نقطۂ نظر غلط ہین، نہ سید صاحب رحمہ اللہ نے راہ سلوک اختیار کرنے کے بعد علمی کامون کو چھوڑا، اور نہ ان کا یہ راہ اختیار کرنا کسی حیثیت سے بھی قابلِ اعتراض ہوسکتا ہے، ان کا مذاق ضرور بدل گیا تھا، لیکن علمی کامون کا سلسلہ بدستور جاری رہا، انھون نے بہت سے خالص علمی مضامین مثلاً ابو البرکات بغدادی، اور اس کی کتاب المعتبر، ابن منصور کو سولی نہین پھانسی دی گئی، عہد اسلامی مین تعلیم نسوان کی درسگاہین، عدلِ جہانگیری کا ایک واقعہ، کیا مرزا بیدل عظیم آبادی تھے، ہم مکت اور پرکھ، ملا خیر اللہ مہندس کے چند رسائل، قنوج، اور قومیت وغیرہ اس کے بعد لکھے، حیاتِ شبلی

جیسی اہم کتاب بھی اسی زمانہ کی ہے، مکتوب فرنگ کے نام سے اپنے ان خطوط کا مجموعہ مرتب کیا، جو وفدِ خلافت کے سفر مین لندن سے اپنے احباب واعزہ کو لکھے تھے، یادرفتگان کے نام سے اُن کے لکھے ہوئے وفیات کا جو مجموعہ حال مین شائع ہوا ہے اس کو بھی وہ ترتیب دیچکے تھے، معارف مین اُن کے جو مضامین شائع ہوئے تھے، اُن کی ترتیب بھی پیش نظر تھی، علمی مجالس کی شرکت بھی برابر جاری رہی، چنانچہ آل انڈیا ہسٹری کانگریس پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، انجمن ترقی اردو وغیرہ کے جلسون کی صدارت اسی زمانہ مین کی اور اسکے خطبۂ صدارت پڑھے، اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ تصوف کی راہ مین آنے کے بعد انھون نے علم کا کوچہ بالکل چھوڑ دیا تھا یا اس کی کوئی اہمیت اُن کی نگاہ مین نہ رہ گئی تھی، اگر کسی خاص حالت مین ان کی زبان یا قلم سے کوئی ایسا فقرہ نکل گیا جس سے تصنیف و تالیف یا علمی کامون کی بے وقعتی ظاہر ہوتی ہو، تو اس کو حقیقت پر محمول کرنا خود سمجھنے والون کی خوش فہمی ہے، جو لوگ شطحیات صوفیہ تک کی تاویل کرتے ہین، کم از کم ان سے تو اس کی توقع نہیں کی جاسکتی،

اس سلسلہ مین ایک ذاتی واقعہ کا ذکر کرنا نامناسب نہ ہوگا، راہِ سلوک مین آنے کے بعد اکثر اپنے تلامذہ اور متوسلین کو بھی اس کی تلقین فرمایا کرتے تھے، ایک مرتبہ مین نے عرض کیا کہ آپنے تو سارے کام ختم کرنے اور جو حاصل کرنا اور دوسرون کو دینا تھا، اس کو حاصل کرنے اور دوسرون تک پہنچانے کے بعد یہ راہ اختیار فرمائی ہے اگر ہم خدام ابھی سے اس راہ پر لگ گئے تو ہمارا انجام کیا ہوگا، میرا اشارہ سمجھکر فرمایا "مین یہ نہین کہتا کہ علمی کام بے کار ہین یا ان کی ضرورت نہین رہی، یا اُن کو چھوڑ دیا جائے، بلکہ تالیف و تصنیف کا مقصد اور نقطۂ نظر بدل جانا چاہیے اور اس کے لئے خود اپنے مین تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ہے، مین نے عرض کیا، اور ان خالص علمی کامون کے متعلق کیا ارشاد ہے، جس کے لئے کسی تبدیلی کی ضرورت نہین ہے، اس کے جواب مین حسب عادت معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا، شوق سے کیجئے اس سے کون روکتا ہے، یہ بھی ایک کام ہے، اور اُن کی دلآویز مسکراہٹ پر بات ختم ہوگئی،

لیکن جو لوگ اُن کے سلوک و تصوف پر اعتراض کرتے ہین، وہ بھی غلطی پر ہین، ہر انسان پر دوسرون کے حقوق و فرائض کے ساتھ اپنے نفس کے بھی کچھ حقوق ہین، اور دوسرون کی خدمت اور اصلاح و فکر کے ساتھ اپنی

فکر بھی ضروری ہے، اس مین کوئی شبہہ نہین کہ سید صاحب نے جو علمی کام انجام دیئے، ان کا مقصد دین و ملت ہی کی خدمت تھا، اس لئے وہ بھی اُن کے اعمالِ حسنہ مین داخل ہین لیکن ان کا تعلق زیادہ تر دوسرون کی اصلاح سے تھا، اسلئے اس فرض کی ادائیگی اور اس کام کی تکمیل کے بعد اگر انھون نے اپنی فلاح و تکمیل کے لئے کوئی راستہ اختیار کیا تو اسمین اعتراض کی کونسی بات ہے، درحقیقت ایک مسلمان کی زندگی کے مراحل کی فطری ترتیب یہی ہے، اور اسوۂ نبوی بھی یہی تھا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اگرچہ آپ کی زندگی کا کوئی لمحہ بھی تعلق مع اللہ اور رضائے الٰہی کی طلب سے خالی نہ تھا، اور آپ کی پوری زندگی اسلام کی تبلیغ، اسکی تعلیمات کی اشاعت، روئے زمین پر حکومتِ الٰہیہ کا قیام اور اس کے احکام کے نفاذ کی جد و جہد مین گذری مگر جب ان کامون سے فراغت اور دین کی تکمیل ہوچکی تو خصوصیت کے ساتھ تسبیح و تحمید اور توبہ و استغفار کا حکم ہوا، اور سورۂ فتح نازل ہوئی، اور جیسا کہ بخاری اور حدیث کی دوسری کتابون مین ہے، اس کے بعد آپ کا زیادہ وقت تسبیح و تہلیل مین بسر ہونے لگا، اس لئے سیرت نگارِ نبوی نے بھی اسی اسوۂ نبوی پر عمل کیا، اور ہر مسلمان کا یہی عمل ہونا چاہئے،

درحقیقت ان دونون زندگیون مین کوئی تضاد نہین ہے، بلکہ وہ ایک ہی تصویر کے دو رُخ، ایک ہی عمارت کے نقش و نگار اور ایک ہی گلدستہ کے مختلف رنگ و بو کے پھول ہین، جن کے بغیر تصویرِ حیات کی تکمیل نہین ہوتی، اس لئے جو لوگ ان دونون پہلوؤن مین سے کسی کو بھی نظر انداز کرتے ہین، وہ خود ناآشنائے حقیقت ہین،

# تاریخ ارض القرآن

## کے متعلق

## میرے ذاتی احساسات و تجربات

از

جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی

الفاظ یا ترتیب کے معمولی ردو بدل سے پیش رو مصنفین کی کتابوں کو نقل کر کے اپنی طرف منسوب کر لینا، شاید دنیا کی عام کتابی زبانوں کا یہ ایک ایسا عارضہ ہے جو نہ کسی ملک کے ساتھ مخصوص ہے، اور نہ کسی فن اور نہ علم کی حد تک یہ قصہ محدود نظر آئے گا، خصوصاً نصابی کتابوں کے ساتھ تجارتی اغراض جب سے وابستہ کر دیئے گئے ہیں، تو اس عارضہ نے وبائی شکل اختیار کر لی ہے، شمار کرنے والے ان کتابوں کے لکھنے والوں کو مصنفین اور مولفین ہی کے ذیل میں شمار کرتے چلے آئے ہیں، اور آج بھی اُن لوگوں کو مصنف و مولف ہونے کی سند ملتی ہی چلی جا رہی ہے، حالانکہ کسی کے کلام (نظم یا نثر) کو بغیر کسی ردو بدل کے کوئی اپنی طرف اگر منسوب کرلے، تو لگانے والے اب بھی اس پر سرقہ اور علمی وزدکاری کا بے محابا الزام عائد کر دیتے ہیں، لیکن سوچا جائے تو پہلے اور دوسرے فریق میں عملاً و حقیقۃً چنداں فرق نہیں ہے۔

لیکن تصنیف و تالیف ہی کے دائرہ میں کچھ ایسی ہستیاں بھی پیدا ہوتی رہتی ہیں جو کسی علم و فن کے کسی موضوع کو اس وقت تک چھوتی بھی نہیں، جب تک کہ اس کے متعلق کوئی نیا پہلو تازہ زاویۂ نگاہ، اُن کے سامنے

نہ آئے، سچ پوچھئے تو صحیح معنوں میں مصنف اور مؤلف قرار پانے کا قدرتی استحقاق ان ہی بزرگوں کو حاصل ہے، ورنہ دوسروں کی باتوں کا دہرانے والا اگر سارق نہیں تو ایک نقل نویس کاتب کے سوا اور بھی کچھ ہے، دنیا میں کتابوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ زیادہ تر انہی دزدانِ علم اور نقل نویسوں ہی کی وجہ سے ہوا ہے، اردو کی یہ داستان کافی ہے، میں کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے سید علامہ مولینا سلیمان الندوی قدس اللہ ضریحہٗ جو اردو زبان کے اعظم المصنفین بجا طور پر سمجھے جاتے ہیں، اور انھوں نے اپنے بعد ہزارہا ہزار صفحات کی شکل میں اپنی تالیفی یادگاریں چھوڑی ہیں آپ اُن کو پڑھ جائیے، سب سے بڑی خصوصیت سید صاحب مرحوم کی تصنیفات میں کم از کم اس فقیر کو تو یہی نظر آتی ہے کہ انھوں نے جو کچھ بھی ارقام فرمایا ہے، اس میں نئی بات، نئے معلومات پڑھنے والوں کو ملتے چلے جاتے ہیں یا کم از کم پہلے جو باتیں مجمل شکل میں تھیں، سید صاحب کی تحقیق و تدقیق نے ان ہی باتوں کو زیادہ مفصل اور زیادہ اُجاگر کر دیا ہے،

مرحوم غفر اللہ لہٗ دینیات و اسلامیات کے عالم تھے، لیکن اسی کے ساتھ عربی فارسی، اردو زبانوں کے ادب کا بھی صالح ذوق رکھتے تھے، اسی لئے اُن کے عام علمی کارناموں کا تعلق اگرچہ اسلامیات و دینیات ہی سے ہے، لیکن اسی کے ساتھ ادبیات کے متعلق کبھی کبھی اُن کو کچھ لکھنے کا موقع اگر مل گیا، تو اُس میں بھی انھوں نے ہمیشہ نئی راہیں پیدا کیں، اور ایسے اچھوتے نتائج اُن کی بدولت اس سلسلہ میں بھی دنیا کے سامنے آئے کہ ہر طرف مرحبا و آفرین کے ساتھ اُن کا استقبال کیا گیا،

قرآن و حدیث، فقہ، کلام و تصوف، اور سب سے زیادہ تاریخ اسلامی، اور ان سب کے سوا جس جس موضوع پر سید صاحب نے قلم اٹھایا ہے، اور اس سلسلہ میں نئے معلومات، یا نئے نقاط نظر سے دنیا کو انھوں نے روشناس کیا ہے بتانے والے اگر اُن کی فہرست بنائیں گے، تو میرا خیال ہے کہ اُن کی تعداد لاکھوں نہیں، تو ہزاروں تک ضرور پہنچ جائے گی، یہ اُن کے سوانح نگار کا فرض ہے کہ اس مطمحِ نظر سے اُن کے تصانیف اور شائع کردہ مقالات و مضامین کا جائزہ لے، دنیا کو حیرت ہوگی کہ کتنے قلیل عرصہ میں اس بندۂ خدا نے جدید معلومات، اور متعلقہ علوم

کے سلسلہ مین کتنے نئے پہلوؤن کا اضافہ فرمایا، بڑے بڑے مصنفین کی کتابون مین بمشکل گنی چنی چند ہی نئی چیزین ہاتھ آتی ہین، لیکن سید صاحب کی کتابون مین قدم قدم پر نئے انکشافات اچھوتے معلومات سے پڑھنے والون کا دامن تحقیق بھرتا چلا جاتا ہے یہی ان کے تصنیفات کی سب سے بڑی خصوصیت ہے، معارف کے سلیمان نمبر نکالنے کا ارادہ جب کیا گیا تو فقیر نے چاہا تھا کہ قرآن کے متعلق سید صاحب کی مشہور کتاب "تاریخ ارض القرآن" سے ان چیزون کو انتخاب کرکے پیش کرے، جن کے متعلق اپنا خیال یہی ہے کہ ایک خاص پہلو سے "قرآن فہمی" کے معیار مین فکری انقلاب پیدا ہوگیا ہے، اعتراف کیا جائے یا نہ کیا جائے لیکن شعوری یا غیر شعوری طور پر عوام ہی نہین خواص کے فہمیدہ و سنجیدہ طبقات بھی سید صاحب کی اس نئی علمی کوشش اور اس کے نتائج سے اکثر و بیشتر متاثر ہوئے، میری خواہش تھی کہ سید صاحب کی اس جدید قرآنی خدمت پر سیر حاصل بحث کرون، لیکن ٹھیک ان ہی دنون مین جب اس مقالہ کی تیاریون مین مشغول تھا، بیمار ہوگیا، اور ایسا بیمار کہ پانچ چھ مہینے گذر چکے ہین اس وقت تک لکھنے پڑھنے کی صلاحیت جیسی کہ چاہئے واپس نہین ہوئی ہے، احباب دار المصنفین کا تقاضا ہوا کہ واقعی شہیدون مین شریک ہونے کا موقع اگر نہین ہے، تو خون ہی لگا کر شہیدون مین شامل ہو جاؤن، اسی حکم کی تعمیل کر رہا ہون،

واللہ ولی الامر والتوفیق،

---

سید صاحب مرحوم کی کتاب تاریخ ارض القرآن اول سے آخر تک ایسے معلومات سے بھری ہوئی ہے جو کم از کم علماء کے لیئے صرف یہی نہین کہ نئے ہین، بلکہ ان معلومات کی راہ نمائی مین مطالعہ اور تحقیق کے ارباب ذوق کو تجربہ بتائے گا کہ کافی مدد مل سکتی ہے، عرب کے جغرافیائی معلومات کے مصادر و مآخذ کی طویل فہرست اس کتاب مین درج ہے، جن مین اسرائیلی و یونانی و رومانی ادبیات، اور اکتشافات اثریہ کے سوا سید صاحب نے ادبیات اسلامیہ کے ذیل مین جن مطبوعہ اور غیر مطبوعہ عربی زبان کی کتابون کا ذکر کیا ہے، یہ ایک ایسی علمی فہرست ہے کہ ہمارے علماء جو انگریزی یا اسی قسم کی جدید عصری زبانون سے ناواقف ہین، وہ بھی "ادبیات اسلامیہ" کی ان کتابون سے کافی طور پر مستفید ہو سکتے ہین، یہ واقعہ ہے کہ سالہا سال کی

کد و کاوش تحقیق و جستجو کے بعد ہم جن کتابوں تک رسائی حاصل کر سکتے تھے، سید صاحب کی درج کردہ فہرست سے بہ یک نظر معلومات کا یہ سارا ذخیرہ ہمارے سامنے اس طرح پر آجاتا ہے، کہ کتابوں کے مصنف سنین تصنیف، مطبوعہ ہے یا غیر مطبوعہ، غیر مطبوعہ شکلوں میں ان کتابوں کے نسخے کہاں کہاں پائے جاتے ہیں، عموماً ان امور کے متعلق بھی کافی و شافی اشارے ملتے چلے جاتے ہیں،

اسی طرح توراۃ اور عہد عتیق و قدیم کا مطالعہ کس طریقہ سے کرنا چاہئے توراۃ کے سوا کتب تلمیم، ترگوم مداش اور تالمود نامی کتابوں کی اسرائیلی دین میں کتنی اہمیت ہے، اور ان کتابوں کے مضامین کی نوعیت کیا ہے، تاریخ ارض القرآن کے ابتدائی اوراق ہی میں یہ سارے قیمتی معلومات ایک ہی جگہ میں مل جاتے ہیں،

عرب اور اس کے جغرافیہ و تاریخ کے ساتھ یورپ کے ارباب تحقیق نے جن معلومات کو وقف عام کیا ہے اور ان سے غلط یا صحیح نتائج نکالنے کی سنجیدہ کوششیں کی ہیں، ایک بڑا قیمتی تبصرہ اس سلسلہ میں بھی آپ کو اس کتاب کے شروع ہی میں مل جائے گا، جو دل میں اس کا شوق پیدا کرتا ہے کہ غیروں کی دلچسپیوں کا حال عرب کے ساتھ جب یہ ہے تو ہم مسلمانوں کا علمی فرض اس باب میں یقیناً اس سے کہیں زیادہ ہونا چاہئے،

بہر حال آپ اس کتاب کو پڑھتے چلے جائیے، کتاب پڑھنے سے پہلے آپ کے جو علمی احساسات، اور معلومات تھے، میں یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ شعوری اور غیر شعوری طور پر ان میں پائیں گے کہ ترمیم ہوتی چلی جاتی ہے، سید صاحب کے پیدا کئے ہوئے نتائج سے اتفاق و اختلاف بجائے خود ایک الگ جداگانہ مسئلہ ہے، لیکن ان کی کاوش و کوشش کی داد میں بخل میرے خیال میں صرف تنگ دلی ہی نہیں، بلکہ گونہ ایک قسم کی عقلی اور طبعی سفاہت ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے،

دور کیوں جائیے، قرآن مجید کے لفظ "عاد" ہی کے متعلق میں پوچھتا ہوں انصاف سے دلوں پر ہاتھ رکھ کر کہئے کہ ہمارے علماء کا عام علمی احساس اس کے متعلق کیا یہی نہیں تھا کہ عاد کسی غیر معمولی صفات رکھنے والی شخصیت کی تعبیر تھی، اگرچہ خود قرآن کی یہ تعبیر کہ "قوم نوح کے بعد عاد والے زمین کے خلیفہ بنائے گئے" دلوں کے اس عام

احساس پر کہ "عاد" کسی خاص آدمی کا نام منطبق نہیں ہو رہی تھی،

اسی لئے زیادہ وسیع النظری سے کام لینے والے بھی بجائے شخص کے "عاد" کو عرب کے کسی ناپید اشدہ مختصر قبیلہ کا عنوان قرار دیتے تھے، لیکن سید مرحوم نے جب یہ اعلان کیا کہ

"عاد صرف کوئی محدود اور مختصر قبیلہ نہ تھا، وہ ایک عظیم الشان قوم تھی، جو عرب ہی نہیں بلکہ دنیا کی قدیم ترین تہذیب کی بانی تھی،

اور یہ فرماتے ہوئے کہ عادی تہذیب و تمدن عرب ہی کے کسی خاص علاقہ تک محدود نہ تھا، سید صاحب نے ناقابلِ انکار مستحکم تاریخی و اثری شہادتوں سے یہ ثابت کیا کہ عاد جو قوم نوح کے بعد زمین کے خلیفہ ہوئے اور یہ کہ

"ایشیا، اور افریقہ کا کثیر حصہ اس کے (یعنی عاد کے) زور و قوت کا تماشا گاہ تھا،

(ص ۶۵ - ج ۱)

اور صرف ایشیا و افریقہ ہی نہیں، بلکہ سید صاحب نے یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ یورپ ہی کے بعض علاقوں مثلاً یونان و کریٹ تک یورپ کے کسی قدیم تمدن کا جو نشان ملتا ہے، یہ سارے قصے اسی "عاد" سے تعلق رکھتے تھے، جو قوم نوح کے بعد زمین کے خلیفہ قرآن کے رو سے قرار پائے تھے،

انصاف سے کہئے کہ قرآنی آیت جس میں عاد کو خطاب کر کے ارشاد ہوا ہے،

| | |
|---|---|
| واذکروا اذ جعلکم خلفاء من بعد قوم نوح | اور یاد کرو (اے عاد کی قوم والو) جب قوم نوح کے بعد خدا نے تو تم کو (زمین) کی خلافت بخشی، |
| (الاعراف) | |

اس کا صحیح وزن سید مرحوم کے بیان و تحقیق کے بعد قلوب میں پیدا جو ہوتا ہو گیا کبھی وزن وہ روایتیں ڈال سکتی ہیں جن میں زیادہ سے زیادہ اگر کچھ پتہ دیا گیا ہے تو وہ اسی قدر ہے کہ

| | |
|---|---|
| کانت عاد ما بین الیمن الی الشام | یمن سے شام عاد والے چیونٹیوں کی طرح |

مثل البلاد (ص ۹۶ ج ۳ درمنثور) پھیلے ہوئے تھے،

ورنہ عام طور پر عاد والون کے متعلق یہی سمجھا بھی جاتا ہے، اور کہا بھی جاتا ہے کہ

فیما بین عمان الی حضرموت عمان سے یمن کے اس علاقے تک محدود تھے،

بالیمن (درمنثور ص ۹۶ ج ۳) جسے حضرموت کہتے ہین،

یہن دوسرون کے متعلق کیا کہون سچی بات تو یہ ہے کہ نسلِ انسانی کی تاریخ کو نبوات اور رسالات کی تاریخ کی روشنی مین جب ادوار (پیریڈ) پر تقسیم کرنے کی ضرورت جامعہ عثمانیہ کے اسباق کے لئے خود فقیر کو ابتدا مین پیش آئی اور اس سلسلہ مین جیسا کہ میرا دستور تھا، ان پانچ دورون پر بنی آدم کی تہذیبی و تمدنی اولوالعزمیون کو تقسیم کر کے بیان کیا کرتا تھا یعنی

(۱) پہلا دور تو آدم تا قوم نوح کا قرار دیتا تھا،

(۲) دوسرے دور کا نام اپنی اصطلاح مین مین نے دجنسلی تمدن رکھ چھوڑا تھا، مقصد یہ تھا کہ ایک خاص علاقہ جو دریائے دجلہ اور دریائے نیل کے درمیان محدود تھا، اسی کے مختلف مقامات مین عمران و ارتقاء کا ظہور ہوتا رہا، کبھی اس کی ابتدا جنوبی عرب سے ہوئی، کبھی شمالی عرب سے کبھی ارض بابل نینوہ سے انسانی تہذیب و تمدن نے سر اٹھایا، اور کبھی دریائے نیل کے کنارے اس کے ہنگامے برپا ہوتے رہے، اسی دور مین عاد و ثمود اور اُن کے انبیاء ھود و صالح (علیہما السلام) اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے وطن اور نمرود ی تمدن، آخر مین موسیٰ علیہ السّلام اور فرعونی تہذیب کے مقابلہ پر اس دور کی داستان ختم ہو جاتی تھی،

(۳) تیسرا دور میرے خیال کے مطابق تاریخ انسانی کا وہ تھا، جب پرانی دنیا کے مشرقی و مغربی، شمالی و جنوبی علاقون مین بنی آدم کی کافی تعداد آباد نظر آتی ہے، اور ہر خطہ کے باشندے اپنے اپنے احوال اور امکانات کے مطابق اپنی اپنی تہذیب و تمدن کی تعمیر مین اس طرح مصروف و مشغول ہین کہ دوسرے علاقون سے ان کا کوئی قوی رشتہ قائم نہ ہوا تھا، چین، ہند، ایران، یونان، روم وغیرہ اقلیمون کی تمدنی تاریخ کا تعلق اسی دور

سے تھا، اسی زمانہ میں شام و فلسطین میں اسرائیلی تمدن برسرعروج تھا، اور عرب کے جنوبی حصہ میں سبائی تبع و حمیر وغیرہ نے اسی عہد میں امتیاز حاصل کیا تھا، الغرض یہ تہذیبیں بھی مقامی تھیں، اور ان کی اصلاح و تصحیح کے لئے بھی مقامی مصلحین خدا کی طرف سے جو اٹھتے رہے، وہ مقامی مصلحین تھے،

(۴) چوتھا دور انسانیت کی تاریخ کا وہ ہے، جب مختلف سیاسی و ذہنی عوامل و مؤثرات کے زیر اثر سارے مغربی ممالک میں قیصر نامی قوت کو اور سارے مشرقی علاقے میں کسریٰ نامی طاقت کو مرکزیت کا مقام حاصل ہو گیا، قیصر و کسریٰ کے مقبوضات کے درمیان عرب کی سرزمین ایک ایسی سرزمین تھی، جس پر نہ پورا اقتدار قیصر ہی کو حاصل تھا، اور نہ کسریٰ کو، یہی وہ زمانہ ہے کہ وسط عرب سے

اذا هلک کسریٰ فلا کسریٰ بعده — جب کسریٰ ہلاک ہوگا تو پھر کسریٰ نہ ہوگا،

ولیهلکن قیصر فلا قیصر بعده — اور قریب ہے وہ زمانہ بھی جب قیصر بھی ہلاک ہو جائے گا، پھر اس کے بعد قیصر نہ ہوگا،

کا پیغمبرانہ نعرہ بلند ہوا جس نے مغرب و مشرق کے سارے قصوں ہی کو ختم کر دیا، اور اسی کے بعد دنیا پانچویں دور میں داخل ہو گئی، اس وقت سے آج تک قدرتی کارفرمائیاں توحید عالم کے نظریہ کو واقعہ کا قالب عطا کرتی چلی جا رہی ہیں، بے شمار خطوں اور اقلیموں میں بٹی ہوئی دنیا ایک ملک بلکہ شاید ایک شہر ایک بستی کی شکل اختیار کئے چلی جا رہی ہے، تاکہ معلوم ہو کہ ساری نسل انسانی ایک ہے، اس کا معبود و خدا ایک ہے، اس کی زندگی کا قدرتی آئین بھی ایک ہے، اس کی کتاب بھی ایک ہے، اس کا نبی بھی ایک ہے، اس کا کعبہ بھی ایک ہے، سارے مقامی خصائص حذف کر دیئے گئے، اور وہ حذف ہوتے چلے جا رہے ہیں، باہر سے زور لگانے والے اگرچہ ایک انسانی ایک دنیا کو لاکھوں انسانی قسموں اور بیسیوں دنیاؤں میں تقسیم کرنے پر اپنا زور صرف کر رہے ہیں[1]، لیکن قدرتی مشیت قاہرہ

[1] ان کی مذہبی حرکتوں کی یہ انتہا ہے کہ شام جیسے مختصر ملک کو انھوں نے جنگ عظیم کے بعد لبنان، اسرائیل، فلسطین، شرق اردن، سوریہ پانچ پانچ مستقل علاقوں کی شکل میں بانٹ رکھا ہے، حالانکہ اس مختصر سرزمین کے باشندوں میں نہ

کا ارادہ انسان کا ارادہ نہیں کر سکتا، تقسیم و تجزی کی آگ لگانے والے ہی توحید عالم کے ذرائع فراہم کرتے چلے جارہے ہیں۔ تخریب ہی والوں سے توحید عالم کی تعمیر کا کام لیا جارہا ہے، اور لیا جاتا رہے گا،

حتّٰی یکون الدین کلہ للّٰہ، تا آنکہ دین صرف اللہ (خالق عالم) ہی کے ساتھ وابستہ ہو کر رہ جائے،

باوجود انتہائی اختصار پسندی اور اجمال کے بیچ کا یہ جملہ معترضہ کافی طویل ہوگیا، اقرار یہ کرنا چاہتا تھا کہ انسانی تاریخ کے ان پنجگانہ ادوار کی ترتیب کے سلسلہ میں مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہئے کہ کم از کم دجنیلی عہد والے دوسرے دور کے متعلقہ معلومات کی فراہمی میں بہت زیادہ مدد مجھے سید مرحوم کی اسی کتاب تاریخ ارض القرآن ہی سے اس وقت ملی تھی، جب آج سے تیس بتیس سال پہلے دروس عثمانی کو پہلی دفعہ مرتب کرنے کا مرحلہ میرے سامنے پیش آیا تھا،

خلاصہ یہی کہ نسل انسانی کے مذکورۂ بالا ادوار و قرون میں سے سید مرحوم کی کتاب تاریخ ارض القرآن میں مجھے دوسرے دور کے متعلق تاریخی اور تاریخی سے زیادہ اثری اکتشافات سے مدد ملی تھی، بلکہ اسی سے یہ سمجھ میں بھی آیا کہ قرآن بجائے خود گو کوئی تاریخی کتاب نہیں ہے، اور جن قصص کا تذکرہ اس کتاب میں بھی کیا گیا ہے، اصلی مقصود سب سے موعظت و بصیرت کا درس ہی ہے، تاہم اسی کے ساتھ انسانی تاریخ کے اس حصہ کو جسے لوگ بھول جانے والے تھے، خاص انداز اور طریقہ سے اس حصہ کو قرآن میں محفوظ کر دیا گیا ہے، اور اس کی مصلحت سمجھ میں آئی کہ پہلے اور دوسرے دور کے متعلق قرآن نے نسبتۂ زیادہ تفصیل سے کیوں کام لیا، اور کیسی تفصیل ؟ کہ قوم نوح[1] کے متعلق آج کوئی چاہے تو قرآن سے ان تاریخی نتیجوں کو پیدا کر سکتا ہے، مثلاً یہ کہ زراعت

---

بقیہ حاشیہ (۲۲۱) زبان ہی کا اختلاف تھا، نہ رنگ کا، نہ نسل کا حتیٰ کہ مذہبی حیثیت سے بھی اکثریت کا دین ایک ہی تھا لیکن باایں ہمہ انتہائی بے شرمیوں سے کام لے کر اس غریب ملک کی تکا بوٹی کر دی گئی،

[1] سورۂ نوح میں اسی قوم کی طرف د استغشوا ثیابھم کے الفاظ منسوب کئے گئے ہیں، ثیاب ثوب کی جمع ہے

وباغبانی ہی نہین بلکہ آب پاشی کے عام ذرائع خصوصاً دریاؤن کو کاٹ کر نہرون کا نظام بھی قائم کرچکی تھی، ایسے جانور اور مویشی جنھین عربی مین الانعام کہتے ہین، یعنی اونٹ گائے بیل بھیڑ بکریون کو لوگ پالتو بنا کر ان سے اُن کے مناسب حال کام لینے لگے تھے، بلکہ قرآن کے ایسے الفاظ یعنی ثیاب دوسر کا ترجمہ اگر دہی کیا جائے اجو لغۃً اُن سے سمجھا جاتا ہے تو کہا جاسکتا ہے کہ جامہ بانی (حیاکت) آہنگری جیسی صنعتون کا رواج بھی اس عہد تک ہوچکا تھا، بلکہ جب تک یہ تسلیم نہ کیا جائے کہ نجاری کا فن عہد نوح تک کافی ارتقائی مراتب طے کرچکا تھا اس وقت تک سفینۂ نوح اور جن کاریگرون سے اس مین کام لیا گیا، ہم اس کی توجیہ نہیں کرسکتے، اسی طرح چھوت چھات، یا جات چار کی طبقاتی تقسیم کا سراغ بھی قصۂ نوح مین ملتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک اس مسئلہ مین اتنی قوت حاصل ہوچکی تھی کہ حضرت نوح ؑ کے انکار کی ایک وجہ اُن کی قوم کی طرف سے یہ بھی پیش کی گئی تھی، کہ تمھارا ساتھ اراذل (یا اچھوت نیچ طبقات) نے دے رکھا ہے،) یہی نہین بلکہ اسی سلسلہ مین حضرت نوح علیہ السلام کے دعویٰ نبوت کی تنقیح کرتے ہوئے جو باتین اس قوم کی طرف سے پیش ہوتی تھین، ہم ان پر جب غور کرتے ہین، تو پتہ چلتا ہے کہ احتجاج کیئے، یا اپڈ وکیسی کی مشق مین یہ قوم کہان تک ترقی کرچکی تھی کہ سورۂ المومنون کے ان الفاظ پر غور کیجئے فرمایا گیا ہے، کہ

| | |
|---|---|
| قال الذین کفروا من قومہ ما | نوح کا جنھون نے انکار کیا تھا وہ بولے کہ |
| ھذا الا بشر مثلکم، یرید ان | نہین ہے یہ ایک آدمی تم ہی جیسا، چاہتا |
| یتفضل علیکم ولو شاء اللہ | ہے، کہ تم پر بڑائی حاصل کرے، خدا چاہتا |
| لانزل ملائکۃ ما سمعنا | تو فرشتون کو اُتارتا، ہم نے اپنے گذشتہ |
| بھذا فی اٰبائنا الاولین ان | باپ دادون مین یہ بات سنی نہین ہے |

(بقیہ حاشیہ ص ۲۲۲) جس کے معنی کپڑا ہین، اسی طرح سورہ القمر مین سفینۂ نوح کے متعلق ذات الواح ودسر کے الفاظ پائے جاتے ہین، دوسر کی تفسیر مسمار کے لفظ سے کی گئی ہے، ترجمہ جس کا میخ آہنی ہے،

| | |
|---|---|
| هو الا رجل به جنة فتربصوا به | مگر ایک آدمی جس پر جنون کا اثر ہے، پس |
| حتیٰ حین، | انتظار کرو کچھ دن کے لئے، |

بجائے ایک دلیل کے آپ دیکھ رہے ہیں، پانچ پانچ باتیں اپنے انکار کی توجیہ میں اُن کی طرف سے پیش ہو رہی ہیں، یعنی وحی کے ایک جدید علمی ذریعہ کا دعویٰ اس لئے صحیح نہیں ہے کہ نوح ہم ہی جیسا ایک آدمی ہے، احساس و ادراک کی جو قوتیں عام انسانوں میں مشترک ہیں، کوئی وجہ نہیں کہ نیا حاسہ اس میں پیدا ہوا ہو، پھر اس جدید حاسہ کا دعویٰ اُس نے کیوں کیا؟ اس کا جواب دیتے کہ بڑے بننے کی خواہش بھی اندرونی محرک ہے جس نے اس دعویٰ پر اس کو آمادہ کیا ہے، اور اگر یہ خیال کہ خدا نے اپنے بندوں کی اصلاح کے لئے اس شخص کو اس جدید علمی ذریعہ سے سرفراز فرمایا ہے، اس کا جواب دیتے کہ خدا کے لئے اس سے زیادہ آسان یہ تھا کہ اپنے کسی فرشتہ کو ہم میں بھیج دیتا، جسے عوام و خواص بآسانی تسلیم کر لیتے، آخر میں تاریخی شہادت یہ پیش کرتے کہ ہماری گذشتہ تاریخ میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی، یعنی کسی نے وحی و نبوت کا دعویٰ کیا ہو، آخر میں کہتے کہ دماغی توازن اس شخص کا کچھ بگڑ گیا ہے، جو خود بخود رفتار زمانہ کے ساتھ درست ہو جائے گا[1]؛

اور یہ تو میں نے چند اجمالی اشارے کئے ہیں، ورنہ قرآن میں انسانی تاریخ کے دور اول یعنی از آدم تا

---

[1] میں نے مختصر لفظوں میں قوم نوح کے پیش کردہ نقاط کا ذکر کر دیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ غور کرنے سے ہر نقطہ بحث سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی منطقی اور استدلالی قابلیت کافی ترقی یافتہ ہو چکی تھی، آج بھی وحی و نبوت کے مخالفین جو باتیں بناتے ہیں، شاید وہ اسی قسم کی ہیں، اس زمانہ میں قوموں کا ایک دستور یہ بھی ہے کہ اپنی قومی زندگی کی جوہری بنیادوں کا خلاصہ چند الفاظ میں کر لیتے ہیں، مثلاً اخوت و مساوات، عدالت، پھر ان لفظوں کو معبود بنا کر ساری قوم کو ان کے آگے جھکنے کا حکم دیتے ہیں، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قوم نوح میں ود (محبت ....) سواع (وقت اور اس کی قدر و قیمت) یغوث (باہمی امداد میں ایک دوسرے کی فریاد رسی) یعوق (دفاعی قوتوں کی تعمیر) نسر (کوئی خاص موسم جب برج نسر میں ستارہ آ جاتا تھا)، ان پانچ دیوتاؤں کی عبادت کا مطلب یہی تھا کہ اپنی قومیت کی صفاتی بنیادوں کو موتون

یا قوم نوح، اسی طرح دور ثانی یعنی عاد و ثمود، ہود و صالح علیہما السلام کی مخاطب قومین، یا ابراہیم و موسیٰ علیہما السلام نے جن لوگون مین کام کیا، اپنی خاص اصطلاح مین جس تمدن و تہذیب کا نام مین نے "جنبی تمدن" رکھ دیا ہے، اس کے بعض پہلوؤن کے متعلق معلومات کا جو ذخیرہ قرآن مین محفوظ کر دیا گیا ہے، شاید ان دونون ادوار کے متعلق اُن کے معلومات قرآن کے سوا اور کسی ذریعہ سے ہم حاصل نہین کر سکتے، سید مرحوم کو خدا جزاے خیر دے کہ ان قرآنی قصص کے متعلق یورپ نے شکوک و شبہات کے جو گرد و غبار اچھالے تھے، خود ان ہی کے طریقہ تحقیق سے اُن کے صاف کرنے کی ایک ایسی راہ کھول دی ہے کہ کام کرنے والے چاہین تو اس سلسلہ مین بہت کچھ کام کر سکتے ہین، اپنی اثریاتی وحضریاتی جد و جہد سے یورپ و امریکہ والے ایسے نئے نئے انکشافات دنیا کے سامنے لا رہے ہین جن سے قرآنی بیانات کی قدر و قیمت روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے،

بہرحال اپنی تاریخ کے جس حصہ کو یعنی دور اوّل و ثانی جسے لوگ عموماً بھول جانے والے تھے، اسی حصہ کے متعلق قرآن مین نسبتہً جو زیادہ تفصیل پائی جاتی ہے، اور ان کے سوا تیسرے دور جس مین دنیا کے اکثر حصون مین مقامی تمدنون کا ظہور ہوا، اس کے متعلق بجز اس قسم کے اجمالی اشارون کے کہ "زمین مین چلو پھرو، اُن کے حالات تم پر واضح ہون گے" یا قرآن کی پہلی مخاطب قوم عرب کو اجمالی لفظون مین اطلاع دی گئی ہے کہ دنیا کی تعمیر و ارتقا کا کام تم سے بہت زیادہ بہتر طریقہ پر دوسری قومین انجام دے چکی ہین، اور اُن کی اصلاح کے لئے راہ نما اٹھتے رہے، ہر آبادی مین چونکانے والے (نذیر) گذرتے رہے، اسی طرح چوتھا دور جس مین دنیا قیصریت و کسرویت کی مغربی و مشرقی قوتون کے ساتھ بلا واسطہ یا بالواسطہ وابستہ ہو گئی تھی، اس کے متعلق سورۂ روم کی ابتدائی آیتون مین حد سے زیادہ اجمالی اشارہ کر کے قرآن جو گذر گیا ہے، تو بظاہر اُس کی مصلحت غالباً یہی نظر آتی ہے کہ دونون پچھلے ادوار سوم و چہارم کی حالت اوّل اور دوم ادوار کی جیسی نہ تھی، بلکہ ہر ملک اور ہر قوم

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵۴) یا اصنام کی شکل مین انھون نے ڈھال لیا تھا، اور ہر شہر قصبہ گاؤن مین انہی بتون کو نمایان مقامات پر گاڑ کر قوم کو وہ زندگی کا درس دیتے تھے، تفصیل کے لئے معلولات کا مطالعہ کرنا چاہئیے،

اپنی تاریخ اور اپنی اثری یادگاروں کو اس طور پر قائم کر چکی تھی کہ بآسانی اُن کے متعلق کافی معلومات عام تحقیقاتی ذرائع سے حاصل کئے جا سکتے تھے، اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کا بڑا حصہ آج ان کا مرتب شکل میں ہمارے سامنے موجود بھی ہے،

خیر میں بہت دور نکل گیا، کہنا یہ چاہتا تھا کہ سید مرحوم کی تاریخ ارض القرآن نے قرآنی مطالعہ کے متعلق ایک نئے زاویۂ نظر کو پیش کیا، جس کا اعتراف قرآن کے ہر خادم کو کرنا چاہئے، انھون نے صرف "عام انسانی تاریخ" کے سلسلہ میں نئی راہیں آیندہ تلاش و تحقیق کرنے والون کے لئے نہین کھولی ہین، بلکہ قرآن کی بعض جزئی شخصیتون کے متعلق بعض ایسے اہم انکشافات پیش کئے ہین جن کی روشنی مین اُن کی حیثیتون اور اُن کی قدر و قیمت مین نمایان تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً لقمان نامی ایک شخص کا ذکر قرآن مین کیا گیا ہے، اور اُن کی طرف منسوب کر کے بعض قیمتی نصائح اس کتاب مین ملتے ہین، اب ایک طرف سوچئے جو عام طور پر مشہور ہے کہ لقمان کسی عرب کے حبشی غلام تھے، اور دوسری طرف سید صاحب مرحوم کی اس تحقیق کو سامنے رکھئے جس کا حاصل یہ ہے کہ قوم عاد کے مادی عروج کے بعد جو زوال ہوا، اور اس کے بعد حضرت ہود علیہ السلام پر ایمان لانے کے بعد یہی قوم ہود کی شریعت کے مطابق "اسلامی تہذیب و تمدن" کے نظام کے قائم کرنے مین کامیاب ہوئی، اسی عہد کے ایک اولوالعزم حکمران لقمان تھے، سید مرحوم نے مختلف تاریخی شہادتون سے اپنے دعویٰ کو ثابت کرتے ہوئے آخر مین عدن کے قریب حصن غراب نامی مقام کے کھنڈرون سے نکلے ہوئے اس کتبہ کو جسے ایک انگریز افسر ولسٹڈ نے ۱۸۳۴ء مین برآمد کیا تھا اسی کتبہ کے اس فقرے سے یعنی

"ہم پر وہ بادشاہ حکومت کرتے ہین، جو کمینہ خیالات سے بہت دور، اور شریرون کو سزا دینے والے تھے، ہود کی شریعت کے مطابق ہمارے واسطے پیدا ہوتے تھے، اچھے فیصلے ایک کتاب مین لکھے جاتے تھے،" (ص ۲۰۱ ج ۱ تاریخ ارض القرآن)

انھون نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ کتاب جس مین فیصلون کے نقل کرنے کا جو ذکر ہے یہی وہ کتاب ہے جو

مجلۂ لقمان" کے نام سے عرب مین عام طور پر مشہور تھی جس کا مطلب یہی ہوا کہ قرآن نے جیسے تورات وانجیل وغیرہ کی سچائیون کو اپنے اندر محفوظ کر دیا ہی، اسی طرح سورۂ لقمان کی وہ باتین جن کا لقمانی حکمت کے نام سے قرآن مین تذکرہ کیا گیا ہے ایہودی شریعت کی غیر فانی صداقتون سے تعلق رکھنے والی باتین ہین، گویا قرآنی دعویٰ "مصدقاً لما بین یدیہ" ہی کی ایک شکل لقمانی حکمت بھی ہے،

اس مین شک نہین کہ اس سلسلہ مین سید صاحب کے بعض دعاوی دلائل کے لحاظ سے اب بھی محل غور و تحقیق ہین لیکن کہنے والون نے جیسا کہ کہا ہے سوال اور جواب علم ان ہی دونون باتون کے مجموعہ کی تعبیر ہے، ہر علم اور فن مین سوال اٹھانے والے علم کے نصف حصہ کے حقدار ہوتے ہین، خواہ اُن کے پیش کردہ جوابون سے لوگون کو اختلاف ہی کیون نہ ہو، یہی بات سید صاحب مرحوم کے متعلق مین کہنا چاہتا ہون انھون نے قرآن کے ایک خاص پہلو کو اپنی اس کتاب مین تلاش و تحقیق کے لئے پیش کیا ہی، ان کا دعویٰ یہی ہی، فرماتے ہین کہ

"تیرہ سو برس مین ایک کتاب بھی مخصوص اس فن مین نہین لکھی گئی" (ص ۳ ج ۱)

اس سلسلہ مین اُن کے جوابون سے ممکن ہے، اختلاف کیا جائے لیکن سوالات کے پیدا کرنے والے یقیناً وہی قرار پائین گے، انھون نے علم سے دین کی خدمت کی ایک نئی راہ نکالی، امید ہے کہ آیندہ اس پر کام کرنے والون کے اجر مین اُن کا بھی حصہ ہوگا،

سید صاحب نے جس زمانہ مین اپنی یہ کتاب مرتب کی تھی، جیسا کہ جاننے والے جانتے ہین اُن پر عقلیت پسندی ہی کا زیادہ اثر تھا، اور شاید اسی کا نتیجہ ہو کہ بعض مواقع پر مثلاً حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کی پیدائش کے سلسلے مین چٹان سے نکلنے کے واقعہ کا جو انھون نے صاف لفظون مین انکار کیا ہے [۱] غالباً یہ اُن کی عقلیت پسندی کی یادگار ہی، لیکن با این ہمہ حیرت ہوتی ہے کہ اسی زمانہ مین سورۂ فیل کا تذکرہ کرتے ہوئے سر سید احمد خان کی تفسیر کے متعلق اُن کے قلم سے یہ الفاظ نکل پڑے ہین کہ

---

[۱] دیکھو ارض القرآن ج ۱ ص ۱۹۷

"سر سید نے اس سورہ کی جو تفسیر تہذیب الاخلاق مین لکھی تھی، اور جس سے اس واقعہ کے اعجوبہ پن کو دور کرنے کی کوشش کی تھی، وہ سرتا پا لغو اور اغلاط سے مملو ہے،" (ص ۳۲۲)

اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصہ مین ہدہد پرندے کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ لکھتے ہوئے کہ

"اس زمانہ کے بعض فطرت پرست کہتے ہین کہ مرغ کا بولنا، اور اس کی بولی سے مفہوم کا سمجھنا خلاف عقل ہے"،

سید مرحوم نے جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"جانورون کی عاقلیت کا مسئلہ مسلم ہوتا جاتا ہے، بندرون کی بولیون کی ابجد تیار کی جارہی ہے" تو ہدہد کے بولنے پر تعجب کیون ہو"

اسی کے ذیل مین یہ اضافہ بھی اُن کے قلم نے کیا ہے کہ

"اگر پرندون کا بولنا اب بھی کھٹکتا ہے تو فرض کرلو کہ نامہ بر کبوترون کی طرح تربیت یافتہ نامہ بر ہدہد ہوگا"

مگر اسی کے ساتھ اسی سلسلہ مین اُن کا یہ فرمانا کہ

"طیر کے معنی فوج لینا جیسا کہ مولوی چراغ علی نے لیا ہے، اسی طرح بے ثبوت ہے جس طرح سر سید کا سورۂ فیل کی تفسیر مین طیر سے فال بد لینا،، (ص ۲۶۸)

یہی باتین اُن کی حقیقی دینی فطرت کی غمازی کر رہی ہین، اور خدا کا شکر ہے کہ اسی پر اُن کا خاتمہ بالخیر ہوا و العاقبۃ للتقوی

# "نقوشِ سلیمانی"

## ادب وانشا کی کچھ جھلکیاں

از:

جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی

"تو یہ کہئے کہ آپ امیرمینائی کی غزل گوئی کے قائل نہیں صرف اُن کی فن دانی اور تحقیقِ لغت وزبان کے قائل ہیں، اچھا ایک شعر سُناتا ہوں،..... بتائیے کیسا ہے،....."

"اچھا اور بہت اچھا ہے،"

"اور یہ شعر!!....."

"یہ بھی خوب ہی، سُبحان اللہ"

"اچھا اور یہ.......اور یہ........لے اب کہاں تک سنئے گا، یہ سارے شعر امیرہی کے تھے!!"

ذکر دسمبر ۱۹۱۲ئہ کا ہے، آگرہ یا اردو والوں کے شہر اکبرآباد میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ حسب معمول خوب ٹھٹے سے ہو رہا ہے، جلسہ میں میلہ کی دھوم دھام، جشن شاہی کا تزک، واحتشام، خواص کا مجمع اور عوام کا اژدہام ملک کے گوشہ گوشہ سے پڑھا لکھا مسلمان کھنچا چلا آرہا ہے، مہمانوں کے ایک خیمہ میں، اخیر دسمبر کی ایک ٹھنڈی رات میں، دو شخص آس پاس لیٹے ہوئے، وقت گذاری کے لئے شغل اردو شعر و شاعری سے کر رہے ہیں،

امیر کو داغ سے ٹکرا رہے ہیں، ایک کو گرا اور دوسرے کو چڑھا رہے ہیں۔ یہ شعر و شعریت کا تار پود سنانے والا ہے سیّدِ ذی جاہ سلیمان ندوی، ۱۳۵۳ھ کا شیخ طریقت نہیں، ۱۳۱۳ھ کا جوان عمر صاحب نظر و صاحب قلم، اور سُن سُن کر بلا بحث بازی مات کھا جانے والا ہے، ان سطور کا راقم آثم، پڑھا نہ لکھا، نام محمد فاضل! — سید صاحب سے رسم و ربط ایک مدت سے قائم تھا، اُن کے علم و فضل کا سکہ کئی سال سے دل پر بیٹھا ہوا، یہ کیا خبر تھی کہ الندوہ کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو سنبھالنے والا اور الہلال کو وقت کی ظلمتوں میں چمکانے والا، کلامِ امیر کا حافظ نکلے گا، مرآۃ الغیب[1] کا آئینہ بردار، صنم خانۂ عشق[2] کا پرستار! یہ پہلی بار کھلا کہ یہ حضرت با این زہد و تقویٰ اردو شعر و سخن کے رسیا ہیں، اور اردو غزل و تشبیب کے متوالے!

سید صاحب کے فاضل اجل اور عالمِ بے بدل ہونے کا ایک زمانہ قائل ہے، دنیا کو مسلّم ہے کہ وہ فنِ تاریخ میں امامِ وقت تھے، اور سیرت نگاری میں اپنی نظیر آپ، لیکن آخر تک کم ہی لوگوں نے اُن کے ادبی شعری تنقیدی مرتبہ کو جانا، اور کمتر ہی لوگوں نے انھیں ادیب انشا پرداز اور سخن سنج کی حیثیت سے پہچانا! — علم و ادب کی تاریخ میں ایسی ناشناسی اور کم شناسی کی مثالیں نہ معدوم ہیں نہ غیر معلوم،

اب آخر زمانہ میں تو اُن کا عام مطالعہ یوں بھی بہت گھٹ گیا تھا، بلکہ کہنا چاہیے کہ سمٹ سمٹا کر صرف "دینیات" تک محدود رہ گیا تھا، لیکن جب شوق مطالعہ جوان تھا، اور وہ سن بھی جوانی کے تھے، تو اردو کی غزلیات کیا معنی ہزلیات تک کا دفتر بے معنی و بامعنی اُن کی انگلیوں کی نوک پر تھا، دیوان کے دیوان پڑھ ڈالے، کلیات پر کلیات ختم کر دئے اور "گلدستہ" کا تو اب لفظ بھی تشریح طلب ہو گیا ہے، (اپنے وقت میں تازہ غزلوں کے ماہنامہ کو کہتے تھے) ایک زمانہ میں ان گلدستوں کی بہار تھی، لکھنؤ تو پھر لکھنؤ ہے، اور اور شہروں بلکہ قصبوں[3] تک میں اُن کے ورق، ورقِ گل کی طرح کھلے ہوئے اور سید صاحب تھے کہ ان کی خوشبوؤں میں بسے ہوئے، پھر شاعروں کی باہمی نوک جھونک کے رسالے، اپنی بوقلمونیوں میں مولوی صاحبان کے مناظرانہ رسالوں سے

---

[1] امیر مینائی کا دیوان اول [2] ایضاً دیوان دوم [3] خیرآباد و تقیہ اللہ کاکوری غالباً،

ٹکر لیتے ہوئے اِس نے اُس کی زبان پکڑ لی، اُس نے اِس سے محاورہ کی سند مانگی، اِس نے اُس کے کلام میں ایطائے جلی نکالا، اُس نے اس کے استاد و ں تک کو پُن کے رکھدیا، انھوں نے اُن پر سرقہ مضمون کا الزام رکھ کر اُن کی موتی سی عزت اُتار لی، انھوں نے اِن کے شعر میں پہلوے ذم و فحش نکال کر اُن کی گردن ناپ دی،——

پٹنہ، سید صاحب کا وطن خود ہی اردو شعر و سخن کے حق میں گلزار اور پھر سید صاحب کا لکھنؤ میں سالہا سال کا قیام جو کور کسر رہ گئی تھی پوری ہوگئی، سید صاحب اس چمن کے ایک چہکتے ہوئے بلبلِ خوشنوا خود بن گئے،

شاعر بھی تھے، تخلص رفقی کرتے تھے کبھی قطعہ کبھی رباعی کہتے، اور تفریحًا ہر بحر سخن میں شناوری کرلیتے، جون ۱۹۱۶ء میں جب اس ہیچمدان کا عقد ہوا ہے، سید صاحب نے ازراہِ محبت و یگانگت کئی کئی رباعیاں فی البدیہہ موزون کردی تھیں، صرف ایک یاد رہ گئی، آپ بھی سُن لیں،

لایا ہے پیام یہ خوشی کا قاصد　　نوشاہ بنے ہیں آج عبد الماجد
وہ روز سعید بھی خدا لائے جلد　　بن جائیں گے جب کسی کے والد ماجد

غزل بھی کبھی کبھی چوری چھپے کہہ لیتے، صرف دو چار شعر نمونہ کے حاضر ہیں،

دل حریفِ نگہ یار کہاں سے لاؤں　　جو نہ بیخود ہو وہ ہشیار کہاں سے لاؤں
مدرسہ چھوڑا، خرابات میں آکر ٹھہرا،　　دوسرا سایۂ دیوار کہاں سے لاؤں
توبہ توبہ، مری توبہ بھی ہے کوئی توبہ　　ٹوٹ جائے جو نہ ہر بار کہاں سے لاؤں
تشہیر کا باعث نہ ہو دامانِ قبا دیکھ　　لائے نہ کہیں رنگ یہ خونِ شہدا دیکھ
انکار تھا تجھ کو مری تاثیر دعا سے　　اب میری طرف دیکھ تو تاثیر دعا دیکھ
آزاد مکان سے ہوا سے قیدِ مکاں کیا　　گر آنکھ ہو بتخانہ میں بھی نورِ خدا دیکھ

یہ مضمون سید صاحب کی شاعری پر نہیں نثر پر ہے، اُن کی شاعری پر نقد و تبصرہ کے لئے ایک مستقل مقالہ درکار ہے، اور یہ منزل تو پھر بعد کی ہے، پہلے کوئی خاکروز تلاش و تفحص سے کام لے کر اُن کا سارا کلام

یکجا تو کرین،

---

سید صاحب کی نثر پر اگر قلم اٹھایئے تو دیدہ و دل حیران، کہ شروع کہان سے کیجئے، اور خطِ تمت کہان پہنچ کر کھینچیے، سیرۃ النبیؐ کی ضخیم مجلدات سے لے کر خیام، خطباتِ مدراس اور رحمتِ عالمؐ تک بڑی منجھولی اور چھوٹی کتابون تک کون سی ایسی ہے، جہان حضرت سلیمانؒ ایک خشک مولوی مُلّا نے معلوم ہوتے ہون، اور صحت زبان و سلاست بیان نمایان نہ ہو؟ شستگی، متانت، شرافت، یہ تو اُن کے اسلوبِ تحریر کے جوہر اصلی ہین، اور اس پر جا بجا شوخی نظافت کی گلکاریان، اور حُسنِ صناعت کی سحر طرازیان، جیسے خاتم سیلمانی مین نگین، اور مستقل تصنیفات کو چھوڑئیے معارف کے شذرات اور معارف اور دوسرے رسالون کے مقالات سب کو یکجا کیجئے، تو صفحات کی تعداد سیکڑون نہین، ہزارون تک پہونچے، اور مجموعہ کو تقسیم کیجئے، تو جلدون پر جلدین کتابون کی ڈھلتی اور نکلتی چلی آئین ــــ اتنے بڑے کام پر ہاتھ ڈالنا ہے، بڑے جگر کا کام، اور ممکن اُسی کے لئے ہے، جو ایک چھوٹے سے مضمون کا نہین، پوری ایک کتاب کا تہیہ کرکے بیٹھے، اور فرصت دو چار دن کی نہین، ایک مدت دراز کے لئے نکال رکھے، سلیمان عالی جاہ کے حدود مملکت کا جائزہ لینا ہرگز کم ہمتون، کم فرصتون، کوتاہ نظرون کا کام نہین،

---

"ہم اپنی زبان کے اس قیمتی سرمایہ کا آغاز یکون سے کرنا چاہتے ہین، تاکہ یہ لفظی دولت مضمون کی معنوی دولت کے لئے فالِ نیک بن سکے" (ص ۲۹۰)

یہ الفاظ سید صاحب کے ہین، اور ایک مقالہ کی تمہید سے منقول ہین، جو بعض پُرانے لفظون کی نئی تحقیق کے عنوان سے ہندوستانی اکیڈمی، یو۔پی کے سالانہ اجلاس الہ آباد مین ۱۹۳۰ء مین انھون نے پڑھ کر سنایا تھا، اور بعد کو وہ اُن کے دوسرے خطبات، مقالات و مقدمات کے ساتھ مل کر اُن کے ادبی و علمی مضامین کے مجموعہ مین شائع ہوا ہے، مجموعہ کا نام نقوشِ سلیمانی ہے، اور یہ کتاب ۲۰ × ۲۶ کے سائز پر ۴۶۰ صفحہ پر ۱۹۴۰ء مین شائع ہو چکی ہے، کتاب کیا ہے سید صاحب کے کمالات ادبی و علمی کی ایک دستاویز، آگے اقتباسات جو پیش ہون گے، اسی کتاب سے ہون گے۔

ہاں تو سید صاحب اپنی زبان کے خزانۂ ادب میں تحقیق الفاظ کے نوادر کا اضافہ کرنے کے لئے کھڑے ہوئے ہیں، اور تمہید کے اس دُرِّ بے بہا کے بعد یوں گہر افشاں ہیں:

"ہماری زبان کا ایک پامال لفظ "دام" ہے، ایک تو اس کے معنی قیمت کے ہیں، اور دوسرے معنی ایک معمولی سکہ کے ہیں، جس کی ایک ذلیل ترین صورت ہماری زبان میں چھدام کی ہے، جو چھ اور دام دو لفظوں سے بنا ہے، اس لفظ کی تاریخ کے لئے ہم کو آج سے دو ہزار برس پہلے لوٹ جانا ہے، ایک زمانہ تھا کہ یونان کے کشور کشا اور سوداگر یورپ ایشیا پر چھا گئے تھے، ان ملکوں میں یونانی حکم اور یونانی سکے چلتے تھے، اور ان کے یونانی نام زبانوں پر تھے،....

......یونان کے چاندی کے سب سے کم قیمت سکہ کا نام درخم تھا، اس نے عربی میں درہم اور فارسی میں بیچ سے ایک حرف گرا کر درم کی صورت اختیار کی، اور ہندوستان میں ایک حرف اور گرا کر اور اُس کی جگہ ایک لمبی آواز بڑھا کر دام ہو گیا[1]، یہ لفظ جس طرح سکہ کو بتاتا تھا، سکہ کے وزن کو بھی بتاتا تھا، چنانچہ عربی طب میں دواؤں کا وزن درہم اور فارسی طب میں درم سے بتایا جاتا ہے، اسی لفظ نے جب فرنگستان کی ٹوپی پہنی تو ڈرام ہو گیا جو اب ہمارے انگریزی طبی کالجوں، دواخانوں اور شفاخانوں میں ایک بیگانہ کی حیثیت سے وارد ہے، اور شاید اب کوئی پہچانے بھی نہیں کہ دام اور ڈرام دونوں کی ایک ہی شخصیت ہے، صرف آب و ہوا، لہجہ اور شکل و صورت کا فرق ہو گیا ہے،

اکبر کے زمانہ میں دام چاندی کے سب سے چھوٹے سکہ کے بجائے تانبے کے سکہ کا نام تھا، اس کو پہلے پیسہ کہتے تھے، اور اب بھی کہتے ہیں، یہ روپیہ کا چالیسواں حصہ تھا، پھر ایک دام کے پچیس حصے کرکے ہر حصہ کو جیتل کہتے تھے، اب اسکو گنڈا کہتے ہیں، اکبر کے زمانہ میں بھی اس کا نام ملتا ہے، اسی تقسیم سے پورب کی زبان میں ایک محاورہ "ہر چلا ہے، ہر گاؤں یا ہر زمیندار کی ملکیت ۱۶ فرض کی جاتی ہے، اور یہ آنے بھر پائی اور دام پر بانٹے جاتے ہیں، ایک دام

---

[1] یہ عبارت نقل کرتے وقت درم و دام کی اس قرابت پر ایک عامی کو غالب کا یہ مصرعہ بے اختیار یاد آ گیا، "درم و دام اپنے پاس کہاں" یا اور فارسی کا چلا ہوا فقرہ، "دامے درمے بھی"،

کا آدھا ادھیلا اور ¼ پاؤلہ اور ⅛ دمڑی کہلاتا ہے، اور یہ اخیر لفظ دام کی تصغیر یا تحقیر ہے، آئین اکبری کے مطابق ایک من تانبے میں ایک ہزار چوالیس درم (پیسے) تیار ہوتے تھے۔" (ص ۲۹۰-۲۹۱)"

سید علیہ الرحمۃ نے یقیناً فیلالوجی (لسانیات) پر کوئی تصنیف اپنی یادگار نہیں چھوڑی، لیکن اس ہلکے سے نمونہ سے اندازہ ہو گیا ہوگا، کہ انھیں فن لغت و اشتقاق الفاظ سے کتنی مناسبت تھی، اس میدان میں اپنا ذہن کہاں کہاں دوڑاتے رہتے، کن کن آسمانوں سے تارے توڑ توڑ کر لایا کرتے، اور خشک لغوی تحقیق کو کتنا شگفتہ بنا کر رکھتے —— اتنا پھیلاؤ تو آپ نے صرف ایک لفظ دام کی خاطر دکھایا، کتاب کا پورا ڈیڑھ صفحہ اسی کی نذر ہو گیا، قدر جب اس گھٹیا سکہ کی یہ ہوئی تو پھر اشرفی کی قیمت تو اس سے کہیں زائد ہے، اس کی وجہ تسمیہ کی کاوش میں تو جو کچھ پاپڑ نہ بیل ڈالے ہوں، بجا ہے، سنیئے اور کچھ دیر تک کان لگائے سنتے رہیے:

"دام اور قیراط جس طرح باہر سے آئے ہوئے نام ہیں، اسی طرح ہمارے سب سے قیمتی سکہ "اشرفی" کا نام بھی باہر سے آیا ہوا ہے، مجھے بہت دنوں سے اس کی اصلیت کی تلاش تھی، اور پتہ نہ چلنے پر دل کو یہ کہہ کر تسکین دے لی کہ چونکہ یہ طلائی سکہ سب سکوں میں اشرف ہے، اس لئے اشرفی کہلایا، مگر دفعتہً ایک غیر متوقع ماخذ سے اس کی اصلیت دریافت ہوئی، تو معلوم ہوا کہ سکہ اشرف نہ تھا، بلکہ جس بادشاہ کی طرف وہ منسوب ہے وہ اشرف تھا،

طلائی سکہ کے لئے سب سے پرانا نام دینار ہے، اور یہ بھی یونانی ہے مگر چونکہ عربوں میں یہ سکہ جاری تھا، اس لئے انھوں نے عبدالملک کے زمانہ میں سنہ ۷۴ھ یا ۷۵ھ میں طلائی سکہ ڈھالا تو اس کا نام "دینار" ہی رہنے دیا جب اُن کے قدم ہندوستان پہنچے تو ان کا دینار بھی اُن کے ساتھ آیا، اور آج تک خاندانی مسلمانوں میں دین مہر کی تعداد میں سکہ رائج الوقت کے ساتھ چند دینار سُرخ رسمی طور سے جاری ہے، تغلق کے زمانہ میں ہم کو اشرفی کے لئے دو لفظ ملتے ہیں، ایک تنکہ زر، یہ تنکہ سکہ کے معنی میں عام طور سے بولا جاتا تھا اور اسی سے تنخواہوں کی تعیین ہوتی تھی، پیادہ کی ماہانہ تنخواہ ۲ تنکہ اور سوار کی ۷ تنکہ تھی، مخدوم زادہ بغدا

کے لئے دس لاکھ تنکہ وظیفہ مقرر ہوا، مصری خلیفہ کا سفیر جب سلطان محمد تغلق کے دربار میں آیا ہے اور جمعہ کے دن خلیفہ کا نام خطبہ میں پہلی دفعہ پڑھا گیا ہے تو "چندین طبقہا پُر از تنکۂ زر و نقرہ بر آن نثار شد" (برنی ص ۴۹۲)

اس سے معلوم ہوا کہ اشرفی کے لئے اس زمانہ میں تنکۂ زر بولا جاتا تھا، خلجی کے زمانہ میں ایک تنکۂ زر ایک تولہ سونے کا ہوتا تھا اور تنکۂ نقرہ ایک تولہ چاندی کا (فرشتہ ص ۱۱۴) روپیہ کو تنکۂ نقرہ اور اس سے کم درجہ کے سکہ کو صرف تنکہ کہتے تھے، یہ لفظ قدیم یادگار کے طور پر آج بھی بعض پرانے خاندانی مسلمانوں میں دین مہر کی تعیین میں بولا جاتا ہے، خیال ہوتا ہے کہ یہی "تنکہ" تو آج ٹکے کی صورت میں ہمارے سامنے نہیں؟

دوسرا لفظ "مہرزر" ہے، اس کو مہر اس لئے کہتے تھے کہ اس پر شاہی نقش ہوتا تھا، مہرزر کی اصطلاح برنی میں ملتی ہے،

"سلطان محمد مہرمس پیدا آورد و فرمان داد کہ مہرمس را خرید و فروخت چنانچہ مہر زر و نقرہ جاری است" (ص ۴۷۵)

...... دکن میں طلائی سکہ کا نام ہون تھا، جو آخر میں مخفف ہو کر ہُن ہو گیا، اور آج ہماری زبان میں اس نسبت سے دولت کی کثرت کے معنی میں ہُن برسنا ایک یادگار رہ گیا ہے، روپیہ کا لفظ اس سکہ شیر شاہ کا چلایا ہوا ہے، (آئین اکبری ص ۱۸) اور عجب نہیں کہ روپا سے بنا ہو، سونے کے سکہ کے لئے اشرفی کا لفظ ہندوستان میں نورالدین جہانگیر کے زمانہ میں استعمال میں آیا ہے، چنانچہ فرشتہ نے اپنی تاریخ میں حسن گنگو بہمنی کے خزانہ پانے کی اتفاقی سرگذشت کے بیان میں لکھا ہے:-

"زنجیر را در گردن ظرفے مملو از اشرفی طلائی و طلائے غیر مسکوک دید"

(فرشتہ - نولکشوری ص ۲۷۷)

...... مصر کے چرکسی بادشاہوں میں ایک برسبائی تھا، اس نے ۸۲۵ھ سے ۸۴۱ھ تک حکومت کی، اس کا شاہی لقب الملک الاشرف تھا، یہی اشرف اشرفی کا مصدر و معدن ہے، مشہور عرب جہاز راں

ابن ماجد اسد البحر نے جس نے ۹۰۴ھ (۱۴۹۸ء) مین واسکو ڈی گاما کو ہندوستان پہنچایا تھا، الفوائد فی اصول البحر والقواعد کے نام سے جہازرانی پر ایک کتاب لکھی ہے، جو چند سال ہوئے کہ فرانس سے چھپ کر شائع ہو چکی ہے، اس کا زمانہ نوین صدی ہجری کا اخیر اور دسوین صدی ہجری کا شروع تھا،

..........اس کی کتاب کے مطالعہ سے اشرفی کا بھید مجھے معلوم ہوا، ابن ماجد ایک خاص سلسلہ مین لکھتا ہے:-

| | |
|---|---|
| الحادی عشر برسبائی الاشرف ضارب | گیارہوان بادشاہ برسبائی اشرف ہے جو اشرفی |
| سکة الاشرفی (ص۴۰ طبع پیرس) | سکہ کا چلانے والا ہے، |

اس سے معلوم ہوا کہ اشرفی کا سکہ مصر سے چل کر بحر ہند مین داخل ہوا تھا، اور وہان سے پورے ہندوستان مین پھیل گیا، ابن ماجد نے اپنی یہ کتاب ۸۹۵ھ مین لکھی ہے اور اس سکہ کے بانی کا ذکر کیا ہے، اور فرشتہ نے اپنی اصل کتاب اس کے بیس برس بعد ۹۱۵ھ مین لکھی، اور "اشرفی علائی" کا نام لیا ہے، یعنی علاء الدین خلجی کے وقت کی اشرفی، حالانکہ خلجی کے زمانہ مین اشرفی کا نام بھی پیدا نہین ہوا تھا، مگر یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم پرانے زمانہ کے بادشاہون کے سونے کے سکّون کو یا انگریزی پونڈ کو اشرفی کہہ دیتے ہین" (ص۲۹۶)

یہ ساری تحقیق، جو یہان ذرا مختصر ہو کر نقل ہوئی ہے، کتاب کے پورے چار صفحون مین آئی ہے، ا——

اور اسی طرح لفظ پر لفظ لکھتے اور ہندی کی چندی کرتے چلے گئے ہین، "کرانت، بیمہ، ڈاک، قمری، سوسی، انبی، نیزہ، رقم، ہندسہ، ریاضیات، سیاسیات" یہ دس عنوانات اور اس لغاتچہ کے ہین، اور ان بارہ لفظون کے اشتقاق اور تحقیق تسمیہ کی موشگافیون مین پورا مقالہ ختم ہو گیا ہے،

پھر یہ بارہ لفظ وہ ہین جن کی ذاتین بالکل الگ الگ ہین، یعنی ان کا تعلق باورچی خانہ سے بھی ہے اور بزازے سے بھی، چڑیا خانہ سے بھی اور صرافہ سے بھی، سرکاری ایوانون سے بھی اور درسی کاشانون سے بھی، یونہی زبردستی گلے مین پتا ڈال کر اکٹھے نہین کر لئے گئے ہین، بات مین بات پیدا کی گئی ہے، نکتہ سنجی کو کھل کھیلنے کا میدان ہاتھ لگ گیا ہے، اور انشائے لطیف نے جیسے الگ تھلگ رہنے والے روٹھے ہوؤن کو گلے ملوا کر

ایک دوسرے سے متصل بنا دیا ہے ـــــ دعویٰ پر دلیل ملاحظہ ہو،

"ڈاک" کے مقابلہ "قمری" آیا ہے، بھلا ان دو اسموں میں کیا ربط، کیا تعلق ہو سکتا ہے، لغت "ڈاک" کے خاتمہ پر سنیئے :-

"اگلے زمانہ میں مصر وغیرہ اور ہمارے ملک میں بھی جہانگیر نے ڈاک کے کبوتر اڑا دیئے تھے، اس نسبت سے ایک اڑتی سی بات کبوتر ہی سے ایک ملتے جلتے پرندے کی نسبت سُن لیجئے،"

دیکھا آپ نے، ادب و انشاء کے اس شہباز نے کس طرح ہنستے کھیلتے ڈاک کے تھیلے کی ڈور، قمری کے پر سے باندھ اس سے حق بہرہ بڑھا دیا! اسی ہلکے پھلکے انداز سے ربط، "بمبا" و "ڈاک" کے "فرینی" اور "رقم" کے، اور "رقم" اور "ہندسہ" کے درمیان قائم ملے گا، ــــــ اس ربط ضبط کی ساری داستان پڑھنا ہو تو اس کتاب کی طرف توجہ فرمائی جائے،

پھر یہی نہیں ہوا کہ یہ لسانیاتی کاوش اسی ایک لکچر پر ختم ہو گئی ہو، اس کی چاٹ جو پڑی تو مصرع طرح پر غزل کے بجائے دو غزلہ تیار ہو گیا، لکچر تو اکیڈمی میں سنایا گیا تھا، اس کا دوسرا نمبر اسی عنوان کے ساتھ خاص معارف کے لئے لکھا، اور وہ ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا، اس میں الفاظ ذیل زیر بحث آئے،

ناشتہ[1]، نہار[2]، فلسفہ[3]، قاب[4]، رکابی[5]، قلیہ قورمہ[6]، شوربا[7]، شراب[8]، کباب[9]، قالین[10]، شاگرد پیشہ[11]، راج[12] زمامل، مستری[13]، خراد[14]، ساہول[15]، گنیا[16]، جہاز[17]، جہیز[18]، تجہیز[19]، سُرخی[20] (عنوان)، مسل[21]، نستعلیق[22]، چلبلا[23]، کفش[24]، مادری[25]، قلعی[26]، تماشہ[27]،

ـــــ یعنی پہلے مقالہ کے دونے سے بھی زائد، ۱۲ کی جگہ ۲۷، نقش ثانی کے معنی ہی یہی ہیں کہ نقش اول سے بڑھ رہی کر رہے، کیا کیفیت میں اور کیا کمیت میں،

اس مقالہ کا بھی رنگ انشاء آپ دیکھنا چاہتے ہیں؟ اچھا تو ایک ہلکی سی جھلک سہی، شوربا کی نمکینی کے بعد قلم کی زبان یوں شکرفشاں ہوتی ہے، ابر مستی کے ذکر میں بھی رندی تک نہیں پہنچتی، صرف شوخی کے حدود کے اندر رہتی ہے :-

"اسی عربی شُرب (پینا) سے ایرانیون نے شراب اور شربت تیار کیا، اور اُسے ہندوستانیون نے قبول کر لیا، شراب کے معنی عربی مین ہین جو چیز پی جائے"، یہان تک کہ قرآن مین دودھ کو بھی شراب کہا ہے، ایرانیون نے جس کو شراب کہا، اُس سے متوالی شراب مراد لی، اس سے یورپی زبانون میں سیرپ تیار ہوا، جو شکر پڑ کر میٹھا ہو گیا، لیکن ایرانیون کے اثر سے ہم نے پانی مین گھول کر جو چیز تیار کی، اس کو شربت کا نام دیا لفظ عربی ہے، اور معنی عجمی، عربی مین اس کے معنی فقط پینے کے ہین" (ص ۳۱۶، ۳۱۷)

ان میٹھے بولون کو سُن کر خیال یہ نہ گذرے کہ سیّد صاحب کی ہر تحقیق سَو فی صدی صحیح ہی تھی، کون فاضل اس کا دعویٰ کر سکتا ہے؟ بشر بہر حال بشر ہے، اور سیّد صاحب اپنی بشریت کے اعتراف و اقرار مین ہرگز کسی سے پیچھے رہنے والے نہ تھے، لسانیات کے ایک ماہر خصوصی ہمارے صوبہ مین ڈاکٹر عبدالستار صدیقی سندیلوی ثم الٰہ آبادی ہین، انھون نے جب بعض حصون پر نقد کیا، تو سیّد صاحب نے یہی نہین کہ فراخ دلی کے ساتھ اسے معارف مین شائع کر دیا، بلکہ شور با کی حد تک تو کھلے طور پر، اور مستری کے لئے بھی ایک حد تک اپنی تحقیق سے رجوع بھی کر لیا،

---

نحوی اور اشتقاقی بحثون کا شعبہ ختم ہوا، سیّد صاحب کے دو اور بڑے کارنامے مستقل قدر و قیمت رکھنے والے یہ ہین، کہ

(۱) انھون نے عربی و فارسی کی تمامتر ماتحتی سے نکال کر اردو کی خود مختاری اور ایک قائم بالذات زندگی کی سرگرم وکالت کی، وہ اصلاً ایک عالم دین اور مولوی تھے، قدرۃً اُن کے طبقہ سے توقع یہ تھی کہ وہ اُردو پر عربی کی حاکمیت سے خوش ہونگے، اور ساری کوشش اس کے قائم و برقرار رکھنے کی کرین گے، لیکن اس کے برعکس انھون نے عربون کی "تعریب"، اور فارسیون کی "تفریس" کی طرح، اہلِ ہند کو بھی حق "تہنید" کا دلایا،

"جب اہلِ ہند یہی کرین، یعنی وہ کسی دوسری زبان کے لفظ کو اپنی زبان کے اصول پر تراش خراش کر کے اپنی زبان مین ملالین تو اُس کو تہنید کہین گے، یہ اصول زبانون کے بڑھنے اور پھیلنے کے لئے بت ہی

مفید ہو، یہ اصول قریب قریب دنیا کی سبھی زبانوں مین چلتا ہے، اور اُس کے مانے بغیر ممکن ہی نہین، کہ زبان ترقی پا سکے" (ص ۳۲۸)

آج ۱۹۵۲ئہ مین یہ بات بالکل صریح و واضح معلوم ہو رہی ہے مگر ۱۹۳۹ئہ مین جب سید صاحب نے "تھنید" کے عنوان سے اُسے معارف مین پیش کیا تو یہ آواز کچھ نامانوس سی تھی، پرانے خیال کے اہلِ قلم خاصی تعداد مین اس پر مصر تھے کہ عربی و فارسی کے قاعدے اردو مین بھی چلائے جائین گے، اور اُن کے پاس دلیل بجز جمود و تقلید کے اور کوئی نہ تھی، اُس کے مقابلہ مین سید صاحب کا سیدھا، صاف و دلنشین استدلال ملاحظہ ہو:-

..... ایک قوم کا آدمی جب کسی دوسری قوم کی بولی کا کوئی لفظ لیتا ہے تو اس کی زبان کی فطرت مجبور کرتی ہے کہ ارادہ اور احساس کے بغیر اس کی شکل بدل دے، ہندوستان کے باہر کا آدمی خواہ کچھ کرے، مگر وہ ہمارے ہندی حرفوں کو کبھی نہ بول سکے گا، وہ اس کو کچھ نہ کچھ بدل دے گا، وہ ہمارے لہجہ سے ہمارے لفظوں کو نہ نکالے گا، مگر اس مین بھی کچھ ہیر پھیر کرے گا،

یہی حال ہندیون کا بھی ہے، عربی کے خاص حرف وہ ادا نہین کر سکتے، ع، ء اور الف مین، ث، ص اور س مین اور ت اور ط مین وہ فرق نہین کر سکتے، اس لئے دوسری زبان کا جو لفظ ہمارے ہان آئے گا وہ جب تک اپنی بیگانگی چھوڑ کر بالکل گھر بلو نہ بن جائے گا، وہ ہمارے دیس مین رہ نہین سکتا، یہی وجہ ہے کہ عربی، فارسی، سنسکرت، انگریزی وغیرہ کے جو ہزارون لفظ ہماری زبان مین آگئے ہین، وہ ہماری زبان کے قاعدون پر چڑھ کر ہماری زبان کی شکل و صورت اختیار کرنے پر مجبور ہین،

متمار کے معنی مین آج کی اصل عربی اور فارسی مین تاذ ہے، مگر ہمارا ہندوستانی لفظ راج ہی ہوگا، عربی کا یہ صحیح لفظ تمنّی ہے، مگر فارسی والون نے اُسے لیا، تو تمنّا کر دیا، اور ہم نے بھی اُسی کو قبول کیا، عربی تماشی کو ایرانیون نے تماشا کیا، اور ہم کو بھی یہی تماشا پسند آیا، لالٹین کی اصل لینٹرن ہے، مگر ہم کو لالٹین ہی کی روشنی پسند ہے ڈبّن انگریزی ہو تو ہو، مگر ہمارا لفظ تو بوتام ہے، جو بٹن کی گمڑی ہوئی شکل ہے، لفظ نبا ذ، عربی کے لحاظ سے

غلط ہی کیوں نہ ہو، لیکن ہماری زبان میں یہ صحیح ہے کہ اس کو چھوڑ کر مبادلہ یا تبادُل کی کوشش زبردستی ہے۔"

(ص ۳۳۱)

قدیم طرز کے عالموں سے اس کی توقع ہو ہی نہیں سکتی مگر سید صاحب عالم تھے ہی ندوی، اور اُن کی ندویت اُن کی خوش ذوقی اور سلامتِ مذاق کی پوری طرح ضامن تھی ——— ۲۰ صفحہ کے مقالہ میں سید صاحب نے پچاسوں عربی لفظوں کی مثالیں دے دے کر دکھایا، ہر کہ عربی میں اُن کے معنی کچھ تھے، اردو میں آکر کچھ ہو گئے، یا اُن کا تلفظ عربی سے اُردو ہو گیا یا اُن کے واحد جمع بنانے میں عمل اُردو قاعدوں پر ہوا ہے،

(۲۰) اسی درجہ کا بلکہ اس سے بھی بڑا دوسرا کارنامہ سید صاحب کا اردو زبان کے سلسلہ میں اس کے نام سے متعلق ہے، سید صاحب کا اصرار تھا کہ اس کا نام "ہندوستانی" چلانا اور پھیلانا چاہیئے، کہ یہی اس کا نام فی الاصل ہے بھی، اور یہی اُس کی اشاعت و مقبولیت میں بھی بہت معین ہو گا، شروع شروع اس تحریک کی خاصی مخالفت ہوئی، اور انہی مخالفوں میں میں بھی تھا، اور بدگمانی مجھے یہ ہو رہی تھی کہ اردو کے خلاف، اس کے اسم و مسمّی دونوں کے خلاف جو زبردست پروپگنڈا اردو کے دشمنوں نے شروع کر رکھا ہے، اس سے کسی حد تک سید صاحب بھی متاثر و مرعوب ہو گئے ہیں، اور نام کی حد تک ہتھیار ڈالنے پر آمادہ ——— لیکن غالباً ۱۹۴۲ء میں جب کہ ایک بار اُن سے علی گڈھ میں اس پر زبانی مفصل گفتگو ہوئی، تو قائل ہونا پڑا کہ رائے انہی کی صحیح و صائب تھی، اور اردو کے بجائے ہندوستانی نام رکھنے کا مشورہ کسی مرعوبیت کی نہیں، عین اردو کی دوستی و ہوا خواہی ہی پر مبنی تھا، سید صاحب کا کہنا یہ تھا کہ

"ہم اس زبان کا نام اردو جو صرف سو ڈیڑھ سو برس سے رفتہ رفتہ ہماری زبانوں پر چڑھ گیا ہے، یک قلم چھوڑ دیں، اس کا نام ہندوستانی رکھیں، اور اسی کو شہرت دیکر عام کریں، دنیا کی اکثر زبانوں کا نام ملک یا قوم کے نام سے موسوم و منسوب ہوتا ہے، اردو کا نام اس ملک و قوم سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، ایسا اجنبی نام جس سے قومی و ملکی جذبہ کو کوئی تحریک نہ پہنچے، احتراز کے قابل ہے، اور اس کے بجائے

اس کا ہندوستانی نام، ہندوستانی، اور وہ بھی ہندو اور مسلمانوں کے مشترکہ وطن کے نام کے تصور کے حامل ہونے کے سبب سے پوری طرح اپنے اندر ہمدردانہ جذبات کی روح رکھتا ہے، اور معلوم ہوتا ہے، کہ یہ ایسی زبان کا نام ہے جس کو پورے ملک سے تعلق ہے، اور وہ پورے ملک کی متحدہ زبان ہونے کا دعویٰ رکھتی ہے، عام خیال یہ ہے کہ یہ ہندوستانی نام انگریزوں کا بخشا ہوا ہے، اگر یہ واقعہ نہیں ...... ہم اس نام کے ذریعہ سے ملک کے سامنے وہ تخیل پیش کریں گے جو ہندو مسلم کے مشترکہ وطن کے تصور کی ترجمانی کرے گا، اور مغلوں کے لشکری استیلاء کی تاریخ سے جو لفظ اردو میں چھپی ہے ہم کو نجات دے گا" (ص ۷۵، ۷۶)

یہ مقالہ ۱۹۳۲ء کا ہے، اور آج اس کی قدر ہوتی ہے، کہ اس زمانہ میں اُس کے اندر کتنی دور اندیشی تھی، کتنی مصلحت شناسی تھی، ـــــ مقالہ میں اور بھی جو مشورے درج تھے، وہ سب ایسے تھے، جو اردو کے ایک دوست دانا ہی کی زبان سے ادا ہو سکتے تھے، مثلاً یہ کہ عربی و فارسی کے جتنے الفاظ اب تک ہماری زبان کا جزو بن چکے ہیں، بس اُن کے علاوہ (بجز اصطلاحات کے) اور نئے نئے لفظوں کو فرہنگ و قاموس کی مدد سے گڑھ گڑھ کر اردو میں نہ لایا جائے، اور یا پھر یہ کہ ہندی کے جو لفظ اردو یا ہندوستانی میں بہ آسانی کھپ جاتے ہوں، اُن کے لینے میں خواہ مخواہ ضد اور ہٹ کو کام میں نہ لایا جائے،

سید صاحب کو اُن کی زندگی کے صرف آخری ۵۔۶ برسوں میں جنھوں نے دیکھا ہے، اور جن کی واقفیت اُن سے اسی زمانہ تک محدود ہے، وہ عجب نہیں کہ انھیں محض ایک مقدس شیخ خانقاہ سمجھ رہے ہوں، جس کے اوقات صرف اوراد و نوافل، اذکار و اشغال کے لئے وقف رہتے ہیں، اور جس کو شعر و شاعری، زبان و ادب کے قضیوں سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہوتا، ـــــ معتقدوں، مریدوں، اور مسترشدوں کی یہ رائے کتنی ہی اخلاص نیت پر مبنی ہو، غلط فہمی ہر حال میں غلط فہمی ہی ہے، سید صاحب اور جو کچھ بھی ہوں، (اور یقیناً وہ اور بہت کچھ تھے بھی) اُن کے اس مرتبۂ امتیاز سے کوئی انھیں محروم نہیں کر سکتا، کہ وہ ایک ادیب صاحب طرز تھے، اور طرز اُن کا شگفتہ و لطیف ایک انشاء پرداز تھے، شوخ و ظریف نقاد تھے، گہری نظر رکھنے والے،

سخن سنج تھے، کھوٹے کھرے کے پرکھنے والے لکھنوی نہ تھے، پر لکھنوی ہی تھے، اپنے استاد شبلی نعمانی ہی کی طرح، بلکہ اُن سے بھی کچھ بڑھ کر، وطن ثانی بھی مثل وطن ہی کے ہو جاتا ہے، یہ اعتراف آپ خود اُن کی زبان سے سننا چاہتے ہیں، تو سنیئے، جنوری ۱۹۳۷ء میں وہ ہندوستانی اکیڈمی کے جلسۂ سالانہ میں شعبۂ اردو کے صدر منتخب ہوئے، خطبۂ صدارت کے شروع ہی میں فرماتے ہیں:-

"......آپ کی اس ذرہ نوازی کی قدر اور بڑھ جاتی ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ مجھے اس اعزاز کی دولت اس سرزمین میں بخشی گئی، جو ہمیشہ سے علم و ادب کا گہوارہ اور بڑے بڑے ادیبوں اور عالموں کا مرکز ہے، خاکسار کو تو لکھنؤ سے وطن کی نسبت حاصل نہیں لیکن گذشتہ ۲۲ برس سے مجھے اس سے جو علمی و تعلیمی تعلق رہا ہے، وہ وطن ہی کے مانند ہے، اسی کی گود میں میرے ہوش و تمیز کی آنکھیں کھلیں، اسی کے دامن میں میری تعلیم و تربیت ہوئی، اور اسی کی آب و ہوا میں میرا علمی و ادبی نشو و نما ہوا، اس نے اس سرزمین کا ہر گوشہ میرے لئے مانوس اور اس چمن زار کی ہر کیاری میرے لئے نظر افروز ہے۔"

خوش نصیب ہے وہ ماں جو ایسے جوہر قابل کو گود دے، مبارک ہے وہ فرزند نامور جسے ایسی مادرِ مہربان کا آغوش نصیب ہو جائے ـــــ اعزاز و اکرام کی تالی دونوں ہی ہاتھ مل کر بجتی ہے،

نازان منم کہ ہمچو توئی قدردانِ من

نازان توئی کہ ہمچو منی مدح خوانِ تو!

تنقید و تبصرہ کی بہار دیکھنا ہو تو اسی مجموعہ کے صفحہ ۲۴۲ سے لے کر ۴۶۹ تک کے سو صفحوں سے اوپر "مقدمات" کی سیر کر جائیے، نثر و نظم کی ۱۱ - ادبی و شعری کتابوں پر مقدمے ہیں، جو کتابیں گمنام، غیر معروف یا دھندلی سی تھیں، وہ جیسے اس مَسِّ سلیمانی سے چمک اٹھی ہیں، اور جو پہلے ہی سے روشن و معروف تھیں، اُن میں اور چار چاند لگ گئے ہیں!

---

اکبر پر نقد و تبصرہ، داد و تحسین، آپ بہتوں کے قلم سے پڑھ چکے ہیں، اب ذرا دیکھئے کہ حضرت سلیمان

جب یہ اہل زہد و متانت اس پیکر شوخی و ظرافت کو اپنی بزم معارف میں لاتے ہیں، تو تعارف کس انداز سے کراتے ہیں، اور نقیب بن کر صدائیں کیا کیا لگاتے ہیں ——— نقیب کی تشبیہ کسی معتقد کو گراں نہ گذرے، ذکر ۱۹۱۶ء کا ہے، اکبر اس وقت ۷۰ سال کے معزز و محترم بزرگ ہیں، اور مولانا ندوی اُن کے خردوں کے خورد، یعنی اُن کے صاحبزادہ سے بھی کم عمر؛

" ظرافت کا رنگ جو سید انشا، اور سعادت علی خان کی بدولت لکھنؤ کی شاعری میں پیدا ہو گیا تھا، اس کا مقصد محض تفریح طبع اور دل بہلانا تھا، ضلع جگت اور رعایت لفظی لکھنؤ کا خاص مذاق ہے، اس کا مقصد بھی صرف تفنن طبع تھا، لکھنؤ میں امانت اس اقلیم کا بادشاہ ہوا ہے، جان صاحب کا رنگ گو زنانہ لہجہ میں آکر بدنما ہو گیا تھا تاہم اس کی بنیاد بھی محض تفریح طبع تھی، میر صاحب کا احسان یہ ہے کہ انھوں نے سعدی، ابن یمین اور خیام کے مغز سخن کو امانت کے الفاظ میں اور سید انشا کی بولی میں اس طرح ادا کیا کہ وہ نہ صرف تفریح طبع اور واہ واہ کا سامان رہا، بلکہ اُس کی تہ میں پند و موعظت، اخلاقی تعلیم، سیاسی نکتے، فلسفیانہ اسرار، مذہبی مسائل، اجتماعی مباحث نظر آنے لگے، سید انشا کے زمانہ کی سرکاری زبان فارسی اور ترکی تھی، وہ اسی شیرہ اور قوام سے اپنا شربت تیار کرتے تھے، اب انگریزی سرکاری زبان ہے، میر صاحب اس بادہ افرنگی کی آمیزش سے ذوق کلام کو لطف دیتے ہیں ........ میر صاحب اسی شیر و شکر میں پند و موعظت اور نصیحت گری کی ان تلخ دواؤں کا گھونٹ گلے سے اتار دیتے ہیں جن کو یوں پینا اس جدید دور لطافت و نزہت پسندی میں ناممکن تھا، میر صاحب بھری محفل میں علمائے کرام، مشائخ عظام، امرا، و حکام، مدعیانِ رہبری عام، اور نوجوانانِ تعلیم یافتوں کا خاکہ اڑاتے ہیں، اور اُن کی چتون پر میل تک نہیں آتا۔" (ص ۱۶۵، ۱۶۶)

اور پھر چند صفحوں کے بعد :-

" جدید تہذیب کے دلدادہ، بے پردگی کے حامی اور عورتوں کو پبلک میں دیکھنے کے مشتاق ہیں، "

سمجھتے ہیں کہ جو انگریزی نہ جانے، گویا وہ تعلیم سے عاری ہے۔ امیر صاحب اُن کے دعوی کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں :-

جامہ وچکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب وہ شمعِ بزم ہے پہلے چراغِ خانہ تھی

"شمعِ بزم اور چراغِ خانہ کی تشبیہ سن کر عجب نہیں کہ عورتوں کی بے پردگی، اور انگریزی تعلیم کے مدعی چراغ پا ہو جائیں"

رخصت اے بزمِ شبلی کے مکین، بلکہ سر دبدوص، برادر چشم و چراغ، سلیمان ندوی رخصت! تو نے جہاں ایک طرف الحاد و بے دینی کے بڑے بڑے سرکش و منہ زور جنات کو بوتلوں میں بند کیا، وہیں الفاظ و معانی کی کیسی کیسی لطیف پریاں بھی شیشہ میں اتارتا رہا!!

# سید صاحب کے پیشِ نظر
## بعض اہم علمی کام

از

مولانا محمد اویس صاحب ندوی استاذ تفسیر دار العلوم ندوۃ العلماء

سید صاحبؒ اس دنیا سے تشریف لے گئے، اور اپنے ساتھ علوم و معارف اور کمالات کا ایک خزانہ لے گئے، لیکن، جو کچھ چھوڑ گئے ہیں، وہ بھی کم نہیں ہے، اُن کی تصنیفات، مقالات، خطبات، اور مکاتیب ایک گنج گرانمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں، موجودہ اور آیندہ نسلوں کی دینی، اخلاقی، علمی، اور ذہنی رہنمائی کے لئے اس میں بڑا قیمتی سامان موجود ہے،

لیکن ان "الباقیات الصالحات" کے سوا سید صاحبؒ کے سامنے کچھ اور بھی کام تھے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ کی جو باتیں میرے علم میں ہیں، اُن کو قلم بند کر دوں، ممکن ہے کہ دوسرے حضرات کے پاس بھی اس سلسلہ کے کچھ معلومات ہوں، اگر یہ سب چیزیں جمع ہو جائیں تو آیندہ کے کاموں کا ایک خاکہ تیار ہو سکتا ہے، اور سید صاحبؒ کے "حسنات" کا ایک نیا باب کھل سکتا ہے،

سید صاحبؒ کو اسلامی علوم میں حقیقی شغف قرآن مجید سے تھا، آیاتِ قرآنی سے کلامی، فقہی، اخلاقی، اور سیاستِ اسلامی کے مسائل کا استنباط، اس کے ادبی لطائف کی تشریح و توضیح، اور تاریخی مباحث کی تحقیق اُن کی زندگی کا دلچسپ موضوع تھا، ارض القرآن، اور سیرۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ضخیم جلدیں، اُن کے اس مذاق کی شاہدِ عادل ہیں،

سید صاحبؒ کے ذہن میں عصری مذاق کے مطابق قرآن مجید کے مسائل کی ترتیب و تدوین کا ایک نقشہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اصول کی رعایت کرتے ہوئے، دیانت اور ذہن کی سلامتی کے ساتھ، آیاتِ قرآنی پر غور کیا جائے، اور ان آیات سے جن کلامی، فقہی، اخلاقی، اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی مسائل کا استنباط ہو سکے، ان کو احادیثِ نبویہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نیز صحابہؓ و تابعینؒ اور سلف صالحینؒ کی تشریحات کے ساتھ الگ الگ مرتب کیا جائے۔!

یہ تجویز بظاہر بہت مختصر معلوم ہوتی ہے، لیکن اگر اس کو عملی جامہ پہنایا جائے تو پورا ایک ادارہ اس کام میں لگ سکتا ہے، اسلامی علوم میں مفید ترین کتابوں کا اضافہ اور اسلامی نظریات کو سمجھنے کے لئے بہترین مواد جمع ہو سکتا ہے!

سید صاحبؒ نے عقائد القرآن اور فقہ القرآن کے نام سے اس سلسلہ میں دو عنوان قائم فرما کر کچھ کام بھی شروع کر دیا تھا، فقہ القرآن کے لئے راقم سطور سے قرآن مجید کی آیاتِ احکام کو جمع کرایا تھا، جو میرے پاس موجود ہیں،

دوسرے محققین کی طرح سید صاحبؒ کا خیال تھا کہ آیاتِ قرآنی کی حیثیت کلیات کی ہے، اور احادیثِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) انہی کلیات کی تشریح ہیں، اس سلسلہ میں سید صاحب کی رائے تھی کہ قرآن مجید نیز ذخیرۂ احادیث کا وقتِ نظر سے مطالعہ کیا جائے، اور ارشاداتِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو انہی کلیات کے ماتحت جمع کیا جائے، اس موضوع سے متعلق سید صاحبؒ نے اپنی یادداشت کی کاپی میں دو عنوانات قائم فرمائے تھے، پہلا عنوان یہ ہے:

"الآیات التی استدل بها النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی ما قاله"

اس عنوان کے تحت میں سید صاحبؒ نے ۱۰ استدلالاتِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جمع فرمایا تھا، مثال کے طور پر چند ملاحظہ ہوں،

(۱) فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادناکم ثم تلا انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء (ترمذی تفسیر)

(۲) فلما قضی الصلوٰۃ قال من نسی الصلوٰۃ فلیصلہا اذا ذکرہا فان اللہ تعالیٰ قال اقم الصلوٰۃ لذکری (ابوداؤد)

(۳) نہانا عن الاستخصاء ثم قرء علینا، یا ایہا الذین آمنوا لا تحرموا طیبات ما احل اللہ لکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین، (بخاری)

(۴) ان اللہ یملی الظالم ثم قرء وکذالک اخذ ربک اذا اخذ القری وھی ظالمۃ، (مسلم)

دوسرا عنوان یہ ہے،

القسم الثانی من الاحادیث التی تفسر القرآن بغیر ذکر القرآن،

اس عنوان کے تحت میں سید صاحب نے ۲۰ احادیث کو جمع فرمایا تھا، اسکی مثالیں ملاحظہ ہوں،

(۱) ایاکم والظن (مسلم) ان بعض الظن اثم،

(۲) انما ھی اعمالکم ترد علیکم ولا تجزون الا ما کنتم تعملون،

(۳) انفق ینفق علیک - وما انفقتم من شیٔ فھو یخلفہ

دوسرے علماء نے بھی اس عنوان سے دلچسپی ظاہر فرمائی ہے، مثلاً صاحب روح المعانی کا خیال ہے کہ دعا "اللّٰہم من احییتہ منا فاحیہ علی الاسلام ومن توفیتہ منا فتوفہ علی الایمان" کا ماخذ آیت ولا تموتن الا وانتم مسلمون ہے[1] اسی طرح حضرت مولانا انور شاہ صاحب فرماتے ہیں:

ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر الآیۃ، استنبط منہ حدیثہ صلی اللہ علیہ وسلم،

---

[1] روح المعانی ج ۴ ص ۱۶،

لاتزال طائفۃ من امتی ظاھرین علی الحق وحدیثہ صلی اللہ وسلم الجھاد ماض الی یوم القیامۃ؎

ان عنوانات کو پورا کرنا کچھ آسان کام نہین ہے لیکن اس مین شک نہین کہ یہ بڑی اہم اور مفید خدمت ہوگی، اور اگر اس موضوع پر کچھ کام کر ڈالا جائے، تو اپنے طرز کی نئی چیز ہوگی،

ان اہم اور بنیادی کامون کے سوا قرآن مجید کے سلسلہ مین سید صاحبؒ کے پیش نظر حسب ذیل کام بھی تھے، ان مین سے بعض سید صاحب کی نگرانی مین انجام پاچکے ہین، مگر ابھی ان کی طباعت کی نوبت نہین آئی ہے،

(۱) دار المصنفین کے کتب خانہ مین الفوز الکبیر کا ایک قلمی نسخہ ہے جس مین شاہ صاحبؒ کے حواشی قرآن مجید اور اصول ترجمۂ قرآن مجید کا رسالہ بھی ہے، سید صاحب کی خواہش تھی کہ اس کو شائع کیا جائے،

(۲) قرآن مجید مین کائنات کی مختلف چیزون کو بطور "آیات الٰہی" کے پیش کیا گیا ہے، سید صاحبؒ کا خیال تھا کہ ان تمام آیات کو الگ الگ عنوانات کے ماتحت جمع کیا جائے، اور جن چیزون کو بطور آیات کے پیش کیا گیا ہے، اُن کے متعلق قدیم وجدید ماخذ سے ایسے معلومات کو جمع کر دیا جائے جن سے ان آیات الٰہی کے آیت (یعنی) نشانی) ہونے کی حیثیت اور حقیقت واضح ہوجائے، سید صاحبؒ نے ان آیات کو عنوانات کے ماتحت جمع کرا لیا تھا، اُن کی تشریح کا کام باقی ہے،!

(۲) سید صاحب کا خیال تھا کہ معانی وبلاغت نیز دوسری کتابون مین مسائل کی تشریح کے ضمن مین قرآن مجید کے لطائف ادبیہ کو واضح کیا گیا ہے، اگر آیات متعلقہ کو عنوان بنا کر ان سب کو سورتون کی ترتیب کے ساتھ جمع کر دیا جائے، تو قرآن مجید پر ادبی حیثیت سے غور کرنے والون کے لئے ایک مفید خدمت ہوگی، بحمد للہ دو جلدون مین یہ کام پورا ہوا،

---

؎ مشکلات القرآن ص ۹۰،

(۴) قرآن مجید کے اعجاز کا مسئلہ قرآنی علوم مین جو اہمیت رکھتا ہے، وہ ظاہر ہے، ہر عہد مین مختلف نوعیتون سے اس پر کلام کیا گیا ہی، مسلمانون کے عہد تصنیف سے لیکر اس وقت تک اس موضوع پر جو کچھ بھی لکھا گیا ہی، اس کو سنین کی ترتیب کے اعتبار سے سید صاحب نے جمع کرایا، یہ مجموعہ ایک جلد مین تیار ہوا، اسکے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے اپنے زمانہ مین لوگون نے کن کن نوعیتون سے اس مسئلہ پر غور کیا ہی،

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کی الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، سید صاحب کی نگاہون مین بہت اہمیت رکھتی تھی، مگر اُن کے نزدیک اس کی حیثیت متن کی تھی، اس لئے وہ چاہتے تھے کہ اس کا تحشیہ کیا جائے، شاہ صاحب کے ارشادات کو آیاتِ قرآنی سے مدلل کیا جائے، نیز اُن کے بیانات کی دوسرے محققین کی کتابون سے توثیق کی جائے، اس سلسلہ مین بھی تھوڑا کام ہو چکا ہے،!

دار المصنفین کے زمانۂ قیام مین سید صاحبؒ نے مجھ سے اسلام کے نظام کاشتکاری، اور کتب فقہ سے زراعت و آب پاشی کے مسائل کو اُردو مین مرتب کرنے کے لئے فرمایا، مین نے کام شروع کر دیا، اسی زمانہ مین سید صاحب تھانہ بھون تشریف لے گئے، وہان مولانا تھانویؒ سے اس کا ذکر آیا، اور رائے یہ قرار پائی کہ شروع سے پورے سلسلۂ فقہ کو اردو مین مدون کر دیا جائے، تاکہ اردو دان طبقہ کے ہاتھ مین ایسا مجموعہ آجائے جو روز مرہ کی ضروریات مین اُن کے لئے کافی ہو، سید صاحبؒ نے تھانہ بھون سے تشریف لا کر اس تجویز کا ذکر فرمایا، اور ارشاد فرمایا کہ اب کتاب الطہارۃ سے کام کو شروع کرو، اس کی تعمیل شروع کر دی گئی، مگر اس کے بعد ہی دار العلوم ندوہ چلا آیا، اور سید صاحب قبلہ بحیثیت قاضی القضاۃ بھوپال تشریف لیگئے، وہان پہنچ کر سید صاحب کو اس سلسلہ کی تکمیل کی اور ضرورت محسوس ہوئی، اور بار بار خطوط مین اس سلسلہ کی تکمیل کی تاکید فرماتے رہے، مین نے کتاب الطہارۃ کو ایک جلد مین مکمل کر کے بھوپال ارسالِ خدمت کیا، تو بھوپال کے بعض علما سے اس پر تقریظین لکھا کر واپس فرمایا، اور دوسری جلد کا کام شروع کرنے کی تاکید فرمائی مگر افسوس کہ پہلی جلد سے کام آگے نہ بڑھ سکا، سید صاحب کو اس سلسلہ کی تکمیل کا بیحد خیال تھا، وفات سے چند ماہ پیشتر جب ہندوستان تشریف لائے تو بار بار فرماتے

تھے کہ اس وقت نئے نئے مسائل سامنے آرہے ہیں، اور ایسے علماء کی ضرورت ہے جو ان مسائل کا تشفی بخش جواب دے سکیں، اس لئے فقہ کی تعلیم پر بہت توجہ کرنا چاہئے، دارالعلوم کے طلبہ کے سامنے جو تقریر فرمائی تھی اس میں بھی اس پر زور دیا تھا، بہر حال اردو میں فقہ اسلامی کی تدوین کی تجویز اہمیت رکھتی ہے، اور یہ کرنیکا کام ہے

ہندوستان کے گذشتہ اور موجودہ علماء کے حالات کے جمع و ترتیب کا کام بھی سید صاحب کے پیش نظر تھا، اسی خیال سے معارف میں وفیات کا عنوان قائم فرمایا تھا، ارشاد فرماتے تھے کہ آئندہ مورخ کو اس سے بڑی مدد ملے گی،!

نواب صدیق حسن خان صاحب مرحوم کے کتب خانہ میں ہندوستان کے گذشتہ علماء کے حالات پر کچھ قلمی مسودات فارسی زبان میں تھے، سید صاحبؒ ان مسودات کو دارالمصنفین لائے، ان کو صاف کرایا، مبیضہ کو اصل سے مطابقت کا کام میرے سپرد فرمایا، اسی زمانہ میں مجھ کو ملا جیونؒ امیٹھوی کی خودنوشت سوانح عمری کا ایک قلمی نسخہ ملا، گو اس کو خودنوشت کہنا آسان نہیں ہے، بہر حال میں نے سید صاحب کو دکھلایا، سید صاحبؒ نے اس کو بھی نقل کرایا، اور اسی مجموعہ میں شامل کرایا، ان کا خیال تھا کہ یہ مجموعہ شائع کر دیا جائے، میں نے برادرم مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی ناظم دارالمصنفین سے اس مجموعہ کے متعلق دریافت کیا تھا، مگر وہ فرماتے تھے کہ دارالمصنفین میں موجود نہیں ہے، خدا کرے یہ مجموعہ محفوظ ہو، اگر کبھی اس کی اشاعت کی نوبت آئی تو ایک تاریخی خدمت ہوگی،

سید صاحبؒ نے ایک بار میبذی پڑھاتے وقت ارشاد فرمایا تھا کہ مسلمان فلاسفہ نے طبعیات کے سلسلہ جن عملی تجربات کا ذکر کتابوں میں کیا ہے، اگر ان سب کو جمع کر دیا جائے، تو ان علماء کی اس سلسلہ کی خدمات پر روشنی پڑ سکتی ہے،!

اسی طرح منطق کے سلسلہ میں سید صاحبؒ کا خیال تھا، کہ مسلمانوں نے فن منطق میں جو اضافے کئے ہیں اسکے متعلق بھی مفصل طور سے لکھا جائے،!

آخر مین سید صاحب کی ایک خواہش کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جس کا تعلق خود اُن کی تصانیف سے ہے، اور جس سے ان کے تصنیفی احتیاط کا اندازہ ہوتا ہے، وہ خواہش یہ تھی کہ اُن کی تصانیف بالخصوص سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نظر ثانی کا کام کیا جائے، اپنے بعض شاگردون سے زبانی اور خطوط مین اس کا ذکر فرمایا، گو صرف عقیدۃً نہین بلکہ حقیقۃً سید صاحب کا قلم خود اس قدر محتاط تھا کہ اُن کی تصانیف پر خصوصی طور سے نظر ثانی کی ضرورت نہیں ہو، لیکن اُن کی یہ خواہش اُن کی عالی ظرفی، وسعت نظری، تلاش حق کی فکر، اور مسائل دینیہ مین انتہائی ورع و احتیاط کی کھلی ہوئی دلیل ہے، شاید عام طور سے لوگون کو نہ معلوم ہوگا، کہ دارالمصنفین مین جب سیرۃ کی کوئی جلد چھپتی تھی، تو پہلا اڈیشن بڑی تقطیع پر چھپتا تھا، اور اس کے دو ڈھائی سال کے بعد چھوٹی تقطیع والا اڈیشن چھپتا تھا، یہ تاخیر صرف سید صاحب کی احتیاط کی وجہ سے ہوتی تھی، وہ چاہتے تھے، کہ پہلا اڈیشن اصحاب علم اور اہل نظر کی نگاہون سے گذر جائے، اُن کی تنقید کا حال معلوم ہو جائے، تب دوسرا اڈیشن چھاپا جائے تاکہ اس نئے اڈیشن مین تصحیح وغیرہ کا موقع مل جائے، اللہ تعالیٰ عام مصنفین کو اسی فضل و کمال اور رسوخ علم کے ساتھ یہی احتیاط نصیب فرمائین، آمین،

# تحریک ندوۃ العلماء اور سید صاحب

از

جناب مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی رفیق دار المصنفین

اٹھارہویں اور انیسویں صدی کا جو زمانہ یورپ کی تاریخ کا سب سے زرین دور شمار ہوتا ہے وہی مسلمانوں کی تاریخ کا سب سے تاریک اور مظلم دور ہے، یورپ اس زمانہ میں اپنی ترقی کے نقطۂ عروج تک پہنچ رہا تھا، اور اسلامی ممالک زوال کے آخری نقطے تک گر کر موت کی ہچکیاں لے رہے تھے، دنیا کی سیاسی و تمدنی قیادت کی وہ باگ جو ایک ہزار برس سے اُن کے ہاتھوں میں تھی یورپ کے ہاتھوں میں جا رہی تھی، اور یہ موت کا سنبھالا لے کر یکے بعد دیگرے اپنی قیادت کی زندگی سے محروم ہو رہے تھے، یا محروم کئے جا رہے تھے، یورپ غالب ہو رہا تھا، اور یہ محکوم و مغلوب ہو رہے تھے،

مسلمانوں کا یہ زوال کوئی اتفاقی واقعہ نہیں تھا، جو اچانک پیش آ گیا ہو، بلکہ اپنے پیچھے اسباب زوال کی ایک لمبی تاریخ رکھتا ہے، اسی طرح یورپ کا یہ غلبہ اور عروج محض کوئی ہنگامی سیاسی تغلب نہیں تھا، جو یکایک اُسے حاصل ہو گیا ہو، بلکہ اس کے جلو میں ایک جدید تمدن، ایک جدید فلسفہ، علم و فن، ایجاد و اختراع کی ہمہ گیر قوت اور سیرت و کردار کی ایک نئی طاقت تھی، جو اُس نے برسوں کی محنت اور جانفشانی کے بعد فراہم کی تھی، یہی وجہ ہے کہ اس کے اثرات جہاں پڑے، وہاں اُس کو محض سیاسی و معاشی غلبہ ہی حاصل نہیں ہوا، بلکہ ان سے وہاں کی تہذیب و تمدن، علم و فن اور فکر و عمل کے تمام گوشے متاثر ہوئے، یورپ کے

اس غلبہ کا اثر یون تو ساری دنیا پر پڑا، مگر اس کا شکار سب سے زیادہ اسلامی ممالک ہوئے، ہندوستان مین اہل یورپ کے معاشی اور کہین کہین سیاسی اثرات تو اٹھاروین صدی کے آخر سے پڑنا شروع ہو گئے تھے، تاہم ابھی تک یہان ایک برائے نام مرکزی حکومت باقی تھی، جو عام ہندوستانیون اور خاص طور سے مسلمانون کی امیدون کا آخری سہارا تھی، لیکن جب ۱۸۵۷ء مین انگریزون نے اس پر بھی قبضہ کر لیا، اور یہ آخری سہارا بھی جاتا رہا تو یہان کے عام باشندون مین شکست خوردگی اور انتشار ذہنی کی عجیب کیفیت پیدا ہوئی،

**تحریک ندوۃ العلماء کا پس منظر** مسلمانون پر اس نئی صورت حال کا رد عمل دو طرح سے ہوا، ایک گروہ نئے انقلاب کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنے مین لگ گیا، اور دوسرا گروہ اپنے اسلاف کے چھوڑے ہوئے سرمایہ کی حفاظت مین مشغول ہو گیا،

پہلے گروہ کا نقطۂ نظر زندگی کے ہر شعبہ مین سراسر نقل و تقلید تھا، اس لئے اس سے جو لوگ متاثر ہوئے وہ آہستہ آہستہ سیاست، معیشت، تہذیب، تمدن، معاشرت، اخلاق حتیٰ کہ دین و مذہب کے بارے مین بھی اُن کا وہی نظریہ بن گیا، جو حکمران قوم کا تھا، اس سے کچھ نہ کچھ مادی فوائد ضرور حاصل ہوئے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ اس طرز عمل کی بدولت ہمارا تصور دین بدلا، تصور اخلاق بدلا، فلسفۂ زندگی بدلا، اور ہماری تہذیب کی بنیادین متزلزل ہو گئین،"

دوسرے گروہ کا رد عمل اس کے بالکل برعکس ہوا، پہلا گروہ اگر "آنے والے سیلاب مین بہ نکلا، تو دوسرا گروہ جمود کی چٹان بن کر بیٹھ گیا، اس نے کوشش کی کہ علم و مذہب اور اخلاق و معاشرت اور روایات کی اس پوری میراث کو جو اٹھارہوین صدی کے لوگون نے چھوڑی، اور انیسوین صدی کے لوگون نے پائی تھی جون کا تون باقی رکھا جائے، اور نئی فاتح قوم کا نہ کوئی اثر قبول کیا جائے، اور نہ اس کے سمجھنے مین اپنا وقت ضائع کیا جائے،" انھون نے ایک لمحہ کے لئے بھی اس پر غور نہین کیا، کہ اگلون کی میراث کا تجزیہ کرکے دیکھین کہ اس مین کیا چیز باقی رکھنے کے اور کیا بدلنے کے لائق ہے اور نہ اس کی جانب توجہ کی کہ جدید تہذیب سے کیا لینے کے

قابل ہے، اور کیا چھوڑنے کے قابل ہے، اس کے بجائے انھون نے اپنا سارا زور پہلی حالت کے باقی رکھنے پر صرف کیا، ان کا نصاب، وطریقۂ تعلیم، اُن کے مشاغل، اُن کے مسائل، اُن کا اندازِ فکر اور طریق کار سب کا وہی تھا جو ایک صدی پہلے تھا، الا ماشاء اللہ،

اس کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ہمارے بزرگون نے دین واخلاق کی جو میراث چھوڑی تھی، کچھ لوگ اس کو سنبھال کر بیٹھ گئے، اور آیندہ نسلون کو منتقل کرنے لگے، اور آج قرآن وسنت کا جو علم ہمارے پاس باقی رہ گیا ہے وہ ان ہی کی بدولت رہ گیا ہے، مگر اس گروہ کے طرز عمل سے کچھ نقصانات بھی ہوئے،

انیسوین صدی کے آخر مین قریب قریب پورے ہندوستان مین یہی صورتِ حال رونما تھی، کہ ایک طرف جدید گروہ تھا جس مین ایک ولولہ اور جوش تھا، اور جس کا اثر ورسوخ دن بدن بڑھتا جا رہا تھا، دوسری طرف ہمارا قدیم گروہ تھا، جو اپنی موجودہ حالت پر بڑی حد تک قانع تھا، اور جس کا حلقۂ اثر روز بروز گھٹتا اور سمٹتا جا رہا تھا ان دونون گروہون کے نسکر دعمل کے اس اختلاف اور اس مین افراط وتفریط کی وجہ سے اُن مین اجنبیت وبے گانگی کی ایک ایسی خلیج حائل ہو گئی، کہ دونون کا ایک جگہ جمع ہونا اور دونون سے بیک وقت تعلق قائم رکھنا بھی دشوار ہو گیا تھا، نہ مذہبی طبقہ نے یہ ضرورت محسوس کی کہ جدید تعلیم کے فوائد سے بہرہ مند ہونا چاہیے، بلکہ وہ اس کو الحاد وزندقہ قرار دے رہا تھا، اور نہ جدید تعلیم یافتہ گروہ نے اس بات کی کمی محسوس کی، کہ علم دین حاصل کرنے کے لئے اہلِ دین کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے، بلکہ وہ اس کو قدامت پرستی، اور تنگ نظری سمجھتا تھا،

قدیم وجدید کی اس کشمکش کے علاوہ خود مذہبی گروہ بھی آپس مین متفق ومتحد نہین تھے، بلکہ وہ مختلف جماعتون مین بٹے ہوئے تھے، اور ہر جماعت دوسری جماعت کو گمراہ سمجھتی تھی، اُن کا آپس مین ایک جگہ جمع ہونا، اور ایک دوسرے کے پیچھے چلنا ناممکن ہو گیا تھا، یہان تک کہ کتنی جگہ انھون نے خانۂ خدا کو بھی تقسیم کر لیا تھا، جن کے اثرات کہین کہین اب بھی باقی ہین، اس صورتِ حال کی وجہ سے مسلمان قدیم وجدید کی تفریق کے ساتھ دوسری

بہت سی تقسیمون اور تفرقون کا شکار ہو رہی تھی،

مگر اس اختلاف و پراگندگی کے دور مین بھی قوم مین بعض ایسے عاقبت اندیش اور اعتدال پسند افراد موجود تھے جو اس اختلاف کو قومی و دینی حیثیت سے سخت مضر سمجھتے تھے، اُنکے خیال مین مسلمانون کے لئے نہ تو جدید طبقہ کی مرعوبانہ اور خالص ترقی پسندانہ ذہنیت بالکلیہ مفید تھی، اور نہ قدیم گروہ کا جمود و تعطل، تعصب و تحزب، اور جدید تعلیم سے گریز سود مند تھا، مگر ان طبقون مین اختلاف کی خلیج اتنی وسیع ہو چکی تھی، کہ اس کا پاٹنا اور ان کو کسی ایک مقصد پر متحد کرنا آسان نہین تھا، اس لئے پہلے انھون نے ایسے تمام لوگون کو جو موجودہ صورت حال کو بدلنے اور اس کی اصلاح کا جذبہ رکھتے تھے، ایک مرکز پر جمع کرنے کی کوشش کی، تاکہ انہی کے ذریعہ موجودہ فضا کو بدلنے اور قدیم و جدید اور مذہبی گروہی عصبیت کو مٹانے کا کام انجام دیا جائے، اسی اعتدال پسندانہ اور جامع تخیل کی صورت گری ۱۸۹۲ء مین کانپور مین مجلس ندوۃ العلماء کی شکل مین ہوئی،

اس مجلس نے جب اس تخیل اور مقاصد کو مسلمانون کے سامنے پیش کیا تو ابتدا مین بعض جماعتون خصوصاً قدیم مذہبی طبقہ کی طرف سے اس کی شدید مخالفت ہوئی، مگر اس کے باوجود قوم کے عاقبت اندیش، درد مند اور اعتدال پسندانہ عناصر خواہ ان کا تعلق کسی گروہ اور کسی فرقہ سے رہا ہو، اس آواز پر کھنچ آئے، اور دو برس کے بعد یعنی ۱۸۹۴ء مین یہ منظر دیکھنے مین آیا، کہ مختلف الخیال اور متضاد عناصر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر دین و ملت کے تحفظ کی تدبیرین سوچنے لگے، اور اجنبی حکومت کی وجہ سے جو نئی صورت حال اور مشکلین پیدا ہو گئی تھین، ان کے حل کرنے کے منصوبے بنائے،

**دار العلوم ندوۃ العلماء**

اس مجلس نے اپنے وسیع اور ہمہ گیر تخیل کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جو تدبیرین اختیار کین، ان مین ایک یہ بھی تھی کہ ایک ایسی درسگاہ کھولی جائے جس کا طریقۂ تعلیم اور نصاب تعلیم قدیم و جدید کی خامیون سے پاک اور ان کی خوبیون کا جامع ہو، تاکہ اس سے جو افراد تعلیم پاکر نکلین، وہ قوم کے اندر اس جامع تخیل کا احساس پیدا کر سکین جس کی اس وقت ضرورت تھی، اور جس کے لئے مجلس ندوۃ العلماء کا قیام عمل مین آیا ہے، چنانچہ

ندوۃ العلماء

اسی تجویز کے تحت لکھنؤ میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے نام سے ایک درس گاہ کا قیام عمل میں آیا، اسی جامع تخیل درسگاہ کے گوہر شب چراغ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ تھے،

اس وقت مجلس ندوۃ العلماء کا مظہر محض ایک عربی درسگاہ رہ گئی ہے، مگر جس زمانہ میں یہ مجلس قائم ہوئی تھی اسوقت مستقلاً ایک نئی تحریک دعوت اور قدیم وجدید کی جامعیت کا ایک نشان تھی، اس کے پلیٹ فارم سے دین وملت کے بیسیوں مسئلے طے ہوئے تھے،

درس گاہ کے قیام کے بعد بھی بہت دنوں تک یہ مجلس اپنی اصلی ہیئت میں باقی رہی، مگر آہستہ آہستہ اس کی تحریکی حیثیت ختم ہوتی گئی، اور اس کے ارباب بست وکشاد کی ساری توجہ اس درس گاہ تک محدود ہو کر رہ گئی، اس میں شک نہیں کہ اس درس گاہ نے تحریک کی جامعیت اور اس کی ہمہ گیری کو کسی نہ کسی حد تک باقی رکھا، اور اس کے تخیل کو عملی جامہ پہنایا، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ درس گاہ درس گاہ ہوتی ہے، اور تحریک تحریک، درس گاہ کا اثر محدود ہوتا ہے، اور تحریک کا اثر ہمہ گیر اور وسیع ہوتا ہے لیکن پھر بھی اس درس گاہ کے نونہالوں نے مسلم قوم کے ہر طبقہ کے فکر وعمل میں جو انقلاب، جو حرکت اور جو اعتدال وتوازن پیدا کیا، اسکو بھلایا نہیں جا سکتا،

آج ہم جس شخصیت کا ذکر کر رہے ہیں، وہ اسی مادرِ علمی کا پروردہ اور اسی دانشکدۂ علم وفن کا گل سر سبد تھا، اور یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر دار العلوم ندوۃ العلماء کی آغوش سے محض ایک سید سلیمان ندوی ہی کی شخصیت پیدا ہوئی تھی، تو بھی ہم اس تحریک کو ناکامیاب نہیں کہہ سکتے تھے، مگر اُس نے تو ملک کے اندر اور ملک سے باہر اتنے نشانات چھوڑے ہیں کہ اُن کے ذریعہ دین وملت کے کتنے راہ رو منزل مقصود کا پتہ پارہے ہیں،

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تقریباً نصف صدی تک ندوہ کی جامعیت، ہمہ گیری اور اعتدال پسندی کو نہ محض زندہ رکھا، بلکہ اس میں اور وسعت دی، قدیم وجدید کی تفریق اور علماء کی گروہی عصبیت کو مٹانے اور ان کو باہم شیر وشکر کرنے میں پورے اخلاص کے ساتھ حصہ لیا، اور اس میں سب سے زیادہ کامیاب ہوئے خود اسلام اور اسلامی تمدن وتاریخ پر جو داخلی اور خارجی حملے کئے جا رہے تھے، ان کی روک تھام کیلئے ندوہ نے جو

داخلی اور خارجی حملے کئے جا رہے تھے، اُن کی روک تھام کے لئے ندوہ نے جو پروگرام بنایا تھا، اسے سید صاحب نے ایجابی و سلبی دونون حیثیتون سے پورا کیا یعنی انھون نے ان حملون کا جواب بھی دیا، اور اسلامی مسائل کی ایسی صحیح اور دلنشین تشریح کی کہ حملہ کرنے والون کی ہمتین چھوٹ گئین، اور کتنے تائب ہو کر اسلام کے گرویدہ ہو گئے،

سید صاحب کی شخصیت ملک و قوم کے مختلف الخیال عناصر کا ایک سنگم تھی، جہان مختلف دھارے آکر مل جاتے تھے، اُن کی ذات پر ہر حلقے، ہر طبقے اور ہر گروہ کو اعتماد تھا، ندوہ کی سالانہ مجلس جب تک ہوتی رہی اس مین ہر مکتب خیال کے لوگ اکٹھا ہوتے رہے، مگر اس مجلس کے برہم ہونے کے بعد علماء مین صرف ایک سید صاحب ہی کی ذات تھی جہان یہ عناصر جمع ہو سکتے، ہر طبقہ کے لوگ ان پر یکسان اعتماد کرتے، اور اُن کو اپنی مشترک علمی دینی اور سیاسی مجلسون کا صدر نشین بناتے تھے،

تحریک ندوۃ العلماء کے پیش نظر جو مقاصد تھے، مختصراً ان کا تذکرہ کرنے کے بعد اُن کی روشنی مین سید صاحب کے کارنامون کی تفصیل کی جائے گی،

ان مقاصد کی تفصیل علامہ شبلی کی زبان سے سنیئے جنھون نے ندوہ کے قالب مین نئی روح پیدا کی،

جب دارالعلوم ندوۃ العلماء کی نئی عمارت بننی شروع ہوئی، اور اس کی دیوارین کچھ بلند ہو گئین تو علامہ شبلی پر اپنے لگائے ہوئے پودے کو پھولتا پھلتا دیکھ کر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی، اور ایک دن تمام طلبہ کو لے کر عمارت کے پاس گئے، جو کمرہ تفسیر قرآن کے لئے تعمیر ہو رہا تھا، وہان سے مزدورون کو ہٹا دیا، اور طلبہ کے ساتھ اپنے ہاتھون سے کچھ دیر اینٹین، گارا اور چونا ڈھوتے رہے، اسکے بعد طلبہ کو جمع کر کے ایک تقریر کی جس کے آخر مین انھون نے بڑے الحاح و زاری کے ساتھ یہ دعا کی،

"اے خدا یہ چند ناتوان، کم حیثیت، کم مایہ بچے تیرے گھر مین مزدوری کرنے آئے ہین، اُن کی مزدوری قبول کر، مغربی خیالات کا سیلاب مسلمانون کو اپنی رو مین بہائے جاتا ہے، جن کے ساتھ اُن کی مذہبی حالت، مذہبی علوم، مذہبی شعائر، سب اس طوفان کی زد مین ہین، اے خدا! ان

چند ناتوان بچوں کا دعویٰ ہے کہ وہ اس سیلاب کی ٹکر کو سنبھالیں گے، یہ بہت بڑا دعویٰ ہے جوان کے چہرہ پر نہیں کھلتا تو یہی ہے جو اُن کی آبرو رہ جائے"

علامہ شبلی جن ناتوان بچوں کو لے کر مزدوری کے لئے گئے تھے، اور جن کے لئے انھوں نے خدا کی بارگاہ میں یہ دعا مانگی تھی کہ ان کو مغربی سیلاب کے مقابلہ کے لائق بنا، ان میں ایک سید سلیمان ندوی بھی تھے،

یہ پُردرد اور پُرسوز دعا اس کمرے کے پاس مانگی گئی تھی، جو کلام الٰہی کی تفسیر کے لئے تعمیر ہو رہا تھا، جو اس بات کی علامت تھی کہ مغربی سیلاب کے روکنے کے لئے نونہالان قوم جو بھی کوشش کریں گے، اس کی بنیاد کتاب اللہ پر ہوگی، چنانچہ سید صاحب نے اپنی تمام علمی سرگرمیوں میں اس کو پیش نظر رکھا،

اوپر ذکر آچکا ہے کہ ندوہ نے نہ تو جدید گروہ کی راہ عمل اختیار کی تھی، اور نہ قدیم گروہ کی، اس لئے شروع میں اس کی شدید مخالفت ہوئی، علامہ شبلی نے اس کے جواب میں بہت سے مضامین لکھے، اور اپنا نقطۂ نظر نہایت سنجیدگی سے سمجھایا، ۱۹۰۵ء میں الندوہ میں ندوہ کی تعلیمی پالیسی پر ایک مضمون لکھا جس کے آخر میں لکھتے ہیں:

"ہم نے بار بار کہا ہے، اور پھر یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے لئے نہ صرف انگریزی مدرسوں کی تعلیم کافی ہے، نہ قدیم عربی مدرسوں کی، ہمارے درد کا علاج ایک معجون مرکب ہے، جس کا ایک جزء مشرقی اور دوسرا مغربی ہو"

جب ندوہ کی چند سالہ کوششوں سے اس کے نتائج نگاہ کے سامنے آئے تو علماء کو جدید تعلیم کی ضرورت کا کسی قدر احساس ہوگیا، مگر جدید حلقہ میں دینی تعلیم کی ضرورت کا احساس ابھی پیدا نہیں ہو سکا تھا، علامہ شبلی نے اس کے لئے ایک طویل مضمون لکھا، جس میں حسب ذیل سوالات قائم کئے، اور پھر خود ہی اُن کے جوابات دیئے:

(۱) جدید تعلیم کی ضرورت ہے یا نہیں؟ (۲) قدیم تعلیم کی ضرورت ہے یا نہیں؟

پہلے سوال کے جواب میں اب اختلاف نہیں رہا، اگر کسی کو ہو تو اس سے خطاب کرنے کی ضرورت نہیں،

دوسرے سوال کا جواب جدید گروہ کے ذہن مین دفعۃً نفی کی صورت مین آئے گا، لیکن ذرا غور سے کام لینا چاہئے، اور پہلے ان سوالات کا جواب دینا چاہئے،

(۱) کیا مسلمانون کی قومیت مذہب کے سوا اور کچھ ہے؟

(۲) اگر نہین ہے تو مذہب کے قیام کے بغیر اُن کی قومیت کیونکر قائم رہے گی؟

(۳) اگر مذہب کی ضرورت ہی، تو مذہبی تعلیم قدیم تعلیم کے بغیر کیونکر قائم رہے گی؟

شاید یہ کہا جائے کہ انگریزی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم بقدر ضرورت ممکن ہے، اور اسی قدر کافی ہے لیکن کیا صرف اسی قدر تعلیم سے قرآن و حدیث کی حفاظت ہو سکتی ہے؟ کیا اس درجہ کے تعلیم یافتہ اسلامی مشکل مسائل کی تشریح کر سکتے ہین، کیا غیر مذہب والے مذہب اسلام.................. جو اعتراضات کرتے ہین، انکے مقابلہ کے لئے اتنی تعلیم کافی ہے،؟

اس کے بعد قدیم و جدید دونون طریقۂ تعلیم پر تنقید کرکے آخر مین لکھتے ہین،

"دونون گروہ اب قوم کے ضروری اجزا ہین.... دونون کو آپس مین دست و بازو ہوکر کام کرنا چاہئے،

"علما کے جس گروہ نے جدید ضرورتون کا اندازہ کیا ہے، اور اس کے موافق عربی تعلیم مین اصلاح و اضافہ چاہتے ہین، وہ ان اصولون کے سوا اور کیا اختیار کر سکتے ہین، جو ندوہ نے اختیار کیا ہے (مقالات شبلی ج ۳)

یہ تفصیلات اس لئے پیش کی گئی ہین، تاکہ اندازہ ہو جائے کہ ندوۃ العلماء محض ایک درس گاہ کا نام نہین ہی، بلکہ وہ ایک جامع تخیل تحریک تھی، جس کے پیش نظر حسب ذیل مقاصد تھے،

(۱) مغربی افکار و خیالات اور تہذیب و تمدن کا سیلاب جو مسلمانون کو اپنی رو مین بہائے لیے جاتا تھا، اس کا مقابلہ کیا جائے.

(۲) قرآن وسنت کی حفاظت، اور اُن سے براہ راست تعلق پیدا کرانے کی کوشش کیجائے یعنی اُن کی تعلیمات کو ایسے موثر انداز سے پیش کیا جائے کہ لوگ ان کا زیادہ سے زیادہ اخلاقی اثر لین، اور اُن کو عملاً اپنی زندگی مین نافذ کرین،

(۳) قدیم وجدید دونون طریقۂ تعلیم کی اصلاح کی جائے، اور اس کا عملی تجربہ دارالعلوم ندوۃ العلماء مین کیا جائے، تاکہ قوم مین ایسے تعلیم یافتہ افراد پیدا ہون جو قوم کی صحیح راہ نمائی کرسکین،

(۴) قدیم وجدید طبقون کی اجنبیت اور علماء کی گروہی عصبیت کو مٹا کر ان کے اندر اعتدال پیدا کیا جائے

سید صاحب کی زندگی اور ان کے کارنامون پر اگر ایک سرسری نظر بھی ڈال لی جائے تو یہ اندازہ ہو جائیگا کہ وہ ان مقاصد کا عملی پیکر تھے، انھون نے زندگی کے ہر کام اور ہر موقع پر ان مقاصد کو پیش نظر رکھا، وہ سیاست کی ہنگامہ آرائیون مین ہون، یا علم وفن کے گوشۂ تنہائی مین، ندوۃ العلماء کے پرسکون اجلاس مین ہون، یا جمعیۃ العلماء کے پرشور جلسون مین، فاضلانِ دیوبند کے حلقہ مین ہون یا ندویون کی برادری مین، قدیم گروہ کے حجرون مین ہون یا جدید طبقہ کے عشرت کدون مین وہ ندوہ اور اس کے مقاصد کو کبھی نہین بھولتے تھے،

ندوہ کے مذکورہ مقاصد کی افادیت کو آج ہر طبقہ اور ہر گروہ نے محسوس کر لیا ہے، اور اسی کے مطابق اپنے انداز فکر اور طرز عمل مین کچھ نہ کچھ تبدیلیان بھی کرلی ہین، مگر نصف صدی پہلے اس کی شدید مخالفت کی گئی تھی اس مخالفت کے نتیجہ مین علامہ شبلی نے ندوہ کی معتمدی سے علٰحدگی اختیار کرلی، سید صاحب کو بھی ان مخالفتون کا سامنا کرنا پڑا، مگر ان کی جامع اور بحر بیکران شخصیت مین یہ ساری مخالفتین چھوٹے چھوٹے گندے نالون کی طرح گرین اور بہ گئین،

یون تو ندوہ کے پورے حلقہ نے اس کے مقاصد کو پورا کرنے مین کچھ نہ کچھ حصہ لیا، مگر سید صاحب نے ان مین سب سے زیادہ کامیابی حاصل کی، اور ان کی کوششین سب سے زیادہ نتیجہ خیز ہوئین،

درسگاہ کے قیام کے بعد ندوہ کے مقاصد کا عملی نمونہ پیش کرنے کے لئے دوسرا قدم یہ اٹھایا گیا کہ

الندوہ جاری کیا گیا، اس رسالہ نے مسلمانوں کے فکر و نظر پر جو اثر ڈالا، اس کا کچھ حال سید صاحب ہی کی زبان قلم سے سنئے،

"اس پرچہ میں علوم اسلامیہ کی تجدید، عقل و نقل کی تطبیق، معقول و منقول اور قدیم و جدید علوم کے موازنہ اور عربی نصاب تعلیم کی اصلاح پر بہت سے محققانہ مضامین شائع ہوئے، اس رسالہ نے سیکڑوں برس بعد علماء کی سطح جامد میں حرکت پیدا کی، اب تک علماء کے تحقیقاتی مسائل منطق، عقائد اور فقہ کے چند مسائل قرار پائے تھے، جن پر گو بہت کچھ لکھا جا چکا تھا، پھر بھی جو آتا تھا، وہ انہی کو دہرا دہرا کر اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرتا تھا، حالانکہ زمانہ کا رُخ اُدھر اُدھر پھر چکا تھا، اور حالات نے اسلام اور علوم اسلامیہ کی خدمت کیلئے کچھ اور ہی ضروریات پیدا کر دیئے تھے، الندوہ کا یہ بڑا فیض ہے، کہ اُس نے علماء کرام کے خیالات میں انقلاب پیدا کیا، اور ان کو کتنی ہی ناگواری ہوئی ہو اور انکی پیشانی پر کتنے ہی بل پڑ گئے ہوں، لیکن انھوں نے اُس کو پڑھا اور پڑھنے پر مجبور ہوئے،

اس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ علماء کے سامنے جدید مباحث کا دروازہ کھلا، اسلام اور علوم اسلام کی خدمت کے نئے طریقے ان کو نظر آئے، زبان و بیان کے انداز و پیرایۂ بیان معلوم ہوئے، الندوہ کا اثر خصوصیت سے نوجوان علماء[1] اور قریب فارغ التحصیل طلبہ پر پڑا، نام نہیں لئے جاسکتے مگر بتا سکتا ہوں کہ بڑے بڑے مقدس آستانوں اور درسگاہوں کے حاشیہ نشینوں نے اس کے طرز نگارش اور پیرایۂ بیان کی نقل اُتاری اور اپنے اپنے دائرہ میں ناموری حاصل کی، اور ان سے دین و ملت کو فائدہ پہنچا، خود دار العلوم ندوہ کے طالب علموں کو اس سے بہت فائدہ پہنچا، اور کئی مستند طالب علموں کی (جو اس وقت مشہور مصنف ہیں) بسم اللہ اسی دبستان سے ہوئی"

---

[1] خاص طور سے مولانا ابو الکلام قابل ذکر ہیں جن کی علمی تحریروں کا آغاز الندوہ سے ہوا،

خود سید صاحب نے ندوہ کے مقاصد کے پیش نظر دینی اور تحقیقی کام انجام دیئے، اس کی ابتدا الندوہ ہی سے ہوئی ابھی سید صاحب نے اس میں دوسرا یا تیسرا ہی مضمون لکھا تھا کہ مولانا حالی پڑھ کر باغ باغ ہو گئے، اور علامہ شبلی کو ان الفاظ میں مبارکباد دی،

"سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ دارالعلوم نے اپنی تعلیم کا نہایت ہی عمدہ نمونہ پہلی ہی بار پیش کیا ہے، فبارک اللہ فیھا وفی طلبتھا وفی تعلیمھا، مجھے امید نہیں بلکہ یقین ہے کہ عربی کی کامل تعلیم اور انگریزی کی بقدر ضرورت ہماری قوم میں ایسے لائق مضمون نگار، اور مصنف پیدا کرے گی کہ محض انگریزی تعلیم آج ویسا ایک بھی نہ پیدا کر سکی"[1]

سید صاحب کی اسی صلاحیت کی بنا پر ان کی طالب علمی ہی کے آخری زمانہ میں اُن کو الندوہ کی نیابت سپرد کر دی گئی، جس کو انھوں نے بدفعات تقریباً چار سال انجام دیا، سید صاحب نے اس مدت میں بہت سے ایسے مضامین لکھے جس کے ذریعہ مغربی خیالات اور مادی تصورِ حیات کی سطحیت اور ناپائداری ثابت کی، اور اس کے مقابلہ میں اسلامی احکام کی فوقیت اور اسکی پائداری دکھائی مثلاً"

مذہب اسلام اور علم و عقل، القرآن والفلسفۃ الجدیدہ، فنائے مادہ، اسلام پر ایک جرمن کا لکچر، مکررات القرآن، ایمان بالغیب، اسماء القرآن وغیرہ،

**ایک اہم مضمون** | اس وقت اردو زبان میں اشتراکیت اور اسلام کے معاشی نظام پر بیشمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں، مگر اس زمانہ میں یہ موضوع بالکل نیا تھا اور اردو میں غالباً سب سے پہلے سید صاحب ہی نے اس پر قلم اٹھایا، اور الندوہ میں کئی قسطوں میں اشتراکیت اور اسلام کے عنوان سے ایک محققانہ مضمون لکھا جس میں اشتراکیت پر سخت تنقید کی، اور اس کے مقابلہ میں اسلام کے معاشی نظام کی خوبی دکھائی، تعلیم سے فراغت کے بعد سید صاحب ندوہ ہی میں استاذ ادب مقرر ہو گئے جس کی وجہ سے تعلیمی حیثیت سے بھی اُن کو ندوہ کی خدمت کا موقع ملا،

---

[1] الندوہ ربیع الآخر ۱۳۲۳ھ

اسی زمانہ مین علامہ شبلی نے ندوہ کی معتمدی سے علیحدگی اختیار کرلی، اور وہ مجلس برہم ہوگئی، جو ندوہ کے مقاصد کی تکمیل کے لئے علامہ شبلی نے کئی برس کی جانکاہ محنت کے بعد بنائی تھی، ان کی علیحدگی تحریک ندوہ کے لئے بڑا حادثہ ثابت ہوئی، اور اس مین ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا جس کا اثر برسون رہا، اور وہ خلا اس وقت پر ہوا جب ۱۹۲۳ء مین سید سلیمان ندوی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم بنائے گئے، اس علیحدگی کا سبب ندوہ کے تعلیمی مقاصد مین مولانا شبلی، اور مدرسین و کارکنان ندوہ مین نقطہ نظر کا اختلاف تھا، مدرسین اور کارکنون کی اکثریت ندوہ کو اسی پرانے ڈھرے پر لیجانا چاہتی تھی، جس کی اصلاح کے لئے ندوہ کا قیام عمل مین آیا تھا، اور علامہ شبلی ندوہ کو ان اصلاحات کا نمونہ بنانا چاہتے تھے، جن کے لئے یہ درسگاہ قائم کی گئی تھی، غرض اسی کشمکش کے نتیجہ مین علامہ شبلی کو الگ ہوجانا پڑا، اس طرح وہ بزم علم و دین جس کی شیرازہ بندی انھون نے برسون کی محنت کے بعد کی تھی، منتشر ہوگئی، خود سید صاحب بھی ندوہ سے علیحدہ ہوگئے، گو اب استاذ اور شاگرد دونون کا ندوہ سے کوئی قانونی تعلق باقی نہین رہا تھا، مگر اس کے مقاصد کی تکمیل کا جذبہ جو ان کی زندگی کا اب مشن بن چکا تھا، باقی رہا،

اسی زمانہ مین ہندوستانی مسلمانون کی سیاسی زندگی مین ایک نیا شور طرابلس پر اٹلی کے حملہ سے برپا ہوا، جس سے ہر صاحب احساس کا دل بے چین ہوگیا، مولانا ابوالکلام نے جو ہندوستان مین اس کے سب سے بڑے وکیل تھے الہلال کے ذریعہ سے ایک دینی و قومی مسئلہ بنا دیا، اور مسلمانون کے دلون مین مغرب کے خلاف ایک نیا جوش و جذبہ پیدا کردیا، علامہ شبلی نے بھی زبان و قلم سے اس مین پورا حصہ لیا اور مولانا ابوالکلام کی درخواست پر سید صاحب کو الہلال کی معاونت کے لئے بھیجا، اس طرح مغربی سیلاب کے مقابلہ کا جو کام سید صاحب اب تک الندوہ کے پرسکون علمی گوشہ مین بیٹھکر کر رہے تھے، اب وہ کام سیاسی میدان مین آکر الہلال کے شعلہ بار مضامین کے ذریعہ انجام دینے لگے، الہلال کے زمانۂ ادارت مین انھون نے بہت سے معرکۃ الآراء مضامین لکھے، اور مسلمانون مین انگریزون کے خلاف جو جذبہ مولانا ابوالکلام کے الہلال نے پیدا کیا تھا، اس مین سید صاحب کے زور قلم کو بھی بڑا دخل تھا، خصوصیت سے ان کا مضمون مشہد اکبر، الحربۃ فی الاسلام تو اس وقت بچے بچے کی زبان پر تھا،

جب ہندوستان کی سیاست مین ذرا سکون پیدا ہوا، تو سید صاحب پھر لکھنؤ واپس چلے آئے، اور اساتذہ کے مشورے سے پونا چلے گئے،

پونا ہی کے زمانۂ قیام مین ارض القرآن جیسے اہم موضوع پر قلم اٹھایا، ارض القرآن کا موضوع جغرافیۂ قرآن ہے، اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ تو اس کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، مگر اس وقت اس کے بارے مین چند باتین جو ہمارے موضوع سے متعلق ہین، عرض کی جاتی ہین،

آج سے پچاس برس پہلے خالص جغرافیۂ قرآن پر اردو کیا عربی زبان مین بھی کوئی جامع اور مکمل کتاب موجود نہین تھی، قدیم عربی تاریخون مین متفرق طور سے اس پر بحثین ضرور ملتی ہین، مگر عربی مورخین کو قدیم یونانی اور رومی تاریخون اور اثری انکشافات سے فائدہ اٹھانے کا موقع کم ملتا تھا، اس لئے جب یہ کتابین اُن کے سامنے آئین، اور عرب و شام عراق وغیرہ مین اثری انکشافات ہوے تو ان کی روشنی مین یورپین مورخین نے قرآن مین مذکورہ مقامات اور اُن کی قومون کے بارے مین شکوک و شبہات پیدا کرنے کی کوشش کی، سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب مین مغربی مصنفین کے تمام جدید ذرائع معلومات اور قدیم ماخذ کو سامنے رکھ کر پورے قرآن کا جغرافیہ لکھا، مغربی مصنفین کی تاریخی تحقیقون اور قیاس آرائیون کی کمزوری دکھائی، اور قرآن پر کئے گئے ایک ایک اعتراض کا پردہ فاش اور اس کا مکمل جواب دیا، اس سلسلہ مین انھون نے عربی مورخین کی بھی بعض تاریخی غلطیون کی وضاحت کی،

غرض اس کتاب کے ذریعہ انھون نے قرآن کو ہدف طعن بننے سے بھی بچا لیا، اس لئے اُن کی یہ خدمت دینی حیثیت سے بھی بہت اہم ہے، اور علمی و تحقیقی حیثیت سے بھی،

**سیرت نبوی**

سیرت نبوی کی تالیف کا کام علامہ شبلی نے ندوہ ہی مین شروع کیا تھا، جس مین سید صاحب بھی شریک تھے، اس تالیف سے ان کا مقصد محض حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کی واقعات نگاری اور آپ کی کچھ اخلاقی تعلیمات کا تذکرہ نہین تھا، بلکہ اس کے متعدد مقاصد تھے جن مین ایک یہ بھی تھا، کہ یورپ کے

اسلام اور آپ کی حیاتِ مبارکہ کے بارے میں جو غلط فہمیاں پھیلائی تھیں، ان کو دور کیا جائے، اور آپ کی سیرت کا صحیح مرقع دنیا کے سامنے پیش کیا جائے، جلد اول کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :-

"اگلے زمانہ میں سیرت کی ضرورت صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کی حیثیت سے تھی، علم کلام سے اس کو واسطہ نہ تھا،

یورپ کے مورخین آنحضرت صلعم کی جو اخلاقی تصویر کھینچتے ہیں وہ نعوذ باللہ ہر قسم کے معائب کا مرقع ہوتی ہے، آج کل مسلمانوں کو جدید ضرورتوں نے عربی علوم سے بالکل محروم کر دیا ہے، اس لئے اس گروہ کو اگر کبھی پیغمبر اسلام کے حالات و سوانح دریافت کرنے کا شوق ہوتا ہے، تو انہی یورپ کی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے، اس طرح آہستہ آہستہ یہ زہر آلود معلومات اثر کر جاتی ہیں،

علامہ شبلی نے اس کا جو وسیع خاکہ تیار کیا تھا ابھی اس میں وہ رنگ نہیں بھرنے پائے تھے کہ جوارِ رحمت میں جگہ پا گئے، ان کے بعد سید صاحب نے انہی کے نقشِ قدم پر چل کر اس کی تکمیل کی، سیرت جلد چہارم کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :-

"ہم انشاءاللہ تفصیل سے بتائیں گے کہ تمدن، معاشرت، بالخصوص قوانین نکاح، طلاق وراثت، حقوق نساء، غلامی، جہاد، اصول حکومت (سیاست) اقتصادیات وغیرہ کے متعلق تمام دنیا کے مذاہب کے کیا اصول اور تمام سلطنتوں اور قوموں کے کیا قوانین تھے، اور آج مغرب نے اس انتہائی تہذیب تک پہنچکر کس حد تک ان امور میں ترقی کی ہے، پھر موازنہ کرکے ہم دکھائیں گے کہ شریعتِ اسلام کے مقابلہ میں مغرب کا معراج ترقی شریعتِ اسلام کا پایۂ اولین ہے"

سید صاحب نے فکر و نظر کی جس وسعت اور مجتہدانہ بصیرت کے ساتھ سیرت کا ذخیرہ تیار کیا، اور اس کے بعد مغربی افکار و خیالات پر جو تنقید کی ہے اس کی مثال کم از کم ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں نہیں ملتی،

دارالمصنفین | ندوہ نے اپنے مقاصد کو بروئے کار لانے اور ندویون کی فکری وعلمی تربیت کے لئے یہ کوشش کی تھی کہ ندوہ مین ایک شعبۂ تصنیف وتالیف بھی قائم ہو، چنانچہ ۱۹۱۰ء مین دلی مین ندوہ کا اجلاس ہوا، تو علامہ شبلی نے اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے ایک نئی تجویز یہ پیش کی کہ اس کے لئے ایک بڑا کتب خانہ فراہم کیا جائے ان کی تجویز کے الفاظ یہ تھے،

"یہ تجویز کہ ندوہ مین ایک دائرۂ تالیف قائم کیا جائے جس کے ارکان کا کام صرف مطالعۂ کتب اور تصنیف وتالیف ہو، ...... یہ اسی وقت پوری ہو سکتی ہے جب ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا جائے"،

اسی جلسہ مین سید صاحب نے بھی ایک مضمون پڑھا تھا جس مین اسی تجویز کو عملی شکل دینے کی متعدد تجویزین تھین، انھون نے آخر مین لکھا تھا،

"ندوۃ العلماء جس قسم کے علماء اپنے مدرسہ مین تیار کرانا چاہتا ہے، وہ اسکیم سے ظاہر ہے کہ یہان کے طلبہ درجۂ عالمیت یا درجۂ تکمیل کے بعد تالیف وتصنیف مین مشغول ہون، اور ایک بڑے پیمانہ پر صیغۂ تصنیف وتالیف قائم کیا جائے، ........ اور اس ادارہ کا نام دارالمصنفین ہو"

مگر بعض کوتہ اندیشیون اور بداندیشیون کے اختلاف کی وجہ سے استاد اور شاگرد کی یہ خواہش پوری نہ ہوسکی کہ دارالمصنفین ندوہ مین کھلے، پھر بھی علامہ شبلی آخر وقت تک اس کیلئے کوشش کرتے رہے، اور ان کے دوسرے شاگردون کی بھی یہی خواہش تھی، جب مولانا مسعود علی صاحب نے یہ خواہش ظاہر کی تو ان کو لکھتے ہین،

بھائی وہ لوگ دارالمصنفین ندوہ مین بنانے کب دین گے، کہ مین بناؤن، حالانکہ اس مین انہی کا فائدہ ہے"،

جب وہ ارباب ندوہ کی طرف سے بالکل مایوس ہوگئے، تو اسے اعظم گڈھ مین کھولنا طے کیا، وہ اس کا خاکہ تیار کرچکے تھے، اور ندوہ کے بعض ذہین طلبہ کا انتخاب بھی کر لیا تھا، مگر ابھی اسکی صورت گری نہین

کر پائے تھے کہ اعلیٰ علیین میں جگہ پا گئے، سید صاحب نے اُن کے بعد ندوہ کے اس مقصد کو پورا ہی نہیں کیا، بلکہ اس میں وسعت بھی دی،

دار المصنفین کے کاموں کی تفصیل کا موقع نہیں ہو لیکن اگر اس کے کارناموں پر ایک اجمالی نظر بھی ڈال لیجائے، تو اس کا اندازہ ہو جائے گا کہ مغربی مصنفین نے اسلامی نظام حکومت، اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم کے بارے میں جو غلط فہمیاں پھیلائی تھیں دار المصنفین نے ان میں سے ایک ایک کا جواب نہایت ہی علمی اور تحقیقی انداز سے دیا، یہاں کی ہر کتاب گویا ایک سوال کا مدلل جواب ہے، دار المصنفین کا یہ علمی و تحقیقی کام گو ایک پوری جماعت نے انجام دیا ہے، مگر یہ سب سید صاحب ہی کے فیض تربیت کا اثر ہے،

سیرت نبوی کی تکمیل کے بعد دار المصنفین کا سب سے بڑا کارنامہ سیر الصحابہ کی تکمیل ہے، اس سلسلہ کی سب سے پہلی کتاب خلفاے راشدین ہے، اسلام جس طرح کا نظام دنیا میں قائم کرنا چاہتا ہے، اس کی تفصیل تو سیرت کے ذریعہ کی گئی تھی، مگر اس سوال کا جواب کہ یہ نظام اپنی پوری جلوہ سامانیوں کے ساتھ آنحضرت کے بعد بھی باقی رہا یا نہیں، اس کتاب سے ملتا ہے، پھر اس کے ذریعہ اس خیال کی بھی تردید کی گئی، کہ مذہب و سیاست دونوں الگ الگ چیزیں ہیں، دونوں کی آمیزش ممکن نہیں ہے

اس کے بعد کی جلدوں میں عام صحابہ کے حالات ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی انفرادی سیرتیں اسلام کی عملی تفسیر تھیں،

سیر الصحابہ کے ساتھ سید صاحب نے تاریخ اسلام کی تالیف کا کام بھی شروع کرایا، جس کے ذریعہ بتایا گیا کہ گو خلافت راشدہ کے بعد اسلامی حکومت کا طریقہ انتخاب رائی نہیں رہا تھا، جس کی وجہ سے اسلامی جمہوریت کی روح مردہ ہو گئی تھی، اور اس کی جگہ ملوکیت نے لے لی تھی، پھر بھی نظام حکومت کا پورا ڈھانچہ اسلامی ہی تھا، اس لئے علم و تمدن، اخلاق و معاملات، اور عقائد و عبادات پر صدیوں تک اس کی برکتیں باقی رہیں، نیز اس کے ذریعہ اسلامی تاریخ کے ان پہلوؤں کو بھی صحیح اور واضح طور سے پیش کیا گیا، جن کو مغربی مصنفین

نے غلط طور پر پیش کیا تھا،

ہندوستان کی جو تاریخین انگریزون نے لکھیں ان مین انھون نے اپنے سیاسی مصالح کے پیش نظر مسلمانون کے دور کو ایسے انداز مین پیش کیا کہ ہندوؤن اور مسلمانون مین کشمکش کی خلیج زیادہ سے زیادہ وسیع ہو، سید صاحب نے ادارہ کے ابتدائے قیام ہی سے اس کام کی طرف توجہ کی، خود متعدد مضامین لکھے اور دارالمصنفین کے متعدد رفقاء کے سپرد یہی کام کیا،

اس کے علاوہ وہ کون ایسا اہم موضوع ہے جس پر دارالمصنفین نے کتابین نہین پیش کی ہین، قرآن، وحدیث، فقہ، فلسفہ، تمدن، غرض کوئی گوشہ نہیں چھوٹا ہے،

**معارف** | ادارہ کے قیام کے تقریباً دو ہی سال بعد سید صاحب نے معارف نکالا، اس پرچہ کے ذریعہ انھون نے دین و مذہب کی، ملک و ملت کی، اور زبان و ادب کی جو بیش بہا خدمت انجام دی اور اسکے ذریعہ ندوی تحریک کو جس طرح زندہ کیا، ہندوستان مین اس کی مثال ملنی مشکل ہے، قدیم و جدید کا کون سا ایسا مسئلہ ہے جس پر معارف مین مضمون شائع نہین ہوا، خصوصاً مغربی افکار و خیالات کی تردید مین تو صدہا مضامین اس مین شائع ہوئے ہون گے، خود سید صاحب نے جو بیش قیمت مضامین اس مین لکھے ہین، اُن کی ضخامت کئی ہزار صفحات ہوگی، انھون نے خاص طور سے اہل مغرب کے افکار و خیالات کے جواب مین جو مضامین لکھے ہین انکی تعداد بھی کافی ہے،

یورپ کے مشہور مستشرق مارگولیتھ کی کتاب کے حوالہ سے مانچسٹر گارجین مین ایک مضمون آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے بارہ مین شائع ہوا تھا جس مین مضمون نگار نے بعض نامناسب باتین واقدی کی روایت سے نقل کی تھین، سید صاحب نے کئی نمبرون مین اس کا جواب دیا، اس بحث مین مارگولیتھ کے علاوہ ڈرہم یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر گولیم نے بھی حصہ لیا، سید صاحب نے ان دونون کو اپنے محققانہ مضامین کے ذریعہ خاموش کیا، ۱۹۳۰ء مین ایک یورپین اہل قلم نے ایک مضمون مین لکھا کہ "مسلمان ارسطو کی گاڑی کے قلی تھے"، سید صاحب نے اس کا

نہایت ہی محققانہ جواب دیا، اور ثابت کیا کہ مسلمانوں نے یونانی فلسفہ کی خدمت ضرور کی ہے، مگر اس فلسفہ کے وہ مقلد نہیں ہیں، بلکہ انھوں نے اس کے سارے تار و پود کو بکھیر کر رکھ دیا ہے، اسی زمانہ میں عورتوں کے حقوق کے سلسلہ میں اسلام پر اعتراض کیا گیا، اس کے رد میں ایک طویل مضمون لکھا، ۱۹۳۱ء کا پورا سال تقریباً اسی طرح کے مضامین کے لکھنے میں صرف ہوا، مشہور انگریزی اخبار اسٹیٹسمین میں ایک مضمون واقعہ کربلا کے بارے میں شائع ہوا، جس میں بعض قابل اعتراض باتیں تھیں، سید صاحب نے اس کا جواب دیا، اسی سال پنجاب یونیورسٹی میں ڈاکٹر وائل کی کتاب تاریخ اقوام اسلامیہ داخل نصاب کی گئی، جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے بارے میں بعض بے بنیاد اور توہین آمیز باتیں تھیں، سید صاحب نے اس کے خلاف معارف میں سخت احتجاج کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کتاب نصاب سے خارج کر دی گئی، اس کے علاوہ خود ہندوستان کے بہت سے فتنہ نگاروں کا بھی جواب دیا،

معارف کی علمی اہمیت اور اس کی قدر افزائی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ مولانا محمد علی نے ایک بار سید صاحب کو لکھا کہ

"میرے متعدد انگریزی رسالوں کی جلدیں نہیں بندھی ہیں، یہ شرف خاص معارف کو حاصل ہوگا کہ مجلدات تیار کرائی جائیں گی،

مولانا ابوالکلام اس کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"معارف کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں، صرف یہی ایک پرچہ ہے اور ہر طرف سناٹا ہے،"

**ایک اہم کارنامہ** | اس سلسلہ میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ سیرت النبی کی تالیف ہے، یہ کتاب نہ محض سوانح نبوی کا بہترین ذخیرہ ہے، بلکہ اسلام کی بنیادی تعلیمات کا بھی ایک عمدہ مرقع ہے،

اردو کیا عربی میں بھی سیرت نبوی پر جتنا ذخیرہ موجود ہے، کوئی بھی ضعیف اور رطب و یابس روایات سے خالی نہیں ہے، مگر اس سیرت کی یہ سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ اس کی ساری بنیاد یا تو قرآن پر ہے یا بقیہ صحیح

اور مستند احادیث نبوی پر،

سیرت نبوی کے علاوہ بھی سید صاحب نے جتنے دینی کارنامے انجام دیئے ہین، ان مین ان کی یہ خصوصیت نمایان نظر آئے گی کہ انھون نے اپنے ہر دعوی کی دلیل قرآن یا سنت صحیحہ سے دی ہے، ہر سوال کے جواب مین قرآن کی کوئی آیت یا حدیث نبوی پیش کی ہے، غرض یہ کہ سیرت کا ضخیم ذخیرہ ہو یا خطبات مدراس اور معارف کے مضامین، ان سب مین اُن کی یہ امتیازی خصوصیت نمایان نظر آئے گی، خود فرماتے تھے کہ "مین نے سیرت کی تالیف اور اسلامی مسائل مین کتاب و سنت کے علاوہ کسی تیسری چیز کو بنیاد نہین بنایا ہے"،

بسا اوقات قرآن و سنت سے استدلال کرنے مین وہ اس دقت نظری سے کام لیتے ہین کہ عام اہل علم کے ذہن کی رسائی، وہان تک نہین ہوتی، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ بعض کم سوادون نے اپنے ذہن کی اسی نارسائی کی بنا پر اُن کی قرآن فہمی پر اعتراضات بھی کئے ہین،

سید صاحب کی اس خصوصیت کی تفصیل کے لئے مستقل ایک مضمون کی ضرورت ہے، اگر مجمل طور سے اُن کے کارنامون کے بارے مین یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا، کہ سید صاحب نے براہ راست قرآن و سنت سے اسلامی مسائل کی جو عالمانہ تشریح کی اور انکی روشنی مین سیرت نبوی کی جیسی جدید ترتیب و تبویب کی ہے، اور پھر ان سب کا ایک دوسرے سے جو ربط و تعلق دکھایا ہے، اس کی مثال پورے اسلامی لٹریچر کی کسی ایک تصنیف مین ملنی مشکل ہو، چند مثالین یہان دیجاتی ہین، جن سے قرآن و سنت پر ان کی وسعت نظر، ان مین غور و تدبر اور ان سے نتائج اخذ کرنے مین اُن کی مجتہدانہ بصیرت کا اندازہ ہوجائے گا، اور یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ سیرت نبوی کے سرچشمہ کو انھون نے ضعیف روایتون کی آلائشون سے کس طرح پاک و صاف کرکے ہمارے سامنے پیش کیا ہے، اور اس کا انداز سب سے زیادہ معجزات کی بحث مین ہوتا ہے،

معجزات نبوی کے سلسلہ مین مسلمانون نے ہمیشہ یا تو افراط سے کام لیا ہے یا تفریط سے، جن لوگون نے افراط سے کام لیا، وہ انکا انکار ہی کر بیٹھے، اور جن لوگون نے تفریط کو راہ دی، وہ ہزارون بے سروپا

روایتون کو جزوِ ایمان بنا بیٹھے، آج بھی مسلمانون مین ان دونون انتہا پسندیون کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے،
سید صاحب نے سیرت کا جو حصّہ معجزات پر لکھا ہے، اس مین ان دونون باتون کو سامنے رکھا، ایک طرف انھون نے عقل پسندون کی خشک پسندی کی دھجی بکھیری، اور دوسری طرف ہزارون روایتون سے انتخاب کرکے معجزاتِ نبوی کا ایک صحیح مرقع پیش کیا، اور اس استدلال اور انتخاب مین انھون نے کسی تجدد سے کام نہین لیا، بلکہ انھون نے منکرین کے سامنے انہی کے مسلّم عقلا و ائمہ کے اقوال سے معجزاتِ نبوی پر استدلال کیا، اور روایت پرستون کے موقف کی کمزوری انھون نے خالص محدثانہ اصول کی روشنی مین دکھائی، جن کی وجہ سے دونون کو خاموش ہونا پڑا،

معجزاتِ نبوی کے بارے مین عام طور پر یہ خیال ہے کہ معجزہ نام ہے محض کسی ظاہری "خرقِ عادت واقعہ کا" جیسے عصاے موسیٰ، ید بیضا، شق القمر وغیرہ، سید صاحب نے اس عام غلط فہمی کا پردہ بڑی خوبی کے ساتھ چاک کیا، اور انھون نے بتایا کہ معجزہ محض اسی کا نام نہین ہے، یہ تو معجزہ کی ظاہری اور معمولی قسم ہے، کسی نبی کا اصل معجزہ اس کی تعلیم، اس کے اثرات اور نتائج، اس کی پاکیزہ سیرت، اس کا اخلاق اور کردار ہوتا ہے، جن کا اس کی زندگی کے ہر لمحہ مین مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، اس کو انھون نے باطنی معجزہ سے تعبیر کیا ہے، ظاہری معجزہ بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے، مگر اس کی حیثیت اصل کی نہین فرع کی ہے، اس کا اثر کچھ دیر رہتا ہے، اور باطنی معجزہ کا اثر تا قیامت رہے گا، پھر اس دعویٰ پر انھون نے قرآن و سنت سے سیکڑون دلیلین دی ہین، جن مین سے ہر دلیل نہایت محکم، اور ناقابلِ تردید ہے" (ملاحظہ ہو سیرت حصّہ سوم (ص ۱۹۲ تا ۲۳۵)

معجزہ کے سلسلہ مین دوسری غلط فہمی یہ بھی ہے کہ انبیاء علیہم السلام براہِ راست کائنات کے تصرف پر قادر ہین، وہ جس وقت جو چاہین کر سکتے ہین، اس غلط فہمی کا شکار سب سے زیادہ عیسائی، اور کسی حد تک جاہل مسلمان ہین، سید صاحب نے اس سلسلہ مین قرآن کی بے شمار آیات کی روشنی

میں ثابت کیا ہو کہ قرآن نے اس ذہنیت کی اصلاح کی ہے، اور اس نے بتایا ہے کہ معجزہ کا ظہور نبی کی قدرت و تصرف سے نہیں ہوتا، بلکہ وہ خالص خدا کی قدرت اور حکمت کا کرشمہ ہوتا ہے،

غرض یہ کہ اس سلسلہ میں اس طرح کی نہ جانے کتنی غلط فہمیوں کو انھوں نے دور کیا ہے، یہ کہنا ایک واقعہ کا اظہار ہوگا کہ معجزات انبیاء سابقین اور معجزات نبوی پر قرآن کے دلائل کا اتنا انبار، اور فکر و استدلال کا ایسا اچھا مرقع، صحیح روایات کا اتنا بڑا ذخیرہ کسی زبان میں حتی کہ عربی میں بھی موجود نہیں ہے،

معجزات نبوی کی طرح معراج نبوی کے بارہ میں بھی عام طور پر اہل علم محض روایات ہی پر اعتماد کرتے چلے آئے تھے، جس کی وجہ سے یہ ایک ما فوق الفطرت واقعہ تو ضرور معلوم ہوتا تھا، مگر اس ما فوق الفطرت واقعہ کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ ہماری زندگی کے لئے اس کی کیا اہمیت ہے؟ اگلے انبیاء کے ساتھ بھی یہ واقعہ پیش آیا یا نہیں؟ اس کا صحیح نقشہ کیا ہے؟ اس میں بارگاہ خداوندی سے کیا پیغام عطا ہوا ہے؟ اس کے یہ سب گوشے بڑی حد تک تشنۂ تفصیل تھے، سید صاحب نے ان تمام گوشوں پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، اور ہر جگہ اپنے استدلال کی بنیاد قرآن اور صحیح روایات ہی کو بنایا ہے، محض واقعہ میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے کہیں کسی روایت کا سہارا نہیں لیا ہے، خاص طور سے انھوں نے معراج کے پیغام کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اسکی نظیر کسی دوسری کتاب میں کم از کم عاجز کو نظر نہیں آئی،

عام طور پر معراج کا پیغام پنج وقتہ نماز کو سمجھا جاتا ہے، سید صاحب نے بتایا کہ یہ معراج کے پیغام کا ایک اہم جزو ہے، کل نہیں ہے، انھوں نے دکھایا ہو کہ سورۂ اسراء میں عقائد، عبادات، تمدن اور معاشرت و سیاست کے جو اصول بیان کئے گئے ہیں، وہ سب معراج ہی کے پیغامات ہیں، معراج نبوی محض ایک خرق عادت واقعہ نہیں ہے، بلکہ یہاں سے نبوت محمدی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے، سیرت جلد ۳ میں تفصیل ملاحظہ ہو،

اسی طرح سید صاحب نے سیرت جلد ۵ میں عبادات قلبیہ کے تحت اخلاص، تقوی، اور صبر

شکر وغیرہ کی جو تفصیل کی ہے، اور ان باطنی کیفیات کے حصول کے لئے قرآن وسنت کی روشنی میں جو طریقہ بتایا ہے اس کا عشر عشیر بھی کسی مروجہ تصوف کی کتاب میں نہیں ملتا، سلسلۂ سیرت کی دوسری اہم کتاب خطبات ہیں یہ وہ خطبے ہیں جو انھوں نے مدراس میں دیئے تھے، اس کتابچہ میں انبیائے کرام کی انسانی خدمت دوسرے بانیانِ مذاہب کی تعلیم کی تاریخی حیثیت اور سیرت نبوی کی ہمہ گیری کا جو مرقع پیش کیا گیا ہے اگر اس کو کوئی غیر مسلم غیر جانبدارانہ نقطہ نظر سے پڑھے، تو وہ اسلام اور پیغمبر اسلام کی ذات سے متاثر ہی نہیں، بلکہ ان کا عقیدتمند ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، اس کتاب نے مسلم قوم کو سیرت نبوی پر بولنے اور لکھنے کا ایک نیا ماخذ دیا، اس کی بدولت مقررین کو سیرت نبوی کے پیش کرنے کا ایک نیا انداز اور نیا ڈھنگ معلوم ہوا، بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس کی بدولت کتنے لوگوں کو سیرت پر بولنا آگیا،

دوسرے ان کے وہ بیسیوں مضامین ہیں، جو انھوں نے قرآن وسنت کے مختلف موضوعوں پر معارف میں لکھے ہیں، ان مضامین کے علاوہ انھوں نے اس مقصد کی خاطر مولانا حمید الدین صاحب فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کے مختلف حصوں کو اپنے خاص اہتمام سے چھپوایا، جن کی وجہ سے قرآن فہمی کی ایک نئی راہ کھلی،

اس مختصر تفصیل سے اندازہ ہو گیا ہوگا، کہ قرآن وسنت کی حفاظت وخدمت کے سلسلہ میں سید صاحب کی امتیازی خصوصیت کیا تھی، اور علما میں اُن کا مخصوص مقام کیا تھا،

**دوسرا مقصد** ندوۃ العلماء کے پیش نظر دوسرا اہم مقصد موجودہ نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم کی اصلاح تھا، نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم کی اصلاح کے سلسلہ میں ندوہ کے پیش نظر قریب قریب وہی نقشہ تھا، جو ڈیڑھ صدی پہلے شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پیش کیا تھا، یعنی ابتدائی صرف ونحو اور عربی ادب کی تعلیم کے بعد طلبہ کو براہ راست قرآن وسنت کی تعلیم میں لگا دیا جائے، اور پھر یہ سلسلہ تکمیل تعلیم تک جاری رہے البتہ طلبہ کی استعداد کے اضافہ کے ساتھ ساتھ ان کی تعلیم وتدریس کے معیار میں بھی اضافہ ہوتا جائے، یہاں تک کہ اختتام تعلیم تک ان ماخذ پر ایک تحقیقی نظر ہو جائے، دوسرے علوم وفنون مثلاً فقہ، اصول فقہ، کی تعلیم، قرآن وحدیث کی تعلیم کے بعد یا ضمنی طور

اُن کے ساتھ ہی دی جائے، تاکہ طلبہ کے ذہن میں اصل و فرع کا فرق بھی پورے طور پر بیٹھتا جائے، اور یہ بھی معلوم ہوتا جائے کہ یہ علوم بجائے خود ماخذ دین نہیں ہیں، بلکہ اصل ماخذ قرآن و سنت کے خادم یا نتائج و وسائل ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس اصلاح کی ابتدا سب سے پہلے خود دارالعلوم ندوۃ العلماء سے ہونی چاہئے تھی، مگر ابتدا میں ندوہ کو جو مدرسین اور منتظمین ملے، اُن میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی، جو اُس نصاب تعلیم میں جو کئی صدی سے عربی مدرسوں میں پڑھایا جا رہا تھا، کسی ترمیم کے لئے راضی نہ تھے، حالانکہ یہ اُن کو بخوبی معلوم تھا کہ اس نئی درسگاہ کے قیام کا بنیادی مقصد ہی اصلاح نصاب ہے، اور اُن کو اس طرف بار بار توجہ بھی دلائی گئی، مگر چونکہ ان کی پشت پر پورے مذہبی طبقہ کی حمایت موجود تھی، اس لئے انھوں نے اپنے اس رویہ میں کوئی تبدیلی نہیں کی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیجئے کہ امرتسر میں ندوہ کے سالانہ اجلاس میں جب علامہ شبلی نے اپنا مشہور اصلاحی ترکیب بند پڑھا، تو مولانا فاروق چریاکوٹی جو ندوہ ہی میں صدر مدرس اور علامہ شبلی کے استاذ رہ چکے تھے، ان شعروں پر بہت خفا ہوئے، جن میں ۴ عناصر کے نظریہ اور فلسفۂ قدیم پر تعریض و تنقید تھی، اور طلبہ کے سامنے ۴ عناصر کے وجود پر کئی دن تک تقریر کرتے رہے، اس ترکیب بند کا ایک شعر یہ ہے،

تا بچہ سودت دہد آں فلسفۂ عہد قدیم
تا بچہ سودت دہد آں ہیئت پارینہ ہنوز

علامہ شبلی نے جو تحریک ندوۃ العلماء میں ابتدا سے شریک تھے، اس ذہنیت کے بدلنے کے لئے بڑی سخت جد و جہد کی، اسی غرض سے دارالعلوم میں قیام کیا، اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہو گئے تھے، مگر پھر اُن کی علحدگی سے یہ اصلاح کی تحریک کچھ دنوں کیلئے دب گئی، اور پھر اس کو پوری کامیابی اس وقت ہوئی جب سید صاحب معتمد بنائے گئے،

سید صاحب نے بھی ندوہ کے اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لئے پوری جد و جہد کی، اور اُن کی اس جد و جہد کا نتیجہ ندوہ کے اندر بھی اچھا نکلا، اور ندوہ سے باہر بھی، علامہ شبلی نے اپنے زمانہ معتمدی ہی میں قرآن کی

تحقیقی تعلیم اور براہ راست اس کے مطالعہ کا سلسلہ شروع کرادیا تھا، اسی طرح نحو و صرف کی کتابوں میں بھی انھوں نے بہت کچھ رد و بدل کر دیا تھا، بلاغت و معانی میں مختصر و مطول کے بجائے امام بلاغت عبدالقاہر جرجانی کی کتاب دلائل الاعجاز رکھ دی تھی، انگریزی تعلیم کا بھی کچھ سلسلہ شروع ہو گیا تھا، سید صاحب نے اس اصلاح کو اور وسعت دی، انھوں نے عربی ادب کا معیار پہلے سے بلند کر دیا، حدیث کی تعلیم تیسرے ہی درجہ سے شروع کرائی، براہ راست قرآن سے قرآن کی تعلیم بالکل ابتدا سے انتہا تک پھیلا دی حتی کہ دارالعلوم ندوہ میں بچوں کو ترکیب کی مشق بھی قرآن کے آخری پارہ سے کرائی جاتی ہے، انگریزی کو نصاب کا ایک ضروری جزء قرار دیا،

عربی مدارس میں عموماً عربی ادب کی جو کتابیں خواہ وہ نثر کی ہوں یا نظم کی پڑھائی جاتی ہیں، وہ بیشتر متاخرین یا عجمی مذاق شعراء و ادباء کی ہیں جن کا اسلوب بیان نہایت ادق اور پیچیدہ ہوتا ہے، جن میں الفاظ زیادہ اور معانی کم ہوتے ہیں، ان کے پڑھنے پڑھانے سے عام طور پر طلبہ کو عربی الفاظ اور کچھ عربی ترکیبوں پر تو ضرور عبور ہو جاتا ہے، مگر ان کے ذریعہ نہ عربی کا ستھرا اور پاکیزہ مذاق ہی پیدا ہوتا ہے، اور نہ قرآن کے سادہ اور دلنشین اسلوب بیان سے مناسبت ہی پیدا ہوتی ہے،

اس سلسلہ میں دوسری خامی قدیم طریقۂ تعلیم میں یہ تھی کہ اس میں طلبہ میں عربی تحریر و تقریر کی صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی تھی، ندوہ کی اصلاحی تحریک سے پہلے عربی مدارس کے عربی مذاق کا کیا حال رہا ہوگا، اس کا اندازہ ایک حال کے واقعہ سے لگائیے، جو مولانا ابوالحسن علی صاحب کے ساتھ پیش آیا تھا، مولانا نے بیان کیا، کہ میں ایک مجلس میں گیا، جہاں ایک مشہور عربی درسگاہ کے ممتاز فضلاء موجود تھے، میں جس وقت مجلس میں پہنچا، تو یہ حضرات کھانے میں مشغول تھے، ندوی سمجھ کر ایک بزرگ نے برجستہ عربی میں فرمایا کہ

یا شیخ تعال واجلس ھٰھنا وکل معنا،

مولانا نے کہا اس عربیت پر مجھے ہنسی تو بہت آئی، مگر بزرگون کا مجمع تھا، اس لئے ضبط کرکے کہا:-

"اما الجلوس فنعم واما الطعام فلا"

اس کے بعد پھر اردو مین بات چیت شروع ہوگئی،

ندوہ نے شروع ہی سے عربی نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم کی اس خامی کی طرف توجہ کی تھی، اور کسی حد تک یہ خامی شروع ہی مین دور بھی ہوگئی تھی، مگر پھر بھی جدید ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے، ابھی اس مین مزید وسعت کی ضرورت تھی، سید صاحب نے اس کی طرف خاص طور سے توجہ کی، متعدد نثر و نظم کی پرانی کتابین نصاب سے خارج کین، اور متعدد نئی کتابین داخل کین، عربی ادب و انشا کی تعلیم کیلئے بعض ممتاز اساتذہ کو عربی ممالک سے بلاکر ندوہ مین رکھا، بعض طلبہ کو عربی ممالک مین تعلیم کے لئے بھیجا، عربی اخبارات و رسائل کے منگانے کا اہتمام کیا، طلبہ کی ایک مجلس نادیۃ العربی کو جو خاص اسی مقصد سے قائم کی گئی تھی، ترقی دی، غرض اس شعبہ کی اصلاح کے لئے ہر ممکن کوشش کی،

سید صاحب کے دور مین ندوہ کے تمام علمی شعبون کو ترقی ہوئی، مگر خاص طور سے اس مبارک دور مین عربی ادب و انشا کو بہت زیادہ عروج ہوا، اس دور مین ندوہ نے عربی ادب کے جیسے بعض بے بہا قوم کے سامنے پیش کئے، اس کی مثال ہندوستان کی کوئی درسگاہ نہین دے سکتی، اس دور کے متعدد ندوی فضلا کی عربی ریڈرین داخل درس ہین، اور ان کی متعدد عربی تصنیفین وہان ہاتھون ہاتھ فروخت ہو رہی ہین، اور ان کے متعدد اڈیشن نکل چکے ہین،

اصلاح نصاب کے سلسلہ مین موجودہ ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے ایک کام جدید عربی ریڈرون کی تیاری کا بھی تھا، سید صاحب نے اس سلسلہ مین دوسرون سے بھی کام لیا، اور خود بھی اس کام کو انجام دیا، انھون نے بچون مین عربی ادب کا مذاق پیدا کرنے کے لئے دروس الادب کے نام سے دو رسالے لکھے جن مین ابتدائی گردانون

جدید و قدیم عربی الفاظ و ترکیبین، اور انشاء کے مشقی سوالات ہین جن کو پڑھ کر بچون مین عربی مذاق آسانی سے پیدا ہو جاتا ہے، جدید تعلیمی تقاضون اور تجربون کے پیش نظر ندوہ کے دوسرے فضلاء نے اس کے لئے اچھی اچھی ریڈرین تیار کرلی ہین، مگر اس سلسلہ کی سب سے پہلی کوشش سید صاحب ہی نے کی، اُن کی یہ کتاب ملک مین کافی مقبول ہوئی، اس مقبولیت کا اندازہ اس سے لگتا ہے، کہ اب تک اس کے ۱۵-۱۶ اڈیشن نکل چکے ہین،

اس سلسلہ مین سید صاحب نے دوسری کوشش یہ کی کہ جدید عربی الفاظ کا ایک لغت "لغات جدیدہ" کے نام سے تیار کیا جس کے ذریعہ ہندوستان کے عربی مدارس کے طلبہ ہزارون جدید عربی الفاظ سے واقف ہوئے، یہ کتاب سید صاحب کی ابتدائے عمر یعنی آج سے پچاس برس پہلے کی تصنیف تھی، اور جدید عربی ادب مین مغربی افکار و خیالات اور جدید انکشافات کی وجہ سے برابر نئے الفاظ، نئی ترکیبین داخل ہو رہی تھین، اس لئے اس کتاب کے دوسرے تیسرے اڈیشن کے وقت اُن کو اس کتاب مین ترمیم و اضافہ کا خیال ہوا، اس کام کے لئے انھون نے اپنے محبوب شاگرد مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کو منتخب کیا، اور اُن کی اصلاح کے بعد یہ کتاب دوبارہ سہ بارہ شائع ہوئی،

اصلاح نصاب کی ان داخلی کوششون کے علاوہ سید صاحب نے بہت سی خارجی کوششین بھی کین، اس موضوع پر متعدد مضامین لکھے، متعدد بڑی اور چھوٹی قدیم و جدید درسگاہون کو اس سلسلہ مین مفید مشورے دیئے خاص طور سے جو درسگاہین ان کے مشورے سے مستفید ہوئین ان مین مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، جامعہ ملیہ دہلی، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، جامعہ عباسیہ بھاولپور، مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ، اسلامیہ کالج پشاور وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہین،

۱۹۳۳ء مین سید صاحب نادر شاہ کی دعوت پر افغانستان گئے، اس سفر مین ڈاکٹر اقبال اور بعض دوسرے اہل علم بھی سید صاحب کے ساتھ تھے، سید صاحب نے نادر شاہ سے تعلیم کے مسئلہ پر جو گفتگو کی اس مین انھون نے ندوہ کے خیالات کی پوری ترجمانی کی، انھون نے فرمایا کہ

"افغانستان کی عربی و مذہبی تعلیم کا نصاب ایسا ہو کہ طلبہ مین موجودہ زمانہ کے لحاظ سے

سیاسی و اجتماعی اصلاحات کی طرف میلان ہو، اور ان میں مذہبی شیفتگی بھی پیدا ہو،

۱۹۳۴ء میں صوبہ بہار اور اڑیسہ کے وزیر تعلیم جناب سید عبدالعزیز صاحب مرحوم نے سید صاحب کو عربی مدارس کے نئے نصاب کی ترتیب و اصلاح کے لئے رانچی تکلیف دی اور سید صاحب نے اس مبارک کام کو مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کی معیت میں انجام دیا، بہاولپور میں ندوہ کی طرز کی ایک درسگاہ جامعہ عباسیہ آزاد اسکے نصاب کی ترتیب و اصلاح میں بھی سید صاحب نے حصہ لیا،

**تیسرا مقصد** | ندوہ کا تیسرا مقصد مسلمانوں کے مختلف مذہبی فرقوں، جماعتوں اور جدید و قدیم تعلیم یافتہ گروہ اور افراد کے درمیان اتحاد و اتفاق، اور ان میں انتہا پسندی، اور تعصب و تحزب کے بجائے، اعتدال پسندی اور وسعت نظری پیدا کرنا تھا، ارباب ندوہ نے شروع سے اس مقصد کے لئے جد و جہد کی، اور اس میں انکو بڑی حد تک کامیابی ہوئی، ندوہ کی انتظامی مجلسیں اور اس کے عام اجلاس اس اتحاد و اتفاق کا نہایت ہی روح پرور منظر پیش کرتے تھے

سید صاحب نے بھی ندوہ کے دوسرے مقاصد کی طرح اس مقصد کو بھی ہمیشہ حرز جان بنائے رکھا ۱۹۲۶ء میں سید صاحب کو جمعیۃ العلماء کی صدارت پیش کی گئی، تو انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں قوم پر ندوہ کے اس احسان کا ذکر علماء کے بھرے ہوئے مجمع میں ان الفاظ میں کیا،

"آج سے تیس برس پہلے چند عاقبت بین اور معاملہ فہم علماء نے ندوۃ العلماء کی تاسیس کی کہ آئندہ اسلام کو جس قسم کے خدمتگزاروں کی ضرورت پیش آئے گی، اس کے لئے قبل از وقت تیاری ہو، اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں جدید و قدیم نئے اور پرانے خیالات اور جمود و فطرت کے بیچ میں صراط مستقیم قائم ہوگئی، اور سنہ کے اجلاس ندوۃ العلماء میں یہ موقع پیش آیا کہ طربوش و دستار (یعنی جدید و قدیم) میں مصافحہ ہوگئی،

"آج ہمارے درمیان جو چند مصلحت شناس وابستہ جانی اور اصلاح کوش علماء کا وجود ہے

اور چند مخلص الایمان، جان نثار اسلام اور دینی عقیدت سے سرمست جدید تعلیم یافتہ ہستیاں ہیں، وہ اسی مصالحت، اور موافقات کے خوشگوار نتائج ہیں،

یہ طربوش و دستار میں مصالحت سید صاحب ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھی،

مسلمانوں کی تفریقوں، اور فرقہ بندیوں کا ایک بڑا سبب علماء کی غلطیاں اور اُن کی تنگ نظری ہے سید صاحب نے اسی مجمع علماء میں بڑے درد و سوز کے ساتھ اُن کو اس خامی کی طرف متوجہ کیا،

"مسلمانوں کی مضبوطی کا راز خود اُن کے درمیان باہم اتفاق و اتحاد اور رواداری ہے، تمام وہ لوگ جو قائین توحید و رسالت میں مشترک اسلامی مفاد کی غرض سے ملت کے باہم مشترکہ مسائل میں اپنی وحدت، ارادہ، اور وحدتِ عمل کا ثبوت دیں، اور مختلف فیہ مسائل میں اظہار اختلاف کے لئے مناسب لب و لہجہ اور طریقۂ ادا سے کام لیں، مسلمان جس ملک میں تباہ ہوئے وہ حدیث مشہور کے مطابق دشمنوں کے حملہ سے نہیں، بلکہ آپس کے اختلاف سے "

(خطبہ صدارت ص ۵۲)

سید صاحب زندگی بھر اس جادۂ اعتدال اور محبت و مسامحت کی اس صراط مستقیم پر قائم رہے اور اپنی اس روش کی وجہ سے علماء میں سب سے زیادہ کامیاب رہے، اپنے سب سے زیادہ محبوب شاگرد مولینا مسعود عالم صاحب ندوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں،

"محبت، اعتماد اور مسامحت، ہمارا دستور العمل ہے، چنانچہ اس وقت تک اس میں کامیابی ہوئی ہے، جس دن یہ بات نہیں رہے گی، میں نہیں رہوں گا،"

(مکاتیب سلیمان ص ۱۳)

سید صاحب کے اس طرزِ عمل کا اثر یہ ہوا کہ مختلف خیال کے لوگ اعتماد کرتے تھے، اور وہ ان کے آپس کے اختلافی مسائل میں اکثر حکم بنائے جاتے تھے، مولانا محمد علی اور مولانا عبد الباری کے سیاسی اور مذہبی

اختلافات کے زمانہ میں سید صاحب ہی کی ایک ذات ایسی تھی، کہ باوجود دوری کے ان پر دونوں اعتماد کرتے تھے، چودھری خلیق الزمان اور مولانا عبد الباری کی کشمکش سید صاحب ہی کی کوششوں سے ختم ہوئی، اس کے علاوہ علماء کے مختلف گروہوں اور افراد کے درمیان بھی عموماً سید صاحب ہی نقطۂ اتصال بنتے تھے، مولانا اشرف علی صاحب تھانوی اور مولانا حسین احمد مدنی میں بعض سیاسی مسائل میں اختلاف تھا اور اب بھی انکے ماننے والوں میں باقی ہے، گو سید صاحب کو مولانا اشرف علی صاحب سے تعلق خاطر زیادہ تھا، مگر مولانا حسین احمد مدنی اور ان کے متوسلین بھی سید صاحب پر پورا اعتماد کرتے تھے، اور یہ دونوں مجلسوں میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، علمائے پھلواری، علمائے بدایوں، اور علمائے فرنگی محل کے مسلک سے سید صاحب کو یک گونہ اختلاف تھا، اور اس سے وہ لوگ واقف بھی تھے، مگر سید صاحب کی ندوی روش نے کبھی آویزش نہیں ہونے دی، بلکہ یہ لوگ بھی ان کو بڑی وقعت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے، مسلم لیگ و کانگریس سیاسی اختلاف کی وجہ سے پورے ہندوستان کے مسلمان دو حصوں میں بٹ گئے تھے، اور دونوں میں عوام سے لیکر لیڈروں اور علماء میں شدید کشمکش پیدا ہو گئی تھی اس کشمکش میں بھی سید صاحب کبھی جادۂ اعتدال سے نہیں ہٹے،

سید صاحب کی اس معتدل روش کا نتیجہ تھا کہ اُن کے زمانہ کی مختلف مذہب و مشرب کی تمام اہم شخصیتوں سے اُن کے تعلقات تھے، ان سب سے ان کے ذاتی اور نجی تعلقات تھے، اور اس مدت میں کوئی ایسا قومی سیاسی، یا دینی کام نہیں ہوا جس میں سید صاحب نے کوئی اہم حصہ نہ لیا ہو، سید کرامت حسین اکبرآبادی، نواب عماد الملک، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر انصاری، گاندھی جی، موتی لال، جواہر لال، نواب فضل اللہ، سر راس مسعود، ڈاکٹر اقبال، ظفر علی خان، مولانا عبد اللہ غازی پوری، مولانا عبد الحی ناظم ندوۃ العلماء، مولانا عبد الباری فرنگی محلی، قاضی سلیمان منصور پوری، مولانا عبد الماجد بدایونی، شاہ سلیمان پھلواروی، مولانا سلمان اشرف، مولانا ابوبکر شیث، مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی، مولانا حمید الدین

فراہی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی مولانا حسین احمد مدنی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی وغیرہ جیسے مختلف الخیال، اور مختلف المذاق اشخاص سے سید صاحب کا کسی نہ کسی درجہ مین تعلق تھا،

ممکن ہو کہ ان کی اس خوبی کو کوئی شخص خامی پر محمول کرے، اگر بہر حال اس "خامی" کے پیدا کرنے کے لئے بھی بڑی عالی حوصلگی، اور وسعت ظرف کی ضرورت ہے جو بڑی مشکل سے پیدا ہوتی ہے،

سید صاحب ندوہ کی درگاہ کے لئے عملی طور پر بھی بہت کچھ کیا ہے، دارالعلوم ندوہ کی مسجد انہی کے دور کی یادگار ہے، عباسیہ ہال انہی کے دور مین مکمل ہوا، طلبہ کا دارالاقامہ انہی کی کوششون سے بنا، ندوہ کو ہزارون روپیہ کی مالی امداد تنہا ان کی کوششون سے حاصل ہوئی،

سید صاحب کو ندوہ سے جو تعلق خاطر تھا، اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ آخر عمر مین وہ ندوہ کے مقصد کے بغیر کوئی سفر کرنا بھی پسند نہین کرتے تھے، مولانا مسعود عالم صاحب کو ایک خط مین لکھتے ہین:-

"گو ڈھاکہ اور جاوا سے بلاوا تھا، مگر اب تک ندوہ کے بغیر سفر کرنے کو جی نہین چاہتا"،

ندوہ کے طلبہ مین کچھ دنون بدنظمی اور دینی احساس کی کمی ہو گئی تھی، ان کی کوششون سے جب یہ خامی دور ہونے لگی، تو ان کو حد درجہ مسرت ہوئی، اس مسرت مین مولانا مسعود عالم صاحب مرحوم کو لکھتے ہین،

"آپ سن کر خوش ہون گے کہ دارالعلوم کا رنگ بدل رہا ہے، طلبہ، ڈسپلن سے آشنا ہو رہے ہین"،

سید صاحب ندوہ کے مقاصد اور اس کے طریقۂ کار کو جامد چیز نہین سمجھتے تھے جن مین ضرورت کے مطابق کوئی تغیر نہین کیا جا سکتا بلکہ وہ اس کو ایک ترقی پذیر چیز سمجھتے تھے جس مین ضرورت کے مطابق تبدیلی کیجا سکتی ہے، انہی کو لکھتے ہین،

"ندوہ کے مقاصد و مطالب کو نئی روشنی مین پھر سے دیکھنا ہے، کہ اب کیا ہوا اور

کیا کرنا ہے"،

ندویوں کی تربیت | سید صاحب کی عین خواہش تھی کہ ان کی جیسی دینی حمیت اور جامعیت، اُن کی اعتدال پسندی اور حق پرستی، ان کا شیوۂ محبت و مسامحت ہر ندوی میں پیدا ہو جائے، وہ قدیم ندویوں کے مجمع میں ہوں یا جدید طلبائے دار العلوم کے جھرمٹ میں سب کو یہی تلقین کرتے تھے تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے، اس لئے اُن کے خط کے چند اقتباسات یہاں پیش کئے جاتے ہیں، مولانا مسعود عالم کو لکھتے ہیں،

"الفرقان میں آپ کا مضمون دیکھا، دین کی حمیت کی شان دیکھ کر خوشی ہوئی۔ میری امیدوں کے مرقعے آپ ہی جیسے چند عزیز ہیں،

مولانا مسعود عالم میں دینی حمیت اور توحید میں شدت غلو کی وجہ سے بعض مصلحین سے ان کا تعلق غلو کی حد تک ہو گیا تھا، اُن کو اس کی طرف توجہ دلاتے ہیں،

تصلب و تعصب حکم دین میں ہونا چاہیئے، نہ کہ اشخاص اور ان کے مسالک میں خواہ حنفیت ہو یا وہابیت بل ملۃ ابراھیم حنیفاً،

ایک خط میں قانون کے مقابلہ میں اخلاق کی اہمیت اور اظہار رائے میں صداقت کی طرف توجہ دلاتے ہیں:-

"میں قانون کے مقابلہ میں اخلاق زیادہ پسند کرتا ہوں،......... رائے عدل و صداقت کیساتھ دیجائے ولو کان ذا قربیٰ،

مولانا مسعود عالم ندوی نے اشتراکیت اور اسلام پر ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا، تو اُن کی ہمت افزائی کرتے ہیں، اور عہد جدید کے فتنوں کے مقابلہ پر ابھارتے ہیں،

"بہت خوب آپ نے اشتراکیت اور اسلام پر لکھنا شروع کر دیا، جی چاہتا ہے کہ جس طرح وقت کے دوسرے فتنوں کے ازالہ میں علمائے ندوہ نے کام کئے ہیں، اسی طرح وہ اس کے ازالہ میں بھی کام

کریں اور آپ لوگ اس کے اہل ہیں۔

یہ چند اقتباسات میں نے مولانا مسعود عالم ندوی کے مجموعہ مکاتیب سلیمانی سے نقل کر دیے ہیں، اس طرح کے خطوط وہ خورد و کلان ندوی کو لکھتے رہتے تھے، مولانا شاہ معین الدین صاحب ندوی کو جو اس وقت انکے علمی جانشین ہیں، اس طرح کے بیشمار خطوط لکھے ہیں، خود اس عاجز کو انھوں نے جو تربیتی خطوط لکھے ہیں، اس کا ایک ایک جملہ حرز جان بنائے رکھنے کے قابل ہے۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

# سیرتِ سلیمانی کا عرفانی پہلو

از

جناب غلام محمد صاحب بی اے حیدر آبادی

اہل اللہ کی بزمِ قدس مین تین طرح کی ہستیان نظر آتی ہین، ایک تو وہ جن کی سیرتین سر تا سر جذب و شوق اور معرفت کا آئینہ ہین، مثلاً بایزید بسطامیؒ، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، مجدد الفِ ثانیؒ وغیرہ، دوسری وہ جن کی زندگیان گو بے داغ ہین، لیکن ان کا جوہرِ عرفانی ایک عرصہ بعد کھلا ہے، جیسے امام غزالیؒ، عارف رومیؒ، شیخ فریدالدین عطارؒ وغیرہ، تیسری وہ ہستیان جن کی حیات کبھی تو عام معیارِ اخلاق سے بھی پست تھی، مگر جب انقلاب آیا، تو رشکِ تقویٰ اور معیارِ معرفت قرار پا گئی، مثلاً سید الطائفہ جنید بغدادیؒ، حضرت بشر حافیؒ وغیرہ ——— ہمارے ممدوح کا مقام اس اعتبار سے وسطانی زمرہ مین نظر آیا،

**ورثہ** انسانی سیرت دو ہی اجزا سے عبارت ہے، ایک تو موروثی صفات، اور دوسرے اکتسابی کمالات ہمارے حضرت والاؒ کو دونون جہتون سے حظ وافر ملا تھا، وہ سید زادے تھے، شرافت و مروت، عفو و درگذر ایثار و سخاوت، حلم و بردباری، عالی حوصلگی، اور پامردی حضرت کو ورثہ مین ملی تھی، پھر یہ بھی خوش بختی کی بات تھی کہ یہ صفات آپکے گرد و پیش کے بزرگون مین پوری طرح نمایان تھین اور آپ کا ماحول علم و عرفان اور طبابت جسمانی و روحانی کا سنگم بنا ہوا تھا، آپکے والد ماجد ایک عالم و طبیب حاذق اور نقشبندی ابو العلائی سلسلہ کے شیخ اور صاحبِ نسبت بزرگ تھے، راقم نے خود حضرت کو یہ فرماتے سنا کہ مین نے اپنے والد اور حضرت مولانا

تھانوی ؒ سے زیادہ بے نفس اور باہمہ ہستیاں اپنی عمر مین نہین دیکھین ، آپکے بڑے بھائی مولانا حکیم ابو حبیب جو عمر مین آپ سے ۱۲ سال بڑے تھے ، دیسنہ کے ایک مشہور طبیب جید عالم ، اور حضرت شاہ ابو احمد بھوپالی مجددی ؒ کے خلیفہ مجاز تھے ، آپ کے چچا حافظ تجمل حسین صاحب ایک صاحب حال بزرگ اور شاہ فضل الرحمن گنج مراد آبادی کے خلیفہ تھے ،

**اکتساب** اس پاکیزہ ماحول اور ان اعلیٰ موروثی صفات کے ساتھ حضرت والا رحمہ کو کسب کمالات کے بھی پورے مواقع ملے ، ابتدا ہی سے آپکے والد ماجد نے آپ کی اخلاقی تربیت کو ہمیشہ پیش نظر رکھا ، پھر آپ کے بڑے بھائی مولانا ابو حبیب صاحب نے بھی بڑی توجہ صرف فرمائی ، خود حضرت رحمہ فرماتے تھے ، کہ لڑکپن ہی مین ، مین نے اپنے بڑے بھائی صاحب رحمہ کے حسب ہدایت کچھ ذکر اور مراقبات بھی کئے ، اور ان کے حلقہ توجہ مین بھی بیٹھا کرتا تھا ، اور اُن کے فیض صحبت سے اپنے اندر پاکی محسوس کرتا تھا ، لیکن یہ باطنی پہلو اس دور مین کچھ اُبھر نہ ہو سکا ، کیونکہ اس وقت حصول علم مقدم تھا ، چنانچہ ابتدائی تعلیم مدرسہ امدادیہ دربھنگہ اور پھلواری شریف مین پائی ، اور پھر غالباً ۱۹۰۱ء مین ذہن و فکر کی آخری تربیت گاہ ندوۃ العلماء لکھنؤ مین پہنچے ، خداداد فہم و ذکا ، اور پھر مولانا شبلی کی تعلیم و تربیت نے مل کر حضرت رح کو صف علماء مین اس قدر ممتاز کیا کہ متنوع علوم و فنون کی جامعیت اور ان مین تحقیق و نظر کے اعتبار سے شاہ ولی اللہ دہلوی ؒ کے بعد اگر نظر کہین آکر ٹھہرتی ہے ، تو وہ حضرت سید صاحب ہی کی ذات گرامی ہے ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء ،

**حکیم الامت سے مراسلت کا غیبی سبب** علوم و فنون کی فضاؤن مین تخت سلیمانی تو خوب پرواز کرتا رہا ، مگر مولانا شاہ ابو حبیب صاحب ؒ کی برکت سے روحانی عالم کے جو اثرات قلب سلیمانی پر پڑتے تھے ، وہ ساری علمی مصروفیات کے باوجود قائم رہے ، اور برابر فکر لاحق رہی کہ کوئی شیخ کامل ایسا مل جائے جو روحانی پرواز مین مدد دے سکے ، عجیب بات ہے کہ اواخر ۱۹۲۹ء مین حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے ایماء سے مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے ایک رسالہ کشف الدجی لکھا ، اور اس کا ایک نسخہ تقریظ کے لئے حضرت علامہ

کی خدمت میں ارسال فرمایا، ہمارے حضرت نے اس کے جواب میں حکیم الامت کو ایک خط لکھا، اس مکتوب کی نقل یہاں طوالت کا موجب ہوگی، البتہ اس کا جواب جو حکیم الامت کی طرف سے عطا ہوا وہ اقتباساً درج ذیل ہے، اس سے طرفین کی خط و کتابت کا حال معلوم ہو جائے گا:

"مولانا المحترم دامت فیوضہم[1] السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

عجیب بات ہے کہ انبساط کا قصد نہ میرا تھا نہ جناب کا، دونوں طرف اتفاقاً ہی اس کے اسباب پیش آگئے، اُس طرف کا واقعہ تو جناب نے تحریر ہی فرمادیا، اس طرف یہ واقعہ ہوا کہ میں نے بالتعیین کسی بزرگ کے پاس رسالہ بھیجنے کو نہ کہا تھا، دو وجہ سے ایک یہ کہ مجھکو بزرگوں کی فہرست ہی بہت غیر مکمل معلوم ہے، دوسرے کسی کو ایسی تکلیف دیتے ہوئے ہمت نہیں ہوتی، خصوص اگر مبصر کلام ہو، تو بے حد حجاب ہوتا ہے، یہ رسالہ میرے ہمشیر زادہ نے لکھا، اگرچہ میرے ہی کہنے سے لکھا، چونکہ آج کل عام طبائع کی حالت پر نظر کر کے اس انتفاع کی مضرتِ عامہ کا قوی اندیشہ تھا، اور اس کے انسداد کی سب سے انفع تدبیر علماء کی موافقت حاصل کرنا ذہن میں آیا کہ عوام پر اس کا خاص اثر ہوتا ہے، اس لئے میں نے عزیز موصوف کو مصارف دیکر مشورہ دیا کہ جہاں جہاں مناسب ہو بھیج دیا جائے، میں ان کا ممنون ہوں کہ انھوں نے جناب کو بھی تکلیف دے کر یہ موقع دیا کہ میں جناب کا مخاطب بن سکا، غرض یہ واقعہ ادھر سے ہوا، بہرحال حجاب مرتفع ہونے کے بعد اب مضامین محبت کا جواب عرض کرتا ہوں، جناب کی تواضع نے ضرور مجھکو ایک معتد بہ درجہ میں معتقد بنادیا، اور غالب یہ ہے کہ آئندہ اس میں اضافہ و ترقی ہو، ...... مسئلہ کے متعلق جس عنوان سے رائے سامی ظاہر فرمائی ہے، اس سے سہل اور دل میں اتر جانے والا عنوان کم ذہن میں آتا ہے، بارک اللہ تعالیٰ معارفکم، ........

---

[1] حضرت حکیم الامتؒ کے ہاں ہر ایک کے حفظِ مراتب کا جو پاس و لحاظ تھا اس کی دلیل میں تنہا یہ مکتوب کافی ہے، حضرت علامہ

آخر میں جو خانقاہ کے متعلق اپنا انجذاب اور اس کے ساتھ کچھ موانع محتملہ کا ذکر فرمایا ہے[1]

اگر خانقاہ میں حضرت شیخ قدس اللہ سرہٗ رونق افروز ہوتے تو یہ سب مضامین حقیقت پر منطبق ہوتے، لیکن اب محض حسنِ ظن پر منطبق ہو سکتے ہیں، اس سے آگے ہیچ، البتہ میں زیادہ تکلف کرنے کو بھی اعادۂ حجاب سابق اور موہمِ انبساط لاحق سمجھکر پسند نہیں کرتا، اس لئے بلا تکلف معاملہ کی سچی بات عرض کرتا ہوں، کہ جناب کا یہ حُسنِ ظن اگر کسی روایت پر مبنی ہے تو لا یوثق بہ" اور اگر ذوقی و وجدانی ہے تو میں دوستی کرنے کے لئے تیار ہوں، بشرطیکہ مجھکو علوم میں مخاطب نہ بنایا جائے، کہ اُن سے معرّا ہونے کو اوپر ظاہر کر چکا ہوں، والصدق ینجی والسلام۔

ناکارہ آوارہ ننگِ نام اشرف برائے نام

از تھانہ بھون، ۲۸ / دسمبر ۲۹ء،

اس پہلی مراسلت کے بعد جس کے سامان غیب ہی سے ہوئے تھے، ہمارے حضرت والا نے ایک اور عریضہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی خدمت میں لکھا جس کا متعلقہ جزء یہ ہے :-

---

(بقیہ حاشیہ ص ۲۸۶) کی رائے یہ تھی: "آپ (یعنی مستفتی) جس کو مکروہ سمجھتے ہیں، میں اس کو عین بدعت کہتا ہوں، اور میرے نزدیک تو قیل وقال و روایت سے زیادہ مستحکم دلیل عمل سلف کرام ہے، کہ ایسا کھلا اور شدید الاحتیاج مسئلہ ہونے کے باوجود کسی نے اس کو جائز نہیں بتایا، اور نہ کبھی اس پر عمل کیا،

[1] حضرت علامہ نے یہ تحریر فرمایا کہ تھا: "بار بار میرا دل جب زمانہ کے فتن و حوادث سے گھبرا گھبرا اٹھتا ہے، اور بے اختیار کسی سکینت وطمانیت کے مامن کی تلاش ہوتی ہے تو خانقاہ امدادیہ کی یاد آتی ہے، لیکن ڈر تھا کہ معلوم نہیں کہ اجنبیت و بے گانگی سے میرے متعلق کیا کیا آپ تک پہنچا ہو، اور آپ مجھے مخاطب کا اہل بھی سمجھیں یا نہیں...... اب میں اس کشمکش کی منزل میں ہوں جس میں علوم ظاہری تسکین کا باعث نہیں بنتے، دعا کا طالب اور ہمت کا خواستگار ہوں"،

"میرے لئے کوئی ایسا نسخہ تجویز فرمائیں، کہ مجھ میں استقامت وتثبت اور رغبت الی الطاعات پیدا ہو، فرائض کا پابند ہوں، بدعات سے نفور ہوں، کبھی کبھی ذوقِ سجود کی لذت بھی پاتا ہوں" امام ربانی مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کے سلسلہ سے عقیدت تامہ ہے، خرافات وطاماتِ صوفیہ کا منکر ہوں ۔۔۔۔"

اس کے جواب میں حکیم الامت نے اپنے رسالہ "قصد السبیل" کی تسہیل روانہ فرمائی، اور ساتھ ہی گُر کی باتیں یہ تحریر فرمائیں جو عطرِ تصوف ہیں،

"ماموربہ وجوباً یا استحباباً اس طریق میں صرف افعال ہیں، انفعالات نہیں، مثلاً استقامت وتثبت ورغبت الی الطاعات والتزام فرائض وتنفر عن البدعات ولذت وذوق واخلاص واصلاحِ قلب وامثالہا، ان میں جو چیزیں یا بعض چیزوں کے جو اجزا افعال ہیں، وہ ماموربہ ہیں، کیونکہ وہ اختیاری ہیں، اور جو انفعالات ہیں، وہ ماموربہ نہیں، کیونکہ وہ غیر اختیاری ہیں، البتہ وہ انفعالات بعضے مطلقاً بعضے خاص احوال میں محمود وفرد ہیں، اور اسی درجہ میں مطلوب بھی ہیں، مگر وہ سب آثار وثمرات انہی افعال کے ہیں، اور وہ افعال ہی اُن کے اسباب ہیں، کہ ان کی طرف فی الجملہ یا فی الاکثر مفضی ہیں ان کے علل نہیں کہ ان سے تخلف ہی نہ ہوں، اگر تخلف بھی ہو تو مضر نہیں، کیونکہ اصل مقصود قرب ورضا کی وہ شرط بھی نہیں؛ والسلام"

(کاوٹ) مذکورہ بالا مکاتبت کے بعد ایک اور خط ان بزرگوں کے درمیان آیا، اور گیا، اور اس پر آخری تاریخ ۲۵ شوال ۱۳۴۸ھ کی ملتی ہے، انگریزی لحاظ سے ۱۹۳۰ء کا کوئی مہینہ ہوگا، اس کے بعد پھر تقریباً دس برس تک کے لئے استفادہ وافادہ کا سلسلہ منقطع رہا، اور اس کی وجہ راقم نے خود حضرت مولانا کی زبانی یہ سنی ہے کہ اس زمانہ میں تھانہ بھون سے رسالہ "النور" مولانا ظفر احمد عثمانی کے زیر ادارت نکلتا تھا، اور اعظم گڈھ

سے "معارف" جب جب حکیم الامتؒ کی خدمت مین عریضہ لکھنے کا ارادہ ہوتا تو کوئی نہ کوئی اختلافی مسئلہ تو ر مین شائع ہوتا، اور اس کی وجہ سے طبیعت مین رکاوٹ پیدا ہوجاتی،

پہلی حاضری | ۱۹۳۴ء کے ختم اور ۳۵ئہ کے آغاز کا زمانہ تھا حضرتِ والاؒ ڈاکٹر اقبال مرحوم کی دعوت پر کسی کمیٹی مین شرکت کے لئے لاہور تشریف لے گئے، اب تک مولانا تھانوی قدس سرہٗ سے کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی، لاہور سے واپسی مین خیال آیا کہ تھانہ بھون کچھ دیر کے لئے اتر جائین، چنانچہ یہ اندرونی تقاضا پورا ہوا، اور اس حاضری سے مرشد تھانوی نے جو اثر لیا، اس کو خود انہی کے جچے تلے موثر الفاظ مین سنئے، مولانا عبد الماجد دریابادی کے نام ایک مکتوب مین تحریر فرماتے ہین،

"مولانا سید سلیمان ندوی صاحب دفعۃً تشریف لے آئے، مین مکان پر تھا سنتے ہی حاضر ہوا، میرے ذہن مین ان کا جثہ طویل و عریض تھا، ملا تو معتدل الخلقت پاکر قلب کو بہت انس ہوا، پھر ملاقات و مکالمت سے اُن کی تواضع و سادگی' در عایتِ مجلس دیکھ کر تو مسخر ہی ہوگیا[ل] گیارہ بجے تشریف لائے تین بجے واپس تشریف لے گئے، مجلس مین بہت دیر تک ثنا خوانی کرتا رہا[۵۲]"

رجوع اور بیعت | اس ملاقات سے ظاہر ہے کہ فریقین کے دل محبت و عظمت سے معمور ہو چکے تھے، لیکن پھر بھی ایک عرصہ تک خط و کتابت کی صورت نہ نکل سکی، حالانکہ اس عرصہ مین سلیمانی نگاہ' مرشد کامل کے لئے برابر متلاشی تھی، اور ہر پھر اگر کہین ٹھہرتی تھی تو وہ تھانہ بھون ہی کے شیخ الشیوخ کا آستانہ تھا، اس عرصہ مین ایک مرتبہ حضرت والاؒ کو عالمِ رویا مین شیخ العرب و العجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر کیؒ کی زیارت نصیب ہوئی، حضرت سیدیؒ نے اپنے سینہ کی طرف اور حضرت حاجی صاحبؒ کے سینۂ مبارک کی جانب اپنے ہاتھ سے اشارہ

---

ل کیسے مفتری ہیں وہ لوگ جنہون نے بزعم محبت یہ مشہور کر رکھا ہے کہ سید صاحب گئے تو تھے ملنے کے لئے لیکن مولانا تھانوی نے اُن کو مسخر کر لیا، اور خود مرید بنالیا، اس بیان مین اگر مولانا تھانوی کی شکایت ہے تو سید والا مرتبت کے رتبۂ عالی کا کوئی پاس لحاظ ہے ۵۲ حکیم الامت ص۲۳۸

کرتے ہوئے عرض کیا "اس کو ایسا کر دیجئے،" حضرت حاجی صاحب مسکرائے اور فرمایا، اب تو مین یہ کام نہین کرتا۔

حضرت سیدؒ ہی کا بیان ہے کہ اس کی تعبیر یہ ذہن مین آئی کہ حضرت حاجی صاحب چونکہ عالمِ ناسوت سے تعلق منقطع فرما چکے ہین، اس لئے اُن کو عذر ہے، اور اُن کے کسی جانشین سے تعلق جوڑنا چاہئے، چنانچہ پھر نظر حکیم الامت ہی پر پڑی، ساتھ ہی اس کا بھی اعتراف فرماتے تھے کہ حکیم الامتؒ سے تعلق قائم ہونے مین مولانا عبدالباری صاحب ندوی کے اصرار کو بھی دخل ہے، غرض پھر مستقل تعلق کے اسباب یون پیدا ہوئے کہ حکیم الامت قدس سرہٗ اگست ۱۹۳۸ء مین اپنے علاج کے سلسلہ مین لکھنؤ تشریف لائے تھے، اس موقع کو حضرت والا نے غنیمت سمجھا، اور حاضر خدمت ہو کر مستقلاً رجوع ہو کر بیعت سے مشرف ہوئے،

حضرتِ والاؒ کی بیعت کے سلسلہ مین ایک واقعہ کا اظہار خالی از دلچسپی نہ ہوگا، دو معتبر راویون[1] سے احقر نے یہ بات سنی ہے کہ قطب ارشاد مولانا تھانوی جب لکھنؤ تشریف لے گئے، تو تھانہ بھون مین ایک مجذوب نے آپ کے ایک مرید سے پوچھا "تمھارے پیر کہان گئے ہین" ؟ انھون نے عرض کیا کہ علاج کے سلسلہ مین لکھنؤ تشریف لے گئے ہین، اس مجذوب نے قہقہہ لگایا، اور کہا علاج ولاج تو ایک بہانہ ہے، ایک شہباز کے شکار کو گئے ہین، وہ شکار کر لائین گے" ــــــ چنانچہ جب حضرت والاؒ کے رجوع و بیعت کی اطلاع عام ہوئی تو سب کو اس قلندر کی بات کا یقین آگیا ع

قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید

خصوصی ربط | غرض اب کیا تھا، اُدھر قوتِ فیضان جوش زن اور ادھر طلبِ صادق بے اندازہ، چنانچہ اسی اضطراب مین فرماتے ہین،

لفظ بیگانہ بھلا کیا ترجمانی کر سکے ‏ ‏ ‏ شوق بے اندازہ پنہان وہ جو میرے دل مین ہے
جام پر جام مجھے دے کے بنا دے بدمست ‏ ‏ ‏ صبر سر جوشیِ اذکار کہان سے لاؤن

[1] مراد حاجی عثمان خان صاحب مرحوم مالک کتب خانہ اشرفیہ اور محترمی ڈاکٹر عبدالحی صاحب مدظلہ ہین،

دیر سے آیا ہوں ساقی دور سے آیا ہوں میں
ہو عطائے خاص مجھکو جو عطائے عام ہے[1]

اور حضرت شیخ نے بھی اس تشنگی کو بجھانے کی پوری سعی فرمائی، بارگاہِ تھانوی کے ایک ممتاز خلیفہ مولانا مفتی محمد حسن صاحب نے کئی بار فرمایا کہ حضرت سید صاحب جب خانقاہ میں تشریف لائے تو ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی طبیعت میں ایک جوش پیدا ہو جاتا، اور معلوم یون ہوتا کہ گویا جوان ہو گئے ہیں، گھنٹہ بھر کی محفل کو دو دو گھنٹہ طول دیتے تھے، اور محترم ڈاکٹر عبد الحئی صاحب نے فرمایا کہ خود حکیم الامت مجھ سے فرماتے تھے کہ جب رات کو دو بجے آنکھ کھلتی ہے، تو جی چاہتا ہے کہ سید صاحب کو بلاؤں اور باتیں کرتا رہوں، مگر اُن کی زحمت کے خیال سے چپ ہو جاتا ہوں۔

شیخ و مرید کے اس خصوصی ربط سے متعلق کم از کم دو روایات اور سنائے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ایک مرتبہ حضرت سیدی خانقاہ میں تشریف لے جا رہے تھے محفل آراستہ تھی، حکیم الامت کی نظر جو سید والا مرتبت پر پڑی، تو بے ساختہ کھڑے ہو گئے، مرید صادق نے بڑھ کر عرض کی "حضرت تشریف رکھیں" تو ارشاد فرمایا، "واللہ میں تعظیماً کسی کے لئے نہیں اٹھتا، میں تو فرطِ محبت سے کھڑا ہو گیا"

ایک مرتبہ حکیم الامت نے ایک چھڑی تحفۂ محبت کے طور پر بھیجی، اور اس کے ساتھ ایک رقعہ بھی جس کا آغاز اس پر از محبت اور بلیغ جملہ سے فرمایا تھا :

"راحتِ جان! راحتِ جسم کا سامان بھیج رہا ہوں"

حضرت سیدیؒ نے اس عطائے شیخ کو دل و جان سے قبول فرما کر جواباً تحریر فرمایا کہ

---

[1] یہ سب اشعار حضرت سیدی کے ہیں، ان کو بطور استدلال پیش کرنے میں اس لئے تامل نہیں کہ حضرت والاؒ نے خود اپنے اس دور کے کلام کے متعلق فرمایا کہ "یہ تو میرا سفرنامہ ہے" اس کلام کا آغاز اور انجام حکیم الامت سے رجوع اور اُن کی رحلت پر ہے بعد میں بہ شکل پانچ چار غزلیں ہوئی ہیں، اس مجموعہ کا نام حضرت والا نے "غزل الغزلات" تجویز فرمایا تھا کہ یہ نام حضرت سلیمان علیہ السلام کے مجموعۂ کلام کا تھا۔ (غ)

"اس عطائے خاص سے مین نے استقامت فی العمل کی تعبیر لی"

حضرت شیخ نے جب یہ عارفانہ جواب پڑھا تو انبساط سے معمور ہو گئے، اور اس کا ایک طویل جواب تحریر فرمایا، جو سراسر دعاؤن سے لبریز تھا۔[1]

مولانا مفتی محمد حسن صاحب نے فرمایا، کہ ہم لوگون کو تعجب ہوتا تھا کہ حضرت سید صاحب کو اتنی جلد اس قدر رسوخ کیسے حاصل ہو گیا، مگر بعد کو پتہ چلا کہ یہ جوہر ہی کچھ اور تھا،

اسی اثنا مین حضرت علامہ نے حکیم الامتؒ کی تحریک اور اشارہ کے بغیر اپنے احساس سے مجبور ہو کر بعض اختلافی مسائل مین رجوع و اعتراف کا مضمون "معارف" مین شائع فرمایا اور اس کو ملاحظہ کے لئے بھیجا، تو حضرت شیخ بے حد مسرور ہوئے، اور خلافِ عادت دس بارہ توصیفی اشعار مثنوی کے وزن پر لکھ کر بھیجے،[1] چند یہ ہین :-

از سلیمان گیر اخلاصِ عمل / وان تو ندوی را منزہ از دغل

اے دلت معمور از اسرارِ حق / اے دولت مخمور از آثارِ حق

اے دلت پر نور از انوارِ حق / اے دلت مسرور از اخبارِ حق

ہم کو نہین معلوم کہ حسام الدین چلپی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد یہ سعادت بجز حضرت سیدیؒ کے کسی اور کے بھی حصہ مین آئی ہو کہ شیخ نے مرید کی مدح مین بے ساختہ اشعار کہے ہون،

---

[1] یہ دونون باتین حضرت سیدی نے احقر سے تنہائی مین ایک مرتبہ فرمائی تھین، اور پھر اس کی اجازت بھی عطا فرمائی تھی کہ احقر اس خط و کتابت کی نقل کر لے، جو حکیم الامت اور ان کے درمیان رہی، مگر مرض الموت کی وجہ سے خود یہ خزانہ نکال کر عطا نہ فرما سکے، اور حضرت کے صاحبزادہ اپنی پریشانیون مین اس سلسلہ کے ارشاد و ہدایت کی تعمیل سے قاصر رہے، ورنہ آج اس سے بڑی مدد ملتی، تین چار ابتدائی خطوط کی جو نقلین مل گئین، وہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا کرم ہے۔ [2] یہ محرم ۱۳۶۱ھ کا واقعہ ہے،

**خلافت** برسوں کی منزلیں دنوں میں طے ہوتی چلی گئیں ایک مرتبہ حکیم الامّت کی طرف سے ایک گرامی نامہ وصول ہوا جس کا عنوان تھا "استشارہ بعد از استخارہ" اور اس میں لکھا تھا کہ "میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کو خلافت دوں اس سلسلہ میں میں نے استخارہ بھی کر لیا اب آپ کا کیا مشورہ ہے، ؟ حضرت سیدیؒ نے فرمایا کہ چونکہ قریب ہی میں تھانہ بھون کی حاضری کا قصد تھا، اس لئے میں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا، بلکہ جب حاضرِ خدمت بھی ہوا تو خاموش ہی رہا، آخر ایک دن حضرت والا کی طرف سے ایک پرچہ ملا کہ آپنے میری استشارہ کا جواب نہیں دیا" ۔۔۔ اس اصرار پر میں نے یہ جواب لکھا کہ

"حضرت والاؒ کا مکتوبِ گرامی پڑھ کر قدموں تلے سے زمین نکل گئی کہاں میں اور کہاں یہ ذمہ داری"[1]

بس یہ جواب پانا تھا کہ شیخ الشیوخ کے قلب سے الحمد للہ کی ایک صدا اٹھی اور سید والا مرتبتؒ کو خلافتِ باطنی سے سرفراز فرما کر مسند ارشاد پر بٹھایا ۔۔۔۔ اور اس بات کے راوی حضرت حاجی عثمان خان صاحب مرحوم ہیں جو حکیم الامّتؒ کے فدائی اور خلیفہ مجاز تھے کہ حضرت سید صاحب کو خلافت عطا فرما کر حضرت والاؒ اس قدر مطمئن تھے کہ بارہا فرمایا کہ الحمد للہ اب مجھے کچھ فکر نہیں، میرے بعد ایسے ایسے لوگ موجود ہیں، ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ،

**شور و غوغا** حیرت ہے کہ عین اس وقت جب کہ بارگاہِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا سیرت نگار اپنے ممدوح کی حیاتِ طیبہ کے آخری نقش و نگار سے اپنی زندگی کو آراستہ کرنے میں مشغول تھا، بے بصروں نے اس کے خلاف ایک شور و غوغا بپا کیا کہ علامۂ عصر نے مسندِ علم چھوڑ دی ہے عین اس وقت جب کہ "وہ آبروئے ندوہ" اپنے ساتھ ایک جماعتِ کثیر پیدا کر کے اور اس کو بہ سرِ کار لگا کر فسبّح بحمد ربک واستغفرہ کی منزل طے کر رہا تھا بعض نادانوں نے اوس کے اس عمل کو تعطّل قرار دیا، اعین اس وقت جب کہ وہ پیکرِ عبودیت اُن ساری خدماتِ علمیہ

---

[1] یہ سب روایت بالمعنی سمجھی جائے، مگر مفہوم کی صحت میں کوئی کلام نہیں۔ (ا۔غ)

سے فارغ ہو کر جو ایک ادارہ سے بھی ممکن نہ تھیں، فاذا فرغت فانصب والیٰ ربک فارغب کے حکم کے آگے سرنگوں ہو رہا تھا، مدعیانِ دانش نے اس پر اعتراض کیا کہ یہ شغل کیسا؟ — لیکن اس عارف نے اس سارے شور وغل کا جواب اپنے عمل کے استحکام اور معنی خیز تبسم کے ساتھ یہی دیا،

دستارِ فضیلت ہو یا دلقِ مرقع ہو
ہونا ہے اُسے اک دن نذرِ مئے و میخانہ

کبھی خود ماننے والوں نے زیادہ شور مچایا، تو صرف اتنا فرمایا کہ لوگ مجھکو کہتے تو محقق اور علامہ ہیں، مگر درحقیقت بے عقل جانتے ہیں، — اور اگر کبھی کسی نے زیادہ احسان جتایا، تو صاف یہ جواب لکھ دیا کہ جن کمالات کی بنا پر آپنے مجھے اپنا قبلہ بنایا تھا، انہی کمالات نے مجھکو مولانا تھانوی کے آگے جھکا دیا، مین نے اپنے انجام کی فکر کر لی، اب آپ کو اختیار ہو کہ اپنا قبلہ کوئی اور تجویز کر لین،

یہ ہنگامہ کوئی نیا یا ہمارے سید ذی شان کے ساتھ خاص نہین، عرفاء و اتقیاء کی تاریخ مین ایسی اور بھی مثالین مل جاتی ہین، — عارف رومیؒ نے جب شمس تبریزؒ کا دامن تھاما تھا، تو کیا خود مولانا رومؒ ہی کے شاگردون نے شمس تابان پر دھول جھونکنے کی کوشش نہین کی؟ اور کیا بالآخر انہی ناقدرون کے ہاتھون عارف رومیؒ کو مدتون باد یہ پیمائی نہین کرنی پڑی؟ — اسی طرح امام غزالیؒ کو بھی اس مرحلہ پر پہنچ کر کیا کچھ نصیحتیں سننی نہ پڑین، خود امام عالی مقام ہی کی زبانی کچھ روداد سنیئے:-

"علماء اور ارکان سلطنت کو جب خبر ہوئی تو سب نے نہایت الحاح کے ساتھ روکا اور حسرت سے کہا کہ یہ اسلام کی بدنصیبی ہے، ایسی نفع رسانی (یعنی درس و تدریس) سے آپ کا دست بردار ہو جانا شرعاً کیونکر جائز ہو سکتا ہے؟ — تمام علماء و فضلاء یہی کہتے تھے لیکن مین اصل حقیقت کو سمجھا تھا، اس لئے سب کو چھوڑ چھاڑ دفعۃً کھڑا ہوا، اور شام کی راہ لی[1]"

---

[1] الغزالی از علامہ شبلی نعمانی،

کیسی یکسانیت ہے عارف رومیؒ و امام غزالیؒ، اور اسی دور کے سید العلماء والصلحاء، مسند نشین شبلیؒ واشرفؒ میں، !!

**فناء الفناء** سچ کہا ہے ایک صاحبِ نظر نے کہ حضرت سید صاحب کو عروج کی حالت میں تو لوگوں نے کچھ پہچانا بھی، مگر نزول کے عالم میں کوئی سمجھ ہی نہ سکا کہ ان کا کیا مرتبہ ہے[1]، راقم بلا خوف تردید عرض کرتا ہے کہ حضرت والا کا پہلا قدم وہاں پڑا جو بہت سوں کی انتہا ہے، تفصیل کا موقع نہیں، فنی زبان میں مختصراً یہ سمجھ لیجئے کہ ایک شہرۂ آفاق محقق و مفکرِ اسلام اور ایک مرجع علمائے عصر شخصیت کا کسی شیخ وقت کے آگے اپنے آپ کو پیش کر دینا ہی اس امر کی بین دلیل ہے کہ وہ مرتبۂ نفس سے گذر کر مرتبۂ روح میں داخل ہو گیا، اور مرتبۂ نفس کا طے کر لینا بلا مبالغہ بہت سوں کی منتہا ہے، ـــــ پھر جب اس منزل پر بھی حضرتِ والاؒ نے اپنے شیخ عالی مقام سے عرض کیا کہ حضرت کچھ نصیحت فرما دیجئے، تو حکیم الامتؒ کا خود بیان ہے کہ وہ کچھ دیر کے لئے سوچ میں پڑ گئے کہ ایک عالم عصر کو کیا نصیحت کریں، کچھ سمجھ میں نہ آیا تو یہی فرما دیا کہ اس راہ کی ابتداء و انتہا فنا ہے[2]، یہ بات خاطرِ سلیمانی میں اس درجہ جم گئی، اور اس کے بعد اپنے آپ کو اسی قدر مٹایا کہ خود مٹنے کا احساس بھی جاتا رہا" فنا سے گذر کر فناء الفناء تک پہنچ گئے، مدح و ذم ایک ہو گئی، مفوضِ کامل بن گئے، خود حضرت حکیم الامت کے متعدد خلفائے اجل مثلاً حضرت مفتی محمد حسن صاحب، مولانا محمود الغنی صاحب، حاجی محمد عثمان خان صاحب مرحوم، مولانا عبد الباری صاحب ندوی، ڈاکٹر عبد الحی صاحب، مولینا مسیح اللہ صاحب وغیرہ کو راقم نے اس معاملہ میں ایک زبان پایا کہ حکیم الامت قدس سرہ سے فنائیت کا درس جیسے حضرت سید صاحب نے حاصل کیا، اور جو کمال اس مرتبہ میں پیدا کیا، وہ کہیں اور نظر نہیں آتا، ـــــ مثالیں اس کی چند ہو تیں تو نقل بھی کرتا، یہ تو ایک مستقل باب ہے،

---

[1] یہ ڈاکٹر عبد الحی صاحب مد ظلہ کا جملہ ہے، [2] یہ واقعہ تفصیلاً "اشرف السوانح" میں موجود ہے، مگر بغیر نام کے صرف ان الفاظ کے ساتھ کہ "ایک فاضل اجل نے مجھ سے نصیحت کیلئے فرمایا"!

ع : سفینہ چاہئے اس بحرِ بیکران کے لئے

بس اس وقت تو بزرگون کی تصدیقات ہی پر یقین کر لیجئے !

صبر و شکر | حیاتِ سلیمانی کا بڑا حصہ "شکر" ہی کا آئینہ ہے، علم و فضل، عزت و عظمت، دولت و ثروت ہر اعتبار سے ہمیشہ سرافراز رہے، مگر آخر عمر کے دس برس مین اپنون کی ناقدری و ناسپاسی، اپنے محبوب ادارہ دارالمصنفین سے جدائی، تقسیمِ ہندوستان کے بعد کراچی کا قیام[1]، اور پھر ان کی مالی اور ذہنی پریشانیان یہ سب ایک مستقل مجاہدِ اضطراریہ تھا، پھر شدید شدید بیماریون کا سلسلہ اس سے الگ ہی ــــ یہ وقت صبر کی آزمایش کا تھا، اور دیکھنے والون نے حضرت سلیمانؒ کے ظرفِ عالی کو دیکھا کہ وہ کس وقار اور متانت سے یہ مقام بھی طے کر گئے"

مجھے ایک معتقد کی حیثیت سے یہ بات کھٹک جاتی تھی کہ ایک پیکرِ مروت و شرافت اور ایک مرنجان مرنج ہستی کے خواہ مخواہ لوگ کیون درپے آزار ہو گئے تھے؟ حضرت سیدی کی رحلت کے بعد اپنا یہ استعجاب استاذی و مخدومی مولانا مناظر احسن گیلانی مدظلہ کی خدمت مین پیش کیا، اس کا جو عارفانہ جواب حضرت گیلانی کی طرف سے ملا، اس سے رنج و غم کے بادل چھٹ گئے، آپ بھی اس کو سُن کر بصیرت و سکینت حاصل کیجئے،

"ہمارے سید الملت قدس اللہ سرہ العزیز کی صبّاریت، کے جن حالات کی طرف آپنے اشارہ فرمایا ہے، اُن کا تعلق سچ پوچھئے تو اس جہان سے زیادہ نہ تھا، اُن کی زندگی کا بڑا حصہ شکوریت کے زیر اثر گذرا تھا، صباریت کی منزلین رہی جاتی تھین، زندگی کے آخری دور مین ان منزلون سے بھی وہ گذر گئے، اور خوب گذرے، صرف علامہ، ڈاکٹر، اور اعظم المصنفین ہی ہونا اُن کے لئے مقدر نہ تھا،

سید العارفین بن کر رفیق اعلیٰ بن قدرت نے ان کو بلانا چاہا، اسی کا نظم کیا گیا، ـــــ

[1] اس کی کچھ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو احقر کا مضمون "علامہ سید سلیمان ندوی اور کراچی کے تین سال" جو ریاض کے خصوصی نمبر بابتہ ماہ مارچ ۱۹۵۵ء مین چھپا ہے۔

.........اذیت نہ ہو تو صبر کا مطلب ہی بے معنی ہو جاتا ہے، صباریت کے اس دور میں

اُن کو اذیت ہوئی، اور کافی اذیت ہوئی، لیکن جس راہ پر اب پڑ چکے تھے، اُس راہ کی ہر اذیت

دوسرے عالم کی مسرتوں کی ضمانت بنتی چلی گئی، انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب"

یہ شعر نہیں لاہوتی حقیقت ہے"

(مکتوب مورخہ ۱۵ فروری ۵۴ئہ)

جود و سخا

بخشش و عطا بزرگوں کا ایک خاص وصف ہے، بعض بزرگوں میں یہ وصف عیاں ہے، اور بعض میں مخفی، بھوپال کی حاضریوں میں اور کراچی کے دوران قیام میں احقر کو اس کا اندازہ ہو گیا تھا، کہ حضرت والا چھپے چھپے بڑے اعتدال سے مالی ایثار فرمایا کرتے ہیں، لیکن رحلت کے بعد میرے ساتھ ایک عجیب معاملہ پیش آیا جس سے شیخ کے دستِ کرم کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے، مرض الموت سے کچھ قبل احقر نے اپنی مالی پریشانیوں کا اظہار کیا تھا اور اس سے مقصود بھی بجز حصولِ دعا کے اور کیا ہو سکتا تھا، پھر مرض الموت میں تو اس کا ذکر بھی بے جا تھا، لیکن وہ سراپا مہر و کرم ہستی، اس ناکارہ کے حال پر اس درجہ متوجہ تھی کہ میری پریشانی کا خیال آخر وقت تک قائم رہا، اور اس درد کی درمانی کئے بغیر چین نہ آیا ____ رحلتِ شیخ قدس سرہٗ کے شاید ہفتہ بھر بعد حضرت کی اہلیہ محترمہ مدظلہا نے ایک بند لفافہ اس ہدایت کے ساتھ عنایت فرمایا کہ گھر جا کر اس کو کھولئے ____ میں یہی سمجھتا رہا کہ شاید کوئی راز کے کاغذات ہوں، یا حضرتِ والا کے مکتوبات، لیکن گھر پہنچ کر جو لفافہ کھولا، تو اس میں یہ خط دیکھ کر آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، اور پھر رقت طاری ہو گئی :-

"عزیز القدر سلمہ ____ السلام علیکم

"مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ، بجز صبر کے انسان اور کیا کر سکتا ہے، حضرت مولانا جب حیات تھے، تو اکثر و بیشتر آپ کو ایک ہزار روپیہ ہدیہ دینے کو کہا کرتے تھے، مگر میں اپنی غفلت یا اُن کی علالت کا الجھاؤ کہیے کہ اُن کی حیات میں پورا نہ کر سکی، اب یہ اُن کی خواہش کے مطابق آپ کو ہدیہ کر رہی ہوں،

آپ اس کو قبول کر کے ممنون فرمائیں، آپ کو یہ رقم دے کر میرا قلب بہت مطمئن ہے، اور اللہ پاک کی رحمت سے اُمید ہے کہ اُن کی روح کو بھی مسرت اور سکون ہوگا، رب رحیم اُن کو اعلیٰ مرتبہ عطا فرمائیں، میرے خاتمہ بالخیر کے لئے ہمیشہ دعا کیجئے،

والسلام "والدۂ سلمان"

خدا جانے فیض روحانی کے ساتھ ساتھ جود وسخا کے دریا بھی کتنے بہائے گئے، — قدس اللہ اسرارہٗ،

**کشف والہام** | کشف والہام اور کرامت جیسی نہ مقصود ہیں نہ مطلوب، نہ اُن کو قربِ الٰہی میں کوئی دخل ہے البتہ بقول حکیم الامتؒ یہ قرب سے ناشی ضرور ہیں، اور جو حضرات اِن کی اہمیت کی نفی کرتے ہیں، وہ ان باتوں سے کچھ خالی نہیں — حضرت مرشدیؒ کی خدمت میں جو لوگ حاضر ہوتے رہے، وہ سب اس بات کو محسوس کرتے رہے کہ جو اشکال ذہن میں لے کر گئے، شیخ نے از خود ایک جملہ میں اس کا جواب عطا فرمایا، اور عرض معروض کی نوبت ہی نہ آئی، حتیٰ کہ بعض مرتبہ یہ بھی ہوا کہ کئی کئی افراد کے ذہن میں مختلف نوعیت کے شبہات تھے، اور حضرت شیخ نے جب گفتگو فرمائی، تو ہر ایک کے شبہہ کا ازالہ ہوگیا، حالانکہ کسی نے اس کا اظہار نہ کیا تھا، — "جگ بیتی" سنانے کے لئے تو ایک مستقل باب کھولنا ہوگا، "آپ بیتی" کا ایک جزو پیش کرتا ہوں:

ستمبر ۱۹۴۷ء میں پہلی مرتبہ حضرت شیخ کی خدمت میں بھوپال حاضر ہوا، دو دن بعد ذہن میں یہ وسوسہ آیا کہ یہاں آنے سے حاصل کیا ہوا، یہ نماز روزہ[1] تو گھر پر بھی ہو ہی رہا تھا —— اس وسوسہ سے بچنے کی وہ تمام تدبیریں اختیار کرلیں جو حضرت حکیم الامتؒ نے تجویز فرمائی ہیں، لیکن وسوسہ تھا کہ بڑھتا ہی چلا جارہا تھا، حتیٰ کہ ۲۴ گھنٹہ اس خیال پر گذر گئے، اور میں نے حضرت والاؒ سے اس سلسلہ میں کچھ عرض نہ کیا، دوسرے دن عصر کی نماز کے لئے حضرت والاؒ مسجد جارہے تھے، احقر بھی ساتھ تھا، چلتے چلتے دفعتہً رُکے، چیں بہ جبیں ہوکر احقر کی طرف دیکھا، اور فرمایا: "تو آپنے مجھ پر کوئی احسان کیا" — بس یہ فرماکر پھر آگے بڑھ چلے،

---

[1] یہ رمضان کا مہینہ تھا،

احقر کو یوں محسوس ہوا کہ کسی نے سر پکڑ کر خوب اچھی طرح جھنجھوڑ دیا، اور وہ وسوسہ کافور تھا! - بعد افطار جب حقیر نے اپنی اس حالت کا ذکر کیا، تو متبسم ہوئے، اور فرمایا:

"ہمارے حضرت والا رح فرماتے تھے کہ جہاں خزانہ ہوتا ہے، چور وہیں نقب لگاتا ہے"

انشاء اللہ آپ کو فائدہ ہوگا"

دوسری مرتبہ مارچ ۴۹ء میں پھر خدمتِ شیخ میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی، حضرت والا کچھ بیمار تھے، ایک روز پلنگ پر جو کمرہ کی دیوار سے متصل لگا ہوا تھا، دیوار ہی کی طرف رُخ کر کے لیٹے ہوئے تھے، خادم سرہانے کے قریب بیٹھا ہوا تھا، میرے دل میں اپنے شیخ کی عظمت و محبت کے خیالات موجزن ہوئے، یکایک حضرت اقدس نے کروٹ بدلی اور مسکرا کر احقر سے فرمایا،

"آپ تو بس یہ سمجھئے کہ پیرِ من خس است و لے اعتقادِ من بس است"

یہیں قیام کراچی کے دوران میں میں نے حسبِ عادت اپنا ایک احوال نامہ (جو ملفوف تھا) پیش کیا، اس میں کچھ علمی الجھنوں کا ذکر تھا، — بس جوں ہی عریضہ ہاتھ میں لیا، فرمانے لگے،

"معلوم ہوتا ہے فلسفیانہ کتابیں آج کل زیرِ مطالعہ ہیں، اُن کو چھوڑیئے، اس میں کیا رکھا ہے!"

احقر کے والد ماجد سلسلۂ نقشبندیہ سے منسلک ہیں، اور مولانا سید عبداللہ صاحب مجددی حیدرآبادی صاحبِ زجاجۃ المصابیح کے مرید رشید، وہ فرمایا کرتے ہیں کہ حضرت والا کا مکاشفہ بھی بڑا زبردست تھا، گو وہ اس کا اظہار نہیں فرماتے تھے!

اور یہ تو حاضری کا معاملہ ہوا، ورنہ حضرتِ والا کے سارے منتسبین خواہ وہ ہندو پاک کے کسی گوشہ میں ہوں اس برکت کو ہمیشہ محسوس کرتے رہے کہ کیسی ہی باطنی الجھن اور پریشانی ہو، جہاں حضرت رح کی خدمت میں خط لکھا، اور ڈاک کے حوالہ کیا کہ وہ ساری تشویش سکینت سے بدل جاتی تھی، اور احقر کے ساتھ تو حضرتِ والا کے آخر حیات میں یہ معاملہ رہا کہ جب کوئی الجھن پیش آئی اور عریضہ لکھنے بیٹھا کہ اس کا جواب

خود بخود ذہن میں آگیا، ایک مرتبہ حضرت والا سے یہ کیفیت عرض کی۔ اور معذرت کی کہ اسی وجہ سے ایک عرصے کوئی احوال نامہ پیش نہ کرسکا، تو فرمایا:- "بھئی اس پر تو شکر ادا کیجئے، معذرت کی کیا بات ہے!"

**بحیثیت شیخ محقق**

اب تک حضرت والا سے متعلق جو کچھ عرض کیا گیا وہ اُن کی نیکی و پاکی، تقویٰ و طہارت، محبت و معرفت کا ایک بالکل اجمالی تذکرہ تھا، لیکن اہلِ فن جانتے ہیں کہ ہر زاہد و عابد اور ولی اللہ کا ایک مصلح و شیخ محقق ہونا بھی کوئی لازمی امر نہیں، تربیت روحانی کے لئے فن تربیت سے مناسبت اور اس میں درک نہایت ضروری ہے، ہمارے حضرت والا جہاں میدان علم کے شہسوار تھے، وہاں فنِ تصوف میں بھی "شیخ محقق" کی شان رکھتے تھے اور ان کے فیوض ہند و پاکستان کے طول و عرض میں جاری و ساری تھے بلکہ رنگون تک کے بھی منتسبین کا حال راقم کے علم میں ہے، اس سلسلہ میں مختصراً صرف چند اقوال نمونۃً پیش ہیں، جن سے اُن کی شانِ تحقیق کا اندازہ ہوگا،

ایک مرتبہ راقم نے عرض کیا کہ حضرت عمل پر توجہ الحمد للہ دوام ہے، لیکن اس کی عدم قبولیت کا گمان ہوتا ہے تو فرمایا:-

"خوب اپنے احوال کو اللہ میاں کے سر تھوپ دیا، اُن کی رضا و قبولیت کا حال تو دوسری دنیا میں معلوم ہوگا، یہاں تو صرف عمل مقصود ہے، عمل میں لگے رہئے"!

پھر عرض کیا کہ حضرت قرب کے آثار کچھ تو یہاں بھی ظاہر ہوتے ہوں گے؟ —— ارشاد ہوا:-

"یہ بھی بندے ہی کے ظنون میں بڑے سے بڑے ولی کا بھی جو اعتقاد ہے وہ محض ظن غالب کی بنا پر ہے، اور اپنے میں آثارِ قبولیت تلاش کرنا عجب ہے، کیسے آثار اور کیسی بزرگی، اس راہ میں تو اپنے آپ کو مٹانا ہی اصل شے ہے!"

ایک مرتبہ احقر نے تنہائی میں بعض اپنے احوال عرض کئے، تو ارشاد فرمایا:-

"میرے ساتھ تو روزانہ کا یہ معاملہ ہے کہ جب سوتے وقت لائٹ بند کردیتا ہوں تو سارا کمرہ

نور سے معمور دکھائی دیتا ہے، مگر میں فوراً آنکھیں بند کر لیتا ہوں کہ ہر آنچہ می شود ہمہ غیر خدا ست"

ایک مرتبہ اذکار و اشغال کا تذکرہ تھا، تو ارشاد فرمایا کہ سلطان الاذکار، شغل اشد، کشف قبور، اور اس قبیل کی چیزیں تصوف نہیں ہیں، بلکہ تصوف کا آرٹ ہیں، آرٹ میں حقیقت کہاں؟ تصوف کا مقصود تو صرف حصول رضائے الٰہی اور اتباعِ سنت ہے، ہاں اس سلسلہ میں از خود کوئی بات حاصل ہو جائے تو وہ اور بات ہے!

اسی طرح یہ بھی فرمایا کہ "مثنوی مولانائے روم بھی تصوف نہیں بلکہ فلسفہ تصوف ہے" اور فلسفہ سے بگڑے ہوئے دماغوں کا علاج ہے نہ کہ ہر ایک کا، اس سلسلہ میں احقر نے عرض کیا کہ مثنوی کے پہلے دو اشعار میں جو بات بیان کی گئی ہے وہ تو ایک حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ عالم ارواح میں ایک مقام حق تعالیٰ کے قرب کا حاصل تھا جہاں وعدۂ الست لیا گیا، تو کیا عجیب جواب مرحمت ہوا فرمایا،

"مقام مستقل ہوتا ہے جس کا ذکر آپ کر رہے ہیں، وہ تو ایک کانفرنس تھی جو بادشاہ نے طلب کی تھی، وہ مقام کیسے ہو گیا؟

ایک محفل میں حضرت شیخ اکبر اور حضرت مجدد الف ثانی رحمہما اللہ کا ذکر آیا، تو حضرت سیدیؒ نے کیسی گر کی بات بتائی، ارشاد فرمایا:

"شیخ محی الدین ابن عربیؒ نے توحید کی تعلیم پر زور دیا، اور اس کو فلسفیانہ انداز میں پیش فرمایا، اُن کی اصطلاحات کے ذریعہ جو ضلالت پیدا ہوئی وہ توحید کی راہ سے آئی اور لوگ اناالحق کے مدعی بن گئے، اور حضرت مجدد الف ثانی نے اتباعِ سنت پر زور دیا، مگر ساتھ ہی نبوت کی فلسفیانہ توضیح و تشریح پیش فرمائی، اس کے ذریعہ جو ضلالت آئی وہ نبوت کی راہ سے آئی، اور انا النبی اور انا مہدی کہنے والے پیدا ہوئے"

ایک دفعہ احقر سے سوال فرمایا کہ فنا فی الشیخ کے کیا معنی ہیں، احقر نے عرض کیا کہ شیخ کی محبت جب ہر محبت

پر غالب آجاتی ہیں تو اسی کا نام "فنا فی الشیخ" ہے، فرمایا کہ یہ تو ابتدائی کیفیت ہے، فنا فی الشیخ" ہوجانے کے اصل معنی تو یہ ہیں کہ اپنے احوال و واردات بھی وہی ہوجائیں، جو شیخ کے ہیں، چنانچہ ہمارے مولانا عیسیٰ صاحب فانی فی الشیخ تھے!

**رویا اور تعبیر رویا** | مسلکِ اشرفیہ میں خواب کو کچھ زیادہ اہمیت حاصل نہیں، ایک مرتبہ حضرت سیدیؒ نے ارشاد فرمایا کہ "اخلاق ہی سے قرب حاصل ہوتا ہے، اچھے اچھے خواب یا محض کثرتِ نوافل سے قرب نصیب نہیں ہوتا، حتیٰ کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں رویت بھی گو بہت بڑی بات ہے، مگر قربِ حق پر دلالت نہیں کرتی، بلکہ اس کا منشا صرف یہ ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ آپ کی اتباع کی جائے، چنانچہ اگر رویت کے بعد اصلاحِ اخلاق کی زیادہ فکر نہیں کی گئی، اور محض رویت پر بزرگی کا خیال ہوگیا، تو پچھلی حالت بھی سلب ہوجاتی ہے: — یہ تو امر واقعہ کا ذکر ہوگیا، ویسے ہمارے حضرت والا کو تعبیر رویا کا خاص ذوق حاصل تھا، دو ایک نمونے ذیل میں پیش ہیں، اہلِ فن کو ابنِ سیرینؒ کی یاد آجائے تو کوئی عجب نہیں،

راقم کی اہلیہ نے خواب میں دیکھا کہ سر کے بال سفید ہوگئے، یہ خواب جب خدمتِ شیخ میں عرض کیا گیا تو جواب ملا:-

"شاید اولاد کی بشارت ہو، واشتعل الراس شیبًا"

اس تعبیر کو پاکر تحقیق کی گئی تو بات بالکل صحیح تھی، — اب ایک خواب اس نامہ کارہ کا اور اس کی تعبیر سنیئے:-

راقم نے دیکھا کہ وہ اور مولینا سید عبدالجبار صاحب (حال مفسر ریڈیو پاکستان) راستہ سے چلے جا رہے تھے کہ ایک کافر عصبیت سے تڑپتا ہوا دکھائی دیا، میرے دل میں ہمدردی کا خیال پیدا ہوا ہی تھا کہ میری ہڈیوں کا ڈھانچہ ایک لکڑی کے تختہ پر ہوا میں معلق ہے، اور اس کافر سے قریب ہونا چاہتا ہے مگر ہو نہیں سکتا، اس کے ساتھ ہی یہ بھی محسوس کیا کہ اپنے گوشت اور پوست کا پورا مجسمہ اپنے کندھے پر ڈالے

مولانا کے ساتھ چلا جا رہا ہوں آبادی بہت دور ایک قبر قد آدم سے زیادہ گہری کھدی ہوئی تھی، راقم نے اپنے گوشت و پوست کی لاش کو اس کے اندر ڈال دیا، اور پھر ہم دونوں نے جلدی جلدی قبر کو مٹی سے بھر دیا۔ اس کے بعد آنکھ کھلی تو طبیعت میں ایک سکون تھا، ــــ اس کی تعبیر جو ملی، ملاحظہ ہو،

"یہ کافر نفس امارہ ہے، آپ کی اپنی لاش، آپ کا مرتبہ فنا کے قریب ہونے پر دال ہے، حدیث میں ہے، عدّ نفسک من الاموات یہ کیفیت اسی مرتبۂ فنا کی طرف اشارہ کرتی ہے، بحمد اللہ"

**حضرت کا آخری حال** احقر کے فہم ناقص میں حضرت والا کا رنگ چشتی نہیں بلکہ نقشبندی تھا، وجد و حال کی جگہ سکون و وقار، قیل و قال کی جگہ اتباع سنت کا اہتمام حضرت کا خاص شعار تھا، پھر بھی منصب ارشاد پر متمکن ہونے کے بعد چند برس تک یہ حالت تھی کہ جب بولنے پر آتے تو سوز و گداز کے دریا بہا دیتے ہیں آہ! آج بھی اس تقریر کی یاد سے ایک کیفیت طاری ہو رہی ہے، جب حیدرآباد میں مولوی محمد مظہر صاحب مرحوم کی کوٹھی پر یہ احقر بھی حاضر تھا، اور مولانا سید عبد الجبار صاحب (حال مفسر ریڈیو پاکستان) کے علاوہ اور بھی چند عقیدت کیش موجود تھے، شیخ نے نہ جانے کس سوز میں ڈوب کر فرمایا،

"اللہ تبارک و تعالیٰ کے پاس کس چیز کی کمی ہے، مقام صدیقیت کیوں نہیں طلب کرتے یہ تو آپ کے ظرف کی کوتاہی ہے، حوصلوں کو بلند کیجئے"

ان جملوں سے سارے حاضرین محفل کی آنکھیں اشکبار اور دل شعلۂ فگار ہو گئے تھے، لیکن آخر کے تین چار برس میں دریائے پر شور ایک بحر ذخار بن گیا تھا، دراصل سنہ ۵۰ء کے حج بیت اللہ کے بعد حضرت والا کو عبدیت کاملہ اور نزول تام حاصل ہو گیا، اور پانی اس تپش پر پہنچ گیا کہ بظاہر جوش کے سارے آثار ختم ہو گئے ہاں جو چھو لیتا اس کو پتہ چلتا کہ حقیقت حال کیا ہے!

دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اپنی ساری نزاکت و نفاست طبع کے باوجود حضرت والا پر دوران قیام مکہ

عبودیت کا اس قدر غلبہ رہا کہ صرف ایک کرتہ اور پاجامہ یا تہمد میں ملبوس برہنہ پا چلچلاتی دھوپ میں طواف کرتے دکھائی دیتے تھے، اور اس پیرانہ سالی و ضعف قویٰ کے باوجود اپنا سارا کام خود ہی کرتے تھے' راقم نے خود حضرت سے سنا کہ ایک روز اسی سادگی سے صحن حرم میں بیٹھے تسبیح پڑھ رہے تھے کہ کسی عرب عالم نے سلام کیا، اور پوچھا کہ اے شیخ ہم نے سنا ہو کہ آج کل آپ تصوف کا شغل رکھتے ہیں ؟ — حضرت فرماتے تھے کہ اس وقت کچھ تائید غیبی ایسی شامل حال ہوئی کہ مسلسل آدھ گھنٹہ تک قرآن و حدیث ہی کی تائیدات سے تصوف کو ثابت کرتا چلا گیا، جس کا ماحصل یہ تھا کہ رذائل نفس سے پاکی اور فضائل اخلاق کا حصول واجب ہے، وہ عرب عالم اس گفتگو سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ انھوں نے اقرار کر لیا کہ اگر تصوف یہ ہے تو اس سے کس کو انکار ہے ——— غرض مکہ معظمہ میں شیخ کو جو فیوض حاصل ہوئے اور جو انشراح نصیب ہوا، اس کا اندازہ ان کی نظم کے دو ایک شعر سے لگا لیجئے، جو اسی فضا میں کہی گئی تھی فرماتے ہیں

دیدۂ دل اگر ہو باز، راز رہے نہ راز میں　　جھانکتی ہیں حقیقتیں آئینۂ مجاز میں
اس کے کرم کے ہیں نثار اسکی عطا کا کیا شمار　　دیدیا عاصیوں کو بار اپنے حریم راز میں

اب مکہ معظمہ سے فارغ ہو کر دیار رسولؐ میں پہنچے، بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر سیرت نگار رسول نے چند نعتیہ اشعار کہے، جس پر شیخ کے کلام کا غالباً خاتمہ ہے، اس نعت کا آخری شعر ان کی حالت کا آئینہ دار ہے استدعا کرتے ہیں،

بجھ جائے تیرے چھینٹوں سے اے ابر کرم آج
جو آگ مرے سینہ میں مدت سے دبی ہے

عاشق رسول کی یہ استدعا قبول ہو گئی، ایک رات حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے، اپنے آپ کو قدوم رسالت پر گرا دیا، رحمت عالمؐ نے اپنے فدائی کو اٹھا لیا، اور ایک طویل دعا پڑھ کر سینہ پر دم کر دی ——— حضرت والا کی آنکھ کھلی تو حضور انور کی دعا یاد تھی اپنی اہلیہ

محترمہ کو بلا کر وہی دعا اُن پر دم کر دی، اور پھر سارا ماجرا سنایا، —— غالباً اس واقعہ کے بعد ہی وہ سکون خاطر اور عبدیت مطلقہ نصیب ہوئی، جو تا آخر حیات قائم رہی، —— اور اس نزول تام کی وجہ سے ان کی عظمت و مرتبت کی معرفت ہی مشکل ہو گئی، مولانا محمود الغنی صاحب سہارنپوری ثم پاکستانی جو حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے قدیم خلفاء میں سے ہیں، اکثر فرمایا کرتے تھے کہ لوگ مولانا کو تو پھر بھی پہچان لیں گے، مگر حضرت سید صاحب کے کمال کو پہچاننا بہت دشوار ہے، اور پھر فرمایا کہ ایک مرتبہ حضرت سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، اور سلام کر کے کمرہ میں داخل ہی ہوا تھا کہ وہ کیفیت محسوس ہوئی، جو حضرت حکیم الامت کی کی رحلت کے بعد پھر کبھی حاصل نہ ہوئی تھی،

اب آخر میں دو لفظ مرض الموت سے متعلق عرض کر کے اس صحبت کو مجبوراً ختم کرنا ہے، ۲۲/ نومبر ۵۳ئہ کے دن (جس کے بعد شام کو حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ داغِ مفارقت دے گئے) بعد نماز ظہر حضرت کی اہلیہ محترمہ حسب معمول حضرت والا کی صحت کے لئے دعا مانگ رہی تھیں کہ یکایک ایک سفید پوش ہستی نمودار ہوئی، اور اُس نے ایک دودھیا رنگ کا گلاس محترمہ کی خدمت میں پیش کیا، محترمہ نے گھبرا کر ہاتھ چھوڑ دیئے، اور پیچھے مڑ کر حضرت والا سے (جو پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے) عرض کیا کہ آپ نے کچھ دیکھا؟ — جواب ملا کیا ہوا؟ اہلیہ محترمہ نے واقعہ سنایا تو خلافِ عادت پورے اطمینان سے یہ ارشاد فرمایا :-

"یہ آپ کی تسکین کا سامان کیا گیا ہے"

اس سے گمان ہوتا ہے کہ شاید حق تعالیٰ نے اپنے محبوب بندے کو کوچ کا اشارہ فرما دیا تھا، —— دن گذر گیا، مغرب کی نماز پڑھ کر داہنی کروٹ ٹھیک مطابق سنت لیٹ گئے، راقم کی نظریں چہرۂ انور پر جمی ہوئی تھیں، دفعۃً ایک ہچکی آئی، اور روح سلیمانی لبیک کہہ کر اپنے مولیٰ کے حضور حاضر ہو گئی، الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون کا مشاہدہ کھلی

انکھون ہوگیا، روح کی مفارقت کے بعد اس عاشق رسول کے جسم مین کوئی تغیر تو کیا آتا، چہرۂ مبارک اس قدر منور و تابان ہوگیا، اور سکینت و فرحت کے ایسے جلوے نمودار ہوئے کہ جس کی بھی نظر پڑی اُس کے دل نے سید الملت کے ولی اللہ ہونے کی تصدیق کی ــــــ آہ! ہندوستان کی تاریخ مین یہ دوسرا "ولی اللہ" پیدا ہوا تھا، سو وہ بھی آج زینت تاریخ بن گیا،

عمرہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید برون

# حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا سلوک و تصوف

اور

# طریقۂ تربیت

از

مولانا سید عبد الرؤف صاحب اورنگ آبادی

آہ! علم و ادب، تاریخ و سیر مین یگانۂ روزگار، سلوک و تصوف مین ممتاز اور جملہ اسلامی علوم مین جامع و باکمال ہستی دنیا سے رخصت ہوگئی،

خدایا بران تربتِ نامدار　　بفضلت کہ بارانِ رحمت ببار

اور اپنی تحقیقاتِ علمیہ، حقائقِ دینیہ، نکاتِ احسانیہ اور رموزِ روحانیہ کے ایسے نقش و نگار چھوڑ گئی، جو مدتون باقی رہین گے، ایسی جامع کمالات ہستی صدیوں مین کہین پیدا ہوتی ہے،

عمرہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات　　تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید برون

علمی بزم کے تو وہ صدر نشین تھے ہی سلوک و تصوف مین بھی اُن کا بڑا درجہ تھا، اور اس کے وہ اسرار و رموز اور معارف و حقائق بیان فرماتے کہ دل کیفِ یقین سے لبریز ہو جاتا، اس مختصر مضمون مین اس کے بعض جلوے دکھائے جائینگے، اس راہ مین ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ علمی صدارت کی بھری مجلس مین اپنی علمی لغزشون (۱) اور کوتاہیون کا اعتراف اور ہر اس تحقیق و رائے سے جو کتاب و سنت کے موافق نہ ہو، رجوع کرکے "ذکرِ دہٗ ناصواب توبہ یارب" کی صدا بہ ملا بلند کی، عملی سلوک و تصوف کی یہ وہ تجلی تھی کہ مدعیانِ علم و عمل کی آنکھین خیرہ

ہوکر رہ گئیں نفس پرستی کے اس دور میں محض رضائے الٰہی، اور اتباع حق کے لئے اتنی بڑی ہستی کا اپنی قلمی لغزشوں کا اعتراف اور اس سے برأت کرنا عرفان حقیقت کے کمال اور فنائیت و فنائے نفس کی روشن دلیل ہے،

فنائے ذات اور اتباعِ حق کی یہ زندہ مثال تھی جس پر خود شیخ طریقت نے مرید کی شان میں مدحیہ اشعار ارشاد فرمائے، اور اس ناچیز کی عقیدتمندانہ نظر پہلی مرتبہ حضور والا رحمۃ اللہ علیہ پر پڑی، ناچیز اس زمانہ میں حضرت مجدد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی بیعت سے مشرف ہوکر مولانا محمد عیسیٰ صاحب کے زیر تربیت تھا، حضرت والا رحمۃ اللہ نے تحریر فرمایا کہ اگر وہ مصلح پسند نہیں ہیں، تو مناسب حال کوئی دوسرا مصلح منتخب فرمالیں، اس کے کچھ دنوں کے بعد حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ سے لکھنو اسٹیشن پر ملاقات ہوگئی، اور شاہ گنج تک رفاقت کا شرف رہا، اس مختصر صحبت کا دل پر ایسا اثر پڑا کہ خط کے ذریعہ نذرِ عقیدت پیش کی، اس کے بعد حضور کے حسب طلب کئی مرتبہ آپ کے وطن دیسنہ میں حاضری کا موقع ملا، اور دوسرے سفر میں اخذ بیعت وارادت اور فیوض و برکات حاصل کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، اس کے بعد بارہا شرفِ زیارت حاصل ہوا، مگر پاکستان کی ہجرت کے بعد اس سے محرومی رہی، البتہ مراسلت کا سلسلہ برابر جاری رہا،

اس دس سالہ مدت میں حضور کی زبان و قلم سے جو ارشادات نکلے ہیں، افادۂ عام کے خیال سے ان کے مختصر اقتباسات درج کئے جاتے ہیں کہ شاید ان سے کسی قلب سلیم کو فیض و برکت حاصل کرنے کی توفیق ہو، ان سے حضور کے سلوک و تصوف کی حقیقت اور آپکے طریقۂ تربیت کا بھی اندازہ ہوگا،

**تواضع** آپ میری نسبت یہ سمجھ لیں کہ یہ خاکسار حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کے خدام میں سب سے کمتر اور رتبہ میں بھی فروتر ہے، اس پر بھی اگر اس ذرہ بمقدار کی طرف اپنے دل کی کشش بے تکلف محسوس کریں تو ظاہر فرمائیں، ایسا نہ ہو کہ بعد کو پچھتانا آئے، میرے حالات کو بھی تحقیق فرمالیں کہ میں اس قابل بھی ہوں، اگر ان سب باتوں کے بعد بھی دل کا میلان ہو تو خدمت سے انحراف نہیں،

**مقصد بیعت اور تفویض امانت** بیعت کا مقصد تو یہ ہے کہ مرشد و مسترشد میں اس امر کا معاہدہ ہوتا ہے کہ مرشد

تعلیم و ارشاد مین تا امکان غفلت و دریغ نہ کرے اور مسترشد تا امکان اطاعت و انقیاد مین کوتاہی سے کام نہ لے، مرشد کے ذمہ جو فرائض عائد ہوتے ہین، اس کی ادائگی پر بلا اخذ بعیت بھی تیار ہون، اور چونکہ مین اپنے مین کوتاہی پاتا ہون، اس لئے تاخیر کر رہا ہون یا ابھی وقت اس امانت کی سپردگی کا نہین آیا ہے، وقت کا انتظار کیجئے جب وقت آئے گا، تو خود بخود یہ دولت نصیب ہوجائے گی،

**پیر اور مرید کے فرائض** غالباً یہ ذہن نشین ہوگا کہ یہ عمر بھر کا سودا ہے، اس لئے اس راہ مین جو قدم رکھا جائے وہ خوب سوچ سمجھ کر رکھا جائے، پیر کی نسبت صرف اتنا اعتقاد رکھنا شرط ہے کہ میری تلاش مین میری نعمت کے لئے اس سے بہتر کوئی شخص اس وقت نہین ہے، بہرحال یہ طرفین سے الحب فی اللہ کا معاہدہ ہے کہ طالب تعمیل مین اور مطلوب یعنی شیخ تعلیم مین کوئی کمی اخلاص مین نہ کرے گا، اس سلسلہ مین چار باتین بمنزلہ اصول کے ہین، اعتقاد، انقیاد، اطلاع، اتباع اس راہ مین ضروری ہے بلکہ اپنے کو مربی کے ہاتھ مین اس طرح دیدین جس طرح مریض طبیب کے ہاتھ مین اپنے کو دیدیتا ہے، اصول اربعہ کی پیروی رہے، مین نے پہلے ہی لکھدیا ہے کہ اپنے شیخ کی نسبت یہ اعتقاد رکھنا چاہیئے کہ میری نافعیت کے لئے میری تلاش مین یہ سب سے بہتر ہے، پس دوسرون سے انکار کی ضرورت نہین ہے، مگر اتباع ایک کی چاہیئے، ایک ساتھ دو طبیبون کا مریض مصیبت مین رہتا ہے، اعتقاد اور انقیاد تو معلوم کرلیا، اطلاع سے مقصود شیخ سے مکاتبت اور اتباع سے احکام شیخ کی پیروی ہے،

**نماز کی حقیقت** نماز کو اپنی طرف سے پوری ظاہری و باطنی آداب اور خضوع و خشوع کے ادا کرنے کی کوشش کیجئے، جس قدر ہو اللہ کا شکر کیجئے، اور آیندہ کے لئے ہمت کیجئے، اور دعا کیجئے، ہمارے حضرت کی تحقیق ہے کہ مبتدی نماز مین یکسوئی کے لئے لفظ کی طرف اور متوسط معنی کی طرف اور منتہی ذات بحت کی طرف یہ تصور کرے کہ بندہ اپنے آقائے حقیقی کے سامنے کھڑا ہے، اور وہ اس کو دیکھ رہا ہے، اس کا اثر یہ ہو کہ قلب مین سکون اور جسم مین پستی اور تواضع کی شان پیدا ہو، نماز مین اصل شے حضور اور خشوع ظاہری و باطنی ہے، اور نیز ہر قسم کے رذائل سے امکان دوری اور فضائل کے حصول کی کوشش اور اطاعت الٰہی پر مداومت، اور حصول رضائے الٰہی کا شوق

باقی غیر مقصود ہیں، تو امورِ مقصودہ میں ان امور کی طرف بیشتر متوجہ رہیں،

**التزامِ سنن و نوافل اور تہجد**

نمازِ پنجگانہ کے بعد حسبِ ذیل نمازوں پر حتی الامکان مداومت کی جائے، نمازِ تہجد، بعد مغرب ۶ رکعات نفل اوابین، طلوعِ آفتاب کے بعد ۲، یا ۴ رکعت نفل چاشت، نوافلِ مسنونہ نمازِ پنجگانہ کے بعد، نماز میں اعتدالِ ارکان، اور حضورِ قلب کی کوشش رہے، تہجد کا التزام ازبس ضروری ہے یہی مفتاحِ اسرار ہے، اگر رات کو احیاناً ناغہ ہو جائے، تو بوقت چاشت، بارہ رکعات پڑھیں، تہجد عجیب عبادت ہے جس پر خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً دوام فرمایا ہے، اس لئے سنتِ موکدہ ہے[1]، اب اہلِ محبت کے لئے کیا گنجایش رہی، فضائلِ اعمال کے اکتساب کا سبق محدثین سے نہ لیں محبین سے لیں، علیکم بقیام اللیل فانہ داب الصالحین تو لزوم پر دال ہے، تہجد باجماعت اگر اتفاقاً ہو تو جائز ہے ورنہ اہتمام اور تداعی کے ساتھ نہیں، غور کرنا چاہئے کہ اس میں ریا اور نمود کی خواہش تو پوشیدہ نہیں، اگر تہجد قضا ہو جائے تو طلوعِ آفتاب کے بعد دوپہر سے پہلے تک بارہ رکعتیں پڑھ لی جائیں، تہجد کی نماز ذرا جہر سے پڑھنا مستحب ہے،

**دعا کا اہتمام**

تہجد کے بعد بارگاہِ الٰہی میں پوری درد و الحاح کے ساتھ اپنے لئے دعا کیجئے، دعا میں تضرع و خضوع ہونا چاہئے، عصر اور صبح کی نماز کے بعد دعا خوب کیا کیجئے، اور مانگئے جو آپ کے لئے مناسب ہو انشاء اللہ ملے گا، اس در سے کوئی محروم نہیں پھرا ہے، اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ اس کا اعلان ہے اور "الدعاء مخ العبادہ" ارشاد ہے،

**احتسابِ نفس**

اپنے عیوب کی تلاش میں رہیے، اور جو عیب سب سے زیادہ اُبھرا ہوا علی العیان معلوم ہو، اس کے دفعیہ کی کوشش کیجئے، مثلاً کبر، عجب، ریا، حسد، وغیرہ، ان عیبوں کی حقیقت دریافت کیجئے، اور پھر اس کا علاج معلوم کیجئے، اپنے میں شکستگی، افتقار، تواضع ہونی چاہئے، اور ہر وقت اپنے عیوب پر نظر جمی رہے، اور اس کے اصلاح

[1] سنتِ موکدہ کی تعریف اس پر صادق ہے، البتہ قولاً تاکید نہیں فرمائی، شفقۃً علی الامۃ، مگر اپنے عمل سے اسکو موکد ثابت کر دیا،

کی فکر دامنگیر ہو، استکبار وافتخار و غرور کہ ہمچون من دیگرے نیست کے شیطانی پھندے مین گرفتار نہ ہوجائین،
اپنے کو مجموعۂ ذمائم اخلاق سمجھنا خیر و برکت ہے، بر سبیل تذکرہ اسرار قلبی اور واردات روحانی کو ظاہر کرنا بھی استکبار
وریا مین داخل ہے، غیبت بہت بُری چیز ہے، اس سے نیکیان دوسرون کو مل جاتی ہین، اپنے قلم سے خود کو
مولوی لکھنا کبر کے آثار مین سے ہے، گویا اس کا اظہار ہے کہ لوگ اس کو بڑا سمجھیں، مکائد نفس بہت دقیق ہین،
اللہ تعالیٰ پناہ مین رکھین، تواضع اور فنائے ذات کی راہ پیشِ نظر رہے، فنائے نفس کے لئے اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِي
فِي عَيْنِي صَغِيْرًا کی دعا مفید ہے، اپنے کو سب سے بدتر سمجھنا سب سے بہتر ہے، اس کا ہمیشہ اور ہر کام مین خیال رہے،
بس اپنے عیوب پیش نظر رہین، اور اُن کی اصلاح کا خیال غالب اور اس باب مین اپنے نفس کے مکائد
پر نظر رہے،

اصل سلوک | حصولِ تقوی تحلی بالفضائل اور تخلی عن الرذائل برائے رضائے الٰہی اصل سلوک ہے، ہر قسم کے رذائل
سے بقدر امکان دوری اور فضائل کے حصول کی کوشش، اور اطاعتِ الٰہی پر مداومت اور حصول رضائے الٰہی
کا شوق اور باقی غیر مقصود ہین، اپنی اصلاح و تربیت کی دھن مین لگے رہئے، تا آنکہ اللہ کے سوا دل سے ہر چیز
کی محبت فنا ہوجائے، ریا، عجب، کبر رنگ برنگ صورتون مین ظاہر ہوتے ہین، اور یہ سالک کے لئے سخت خطرناک
ہین، اس لئے ان سے احتراز کا اہتمام نہایت ضروری ہے، بڑی چیز یہ ہے کہ اپنے پر نظر بڑائی کی نہ پڑے، "یہ
راستہ مردودیت کا ہے، ابی واستکبر وکان من الکافرین، ہر حال مین تواضع اور فنا پر نظر رہے اور
ذمائم اخلاق پر،

حصولِ تقوی | منہیات واوامر کی تصریح پیش نظر رہے، مقصود حصولِ تقویٰ ہے، کہ قرآن پاک "هُدًى
لِلْمُتَّقِيْنَ" ہے، عبادات کا منشا بجا آوری کے بعد حصولِ تقوی ہی ہے، "لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ" بعد فرائض وسنن
و نوافل کی پابندی علی مراتب الوجوب والاستحباب کے منہیاتِ شرعیہ سے احتراز کا لزوم
کیا جائے،

**اہتمام والتزامِ عمل**

اعمال تو سب کو معلوم ہین ضرورت عمل کی ہے، اور حصولِ تقویٰ اور رضاے الٰہی کے لئے ساری کوشش اسی کی چاہئے، باقی سب فلسفہ ہے، کام مین لگے رہین،

ع "تا دمِ آخر دمے فارغ مباش"

عمل خیر لوجہ اللہ تعالیٰ ہو، اصل یہ ہے کہ امتحان کی تیاری کے لئے جو وقت صرف ہوتا ہے، وہ بیکار نہین جاتا ہے، نمبر اسی سے ملتے ہین، کسی اضطراری عذر کے سبب سے اگر کسی معمول مین کمی ہو جائے تو انشاء اللہ تعالیٰ ہم کو ہماری نیت کے مطابق حق تعالیٰ اُس کی جزا عنایت فرمائین گے، یہ اُن کی شانِ رحیمی و کریمی ہے، عمل کیلئے صرف ہمت و عزیمت، دوامِ عمل، اور صحتِ فکر و نظر کی ضرورت ہے، عمل، عملیات اور تعویذ کی نہین، مقبولیت کی خواہش اس راہ کا کانٹا ہے، اللہ تعالیٰ کی رضا کے سوا عمل کا دوسرا محرک نہ ہو، اور ہر حال مین ذکر لساناً و قلباً و عملاً جاری رہے،

**احکامِ الٰہی کی اطاعت اور رضاے الٰہی کی طلب**

اصل شے احکامِ الٰہی کی کلی اطاعت، حلال حرام کا خیال، معاملات مین صفائی اخلاق کی نزاہت، اتباعِ نبوی کا دھیان، التزامِ سنت کا اہتمام ہے، بدعات و رسوم سے تمام امور مین احتراز، اور تمام امور مین رضاے الٰہی کی طلب، ان امور کی طرف توجہ فرمائیے کہ یہ اصول ہین، اور باقی سب فروع، اور تدابیرِ دوامِ ذکر کا ظہور یہی ہے، اطاعات و مرضیاتِ الٰہی کی اتباع کا ذوق بڑھے اور اللہ تعالیٰ کی یاد حالاً ہو، باقی کیفیات تو آتی جاتی رہتی ہین،

**استقامت بڑی دولت ہے**

اب تو زندگی کے آخر لمحہ تک یہ استقامت قائم رکھنا ہے، توفنی مسلماً والحقنی بالصالحین کی دعا چاہئے، اپنے کام مین تا دمِ آخر استقامت کے ساتھ لگے رہئے، یہی بڑی دولت ہے "تا دمِ آخر دمے فارغ مباش" معمولات پر استقامت مبارک "الاستقامۃ فوق الکرامۃ" قال اللہ تعالیٰ "قل اللہ ثم استقیموا" سلوک کی اصل کلید ہے، عوارض کی وجہ سے کمی باعثِ افسوس نہین، وہ کمی افسوس کے قابل ہے، جو غفلت یا کوتاہی کے باعث ہو، اپنی تکمیل اور اصلاح سے کبھی غفلت نہ برتین، ہر حالت

مین ناقص ہین، یادِ الٰہی سے غفلت نہ ہو، ذکر کا مقصود یہی ہے،

ذکرِ دوام

ادعوا ربکم تضرعًا و خیفۃً الی ولا تکن من الغافلین" تلاوت فرماکر دوامِ ذکر کے فضائل، ثمرات اور وعدے اور غفلت کے نتائج بد اور وعید بیان فرمائے، اور ومن یعرض عن ذکر الرحمٰن الخ کے تفسیری نکات بیان کئے، اور ہر حرکت و سکون پر عمل و قول مین ذکر کی تاکید فرمائی، یادِ الٰہی کو مرکزِ خاطر کرنے کی ہدایت فرمائی، اور بیان کیا کہ احکامِ شرعیہ کی روح ذکر ہی ذکر ہے، جمال، نوال، کمال کے اعتبار سے ذاتِ باری ہی کو محبوبیت حاصل ہے، تو اسی محبوبِ حقیقی کی یاد واجب ہے، الذین اشد حباً للّٰہ" منصوص ہے، دنیا اور تعلقاتِ دنیا کے ساتھ یادِ الٰہی بڑی چیز ہے، اور یہی سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، و صحابہ رضوان اللہ علیہم ہے، چنانچہ حضرت عروہ رض کا پاؤن جب کاٹا جانے لگا تو ہوش و حواس ہی مین پاؤن کاٹنے کا انھون نے حکم دیا (اسم ذات یعنی اثبات و نفی کے ذکر کے جمالی و جلالی ہر دو طریقون کو عملاً ظاہر فرماکر تکرار کی ہدایت کی، اور فرمایا کہ وقتِ ذکر قربتِ حق، سماعتِ حق، رحمتِ حق اور نزولِ رحمت پر اذعان و نظر رکھنا چاہئے، تاکہ ثمراتِ ذکر جلد سے جلد تر ظاہر ہون، اپنی بابت فرمایا کہ مجھے تو ذکرِ جلالی مین خشکی پیدا ہو جاتی ہے، اس لئے ذکرِ جمالی پر بیشتر عمل کرتا ہون، اور اسی مین سہولت و لذت محسوس کرتا ہون، آپ کو اختیار ہے کہ جس طریقہ کو چاہین، اختیار کرین، نپولین اعظم جب کسی سپاہی کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا تو اس کا نام لے کر پکارتا تھا، جس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ وہ اس پر جان دینے کو تیار ہو جاتا تھا، اسی طرح اسمائے الٰہی کی یاد اور تکرار اُن کی توجہ خاص کو اپنی طرف مبذول کراتا ہے، اس ارحم الراحمین کا نام پاک ورد کیا جائے گا، تو اس کی رحمتین ذاکر کی طرف متوجہ کیون نہ ہون گی، ماسوی اللہ سے بے نیازی کے لئے اثبات و نفی کا ذکر اس کے معنی کے استحضار کے ساتھ کافی و وافی ہے،

---

لہ اسم مین خود محبوبیت نہین اسم مین محبوبیت محبوب کی ذات پر دال ہونے کے سبب سے ہوتی ہے کسی اسم کی محبوبیت ذاتِ پاک کی محبوبیت کا نتیجہ اور ظل ہے،

**پاسِ انفاس** پاسِ انفاس کا مقصد بھی یہ ہے کہ کوئی سانس ذکر الٰہی سے خالی نہ جائے اس کی صورت یہ ہو جو آسانی سے ہو سکتی ہے کہ ہر سانس کے ساتھ اللہ اللہ جاری رہے، بغیر تلفظ لسانی محض ذکر جلی کے ساتھ اس کا فائدہ ذکر دوام ہے، جو حسب استطاعت مامور ہے،

**مراقبۂ اللہ معی** اللہ معی کا مراقبہ شروع کر دینا چاہئے، اللہ معی کا تصور کہ ہر وقت وہ ہمارے ساتھ اور ہمارے قریب اور ہمارے ہر فعل و خیال کا ناظر و حاضر ہے، اس کے مضمون پر غور کیا جائے، اور اس کے مناسب آیات کا استحضار رہے، واذا سألك عبادی عنی فانی قریب، وھو معکم اینما کنتم، ونحن اقرب الیہ من حبل الورید، نحن اقرب الیہ منکم ولکن لا تبصرون، وھو علیم بذات الصدور ولا تخفی علیہ خائنۃ الاعین وما تخفی الصدور، الا یعلم من خلق، الم یعلم بان اللہ یری اسی کیفیت کا رسوخ اصل روح ہے جس کا طریقہ ذکر و شغل ہے،

**قلب کا ذاکر ہونا** قلب کا ذاکر ہونا یہ فن کی کوئی اصطلاح نہیں ہے، کثرتِ ذکر سے قلب میں ذکر کا لفظ اللہ اللہ ہو یا لا الٰہ الا اللہ یا کوئی اور مرکوز ہو کر حدیث نفس کے طور پر جاری ہو جاتا ہے، جو ارادہ کے بغیر بھی قائم رہتا ہے، بلکہ اس کا استحضار بھی نہیں رہتا ہے کہ ذکر جاری ہے، ........ بہر حال اس کا طریقہ صرف کثرت ذکر پر توجہ تام ہے، اور یہ کوئی مشکل نہیں ہے،

**مجاہدہ و ریاضت اور اس کے ثمرات** مجاہدہ و ریاضت سے فضل و رحمت اور توفیقاتِ الٰہیہ کی صلاحیت و استعداد پیدا ہوتی ہے، ہر نبی و ولی کو مجاہدہ و ریاضت کے عقبات سے گذرنا ضرور ہے، رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کا غار حرا میں معتکف ہونا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کوہ طور پر قیام کرنا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جنگلوں میں مقیم ہونا، اور اولیاء و فقراء کی نفس کشی اسی سلسلہ کی کڑی ہے لیکن باہمہ کسب و ریاضت ضرور نہیں کہ رحمت کا ورود اور برکات روحانی کا نزول فی البدیہہ ہو یہ سب فضلِ رحمانی ہے، وہ ذات پاک بے نیاز ہے، مگر سالک کو پر امید ہی رہنا چاہئے، جزاءً من ربک عطاءً، گویا مزد نہیں بخشش ہے، اور یہ بخشش بے حساب و کتاب ہوتی ہے،

اوامر و نواہی کی بجاآوری جس گرم جوشی اور خلوص سے ہوگی، اسی قدر انوار رحمت و برکات کا نزول ہوگا، بعض لوگ احکام و اعمال بجالاتے ہیں، ذکر و شغل بھی کرتے ہیں، مگر ثمرات و اثرات مرتب نہیں ہوتے ہیں، وجہ اس کی یہی ہے کہ خلوص و محبت جو بمنزلۂ روح کے ہے، وہ ان میں مفقود ہے، کوئی شخص کونین کھائے، اور کونین کے اثرات مرتب نہ ہوں، تو ظاہر ہے کہ اس کے ناقص ہونے کا حکم لگایا جائے گا، اسی طرح نماز و روزہ اور دیگر احکام و اعمال بجالاتے ہیں، اور ان کے اثرات و ثمرات ظاہر نہیں ہوتے ہیں، تو سمجھ لو کہ ان اعمال کی بجاآوری میں نقص ہے، ورنہ بارگاہِ الٰہی میں تو قدر کمال کی ہے۔

**کیفیات** سالک کو بڑا دھوکہ ذوق و شوق اور لذت کا ہوتا ہے، سو اس کو پوری طرح سمجھ لیجئے کہ یہ چیزیں آثار محمودہ ضرور ہیں، مگر مقصود نہیں، ان کا منشا اسی قدر ہے کہ کام میں جی لگتا ہے، اور آسانی ہوتی ہے، مگر اس کو قرب و رضا و حصول ثواب میں کوئی دخل نہیں، کیونکہ یہ امور غیر اختیاریہ میں ہیں، اور غیر اختیاریہ نہ مطلوب ہیں، اور نہ مقصود، دوا کا اصل مقصود صحت بخشی ہے، خوش ذائقگی اور لذت نہیں، جب انسان کے بدن میں صحت آتی ہے، تو طاقت اور کھانے کی لذت تو خود بخود آجائے گی، اس کے لئے کوئی الگ دوا کی ضرورت نہیں، ابتدائی جوش و شوق میں کمی فطری ہے، یہ مرحلہ زندگی میں بھی پیش آتا ہو یہ کوئی افسوس کی چیز نہیں، جوش و شوق ہو یا نہ ہو، عمل میں کوتاہی نہ ہونے پائے، جس طرح آغاز شباب میں عروس نو کے ساتھ جو شورش و جوش طبع کا مظاہرہ ہوتا ہے، وہ رفتہ رفتہ تمکین سے بدل جاتا ہے، اور بجائے بوالہوسی کے دیرینہ محبت ..... اس کی جگہ لیتی ہے، میرا ایک شعر ہے،

دیکھئے ملتی ہے کب دولت سکون عشق کی — ہائے ہوئے جوش تو ہنگامۂ آغاز ہے

**صبر و شکر** حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کا ملفوظ ہے کہ دو حال سے خالی نہیں، یا تو بندہ کو نعمت ملتی ہے، تو اس پر شکر واجب ہے، یا ابتلا پیش آتا ہے، تو اس پر صبر مامور ہے، اور یہ دونوں حالتیں موجب ازدیاد ترقی ہیں، اور یہی صبر و شکر کی دوہری منزل پوری زندگی کے سفر میں ملتی رہتی ہے، شکر و رضا بڑی چیز ہے، اور توفیقاتِ الٰہی

پر بھی شکر کیجئے، آپ کو گونہ طمانیت جو حاصل ہوئی ہے، آپ اس طمانیت کو ذکر و لجاجت مین صرف کیجئے، کہ اس کا شکر یہی ہے، شادی و غم دونون توام ہین،

ع موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیون؟

خواب اور اس کی حیثیت | رویا اور خواب بشارات ہین، اس کے سوا ان کی اور کوئی حیثیت نہین، نہ یہ ذریعۂ قربت ہین اور نہ ان پر اتکال مفید طریق، البتہ خوش ہونا چاہئے کہ خواب سے مطلع کیا جا سکتا ہی، مگر اس سے اپنی بزرگی کا زعم نہ ہو کہ ایسے خواب فاسق بھی دیکھ سکتے ہین، ہان اس بات کا شکر کیجئے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی تربیت اس طرح فرماتے ہین، بہرحال اس کے پیچھے نہ پڑیئے، یہ گو بشارات ہین، مگر مقصود نہین،

ع نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم

بیداری کے معاملات کی طرف توجہ فرمایئے، اسی کا سوال اور اسی کا مواخذہ ہے، باقی رویا اور خواب بشارات سے زیادہ نہین، دھن کے ساتھ اپنے کام مین لگے رہیئے، خواب کی حیثیت شرع مین صرف بشارات کی ہے، اللہ تعالیٰ اس اظہار بشارت سے کبھی ان شکلون کو منتخب فرماتے ہین، جن سے خواب دیکھنے والون کو موانست ہوتی ہے، اس مین خواب مین نظر آنے والے بزرگون کو کوئی دخل نہین ہوتا، بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے اس اظہار بشارت مین اپنا آلہ اپنے فضل سے بنا لیا،

کمر مکتوب ہے کہ خواب کی حیثیت صرف بشارات کی ہے، اور اس ہیچمدان کو دیکھنا اس بات کی علامت ہے کہ آپ مجھ سے محبت رکھتے ہین، اللہ تعالیٰ کے ہاتھ مین ساری توفیقات ہین، وہ جب چاہتے ہین تو کسی بندہ کو خواب مین یا بیداری مین تنبیہ یا توفیق ارزانی فرماتے ہین اور اس کے لئے کبھی کبھی اتفاقی انفس ہونے کے لئے اسی کی شکل و صورت کو بمنزلہ . . . . . . . وجہ و آلہ بناتے ہین، جس سے صاحب معاملہ کو مناسبت اور محبت اور عقیدت ہوتی ہے ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء،

احترام نبوی اور حب رسول | رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی اور ذکر گرامی کے ساتھ صلی اللہ علیہ وسلم لکھا کیجئے،

عزت و احترام ظاہری و باطنی دونوں چاہیئے، عملاً اتباع سنت ہر کام میں اور قولاً درود کی کثرت حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذریعہ ہیں، درود خصوصاً جمعہ کے دن کہ وہ اس دن پیشگاہ نبوی میں پیش ہوتے ہیں، ہمارے حضرت رحمۃ اللہ کو یہ درود پسند تھا، اللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِہٖ سیدنا و مولانا محمد وبارک وسلم جمعہ کی رات بالخصوص کثیر درود چاہیئے، ایک خواب کے سلسلہ میں سوال ہے کہ کیا واقعاتِ عالم اور حوادثِ روزگار کا وقوع وحدوث پیشگاہ نبوی سے ہوا کرتا ہے؟

جواب:۔ استغفراللہ" واقعاتِ عالم اور معاملاتِ تکوین صرف اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم باعثِ رحمت ہیں، آپ پر اللہ تعالیٰ کی جو بظاہر رحمت ہوئی وہ مثالی بشارت رحمۃ للعٰلمین کے توسط سے دکھائی گئی، مکرر گذارش ہے صلوٰۃ و سلام بطور ذکر کے نہیں، بلکہ بطور درود کے پڑھ سکتے ہیں، خصوصاً جمعہ کے روز اگر بجائے ذکر درود پڑھا جائے تو اچھا ہے، وحشت دور کرنے کے لئے کسی مختصر درود کی کثرت کیجئے،

اے نامِ تو دافعِ بلاہا

بیماری قلب را شفاہا

بحمداللہ آپ کے لئے حرم میں دعا کی گئی، اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں، آپ کا خواب مبارک ہے اور اس سلسلہ میں آپ کی مقبولیت کی دلیل ہے، اللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ مناجات مقبول میں جو کچھ ہے وہی ہمارے ہاں معمول ہے اس کی اجازت ہے، بارک اللہ تعالیٰ،

**تصورِ شیخ اور صالحین کی محبت**

تصورِ شیخ بلا قصد و ارادہ ہو تو حرج نہیں، اور ہمارے حضرت کے خلفاء میں سے جناب خواجہ عزیزالحسن رحمہ اللہ تعالیٰ کا ۷ شعبان کو انتقال ہوگیا، افسوس دعائے مغفرت کیجئے اور ایصال ثواب بتلاوۃ القرآن کیا کیجئے،

صالحین کی محبت کلید کامیابی ہے،

**وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود**

وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کا مفہوم صحیح مختصر یہ جان لیجئے کہ صرف اسی کی ذات

پاک موجود ہے، ماسوی ذاتِ باری تعالیٰ سب کالعدم ہیں مگر اس کا ہرگز یہ مفہوم نہیں کہ ہر چیز خدا ہی خدا ہے، یہ تو وحدت نہیں، کثرت کا مفہوم ہے، نعوذ باللہ من ذالک، وہ وحدہٗ لاشریک ہی؛

اور وحدۃ الشہود کا مفہوم یہ ہے کہ ہر چیز میں ایکے وجود اور اس کی قدرت کا ظہور ہے اور بس،

**تصوف علمی اور تصوف عملی** تصوف کی دو قسمیں ہیں، ایک علمی دوسری عملی، تصوف کی کتابوں سے جو علم حاصل ہوتا ہی، وہ تو تصوف علمی ہی، اور مجاہدہ اور عمل سے جو صوفیانہ شان پیدا ہوتی ہے، وہ تصوف عملی ہے آپ تصوفِ عملی میں اپنا وقت صرف کیا کیجئے، اور اس پر وقت صرف کرنا زیادہ مفید اور موجب خیر و برکت ہی، ملفوظاتِ قرآن وہ گنجینہ ہی کہ ہر نظریہ والا اپنے نظریہ کے مطابق اس میں نکات و رموز پاتا ہے، ایک متصوف کو تصوف ہی تصوف نظر آتا ہے، ایک سیاسی کو سیاست ہی سیاست اوس میں نظر آتی ہی، مگر مجھے تو قرآن پاک میں تصوف ہی تصوف نظر آتا ہے،

ہمارے شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ کا نظریہ تصوف وہی ہے، جو مجدد طریقت شیخ الکل حضرت مولٰنا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، اکمال دین و اسلام کا نام تصوف ہے، احکام شرعیہ کی بجاآوری احسان و اخلاص کے ساتھ عین طریقت و حقیقت ہی، تصوف اسلام کا خلاصہ اہتمام طاعت اور اجتنابِ معصیت، اور دوام ذکر ہے اور بس،

**افکار دنیا لاحاصل ہیں** قلب کو طمانیت اور دماغ کو سکون کیوں نہیں ہے؟ اس کے عدم حصول کا باعث کوئی دینی یا دنیاوی فکر ہوگی، اگر دینی فکر ہے تو مبارک، اور دنیاوی فکر ہے، تو اس فکر کا حاصل ہی کیا ہی؛ اللہ ولی المومنین و نعم الوکیل پیش نظر رہے،

فکر ما در کار ما آزار ما کار ساز ما بفکر کار ما

**مجدد طریقت شیخ الکل کی تصانیف کا مطالعہ** برات و کرات مکتوب ہی کہ ہمارے حضرت کی تصانیف یعنی جس قدر ملفوظات اور مواعظ ہیں، انھیں مطالعہ کیا کیجئے، مواعظ و رسائل کا مطالعہ اکسیر ہدایت ہی،

اس سے استقامت اور بصیرت میں مدد ملے گی،

آپ التکشف فی التصوف اور بادۂ عرفان شرح دیوان حافظ پڑھا کیجیے، حضرت والا کے مواعظ و ملفوظات کے مطالعہ سے انشاء اللہ تعالیٰ کشف حجابات ہوں گے، اور سلوک کی سیدھی راہ معلوم ہوگی،

امام اور امامت کے فرائض | ناچیز کے ذمہ خطابت و امامت کی خدمت بھی سپرد ہے، اس لئے اس باب خاص میں بھی زبانی اور تحریری ہدایات فرمائیں، اور حاضری کے مواقع پر خطابت و امامت کے لئے آگے بڑھا کر عملاً ہدایات حاصل کرنے کا موقع دیا،

امام نماز کا انتخاب تو جماعت کے ہاتھ میں ہے، تو پھر انتخاب و اجازت کے بعد امامت کیلئے آپ کو بڑھنا چاہئے تھا، اور تقاضائے ادب تو یہی تھا کہ بعد اذن بلا پس و پیش آگے بڑھ جائیے، ہاں بلا اذن جماعت امامت کرنا غلط تھا، بصورت امامت امام میں جو ریائی کیفیات پیدا ہوئی تھیں، ان کو ظاہر فرماکر ان سے اجتناب و احتراز کی تاکید فرمائی،

تحسین صورت اور بتکلف حسن و خوبی کے ساتھ قرأت ادا کرنے کی کوشش جو امام کرتا ہے، اس کا مقصد مقتدیوں سے دادِ تحسین کے حصول کے سوا اور کیا ہے؟ اور یہ چیز خلوص کے بالکل منافی ہے، نماز میں تمامتر توجہ خلوص نیت کے ساتھ احکم الحاکمین، خالقِ کائنات اور رب العالمین کی طرف ہونی چاہئے، نماز اور دیگر عبادات محض انہی کی رضا اور خوشنودی کیلئے تو ہونی ہی چاہئیں، بلکہ مومن و مسلم کو ہر معاملہ، ہر فعل و عمل ہر حرکت و سکون میں خدا کی رضا پر نظر رکھنا چاہئے، اور ان ہی کے مرضی کی سعی چاہئے، روایات و آثار اور امثال سے امام و امامت و خطابت سے متعلق آداب و رعایات امام و ماموم بیان فرمائے،

کیفیات و احوال اور توحش کے بعد بھی ضبط و سکون کے ساتھ مخلصانہ طور پر اس خدمت کو انجام دینا چاہئے، کسی وقت نماز میں بندہ ہیچمدان سے سہو ہو گیا، جب سجدۂ سہو ادا کر کے نماز سے فارغ ہوا، تو اعادۂ نماز کے لئے بنظرِ تحسین صلوٰۃ حکم فرمایا،

**حضرت مولانا کا تفقہ** | حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے تعلقات سے پیشتر گاہے گاہے اور تعلقات کے بعد تو اکثر عاجز استفتا اور استفسارات کیا کرتا تھا، گاہے فرماتے کہ کسی مفتی سے فتوی طلب کیجئے، گاہے جواب عنایت فرماتے، چنانچہ چند فتاوی راقم کے پاس محفوظ ہیں، ان میں سے صرف ایک فتوی بابت رویتِ ہلال صوم و افطار جو علماء کے درمیان میں معرکۃ الآرا ہے، درج کیا جاتا ہے جس سے مولانا کے تفقہ فی الدین کی حیثیت ناظرین پر واضح ہو جائے گی،

استفتاء: علمائے دین متین مسائل مندرجۂ ذیل میں کیا فرماتے ہیں:- ؟

## مسئلہ (۱)

کسی مسلم ریاست کی مسلم جماعت یا کسی غیر مسلم ریاست کی مسلم جماعت نے رویتِ ہلال صوم، یا رویتِ ہلال فطر کی تحقیق و تفتیش اور شرعی شہادت لینے کے بعد کسی مسلم عادل مجاز شخص یا کسی غیر مسلم صادق و مجاز شخص کی زبانی، ریڈیو یا ٹیلیفون یا تار کے ذریعہ رویتِ ہلال صوم، رویت ہلال فطر کی خبروں کو دیگر بلاد و شہور میں نشر کرایا، اور بیک وقت مختلف مقامات سے نشر کرایا، تو ایسی متحقق و مصدق اور متواتر خبروں پر مسلمانوں کا صوم یا افطار شرعاً جائز ہے یا ناجائز ؟ اگر ناجائز ہے، تو اس کی دلیلیں ازروئے شرع عقلی و نقلی کیا ہیں ؟

## مسئلہ (۲)

کسی مسلم یا غیر مسلم ریاست کے کسی شہر کے عالمِ دین یا امام مسجد جامع جن کی عدالت و صداقت مسلم ہو خود بعد اخذ شہادت شرعی کسی ریڈیو اسٹیشن سے رویتِ ہلال صوم یا رویتِ ہلال فطر کی خبروں کو نشر کرتے ہیں، یا بجواب تار ٹیلیفون کے ذریعہ خبر ارسال کرتے ہیں، تو ایسی صورت میں صوم یا افطار شرعاً جائز ہے، یا ناجائز، اگر ناجائز ہے تو کیوں ؟ اس کی عقلی و نقلی دلیلیں ازروئے شرع شریف کیا ہو سکتی ہیں،

بینوا و توجروا،

# الجواب

(۱) کوئی قاضی ریاست اسلامیہ یا غیر اسلامی ریاست میں کوئی مسلمانوں کا مقرر کردہ قاضی یا امام شرعی شہادت لینے کے بعد رویت ہلال صوم یا فطر کا اعلان بذریعہ ریڈیو یا تار ٹیلیفون کرے تو اس کے قضا کے مطابق عمل کرنا درست ہے، کیونکہ یہ شہادت نہیں بلکہ نتیجہ شہادت ہے، قضائے قاضی کا اعلان ہے مگر ضرورت ہے کہ ان آلات نشر کی پوری نگرانی کی جائے، اور اس کا سارا کام مسلمانوں کے ہاتھوں انجام پائے،

(۲) تنہا عالم دین یا امام جامع مسجد ہونا کافی نہیں، اس کا مسلمانوں کی جماعت کا مقرر کردہ یا عملاً مسلّم ہونا ضروری ہے، اگر ایسا شخص ہلالِ فطر، اور ہلالِ صوم کی شہادت شرعی لیکر کسی آلہ نشر سے شائع کرے، یا تار ٹیلیفون سے ارسال کرے، تو اس کے مطابق عمل کرنا درست ہے، جب کہ آج بھی توپ یا گولا یا نقارہ یا گھنٹہ سے ہلال یا چاند کے طلوع و غروب کا اعلان حکومت یا کسی مسلّمہ جماعت کی طرف سے کیا جاتا ہے، اور اس پر عمل کیا جاتا ہے،

سید سلیمان تاریخ ۱۲ر اگست ۴۸ء

از ریاست بھوپال

اس فتوی میں یہ فقہی نکتہ کہ یہ شہادت نہیں بلکہ نتیجہ شہادت ہے، قضائے قاضی کا فیصلہ و اعلان ہے، علامہ رحمۃ اللہ علیہ کی فقیہانہ نکتہ سنجی کی دلیل روشن ہے، دوسرے علماء نے اس شہادت کے غیر معتبر ہونے کی وجہ یہ بیان کی کہ یہ آلات جدیدہ شہادت کے قائم مقام نہیں ہیں، یا یہ آلات ذرائع شہادت کے قائم مقام نہیں ہو سکتے ہیں، اور اسی پر بار بار زور دیتے ہیں، شہادت اور نتیجہ شہادت کے فرق کی جانب کسی کی نظر نہیں گئی،

# حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کا عارفانہ کلام
اور
# تصوف مین اُن کا مقام

از

جناب سید حسین صاحب اڈیشنل کمشنر لکھنؤ ڈویژن

حضرت قبلہ سید صاحبؒ کے ذکر کو اُنھی کے شیخ کے اس مصرعہ سے شروع کرتا ہون،

ع از سلیمان گیر اخلاص عمل

یہ ایک شعر کا مصرعۂ اولیٰ ہی، اور مصرع ثانی محفوظ نہین، اس کو خود حضرت قبلہ کی زبانِ مبارک سے سُنا تھا،

غالباً ماہ اکتوبر ۱۹۴۲ء کی آخری تاریخون مین سے کوئی تاریخ اور شوال ۱۳۶۱ھ کا آخری عشرہ تھا، مین اس زمانہ مین بلیا سے رخصت پر دار المصنفین اعظم گڈھ گیا ہوا تھا، حضرت قبلہ کے قیام کا کمرہ تھا، عصر و مغرب کے درمیان کا وقت تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب کہ حضرت قبلہ کو تھانہ بھون سے گہرا ربط اور حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے خط و کتابت کا اصلاحی سلسلہ شروع ہو چکا تھا، حضرت قبلہ اس وقت کن مقامات سے گذر چکے تھے، اور کن حالات سے عبور کر رہے تھے، اس کا جاننے والا بجز ربّ العزت کے اور کوئی نہین، شیخ کامل واصل و طالب صادق و بے بدل دونون اس دارِ فانی سے دار البقا مین پہنچ چکے ہین، انھون نے اصولِ طریق کے مطابق اس چیز کو راز مین رکھا، مگر عادۃ اللہ ہے کہ جن حالات سے مخلوق

آشنا کرنا چاہتے ہین، اس کے لئے غیب سے سامان مہیا کر دیتے ہین، ورنہ بزرگان پیشین کے حالات ہم تک نہ پہنچے؛ چنانچہ اس دن حضرت قبلہ کے خط کا جواب حضرت تھانوی کے دستِ مبارک کا لکھا ہوا موصول ہوا، چونکہ حضرت قبلہ کے علم مین یہ تھا کہ اس ناچیز کو بھی حضرت حکیم الامت سے عقیدت ہے، اس لئے فرمایا کہ حضرت مولانا کا والا نامہ آیا ہے، اور خود حضرت کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس زمانہ مین حضرت مولانا بوجہ ضعف خطوط کے جواب عموماً خود نہیں تحریر فرماتے تھے، بلکہ دوسرون سے لکھوا دیتے تھے، لیکن حضرت قبلہ سے اس درجہ خصوصیت تھی کہ خود ہی جواب تحریر فرمایا تھا، یہ سن کر مین متوجہ ہو گیا کہ اگر کوئی خاص بات ہو گی تو خود ہی بتلائین گے، میری توجہ کو دیکھ کر فرمایا حضرت مولانا کبھی کبھی اشعار مین جواب تحریر فرماتے ہین، مین نے دیکھا کہ چار پانچ شعر حضرت مولانا تھانوی کے تحریر کردہ اس مکتوب پر تھے، مگر مجھے زیادہ قریب سے دیکھنے کی جرأت نہ ہوئی، میرا اشتیاق دیکھکر اس کا ایک شعر پڑھ کر سنایا جس کا مصرعۂ اولیٰ اوپر تحریر کیا گیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ نے اس کی تصدیق فرمادی کہ حضرت قبلہ اخلاص عمل کی منزل کو طے کر چکے تھے، اس پر رسوخ ہو چکا تھا، اور دوسرون کے لئے ان کا اخلاص عمل نمونہ بن چکا تھا، حضرت تھانوی کو جن لوگون نے دیکھا ہے، اور اُن کے معیار و مسلک سے آگاہ ہین، وہ اس کو سمجھ سکتے ہین کہ حضرت کا فرمانا کہ فلان شخص سے اخلاصِ عمل کا سبق لو معمولی بات نہ تھی یہ خطاب بھی یقیناً اُن کے کاغذات مین ہوگا،

میرا قیام اعظم گڈھ ہی مین تھا کہ حضرت قبلہ نے الٰہ آباد کا سفر کیا، اور اثنائے راہ مین یہ غزل وارد ہوئی، جو کسی حد تک اُن کے اس وقت کے جذبات کی طرف اشارہ کرتی ہے،

براہ الٰہ آباد ۲۴ر اکتوبر ۴۲ء

ابھی تو مشق[۱] فغان کنج[۲] مین ہزار[۳] کرے — اثر[۴] کے واسطے کچھ اور انتظار کرے

---

۱ یعنی گوشہ محل وخمول یا خلوت شب ۲ مراد خود طالب یعنی اپنی ذات ہے ۳ مراد داہی وزاری ۴ رضائے حق،

جو آج لذّتِ دردِ نہاں کا جویا ہے — وہ پہلے سوز سے دل کو تو داغدار کرے

اُنہی کے دینے سے ملتا ہو جس کو ملتا ہو — وہی نہ چاہیں تو کوشش کوئی ہزار کرے

ادب سے دیکھیں عشاق دوریان کو — محال ہے جو انھیں کوئی ہمکنار کرے

سنا تو دے اُسے افسانۂ غمِ ہجران — وہ اعتبار کرے یا نہ اعتبار کرے

وہ اپنے کان سے سنتے ہیں میرے نالوں کو — وہ طرزِ نالہ ہو جو ان کو بے قرار کرے

پلا دے ساغرِ سرشار مجھکو وہ ساقی — خزاں کو ایک اشارہ میں جو بہار کرے

تری نظر میں ہے تاثیرِ مستیِ صہبا — تری نگاہ جسے چاہے بادہ خوار کرے

تری نگاہ میں دونوں خواص رکھے ہیں
وہ چاہے مست کرے چاہے ہوشیار کرے

اس غزل سے ثابت ہوتا ہے کہ باوجود شیخ کے اس ارشاد، ع از سلیمان گیرا خلاصِ عمل وہ اپنی حالت پر مطمئن نہیں ہیں، اور آثار جذب و عشق سے پوری غزل اس کیفیت سے لبریز ہے،

دوسرے ہی دن حضرت سید صاحب قبلہ رحمۃ نے الہ آباد سے لکھنو کا سفر فرمایا اور اس سفر میں وہ غزل ارقام فرمائی، جو لکھنؤ کے تعزیتی جلسہ منعقدہ ۲۶، ۲۷، دسمبر ۵۳ء کو مولوی حمید صاحب نے اثر حرم نے پڑھ کر سنائی تھی، جس سے حاضرین جلسہ پر وہ حالت طاری ہوئی جو دیکھنے والے ہی جانتے ہیں، اور اس کا بیان کرنا کم از کم میرے لیے مشکل ہے، وہ غزل یہ ہے،

براہ لکھنو ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۲ء

صدقِ احساس کی دولت مجھے ہو لا دیدے — غمِ امروز بھلا دے غمِ فردا دیدے

دھن کچھ ایسی ہو فراموش ہو اپنی ہستی — دلِ دیوانہ و سودائی و شیدا دیدے

اپنے میخانہ سے اور دستِ کرم سے اپنے — دونوں ہاتھوں میں مرے ساغر و مینا دیدے

کھول دے میرے لئے علم حقیقت کھود — دل داتا دل بنیا دل شنوا دیدے
قول مین رنگ عمل بھر کے بنا دے رنگین — لب خاموش بنا کر دل گویا دیدے
دل بیتاب ملے دیدۂ پُر آب ملے — تب آتش مجھے دیدے نم دریا دیدے

دردِ دل سینہ مین رہ رہ کے ٹھہر جاتا ہے
جو نہ ٹھہرے مجھے وہ درد خدایا دیدے،

یہ غزل اپنی کیفیات کے اعتبار سے سید صاحب قبلہ کی بہترین غزلون مین، اور ان کی کیفیات کے عروج و کمال کی آئینہ دار ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ اشعار مین جو عرض درگاہ قاضی الحاجات مین کی گئی تھی، وہ مقبول ہوگئی، اس کو پڑھکر بے ساختہ حضرت خواجہ حافظ رحمۃ اللہ علیہ کی یہ غزل یاد آتی ہے، اس کا بھی شان ورود کچھ اسی قسم کا ہے،

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند — واندران ظلمت شب آب حیاتم دادند
بیخود از شعشعۂ پرتو ذاتم کردند — بادہ از جام تجلّی بہ صفاتم دادند
من اگر کامروا گشتم و خوش دل چہ عجب — مستحق بودم و این ہا بزکاتم دادند

کیمیائیست عجب بندگی پیر مغان
خاک او گشتم و چندین درجاتم دادند

ایک مرتبہ لکھنؤ سے قبلہ کا سفر تھانہ بھون کا ہوا، اور شیخ کی بارگاہ مین تشنگی کو سیرابی عطا ہوئی اس کی مرقع ایک غزل اور ایک نعت ہے، نعت یہ ہے،

تھانہ بھون ۲۰ شوال ۱۳۶۱ھ

مطابق ۴ نومبر ۱۹۴۲ء عیسوی

نام محمد صلِ علیٰ نور محمد صلِ علےٰ — خد مودود صلِ علیٰ قد ممدود صلِ علیٰ

رحمتِ عالم صلِّ علیٰ فخرِ آدم صلِّ علیٰ
مرسلِ اکرم صلِّ علیٰ اسمک احمد صلِّ علیٰ

چہرۂ انور شمس ضحیٰ زلفِ معنبر لیل سجیٰ
قلب مطہر مبین ہدیٰ ذکر محمد صلِّ علیٰ

شاہدِ عالم شاہِ امم ہادیٔ اعظم شمعِ حرم
صاحب لطف و جود و کرم حق نے کہا صلِّ علیٰ

راقم کا گمان غالب ہے کہ اس قیام تھانہ بھون میں قبلہ علیہ الرحمۃ فانی فی الرسول ہوگئے، اور سیرت نگار نبوی کے لئے فنافی الشیخ ہونے کے بعد فنافی الرسول ہونے میں کیا دیر لگ سکتی ہے، جس شخص نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس زندگی کے ہر ہر پہلو پر سالہا سال کے غور و فکر کے بعد قلم اٹھایا ہو، اور اس کو مدلل و مبسوط طریقہ سے ضبط کرکے دنیا کے سامنے پیش کیا ہو، کیا یہ ممکن ہے کہ اس نے اپنے حالات و اخلاق کو اسی سانچہ میں ڈھالنے کی سعی نہ کی ہوگی، جن لوگوں کو حضرت علیہ الرحمۃ اور ان کی نشست و برخاست ان کے رہن سہن، ان کے خندہ و تبسم اون کے خورد و نوش، ان کی رفتار و گفتار، اُن کے حالات و کردار، اُن کے معاملات —— ان کا صبر و تحمل، اُن کی جود و عطا وغیرہ کو دیکھنے کا موقع ملا ہے، وہ اس کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ اُن کے جملہ حالات میں اسوۂ رسول کی کتنی جھلک تھی اس کے علاوہ حضرت نجیب الطرفین سید تھے اور انکے اسلاف میں سلسلہ بسلسلہ دولتِ ولایت ودیعت ہوتی چلی آئی تھی، خود اُن کے ذاتی حالات اظہر من الشمس ہیں، اُن کو قریب سے دیکھنے والوں کا جن میں ہر طبقہ، ہر جماعت اور ہر خیال کے لوگ شامل ہیں، اس پر اتفاق ہے کہ سیرت نگار نبویؐ کے ظاہری و باطنی اخلاق و اعمال پر خلق نبوی کا کتنا گہرا اثر تھا، خود حضرت مولانا تھانوی نے پہلی ہی ملاقات میں اپنے خاص متعلقین سے فرمایا تھا کہ

"بھائی ان کے اندر کس بات کی کمی ہے، ان کی مثال تو بارود کی سی ہے، محض دیا سلائی لگانے کی دیر ہے"

تھانہ بھون میں دس بارہ روز کے قیام کے بعد جب لکھنؤ واپسی ہوئی تو مجھے بھی اُن کے پروگرام کی اطلاع ہوئی، رخصت پر تو تھا ہی اپنے نجی کام سے لکھنؤ گیا، اور بعد فجر ندوۃ العلماء کے مہمان خانہ پر پہنچا، وہاں قبلہ کو

موجود پایا، آپ کے حالات و کیفیات کو یہ ناچیز کیا سمجھ سکتا لیکن اتنا اندازہ ضرور ہوا کہ حضرت بے حد مسرور و شادان ہیں، دارالعلوم کے اساتذہ، طلبہ اور دیگر حضرات مہمان خانہ میں حضرت کے گرد جمع تھے، اور آپ اپنے مخصوص انداز میں گفتگو فرمارہے تھے، چائے آئی، میں بھی شریک ہوا، چائے کے بعد مخصوص حضرات وہاں رہ گئے تھے، جن میں زیادہ دارالعلوم ہی کے اساتذہ اور طالب علم تھے، اس مجلس میں قبلہ نے اپنی غزل مورخہ ۲؍نومبر جو اوپر درج ہو چکی ہے لوگوں کو سنائی، یہ مجلس تقریباً دس گیارہ بجے ختم ہوئی، کھانا کھایا گیا، قدرے قیلولہ کے بعد نماز ظہر مسجد دارالعلوم میں جماعت کے ساتھ ہوئی، اس کے بعد پھر مہمانخانہ میں مجلس ہوئی، اس مجلس میں بھی کچھ غزلیں سنائیں، حاضرین میں سے چند حضرات کو میں نے علحدہ کہتے ہوئے سنا کہ سید صاحب قبلہ میں غیر معمولی تغیر ہے، یہ باتیں ان میں نہ کبھی دیکھی تھیں اور نہ سنی تھیں، اس سے اُن کی مراد یہ تھی کہ ان کو کبھی اس طرح شعر پڑھتے نہیں سنا تھا، اس لئے بہت متعجب تھے، دو یا تین دن دارالعلوم میں قیام رہا، اس درمیان میں برابر اس قسم کی مجلس ہوتی رہی، پھر لکھنؤ سے قبلہ کے ساتھ میں بھی ہم سفر ہوا، ریل میں یہ غزل ارقام فرمائی،

براہ شاہ گنج ۱۶؍نومبر ۴۲ء

ہر بات میں جس کی ہو کیفیتِ مستانہ — آباد رہے یارب تا حشر وہ میخانہ

چھائی ہے یہاں مستی ہر ایک نمازی پر — حیرت ہے یہ گھر اے دل مسجد ہے کہ میخانہ

زاہد نے کہاں پائی زاہد نے کہاں پی لی — گفتار ہے رندانہ رفتار ہے مستانہ

دستار فضیلت ہو یا دلقِ مرقع ہو — ہونا ہے اسی کو اک دن نذرِ درِ میخانہ

ہر قطرہ ندامت کا جو دیدۂ تر میں ہے — ہے دامن خالی کا وہ گوہر شاہانہ

وہ چشم محبت تو جویائے محبت ہے — دیکھے تو ذرا کر کے اس سے کوئی یارانہ

معشوق یگانہ ہے عاشق بھی یگانہ ہو — یعنی کہ جو اُن کا ہو وہ سب سے ہو بیگانہ

حاصل رہے کیفیت ہر وقت حضوری کی

آ دل میں مرے چھپ جا اے صورتِ جاناں

جو شعر لکھتے تھے اس کو کمترین کو سناتے تھے کچھ اشعار ظہر کی نماز سے پہلے لکھے، پھر اس کے بعد اور عصر سے پہلے غزل مکمل ہو گئی، اور شاہ گنج ہوتے ہوئے ہم لوگ ۸ بجے شب کو اعظم گڈھ کو پہنچے، آخری شعر کے علاوہ پوری غزل میں یا تو شیخ کے فیوض و برکات کا ذکر ہے، یا خود اپنی ذاتی کیفیت و حالت کا بیان ہے، آخری شعر خاص طور پر کئی حیثیتوں سے قابل غور ہے، اس میں فنائی اللہ کی دلالت پائی جاتی ہے،

حضور دوام کی تمنا کے ساتھ محبوب حقیقی سے دل میں سما جانے کی التجا عروج کا انتہائی مقام ہے جس کے بعد سیر فی اللہ شروع ہوتی ہے، جس کی انتہا نہیں، اسی مقام کو کسی عارف نے اس شعر میں ظاہر کیا ہے،

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جان شدی

تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

اس کے بعد ۲۰ر نومبر ۴۲ء کو اعظم گڈھ ہی میں یہ غزل ہوئی،

کیا بھری تاثیر میں مطرب تری آواز ہے | جو تری محفل میں بیٹھا وہ سراپا ساز ہے
باغ میں صحرا نظر آتا ہے اور صحرا میں باغ | اب مرے جوشِ جنوں کا اور ہی انداز ہے
پاؤں تو حد ادب سے عشق میں باہر نہ رکھ | وہ ہمہ خوبی و محبوبی سراپا ناز ہے
نام اُن کا ہر نفس میں لب پہ یوں آیا کیا | تن سے جیسے روح بسمل مائل پرواز ہے
دیکھئے ملتی ہے کب دولت سکونِ عشق کی | ہائے ہوئے جوش تو سرمایۂ آغاز ہے
گاہ دیکھا تھا مری چشم تصور نے تمھیں | اب وہی تصویر میری ہمدم و دمساز ہے

جو نہیں معلوم ہے اس کو کوئی جانے گا کیا

جب کہ جو معلوم ہے وہ بھی سراسر راز ہے

اس غزل کا بھی قریب قریب وہی انداز ہے، جو اس سے پہلے کی غزل کا ہے، اب سید علیہ الرحمۃ فانی فی اللہ ہو چکے تھے، اون کا کلام اسی نہج پر قائم ہوگیا،

دسمبر ۴۲ئہ کی پہلی یا دوسری تاریخ کو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا والا نامہ آیا، عصر کی نماز کے بعد حسب معمول کمرہ مین چائے آئی، سب اعزہ جمع ہوئے، چائے پی کر سب لوگ چلے گئے، مگر مین وہین بیٹھا رہا، تھوڑے سکوت کے بعد ارشاد فرمایا کہ حضرت مولانا کا والا نامہ آیا ہے، تحریر فرمایا ہے کہ من جانب الٰہی وارد ہوا ہے کہ آپ کو طریق قادریہ نقشبندیہ سہروردیہ و چشتیہ مین اجازت بیعت کی دون، چنانچہ اس وارد غیبی کے تحت آپ کو اس کا اہل پاتے ہوئے اجازت بیعت کی دیتا ہون، اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہون کہ برکت و صبر عطا کرین، اور آپ کے فیوض کو عرصۂ دراز تک جاری رکھین، آپ اس کی اطلاع اپنے ملنے والون، اور دوستون کو بھی کر دین، تاکہ لوگون کو علم ہو جائے، اور ان کو افادہ ہو،

یہ خبر سنانے کے بعد اپنے مخصوص انداز مین فرمایا، کہ بھائی مین تو بالکل خام ہون، لیکن حضرت کے ارشاد کی تعمیل مین تم کو اس کی خبر کرتا ہون، تم اپنے عزیز بھی ہو، اور حضرت سے تم کو عقیدت بھی ہے، مین سُن کر باغ باغ ہوگیا، اس کے بعد بھی میرا قیام تقریباً ۲ ہفتہ اعظم گڈھ مین رہا، اور برابر قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میسر رہی، اور بہت قریب سے اُن کے حالات مشاہدہ مین آئے، جن کا پوری طرح تحریر مین لانا میرے لیے مشکل ہے، اور اس کی اس مختصر مضمون مین گنجایش بھی نہین ہے، اس لئے صرف نمونہ مشتے از خروارے پیش کرتا ہون کہ اُن سے محبت کرنے والون کے اشتیاق کو کچھ سیری ہو سکے،

سب سے بڑی بات جو مین نے دیکھی وہ یہ تھی کہ اس کے بعد بڑی تیزی سے ماسوا سے قلب کا، رہا سہا علاقہ بھی منقطع فرما لیا، پہلے دارالمصنفین کے کامون سے خالی اوقات کا کافی حصہ اہل و عیال کے ساتھ دینی مذاکرہ مین صرف فرماتے یا چھوٹے بچون سے بذلہ سنجی مین، اب ان اوقات کا بڑا حصہ خلوت مین گذرتا، خواہ مسجد مین ہو یا اپنے مسکونہ کمرے مین، پہلے عصر کے بعد چائے رفقائے دارالمصنفین کے ساتھ نوش فرماتے، اور مغرب تک اُن سے مختلف

مسائل پر گفتگو فرماتے، یہ مجلس بھی تقریباً ختم ہوگئی، کبھی اعزہ، اہلیۂ محترمہ سے اشتیاق ظاہر کرتے کہ قبلہ سے کچھ باتیں سنوا دیجئے، عرصہ ہوا اُن کی صحبت جی بھر کر نہیں میسر نہیں آئی، تو وہ جاکر گوشہ مخلوت ہوئے آتیں، اور کچھ دیر کے لئے آپ تشریف لے آتے، اہل وعیال واحباب کی درخواست بہت کم مسترد فرماتے تھے، اس لئے انکی دلجوئی واستمالت کے لئے برآمدہ یا آنگن میں تشریف رکھتے، مگر دل کہیں اور ہی ہوتا، سب کی خیر وعافیت دریافت فرماتے، اور جلد ہی اُٹھ کر جانا چاہتے، اگر کوئی اصرار کرتا، تو تھوڑی دیر کے لئے رُک بھی جاتے لیکن سب کو یہ محسوس ہوتا،

چسکا لگا ہے جام کا شغل ہے صبح وشام کا

اب میں تمہارے کام کا ہم نفسو نہیں رہا

یہ صورت دیکھ کر لوگوں نے اصرار کرنا ترک دیا، اور حضرت قبلہ کا اہل وعیال سے ملنا جلنا بھی دس پانچ منٹ کا رہ گیا، باہر کے سفر بھی ترک فرما دیئے، ایم اے وغیرہ کے امتحانات کی ممتحنی وغیرہ سب چھوڑ دی، دارالمصنفین کے کام کے اوقات کے علاوہ خلوت کو زیادہ عزیز رکھنے لگے،

خورد ونوش اور لباس وغیرہ میں بڑی تبدیلی ہوگئی، پہلے کے لباس فاخرہ سب بکسوں ہی میں بند رہ گئے، نادر شاہ کی عطا کردہ خلعت کو کیڑوں نے چاٹ لیا، اکثر اہلیۂ محترمہ یاد کرکے ہر دوسرے دن کپڑے نکال دیتیں، اور اگر کاموں کی مشغولیت سے انھیں خیال نہ رہتا، تو خلاف معمول تین تین دن تک ایک ہی کپڑا پہنے رہتے، بعض لوگ جن کو مزاج عالی میں درخور تھا، کبھی عرض کرتے کہ حضرت تصوف کے یہ معنی تو نہیں کہ انسان کو کپڑا بدلنے کی بھی خبر نہ رہے، مسکرا کر فرماتے کہ اب بوڑھا ہوگیا ہوں، یاد نہیں رہتا آپ یاد دلا دیا کریں،

چودھری اکبر حسین صاحب جج نے جن کو حضرت سے عقیدت تھی، تحریر فرمایا کہ حضرت آپ تو خود علوم ومعارف کا سمندر ہیں، آپ کو مولانا تھانوی کے پاس جانے کی کیا ضرورت پیش آئی، دریا سمندر میں

گرتا ہو نہ کہ سمندر دریا ہیں، اور بھی بعض لوگوں کے اسی قسم کے خطوط آئے، ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ دیکھئے ان حضرات کو کہ ایک طرف مجھ سے اظہار عقیدت بھی فرما رہے ہیں، اور دوسری طرف اپنی تجویز بھی پیش کر رہے ہیں، اور میرے فیصلہ پر تنقید بھی ہے، عقیدت کے تو یہ معنی ہیں کہ اُن کو یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ میرے متعلق جو کچھ کہتے ہیں، اگر وہ سب صحیح ہو تب بھی اُن کو غور کرنا چاہئے کہ میں نے جو کچھ کیا ہے وہ سوچ سمجھ کر، اور دور دست جان کر کیا ہوگا، یہ تو ایک اصولی بات ہو کہ اگر ایک فن میں مجھے مہارت نہیں، اور کوئی اس فن کا مجھ سے زیادہ واقف کار ہے، تو اس سے اس بات کے دریافت کرنے میں کونسی بات خلاف عقل ہے، یہ کیا ضروری ہے کہ ایک انسان میں سارے علوم موجود ہوں، تمام کمالات تو اللہ پاک ہی کے لئے ہیں، اور یہ تو نص سے بھی ثابت ہے کہ فضّل اللہ بعضھم علی بعض، اس لیے ان کا یہ اعتراض میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا، مگر یہ بیچارے معذور ہیں، اُن کی نیت بُری نہیں ہے، کبھی کسی پر تعریض نہیں فرماتے، بات کو منقح کرنے کے بعد فیصلہ سامع پر چھوڑ دیتے، خود قطعی حکم نہ لگاتے، عجیب تحمّل اور صاحب خلق ومروّت انسان تھے، اکثر فرماتے کہ بھائی کیا میرے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ میں اپنے کپڑے بھی خود سی لیا کروں، یہ تو فن کی بات ہے، حضرت مولانا تھانوی کو اللہ پاک نے فن تصوّف میں اس دور میں بڑی مہارت عطا فرمائی ہے، اس لئے ان کی مہارت سے اگر فائدہ اٹھایا جائے، تو اس میں کونسی عیب کی بات ہو،

انہی ایام میں اکثر دیکھا کہ حضرت قبلہ فرش زمین پر بیٹھے ہیں کہ لوگ آ گئے آپ وہیں بیٹھے بیٹھے گفتگو فرمانے لگے، کبھی بعد نماز مغرب دار المصنفین کی مسجد کی شمالی چار دیواری پر ایک کونہ میں ذکر حق میں مشغول ہوتے، کبھی مکانِ مسکونہ کے باہر برآمدہ میں تخت پر بغیر کسی فرش کے کبھی مکان کے کسی اور گوشہ میں متوجہ الی الحق پائے جاتے، کھانے کا وقت آتا یا کسی اور ضرورت سے لوگ تلاش کرتے ہوئے پہنچے تو اس حالت میں دیکھ کر عرض کرتے کہ اس طرح کیوں تشریف رکھتے ہیں، فرما دیئے ہوتے تو فرش بچھا دیا جاتا، یا قالین کی جانماز بچھا دی جاتی، سردی کا موسم ہے "ٹھنڈک نہ لگ جائے" فرماتے کہ ان ظاہری باتوں میں کیا رکھا ہے، خود قبلہ کا شعر اس

موقع پر یاد آیا،

جون پور، ۲۷ اکتوبر ۴۳ء،

ہم ایسے رہے یاں کہ ویسے رہے — وہاں دیکھنا ہے کہ کیسے رہے

خیالِ دو روزہ کا کیا عیش و غم — سفر کا بھی کیا جیسے تیسے رہے

یہ اس شخص کا حال ہے جو اس دور میں نفاست مزاج میں مرزا جان جاناں شہید کی مثال اور ظاہری و باطنی حسن اخلاق کا مجسمہ تھا، جس کا رہن سہن اور لباس شاہانہ رہ چکا تھا، جس کی سیرت نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرونِ ہند بھی مقبول ہو چکی تھی، وہ دار العلوم ندوۃ العلماء کا درخشندہ ستارا جس کی علمی شہرت ساری دنیائے اسلام میں تھی، وہ صاحبِ علم جس کے قلم کا لوہا یورپ کے مستشرقین تک مانتے تھے، جس کے زورِ قلم نے الہلال کو بدرِ کامل بنا کر چمکایا، جس کی معارف نوازی نے علم و فن کے دریا بہا دیئے، جس نے استاد مرحوم کی وصیت کو اس درجہ نباہا کہ اعظم گڈھ جیسے ویرانے کے ایک گوشہ میں ساری عمر گزار دی، اس چھوٹے سے مقام کو علم و فن کا مرکز بنا دیا، اور دار المصنفین کی علمی شہرت ساری دنیا میں پھیلا دی، جس کی زیارت کے لئے دور دور کے اہلِ کمال آتے تھے،

وہ جامع العلوم جس کو نادر شاہ نے کابل یونیورسٹی کا نصاب بنانے کے لئے منتخب کیا، جس نے اپنی عربی دانی کا سکہ عربوں تک پر بٹھا دیا، جس نے پیرس اور روم و لندن وغیرہ کے علمی حلقوں سے خراجِ تحسین حاصل کیا، وہ مورخِ اعظم جو اپنے دور میں مدتوں معیارِ تاریخ سمجھا گیا، وہ قدیم و جدید کا سنگم جس کی ذات میں دونوں کی حدیں ملتی تھیں، وہ پرتو صفاتِ نبوی، وہ نمونۂ اخلاقِ اسلامی، وہ جامع کمالاتِ انسانی، وہ جسے دنیا کی ہر قسم کی جاہ و شہرت بے طلب حاصل تھی، دفعۃً جب مقامِ فنا سے گزرتا ہے تو اپنے آپ کو ایسا مٹاتا ہے کہ موتوا قبل ان تموتوا کا مصداق بن جاتا ہو حضرت قبلہ کی ایک غزل ان حالات کی بہترین ترجمان ہے،

پاکر تجھے اپنے کو میں کیا بھول گیا ہوں | ہر سود و زیانِ دوسرا بھول گیا ہوں
جس دن سے مری دل میں تری یاد بسی ہے | ہر ایک کو میں تیری سوا بھول گیا ہوں
آتا ہے خدا بھی ترے صدقہ میں مجھے یاد | گویا کہ بظاہر میں خدا بھول گیا ہوں
عالم کے تماشے نہیں اب جاذبِ دل ہیں | ہر لذتِ ہستی کا مزا بھول گیا ہوں
ہر سمت نظر آتے ہیں ہر وقت وہ مجھکو | دوریٔ مسافت کا گلہ بھول گیا ہوں
اب مسئلۂ کثرت و وحدت کو میں سمجھا | پاکر تجھے سب تیرے سوا بھول گیا ہوں
سجدہ طرفِ کعبہ ہے، دل تیری طرف ہے | اب قبلہ بھی اے قبلہ نما بھول گیا ہوں
حل جب سے ہوا فلسفۂ حسنِ حقیقت | ہر مسئلہ اے ذہن رسا بھول گیا ہوں
ہے آہ سحرگاہ میں وہ ذوقِ لب و گوش | چنگ و نئے و بربط کی صدا بھول گیا ہوں
منظور تری چشمِ رضا جب سے ہوئی ہے | امید جزا خوف سزا بھول گیا ہوں
اے رہبرِ توفیق مجھے راہ بتادے | نقشِ قدمِ راہ نما بھول گیا ہوں
اے خضر مرا قافلہ کس سمت گیا ہے | تیسیرِ صداہائے درا بھول گیا ہوں
الٹا ہے ورق آج سے افسانۂ نو کا | افسانۂ پارینہ و لا بھول گیا ہوں

یہ غزل حضرت مولانا تھانویؒ سے بیعت ہونے کے ہفتہ عشرہ کے اندر ہی کہی تھی، اس زمانہ میں جو کیفیات اُن پر طاری ہوئیں، ان کی ترجمانی اس سے بہتر اور کسی غزل میں نہیں پائی جاتی،

تصوف میں حضرت کا جو مقام تھا، اس کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے، مگر اس فن میں حضرت کو جو دستگاہ حاصل تھی، اس کا کسی قدر اندازہ حضرت کے اقوال سے کیا جاسکتا ہے، ایک بار میں نے استفسار کیا کہ حال، و مقام کیا ہے، اور مراتب سلوک کسے کہتے ہیں، اس کے جواب میں تحریر فرمایا،

حال:۔ سالک کے قلب پر جو عارضی کیفیت اس کے اختیار کے بغیر

طاری ہو جائے،

مقام: وہ مرتبۂ سلوک جس پر سالک رسوخ قدم کے ساتھ قائم ہو جائے،

مراتب سلوک: یعنی مقامات جیسے صبر و شکر، توکل، استقامت علی الحق، زہد، رجاء وغیرہ،

ایسے جامع کمالات کا تذکرہ جس کے قلم نے صدہا انسانوں کو زندۂ جاوید کر دیا، مجھ جیسے ہیچ میرز انسان کے بساط سے باہر ہے، لیکن اُن کی جو شفقت اس ناچیز پر تادم آخر رہی، اس کو کسی طرح بھولا نہین جا سکتا، اور یہ کمترین فرد خانوادۂ سلیمانی اس وقت بھی اُن کے فیوض کو اپنے اوپر اسی طرح پاتا ہے، جس طرح اُن کی حیات مین پاتا تھا، اور انھی کی روحانی برکت سے یہ چند سطور اس ناچیز کے قلم سے تحریر مین آگئین،

اب مین اس ذکر کو حضرت قبلہ کے خواجہ تاش حضرت مولانا عبد الصمد صاحب مدظلہ دامت برکاتہ کی اس تحریر پر ختم کرتا ہون، جو انھون نے حضرت قبلہ کی وفات کے وقت مجھکو لکھی تھی،

"ایک خبر جانکاہ ریڈیو سے ۲۲ر نومبر کی شب مین پاکستان سے نشر ہوئی تھی کہ ہمہ صفت علوم دینیہ و ادبیہ و تاریخ و تصوف کے آن موصوف کے ارتحال کی تھی، اس کا صدمہ بہت ہے، انا للہ و انا الیہ راجعون" اللہ تعالیٰ اُن کو بہتر ٹھکانا جنت الفردوس مین عطا فرمائین، اور ان کے درجات عالیہ ہر روز وہان بلند فرماتے رہین، موت تو اس عالم آب و گل کے ہر بسیط ہستی کے لئے لازم ہو چکی ہے مگر موصوف ہمہ صفت پر کیا ماتم کا حق ادا ہو سکے، سوا اس بات کے کہ ہند کی سرزمین کا ایسا فرد جو علمی و ادبی عالم مین مایۂ ناز ہستی تھا، جس کی تلافی اس دور مین محال کا اندازہ لگاتے ہوئے دشوار ہی نہین بلکہ محال ہے، اللہ تعالیٰ آن موصوف کو اعلیٰ علیین مین بلند مقام پر فائز فرمائین،

اور ہم پس ماندگان کے لئے اُن کی ذات اقدس کو نمونہ بنا کر درس عمل کی توفیق بخشیں، آپ کی بہت سی خصوصیات، اکتسابی وغیر اکتسابی نوادرات میں سے تھیں جو قابل مطالعہ و وسبق ہیں، اللہ تعالیٰ صبر جمیل عطا فرمائیں،

حضرت قبلہ مرحوم میرے محترم بڑے پیر بھائی تھے، جن کا صدمہ مجھے بہت زیادہ ہے، اس کی تلافی تو بس اللہ تعالیٰ کی ذات پاک بن سکتی ہے،"

# ڈاکٹر سید سلیمان ندوی مرحوم اور انکا تشخص

از

ڈاکٹر محمد زبیر صاحب صدیقی

مولانا ڈاکٹر سید سلیمان ندوی کی وفات ہم لوگون کے لئے ایک جانکاہ حادثہ ہے، اس حادثہ ہائلہ سے ہندوستان کی مسلم سوسائٹی مین علی العموم اور ہماری علمی دنیا مین علی الخصوص ایک ایسا خلاء پیدا ہوگیا ہے جس کا پُر کرنا بہت ہی مشکل اور متعذر معلوم ہوتا ہے، سید صاحب مرحوم مین اُن کے علمی تبحر کے ساتھ ساتھ ایسی ذاتی اخلاقی اور نفسانی خوبیان تھین، جو آج کل ہم لوگون مین مفقود ہیں، یہ خصائل حسنہ اُن کو اپنے آباء و اجداد سے وراثۃً ملے تھے، اور علمی تبحر انھون نے اپنی مسلسل محنت و جانفشانی، اور مطالعہ سے حاصل کیا تھا،

وہ علماء بہار کے ایک ایسے ممتاز خاندان کے چشم و چراغ تھے، جن کی اخلاقی خوبیون کی داستان وہان کے اکثر بڑے بوڑھے بیان کیا کرتے تھے، اُن کا مولد و موطن بہار کا ایک چھوٹا سا گاؤن دسنہ تھا، جو اب بھی اہلِ علم کا جم بھوم ہونے کی حیثیت سے اس صوبہ مین ایک خاص امتیاز رکھتا ہے، ایسی چھوٹی سی بستی کے علمی ماحول مین سید سلیمان مرحوم نے اپنی ابتدائی عمر صرف کی، اور عربی فارسی کی ابتدائی تعلیم بھی حاصل کی، زندگی کا یہ ابتدائی حصہ ہر شخص کے لئے بہت ہی اہم ہوتا ہے، اسی زمانہ مین انسان کے خصائل بنتے ہین، اس کی سیرت کا بڑا اہم حصہ جڑ پکڑتا ہے، اور اس کا تشخص متعین ہوتا ہے، ماہرین نفسیات کی تو

راے ہے کہ پانچ سال کی عمر کے بعد انسان کے کردار مین عموماً کوئی اہم تغیر پیدا ہی نہین ہوتا، سید سلیمان مرحوم کی سیرت اور خصائص وشمائل کی بنیاد اسی چھوٹے سے گاؤن کے علمی ماحول مین پڑی، اور اُن کا تشخص یہین متعین ہوا،

یہ ماحول ہمارے قدیم طرز کے علماے اسلام کا تھا، جو قرآن و حدیث وغیرہ کو پڑھ کر صرف اپنے حافظہ ہی مین نہ رکھتے تھے، بلکہ ان مین جو اخلاقی تعلیم ہے، اس کو اپنے دلون مین سمو لیتے تھے، وہ محاسنِ اخلاق کے مجسمے ہوتے تھے، اُن کی جیتی جاگتی چلتی پھرتی تصویر ہوتے تھے، عجز و انکسار، محبت و مودت، صداقت و امانت، صبر و استقامت، تحمل و تشکر، عفت و پاکبازی، عام انسانی ہمدردی، خوفِ خدا، اور جذبۂ خدمتِ خلق، اور دوسری صفاتِ عالیہ کے ساتھ، جن کی تعلیم کلامِ پاک اور رسولِ کریمؐ نے دی ہے متصف ہوتے تھے، یہ لوگ اپنے بچون اور طلبہ کو ابتدائی عمر مین کریما، اور پند نامہ جیسی اخلاقی کتابین صرف پڑھاتے ہی نہ تھے، بلکہ انھین جو اعلیٰ اخلاقی تعلیم دی گئی ہے، ان کا اپنے اعمال و افعال، اور حرکات و سکنات سے، ان کے سامنے مظاہرہ بھی کرتے تھے، وہ جس طرح اپنے اوقات کی قدر کرتے تھے اسی طرح دوسرون کے اوقات کی قدر و قیمت کو بھی سمجھتے تھے،

یہ سارے صفاتِ حمیدہ سید سلیمان نے اپنے آباؤ اجداد سے وراثۃً پائے تھے، اور اُن کے ماحول نے انکی سیرت و کردار مین پختگی پیدا کر دی تھی، میری جو چند ملاقاتین سید سلیمان صاحب مرحوم سے ہوئین، اُن سے مجھ پر یہی اثر ہوا کہ سید صاحب مرحوم کے محاسن اخلاق، اہلِ اسلام کے لئے ایک نمونہ تھے، ان ملاقاتون کی تفصیل یہ ہے،

یہ عجیب افسوسناک واقعہ ہے کہ باوجود اس کے کہ میرا مولد و موطن ضلع پٹنہ ہی ہے، اور مین نے بھی علومِ عربیہ کی ابتدائی تعلیم شہر پٹنہ ہی مین حاصل کی، سید سلیمان مرحوم سے میری ملاقات صرف پانچ دفعہ ہوئی، اور ان مین بھی چار بار محض اتفاقی طور پر،

پہلی ملاقات ۱۹۱۱ء مین ہوئی، جب مین مدرسۂ عالیہ رامپور سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اورینٹل کالج لاہور مین مولوی فاضل کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا، سید صاحب اُس زمانہ مین دار العلوم ندوۃ العلماء مین مدرس تھے، لاہور سے پٹنہ جاتے ہوئے مین مولانا شبلی مرحوم اور سید صاحب مرحوم کی زیارت کرنے کیلئے دو دن

لکھنؤ میں ٹھہر گیا، سید صاحب سے مسجد میں نماز ظہر کے وقت ملاقات ہوئی، صرف چند منٹ کچھ باتیں کیں، پھر میں نے رخصت چاہی، تو سید صاحب نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا، میں نے مدرسہ کے طلبہ کے شرارت آمیز انداز میں مسکرا کر عرض کیا کہ مولانا! رخصت کے وقت تو مصافحہ آیا نہیں ہے، سید صاحب مسکرائے، اور بجائے اس کے کہ اس مسئلہ پر بحث کرنا شروع کر دیتے، خاموش ہو رہے، حالانکہ وہ اس مسئلہ پر اچھی خاصی عالمانہ بحث کر سکتے تھے،

سید صاحب سے میری دوسری ملاقات سنہ ۱۹۳۶ء میں ندوۃ العلماء کے کتبخانہ میں محض اتفاقی طور پر ہوئی، میں کتب خانہ میں ابن تیمیہ کی کتاب المعتبر کے مخطوطہ کی تلاش میں گیا تھا، اتفاق سے سید صاحب بھی وہاں موجود تھے، لیکن میں نے اُن کو نہ پہچانا، مہتمم کتب خانہ سے باتیں کر کے واپس ہونے لگا تو سید صاحب نے خود ہی بلا تکلف میرا نام دریافت کیا، میں نے عرض کیا "زبیر" تو فرمایا کہ "میں بھی یہی سمجھا تھا، میرا نام سید سلیمان" ہے، میں نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا، اور نہ پہچاننے کی معذرت کی، اس کے بعد ندوہ کے متعلق چند باتیں ہوئیں، اور آئندہ تفصیلی ملاقات کی امید پر میں نے رخصت حاصل کی،

میری تیسری ملاقات سید صاحب سے اتفاقی طور پر ریل میں سنہ ۱۹۳۲ء میں ہوئی، سید صاحب حسب معمول نہایت بے تکلفی سے ملے، اس زمانہ میں میں تاریخ علم الحدیث پر کام کر رہا تھا، اس موقع کو غنیمت سمجھکر میں نے اُن سے استفادہ کے خیال سے فن اسماء الرجال کی ابتداء، اور نقد حدیث وغیرہ کے متعلق مختلف سوالات کئے، اور اس سلسلہ میں گولڈزیہر کی کتاب "مطالعاتِ اسلامیہ" کی تعریف کی، سید صاحب کو میری یہ بات پسند نہ آئی، فرمایا کہ یورپین مصنفین اصطلاحات وغیرہ کی ناواقفیت کی وجہ سے غلطیاں کرتے ہیں اور اسلام پر حملے کرتے ہیں، آپ ان لوگوں کی باتوں پر نہ جائیے، میں نے عرض کیا کہ یہ تو صحیح ہے کہ پڑھے لکھے آدمی کو کسی دوسرے کے کہنے پر بے سوچے سمجھے آمنا و صدقنا نہ کہنا چاہئے، بلکہ ہر مسئلہ پر جہاں تک ممکن ہو تو تحقیق کے بعد رائے قائم کرنا چاہئے............ لیکن اس کے ساتھ

ساتھ دوسرون مین کوئی خوبی ہو تو اس کی داد بھی ضرور دینا چاہئے، اور گولڈزیہر کی وسعت نظر کا مین قائل ہون،
اور اس کی داد دیتا ہون، مولانا نے فرمایا کہ جب آپ اوس کی کتاب کا زیادہ غائر مطالعہ کرین گے، تو آپ
کو معلوم ہوگا کہ اس کی تحقیق کی نوعیت کیا ہے، بعد کے مزید مطالعہ سے مولانا کا فرمانا اتنا بھر تو صحیح
ثابت ہوا کہ گولڈزیہر کبھی کبھی اپنے نتائج محض مفروضات کی بنا پر نکالتا ہے، اور اس مین سخت غلطی کرتا ہے، لیکن
اس کا علمی تبحر اور اس کی وسعتِ نظر اپنی جگہ پر ہے،

اسی صحبت مین سید صاحب مرحوم نے مجھ سے حضرت عائشہؓ کی تنقید حدیث کا ذکر کیا اور اس مسئلہ پر سیوطی کے
ایک چھوٹے سے رسالہ کا بھی نام لیا، بلکہ کچھ دنون بعد انھون نے یہ رسالہ میرے پاس عاریۃً بھیج بھی دیا، جس سے
مین نے استفادہ کیا، لیکن بعد کے مطالعہ سے پتہ چلا کہ ان مین سے اکثر حدیثین مسند ابی داؤد طیالسی مین موجود ہین،

اس کے تھوڑے دنون بعد سید صاحب سے میری ملاقات حیدرآباد کے دائرۃ المعارف کے جلسہ منعقدہ
۱۹۳۸ء مین ہوئی، اُس جلسہ مین ہندوستان کے مختلف حصون کے اکابر علماء شریک تھے، ان مین
ایک نہایت جید فاضل بھی تھے، جو میرے اور سید صاحب دونون کے دوست تھے، اُن کے علم و فضل کی سید صاحب
بھی قدر کرتے تھے، اور مین تو اُن کے فضل و کمال کا قائل تھا ہی، اُن کی ایک کتاب پر دوسرے جید فاضل
نے بہت سخت تنقید کی تھی، اور یہ تنقید سید صاحب نے 'معارف' مین شائع کی تھی، انھون نے سید صاحب سے شکایت
کی کہ یہ تنقید کیون شائع کی، سید صاحب نے فرمایا کہ یہ ایک علمی مضمون تھا، اور معارف ایک علمی جریدہ ہے،
مین نے اس مضمون مین جو سخت اور نا ملائم الفاظ تھے، ان کو نکال کر شائع کر دیا، اور یہ میرا فرض تھا، آپ چاہین
تو اس کا عالمانہ جواب لکھین، وہ بھی شائع کر دیا جائے گا، لیکن اگر اس مین کوئی سخت اور نامناسب لفظ ہوگا
تو اُن کو بھی حذف کر دیا جائے گا، باوجود اس جواب کے جو میرے خیال مین نہایت معقول تھا، ہمارے دوست
خفا ہوتے رہے، اور سید صاحب مرحوم سنجیدگی اور متانت کے ساتھ جواب دیتے رہے، میرے دوست کی گفتگو
کی سختی کے باوجود انھون نے کسی طرح کے غم و غصہ کا اظہار نہ کیا،

سید صاحب مرحوم سے میری پانچوین اور آخری ملاقات ڈھاکہ مین آل پاکستان ہسٹوریکل کانفرنس کے جلسہ کے موقع پر ہوئی، سید صاحب مرحوم اس جلسہ کے صدر تھے، انھون نے اپنے خطبۂ صدارت مین چند تاریخی اور ادبی حقائق بیان کئے تھے جن سے کسی پڑھے لکھے آدمی کو انکار نہین ہوسکتا، لیکن بعض خاص سیاسی اسباب کے باعث طلبہ مین غلط فہمی پھیل گئی، یا پھیلائی گئی، ان لوگون نے جلسہ کے دوسرے دن سید صاحب کے سامنے اُن کے خلاف نہایت سخت اور افسوسناک مظاہرہ کیا، اور اُن کو مجبور کیا کہ وہ جلسہ سے چلے جائین، جلسہ موقوف کردیا گیا، اور مولٰنا رفع شر کے خیال سے اپنے جاے قیام پر چلے گئے، مین بھی وہان گیا، مولانا لیٹے ہوئے تھے، مین نے حال دریافت کیا، فرمایا سب ٹھیک ہے، پھر یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور چند اساتذہ معافی مانگنے کے لئے آئے، اُن سے سید صاحب نے دوران گفتگو مین بلا کسی غم و غصہ کے فرمایا، کہ جو کچھ مین نے کہا وہ تاریخی حقائق ہین، اور مظاہرہ اور ہنگامہ کرنے سے یہ حقائق تو بدل نہین سکتے،

اس تمام ہنگامہ اور قصہ مین سید صاحب کا صبر و تحمل اور ضبط نفس قابلِ ستایش و آفرین تھا، انھون نے نہ تو طلبہ کی کسی سے شکایت کی، نہ کسی کے خلاف ایک حرف زبان سے نکالا،

ان پانچون واقعات سے سید صاحب کے کردار اور اُن کی شخصیت پر نمایان روشنی پڑتی ہے، ان کے اندر نہ تو کبر و نخوت تھا، نہ خود پسندی تھی، وہ لاطائل صحبت ناپسند کرتے تھے، چھوٹون سے محبت و خلوص سے ملتے تھے، علمی کام کرنے والون کی ہر طرح اعانت کرتے تھے، تحمل و بردباری اُن کی خاص صفت تھی، شر و فساد سے اُن کو نفرت تھی، جو لوگ ان کی تذلیل کرتے تھے، اُن کو بھی وہ مخلصانہ اور مصلحانہ نصیحتین کرتے تھے،

علماے اسلام کے طرۂ امتیاز یہی نفسانی اور اخلاقی فضائل حسنہ ہین، اگر علومِ اسلامیہ کی درس و تدریس کے بعد بھی یہ خصائل نہ پیدا ہون تو سارا علم و فضل بیکار ہے، معلم الملکوت سے زیادہ بڑا عالم کون

ہو سکتا ہے؟ لیکن اس کا علم کس کام کا ہے؟

سید سلیمان ندوی مرحوم فضائلِ عالیہ نفسانیہ کے ساتھ متصف ہونیکے ساتھ ساتھ عالم متبحر اور فاضلِ اجل بھی تھے، اور مختلف علوم اسلامیہ کا وسیع علم رکھتے تھے، انھون نے اپنی پچاس سالہ علمی زندگی مین سیکڑون مضامین الندوہ، الہلال، معارف اور دوسرے جرائد کے لئے لکھے، بیسیون چھوٹے بڑے خطبے پڑھے اور درجنون چھوٹی بڑی کتابین تصنیف کین، اُن کے ہر مضمون، خطبے اور تصنیف سے معلوم ہوتا ہی کہ وہ اپنے موضوع سے کافی واقفیت رکھتے تھے،

سید صاحب جب کسی اہم موضوع پر قلم اٹھانا چاہتے تھے، تو اس کے متعلق کافی مطالعہ کرتے تھے اور جہان کہین بھی ان کو اپنے موضوع کے متعلق معلومات کے ملنے کی توقع ہوتی، وہان سے جو کچھ ان کو مل سکتا تھا، اس کو اخذ کرتے تھے، اور حتی الوسع تحقیق و تنقید کے بعد جو کچھ اُن کو ملتا تھا، اس کو نہایت سلیقے اور عالمانہ طور سے سجاتے تھے،

سید صاحب کا طریق تحقیق عموماً تو وہی تھا، جو اُن کے استاد مرحوم مولٰنا شبلی کا تھا، لیکن ایک حد تک وہ آزادانہ اپنے خیال کا اظہار کرتے تھے، چنانچہ بعض مسائل مین انھون نے مولٰنا شبلی سے اختلاف بھی کیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ سید صاحب قید بن فکر کے اُس جنجال سے جو گذشتہ دو تین صدیون مین مسلمانون مین پھیل گیا تھا، بہت باہر نکل آئے تھے، یہ لوگ تو علومِ عقلیہ مین بھی اپنے اساتذہ سے اختلاف کرنے کو اثم عظیم سمجھتے تھے، چنانچہ میرے استاذ مولٰنا فضلِ حق رامپوری مرحوم نے جب میرزاہد امورِ عامہ کے حاشیہ مین مولٰنا عبدالحق خیرآبادی مرحوم پر جو میرے استاد الاستاد تھے بعض فلسفیانہ مسائل کے متعلق کچھ اعتراضات کئے، تو مولٰنا عبدالحق مرحوم کے معتقدین اور شاگردون مین غم و غصہ کا ایک طوفان اٹھا، اور مولٰنا ہدایت اللہ جونپوری مرحوم، مولانا حکیم برکات احمد ٹونکی مرحوم، مولٰنا محمد طیب عرب رامپوری مرحوم، مولٰنا عبدالعزیز سہارنپوری مرحوم وغیرہ ہم مین عتاب و عناد کی ایک زبردست لہر دوڑ گئی، متعدد رسالے

شائع کیے گئے، اور آخر میں نواب حامد علی خان رئیس رامپور کے دربار میں مولانا عبدالوہاب بہاری مرحوم اور مولانا برکات احمد البہاری ثم التونکی کے درمیان مناظرہ ہوا، مسلمان علما میں جمودِ فکر اور تقلیدِ ذہنی کی یہ حد تھی، حالانکہ فقہی اور مذہبی مسائل میں صحابۂ کرام نے آپس میں اختلاف کیا، ائمۂ فقہ میں بعض اہم اصولی اختلافات ہوئے اور مختلف مذاہب فقہیہ پیدا ہوئے، محمد بن جریر طبری نے بعض مسائل میں ائمۂ اربعہ سے اختلاف کیا، لیکن ان اختلافات نے کبھی ذاتیات کی حیثیت نہ اختیار کی،

اسی طرح سید سلیمان مرحوم نے بھی بعض علمی اور تاریخی مسائل میں اپنے استاذ محترم سے مودبانہ اختلاف کرکے اپنی حریتِ فکر اور آزادانہ تحقیق کا بھی ثبوت دیا ہے،

مولانا سید سلیمان مرحوم کا طرزِ تحریر اور طریقۂ بیان صاف ستھرا اور سلجھا ہوا تھا، نہ تو انکی تحریروں میں کسی طرح کی تعقید ہے، نہ اُن کی تقریر میں کسی طرح کا جھول ہوتا تھا، بلکہ اُن کی تقریریں صاف ستھری اور سادی ہوتی تھیں، ان میں نہ تو ادا کا اُتار چڑھاؤ ہوتا تھا، نہ الفاظ کا خطیبانہ الٹ پھیر، تحریر میں وہ مختلف انداز میں مہارت رکھتے تھے، اور ہر موضوع کے لئے وہی اندازِ بیان اختیار کرتے تھے، جو اس کے مناسب ہوتا تھا، چنانچہ الہلال میں جو مضامین سید صاحب کے شائع ہوئے ہیں، ان کا طرزِ بیان "خطباتِ مدراس" کے اندازِ تحریر سے بالکل مختلف ہے، "عربوں کی جہازرانی" اور "عرب و ہند کے تعلقات" کے اندازِ بیان میں نمایاں فرق ہے، ارض القرآن، سیرت عائشہ رض اور سیرت النبی کی زبان تو یکساں ہے لیکن ان میں بھی سلاست اور علمیت کے مختلف درجے نظر آتے ہیں،

سید سلیمان مرحوم کا شاہکار عام طور پر سیرت النبی کی جلدیں ہی سمجھی جاتی ہیں، اس میں شک نہیں کہ اس کارنامے پر سید صاحب مرحوم جتنا بھی فخر کرتے کم تھا، انھوں نے سیرۃ النبی لکھ کر تمام مسلمانوں کی طرف سے ایک فرضِ کفایہ ادا کر دیا ہے جس کا اجر اُن کو خدائے تعالیٰ دے گا، لیکن میرے خیال میں جس طرح مولانا شبلی مرحوم کا اہم ترین کارنامہ اُن کی تصنیفوں میں مضمر نہیں ہے، اگرچہ وہ بھی یقیناً بہت اہم ہیں بلکہ ان کا سب سے بڑا کام علمی خدمت کرنے والوں کی ایک جماعت پیدا کرنا، اُن کی رہنمائی کرنا، اور دارالمصنفین کی تاسیس ہے، جس کے ذریعہ اسلامی علوم

کی مزید تحقیق اور اشاعت ہوتی رہی ہے، اسی طرح سید سلیمان مرحوم کا سب سے بڑا کارنامہ دارالمصنفین کے قائم رکھنے، اور نئے کارکنوں کے پیدا کرنے میں مضمر ہے، دارالمصنفین اب صرف مولانا شبلی کی یادگار نہیں ہے بلکہ زیادہ تر سید سلیمان مرحوم کی یادگار ہے،

دارالمصنفین ہندوستان کا اپنے قسم کا سب سے پہلا قومی علمی ادارہ ہے، جس نے اب تک نہایت مفید علمی خدمت کی ہے، اس نے اب تک اپنی زندگی اور افادیت کا کافی ثبوت دیا ہے، اب اس کو قائم رکھنا اور اس کو ترقی دینا ہم لوگوں کا فرض ہے، حیدرآباد کا دائرۃ المعارف بھی اسی طرح کا ایک مفید علمی ادارہ ہے، لیکن اولاً تو وہ سرکاری یا نیم سرکاری ادارہ ہے، دوسرے اس کی افادیت عربی خوان طبقہ تک محدود ہے، اور اس کی اشاعتوں سے استفادہ کرنے، اور اہل ہند کے لئے عموماً مفید تر بنانے کے لئے بھی دارالمصنفین جیسے ادارہ کی ضرورت ہے، دہلی کا ندوۃ المصنفین دارالمصنفین جیسا ایک علمی قومی ادارہ ہے، لیکن ایک تو وہ ابھی نوعمر ہے، دوسرے ہندوستان جیسے وسیع ملک کے لئے ایک قسم کے دو علمی ادارے بھی کم ہی ہیں،

لہٰذا جو لوگ سید سلیمان مرحوم کی یادگار قائم کرنا چاہتے ہیں، اُن کے لئے بہترین صورت یہ ہے کہ اُن کی اس زندہ یادگار کو مزید ترقی اور وسعت دیں، اور اس میں نئی شاخیں پیدا کریں،

* * *

# سفر حجاز کے چند تاثرات

از

جناب پروفیسر عبدالمنان صاحب بیدل، سابق صدر شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی

سنہ ۱۹۴۹ء سے پہلے الحاج سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بہ قصد انتفاع و استفادہ حاضر ہونے کی سعادت نصیب نہ ہوئی تھی،

سنہ ۱۹۴۹ء میں بفضل باری تعالیٰ، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی حاضری کا موقع ملا، مکہ مکرمہ میں ایک عالم دوست، رفیق سفر نے خبر دی کہ مولٰنا سید سلیمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی فریضۂ حج ادا کرنے کے لئے اپنے چھوٹے بیٹے محمد سلمان سلمہ المنان، اور چند خواتین کے ساتھ تشریف لائے ہیں، اور رباط بھوپال میں قیام فرما ہیں، مگر یہ خوشخبری ملنے کے بعد بھی میں اُن سے ملنے نہ گیا،

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ملنے کی تمنا بھی تھی، اور ضرورت بھی، مگر اُن کے پاس نہ جانے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں فطرۃً کم آمیز ہوں، اور سید صاحب رحمۃ اللہ سے عمر بھر میں چند بار سے زیادہ اطمینان کے ساتھ ملنے اور تبادلۂ خیالات کا موقع مجھے نہ ملا تھا، چند بار پٹنہ کالج کے پروفیسر محمد قاسم مرحوم کے بنگلہ پر اور چند مرتبہ ریاض حسن خان خیال مرحوم مظفرپوری کی قیام گاہ پر، پروفیسر محمد قاسم مرحوم میرے عزیزوں میں تھے، میری پٹنہ کالج کے بعض اساتذہ اور محلہ کے دو ایک وکیلوں کی شام کی نشست پروفیسر محمد قاسم مرحوم ہی کے یہاں ہوا کرتی تھی، کبھی کبھی خصوصاً جب سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی تشریف فرما ہوتے، تو سیاسی، تاریخی، مذہبی اور

معاشی مسائل پر آزادانہ طور سے تبادلۂ خیالات بھی ہو جاتا، مگر علامہ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ہم لوگون مین اکثر سیاسی مسائل مین سخت اختلاف رائے تھا،

نہ ملنے کی دوسری اور اصل وجہ یہ تھی کہ میرے بعض بزرگون اور دوستون نے جو سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اچھی طرح واقف تھے، بلکہ اُن کے ہم خیال و ہمراز تھے، مجھے واقف کر دیا تھا کہ اب سید صاحب اُس گروہ کے ایک بلند مقام فرد ہین جن سے تم ملنے سے ڈرتے ہو، شرماتے ہو اور ہچکچاتے ہو،

آپ شاید سوال کرین کہ وہ کونسا گروہ ہے، جواب ہے، اہلِ دل، اور اہلِ نظر کا گروہ، آپ پوچھ سکتے ہین، — کیون؟ — بلاتصنع عرض کرتا ہون — ڈرتا ہون کہ کہین اپنا بھرم نہ کھل جائے شرماتا ہون کہ میرے مخفی عیوب سے اہلِ نظر واقف نہ ہو جائین اور ہچکچاتا ہون کہ کہین میری حاضری سے اُن لوگون کی طبیعت منغض نہ ہو جائے،

اسلئے تمنائے قدمبوسی کے باوجود علامہ مرحوم سے ملنے کی ہمت نہ پڑی کئی بار صحنِ حرم مین مشغول نماز یا محوِ دیدار کعبہ نظر آئے، دو ایک بار سعی کرتے کوہِ صفا پر دعا مانگتے اور آنسو بہاتے ہوئے بھی دیکھا، سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق آنکھ والون کو یہ بھی کہتے سُنا کہ

"ایمان واحتساب کی جلوہ ریزیان اُن کی ہر نقل و حرکت سے ظاہر ہین"

مگر مجھ کو سید صاحب علیہ الرحمہ مین کوئی خاص کیفیت نظر نہ آئی، قیام مکہ مکرمہ کی مدت ختم ہوئی، مدینہ منورہ جانے کا حکم ملا تو میرے ایک دوست نے کہا کہ تم کو مبارک باد دیتا ہون کہ سید صاحب بھی اُسی دن تشریف لے جائین گے جس دن تم کو جانا ہے، مین نے کہا کہ —— بھائی معاف کرنا مین نے سید صاحب کو نزدیک سے بھی دیکھا اور دور سے بھی، اور سوچتا رہا کہ تم اُن کو اب" علامہ سید سلیمان ندوی" نہین بلکہ "سید العارفین" کہتے ہو آخر اس کی وجہ کیا ہے، مجھے تو آج سے تیس سال پہلے کے سید صاحب اور آج کے سید صاحب مین کوئی خاص فرق نظر نہین آیا، میرے پھٹے پُرانے کپڑے والے، خود فراموش

دوست نے کوئی جواب نہ دیا، اور یہ شعر گنگناتے ہوئے حرم شریف کی طرف روانہ ہوگئے،

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب راچہ گناہ

(۲۰)

مدینہ منورہ مین ایک دن باب مجیدی کے قریب سید صاحب نظر آئے مین نے السّلام علیکم کہا جواب ملا وعلیکم السّلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ اس کے بعد مولانا آگے بڑھے، مین نے قریب جاکر عرض کیا، حضور نے اس دیرینہ نیازمند کو یقیناً نہ پہچانا ہوگا فرمایا، ہان، دیکھ کر تو نہین پہچانا تھا، مگر آواز سُن کر اب پہچان گیا، بھلا کہئے تو کیسے پہچانتا نہ وہ سوٹ مین ملبوس بھرا ہوا بدن ہے، نہ منڈی ہوئی داڑھی، نہ ہاتھ مین طلائی دستہ کی چھڑی ہے، نہ لب کے داہنے گوشہ مین نیم سوختہ سگرٹ ہے، آپنے تو ایسی صورت بنائی ہے کہ مین کیا آپ کا قریب ترین اور قدیم ترین دوست بھی شاید ہی پہچانے، عرض کیا حضور صورت ہی صرف بدلی ہے، مسکرا کر فرمانے لگے، انشاء اللہ اس دربار سے جاتے جاتے سیرت بھی بدل جائے گی، ـــ اس جملہ کے ساتھ ہی ساتھ اُن کی آنکھون سے آنسو کے چند قطرے بھی نکل پڑے ـــ کہنے لگے، ـــ بیدل صاحب کیا عرض کرون، جلال وجبروت والے کے دربار مین بھی بہت کچھ ملتا ہے مگر رافت ورحمت والے کے دربار مین سب سے بڑی چیز یعنی محبت ملتی ہے آنا شرط ہے، آئے نہین کہ ہدیۂ محبت ملا نہین، ہان ایک بات اور عرض کرون، کچھ ایسے لوگ بھی ہین جن کو یہان آئے بغیر بھی بہت کچھ دیدیا جاتا ہے، اللہ رے اُن کی قسمت،

مدینہ منورہ کے بارہ روزہ قیام کے زمانہ مین بھی سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سوا ایک بار کے گفتگو کا موقع نہ ملا، مجھے ایسا شبہہ ہوا کہ وہ مجھ سے اس سرزمین مقدس مین ملنے سے پرہیز کرتے ہین، کوئی تعجب کی بات نہین صحبت ناجنس، عذاب الیم ہے،

ایک دن خبر ملی کہ مولانا جدہ کے لئے روانہ ہو گئے، مجھے بھی حکم ہوا کہ جدہ جاؤ جہاز تیار ہے، روانہ ہو گیا، مدینہ منورہ سے تھوڑے ہی فاصلہ پر دیکھا کہ کئی لاریان بالوین دھنسی ہوئی ہین ___ کئی دنون سے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی کو سون تک سڑکون پر بڑے بڑے گڈھے پڑ گئے تھے، اور بھاری لاریون کا گذرنا سخت دشوار ہو گیا تھا، حجاج کرام کو لاریون سے اتر کر ڈرائیورون کی ہدایت کے مطابق اپنے اور اپنے ساتھیون کی لاریون کو ٹھیلنا پڑا، اس کام مین سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی کسی سے پیچھے نہ رہے، لاریون کے پھنسنے چلنے، اور پھر رُک جانے کا سلسلہ رابغ تک رہا، رابغ پہنچکر اطلاع ملی کہ مکہ مکرمہ کے قریب تک ایسا ہی راستہ ہے، اس لئے حکومت کا حکم ہے کہ پانچ، چھ دنون تک حجاج کرام رابغ ہی مین رہین اور راستہ کے خشک ہو جانے اور بنجانے کا انتظار کرین، اس لئے چھ سات دن چھ سات سو حجاج رابغ ہی مین ٹھہرے رہے، رابغ کے قیام کے دوران مین سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اکثر مسجد جاتے وقت یا مسجد سے لوٹتے وقت ملاقات ہو جاتی، ایک دو بار گفتگو کا موقع بھی ملا، رابغ مین دو مسجدین ہم لوگون نے دیکھین، ایک منزل سے بہت قریب اور ایک بڑی مسجد منزل سے دو تین فرلانگ کے فاصلہ پر، مگر ان دونون مسجدون مین سے کسی مین بھی وہ سامان نہ تھا جس کے دیکھنے اور استعمال کرنے کے ہم ہندوستانی عادی ہو گئے ہین، ایک مسجد مین تو چراغ وغیرہ قسم کی کوئی چیز بھی نہ تھی، نمازی اندھیرے مین نماز ادا کرتے تھے، بمبئی کے ایک بوہرے تاجر ظروفِ شیشہ کو توفیق ہوئی، انھون نے لالٹین کا سامان کر دیا، جزاک اللہ فی الدارین خیرا، ایک روز مسجد سے واپس آ رہا تھا کہ مولانا سے گفتگو کا موقع ملا، عرض کیا بڑے افسوس کی بات ہے، مسلمانون کا ملک ہے، حجاج ابرابر اس راہ سے گذرتے رہتے ہین، مگر یہان کی مسجدین شکستہ حال ہین، نہ وضو کا سامان ہے، اور نہ جا نمازین قرینہ کی ہین، صرف دو چار گرد آلود چٹائیان بچھی ہوئی ہین، فرمانے لگے، ___ حالت تو ظاہر ہی ہے، مگر اس پر داے زنی وہی کرے، جو صاحبِ اختیار بھی ہو، اور دانائے اصولِ سیاست بھی، ایک دن مین نے عرض کیا، بیچارے عرب اب تک بہت مفلوک الحال نظر آتے ہین، حالانکہ کہا جاتا ہے کہ یہ دیارِ محبوبِ خدا

اور خداوند کریم کے محبوب ترین ممالک مین ہے. کاش امریکہ کی دولت کا کچھ حصہ ان لوگون کو بھی مل جاتا ــــ

ارشاد ہوا، ــــ دنیاداروں خصوصاً غیر مسلمون کی ترقی پر رشک کرنا حکمت الٰہی سے ناواقفیت کا ثبوت ہے،

ایک روز مین نے کہا مسجد نبوی مین بعض لوگ اماموں کے پیچھے نماز نہیں ادا کرتے تھو بلکہ جب نماز جماعت ہو جاتی

تو اپنی ٹولی الگ بنا کر نماز پڑھتے تھے، ارشاد ہوا، ــــ ہو سکتا ہے، بیدل صاحب اب مذہب تو نہ رہا

مذہب کے جھگڑے رہ گئے، غرض جب تک رابغ مین قیام رہا، اور جب جب موقع ملا، سید صاحب رحمۃ اللہ

علیہ سے مختلف سوالات بہ نظر استفادہ کرتا رہا، اور ہمیشہ تشفی بخش جواب ملا، جب رابغ مین ٹھہرے ہوے

کئی دن ہو گئے، اور دل گھبرانے لگا تو ایک دن سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ حضور مکہ مکرمہ اور

مدینہ منورہ کے بجائے بندرگاہ رابغ مین ہم لوگون کے ٹھہرانے مین کیا مصلحت خداوندی ہے، ــــ فرمایا

ــــ دعوی عبودیت کا ثبوت طلب کیا جا رہا ہے، سبق یہ دیا جا رہا ہے. کہ اپنی خواہش کو مرضی مولا

کے تابع بنانے کی عادت ڈالو،

(۳)

رابغ سے روانہ ہو کر جدہ پہنچا، جدہ مین سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے صرف دو بار عبد المجید صاحب

حریری قونصل جنرل ہند کے آفس مین ملاقات ہوئی، کسی خاص قابل ذکر گفتگو کا موقع نہ ملا، صرف ایک دن

دوران گفتگو مین ایک جملہ کہہ گئے جس کا مفہوم مین نہیں سمجھا ــــ قونصل صاحب ایک شخص کو کہہ رہے

تھے "کہ آپنے رٹائر کیون کیا" مولانا نے کہا "رٹائر نہیں کیا جوانی کیا" بعد کو معلوم ہوا، کہ وہ حضرت کسی عرب

دوشیزہ سے محبت کرنے کے جرم مین ملازمت سے برطرف کر دیئے گئے تھے، اسی نشست مین ایک جملہ "

بھی ارشاد ہوا کہ ــــ سو کجے قونصل خانہ مین "خاص قسم کے لوگون کا تقرر ہوا کرے تو زیادہ مفید ہو" معلوم

نہیں اس سے کس کی طرف اشارہ تھا، اور کیا مطلب تھا،

۱۴ دسمبر ۱۹۲۹ء کی شام کو عبد المجید صاحب قونصل جنرل ہند سے ملنے گیا، تو انھون نے کہا کہ

خسرو جہاز کل بمبئی کے لئے روانہ ہو رہا ہے، چونکہ بمبئی سے جدہ آتے وقت آپ ہی امیر الحاج تھے، اس لئے ہم لوگ آپ ہی کو پھر امیر الحاج بنانا چاہتے تھے، مگر مولانا سید سلیمان ندوی صاحب بھی اسی جہاز سے تشریف لیجا رہے ہیں اس لئے اُن کی موجودگی میں کسی دوسرے کو امیر الحاج بنانا سخت گستاخی ہے، میں نے بھی کہا کہ ان کے ہوتے ہوئے، کوئی بھی امیر الحاج ہونا پسند نہیں کرے گا،

۱۵ ر دسمبر کو جب میں جہاز پر سوار ہو گیا، تو ظفر جمیل صاحب قونصل جنرل کے سکریٹری تشریف لائے اور مجھ سے کہا کہ مولانا (سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں، کہ بیدل صاحب کی موجودگی میں ہرگز یہ عہدہ قبول نہ کروں گا، میں نے جب بہت اصرار کیا، تو فرمایا میں اسی شرط پر امیر الحاج کہلائے جانے پر راضی ہو سکتا ہوں کہ عملاً آپ ہی اس خدمت کو انجام دیں، اور کپتان کے ساتھ ہر روز گشت میں بھی آپ چلیں تاکہ لوگوں کو معلوم رہے کہ آپ امیر الحاج کا کام کر رہے ہیں، سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انکسار و خاکساری کا اس سے بہتر نقشہ اس سفر میں مجھے نظر نہ آیا، جہاز پر سوار ہونے کے چند دنوں بعد سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بخار آ گیا، اور بمبئی پہنچنے کے بعد تک صحت نہ ہوئی، خسرو جہاز ۲۹ ر دسمبر ۱۹۴۹ء کو بمبئی پہنچا، اتنی دیر میں پہنچنے کی وجہ یہ ہوئی کہ اکثر گودیوں میں ٹھہرتا ہوا آیا تھا، مدت سفر طویل تھی، اس لئے سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں اکثر انتفاع و استفادہ کی خاطر حاضر ہوا کرتا تھا، وہ خود بھی ازراہ نوازش اکثر مجھے اپنے کیبن ہی میں بلا لیتے تھے، ایک روز سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بخار زیادہ تھا، اور طبیعت بے چین تھی، میں نے جہاز کے ڈاکٹر کو خبر دی، مگر وہ گھنٹوں کے بعد آیا، جب میں جہاز کی رپورٹ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے لکھ کر لے گیا، اور سید صاحب کو ترجمہ کر کے سنانے لگا، تو سید صاحب نے فرمایا کہ —— پڑھئے میں سمجھتا ہوں، —— اس کے بعد فرمایا —— رپورٹ بہت خوب ہے، مگر ڈاکٹر کی شکایت والا جملہ نکال دیجئے، اور عملہ کی کارگزاری کی تعریف میں دو جملے اور بڑھا دیجئے، میں نے عرض کیا کہ ڈاکٹر کی بے پروائی، اور سخت کلامی سے اکثر مریض ناراض ہیں، اور مجھ سے اس کے خلاف شکایت

کی ہے فرمایا:

"آپ اس کی شکایت نہ کیجئے ممکن ہے سمجھ آجائے گی، اور مسلمان بھی تو ہے"

جہاز پر سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب تک اچھے رہے بعد نماز عصر کیبن سے باہر عرشہ پر آکر ادھر ادھر ٹہلتے، یا دیر تک کھڑے ہوئے سمندر کا نظارہ کرتے رہتے، میں بھی معمولاً اس وقت حاضر خدمت ہو جاتا، چونکہ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو معلوم تھا کہ ان کا مخاطب نہ مولوی ہے نہ مولانا، نہ عالم ہے نہ عارف نہ مورخ ہے، نہ مفسر، بلکہ صرف اردو کا شاعر ہے، اور کبھی فارسی کا پروفیسر تھا، اس لئے جب وہ خود سلسلۂ گفتگو شروع کرتے، تو فرماتے — بیدلؔ صاحب کچھ پڑھیئے، — عرض کرتا کہ کالج کے مشاعروں میں لڑکوں کی خاطر غزل لکھتا بھی ہوں اور پڑھتا بھی ہوں، مگر کالج کے مشاعرہ سے باہر شعر سنانے سے پرہیز کرتا ہوں، اسی لئے اشعار بھی یاد نہیں ہیں، — اس کے بعد عرض کرتا — شاید کہ آپ بھی تو شعر کہتے ہیں، کچھ اشعار یاد ہوں تو ارشاد فرمایا جائے، میری درخواست پر اکثر سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی نظمیں اور غزلیں مجھے سنائیں، میں نے عرض کیا، اگر یہ اشعار لکھوا دیے جائیں تو میں انھیں اپنے رسالہ (معاصر) میں چھاپ دوں۔ پہلے تو مسکرا کر فرمایا، "اس کی اجازت نہیں" مگر جب میں نے بہت اصرار کیا، تو فرمایا — سلمانؔ سے کہئے وہ یہ اشعار لکھ کر آپ کو دیدیں گے، میں نے سلمانؔ سے کہا، انھوں نے جو نظمیں مجھ کو دیں، اُن میں سے حسب ذیل نعت جس کا عنوان ہے "گلہائے عقیدت" معاصرؔ بابت ماہ نومبر و دسمبر ۱۹۴۹ء میں چھاپ دی،

| | |
|---|---|
| مکّی، مدنی، ہاشمی و مطلبی ہے | آدم کے لئے فخر یہ عالی نسبی ہے |
| پاکیزہ تر از عرش و سما جنت و فردوس | آرام گہ پاک رسول عربیؐ ہے |
| کیا شان ہو اللہ رے محبوب نبی کی | محبوب خدا ہی وہ جو محبوب نبی ہے |
| بجھ جائے تر چھینٹوں سے اے ابر کرم آج | جو آگ مرے سینے میں مدت سے دبی ہے |

اے زائرِ بیت نبوی یاد رہے یہ
بے قاعدہ یان جنبشِ لب بے ادبی ہو

آہستہ قدم، نیچی نگہ، پست صدا ہو

خوابیدہ یہان روحِ رسولِ عربی ہو

یاد نہین کہ اُن کے علاوہ دوسرے اشعار کہان رکھدیئے، پھر جب دوبارہ سلمان سلمہ کو لکہا تو کوئی جواب نہین ملا،

دوران سفر مین مولانا کا وقت اوراد و وظائف یا تبلیغ و تفہیم مسائل مین صرف ہوتا تھا، مجھے یہ دیکھکر بڑی خوشی ہوئی کہ مولانا بیانِ مسائل مین "مصلحتِ وقت" اور اظہارِ حقیقت مین کسی شخصیت کا کوئی خیال نہین کرتے تھے جس چیز کو صحیح سمجھا، اس کو کہہ دیا، ایک روز مجھ سے حاجیون نے فرمایش کی کہ مجلس میلاد شریف منعقد کرنے کا ارادہ ہے، ــ آپ مولانا صاحب کو راضی کر دیجیۓ کہ وہ بیان فرمائین، مین نے کہا ــ کوشش کرون گا، ــ مگر شاید ہی کامیابی ہو، ــ لوگون نے نہ مانا اور مین سید صاحب کو مجلس میلاد النبی مین لے آیا، اور میلاد پڑھنے کی درخواست کی، انھون نے مختصر سی تمہید کے بعد وعظ و پند شروع کردیا، تقریر مین بہت سی باتون کے علاوہ یہ بھی کہا کہ اگر مجلسِ میلاد آپ اظہارِ محبتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی پیروی کرنے کے طریقون کا ذکر کرنے کے لۓ منعقد کرتے ہین، تو آپ کو سمجھ لینا چاہیۓ کہ ہر وہ طریقۂ اظہارِ محبت غلط ہے جس کا پسندیدہ ہونا خود حضور سرورِ کائنات یا صحابۂ کرام سے ثابت نہین ہے، جو شخص محبتِ رسول اور ساتھ ہی ساتھ اللہ کی محبت کا دعویٰ کرتا ہے، اس کو چاہیۓ کہ ہر کام مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم اور منشار کا لحاظ رکھے، صرف اسی حال مین اُن کی محبت اصلی معنون مین محبت ہو گی، رسول اللہ سے محبت کرنے کا واحد اور شرعی طریقہ رسول کا اتباع کامل ہے، سُن لیجیۓ کہ رسول سے جس قدر محبت بڑھتی ہے اسی قدر اللہ کے محبوب رسولِ کریم کی تابعداری کا شوق بڑھتا ہے، ــ اسی طرح کی باتین کہنے کے بعد سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دعا کے لۓ ہاتھ اُٹھا دیۓ

اور مجلس میلاد ختم ہوگئی،

سفر مین عموماً اور سفر حج مین خصوصاً لوگون کا مزاج چڑچڑا ہو جاتا ہے، مگر مین نے دیکھا کہ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو حاجیون کی بیجا حرکتون، غلط شکایتون اور احتجاجی فقرون کے باوجود کبھی غصہ نہ آیا، بلکہ جب کبھی مین تند و تیز لہجہ مین جواب دیتا، تو سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ آہستہ سے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر فرماتے

"سراپا محبت و عنایت والے کے دربار سے ابھی نہ آپ آرہے ہین"

مقلہ کے کچھ عرب جہاز پر ساتھ تھے، اور اپنی سیٹ کے پاس ہی کھانا پکاتے تھے، جہاز پر اسٹوو جلا کر کھانا پکانا منع ہے، مگر وہ نہ کپتان کا حکم مانتے تھے اور نہ میری ڈانٹ سنتے تھے، مین نے سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کہا ــــ آپ ان لوگون کو ڈانٹئے اور کہہ دیجئے کہ اگر کپتان کا حکم نہین مانوگے، تو سزا کر دیجائے گی، ــــ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آپ جو کہتے ہین، وہ تو نہ کہون گا، مگر سمجھا دون گا، غالباً مان جائین گے، ــــ چنانچہ میرے ساتھ ان عربون کے پاس تشریف لے گئے، اور دو چار جملے عربی مین نہایت نرمی اور محبت سے ان سے کہے، کہنا تھا کہ اُن لوگون نے اسٹوو گل کر دیا، اور کھانا پکانے کا سامان اس جگہ سے اٹھانے گئے، جہان جانے سے پہلے وہ انکار کر چکے تھے، مین نے سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ آپ کی زبان مین بلا کا اثر ہے، ــــ ارشاد ہوا کہ ــــ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی پر غصہ نہین فرمایا، ہم لوگون پر اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرض ہے، درشتی و نرمی دونون مفید ہین، مگر نرمی زیادہ کارآمد ہے،

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ خود سے کوئی دینی، شرعی یا تاریخی مسئلہ نہین چھیڑتے تھے، جب مین خود کچھ پوچھتا تو مختصر جملون مین جواب باصواب دیدیتے، اور زیادہ تفصیلی گفتگو نہ فرماتے، ــــ ایک دن مین نے عرض کیا ــــ حج کے مقبول ہونے کی کوئی ایسی علامت بھی ہے جو ہم عامیون کی سمجھ مین آجائے، ــــ فرمایا ــــ اگر آپ کی زندگی کا لاحق دور سابق سے بہتر ہو جائے تو سمجھئے کہ حج مقبول ہوگیا،

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تحمل کی داد دینی پڑتی ہے، مین دینی علوم سے ناواقف ہون، اکثر ان سے عامیانہ گفتگو اور مہمل سوالات کرتا، غیر مفید نزاعی مسائل چھیڑتا، مگر کبھی بھی سید صاحب رحمۃ اللہ کے ماتھے پر شکن نہ آتی مہمل سوالون کے پوچھنے پر مجھے کبھی نہین جھڑکا، پیچیدہ سیاسی مسائل بھی بحث مین لے آتا مگر سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نہایت نرمی اور محبت سے میری تشفی کرنے کی کوشش فرماتے، ایک روز شاہ حجاز کی روز افزون دولت اور عرب تاجرون کے آرائش وآسائش کے سامانون کی فراوانی پر اظہار مسرت کرکے سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اپنے خیال کی تائید چاہتا تھا ۔۔ کہنے لگے ۔۔ بیشک دولت نعمت ہے، اور خداوند کریم کی نعمتون مین ایک بڑی نعمت ہے، مگر اس دور مین دولت کے وفور کے برے نتائج کی تلافی وتدارک کا امکان بہت دشوار ہے، مولٰنا کے سیاسی شعور کی بلندیون تک پہنچنا میرے لئے ناممکن ہے، مولینا رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوستان و پاکستان کے غیر دانشمندانہ تعلقات پر گفتگو کی، عربون کی امریکہ نوازی پر دانے زنی کی، بھارت کے مسلمانون کی بد حالی کے اسباب بیان کئے، اور جن مسائل کو مین بڑے بڑے لیڈرون کی توضیح و تفصیل کے بعد بھی نہ سمجھا تھا، سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تشریح سے پوری طرح سمجھ مین آگئے، اور کشف صدر ہوکر اطمینان ہوگیا، اور خدا کا شکر ادا کیا کہ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مختصر صحبت سے برسون کی الجھن دور ہوگئی، غرض بمبئی پہنچنے تک مولانا کی تعلیمات سے اپنی معلومات مین اضافہ کرتا رہا، مگر ایک تمنائے دیرینہ پوری نہ ہوئی ۔۔۔ ایک دن جو چشم کرم اپنی طرف دیکھی تو عرض کیا،

آنانکہ خاک رابہ نظر کیمیا کنند      آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

مسکرا کر رہ گئے اور کوئی جواب نہ دیا، صاحب نظر تھے، سمجھ گئے ہونگے، کہ کثرت گناہ سے وعظ و نصیحت کے قبول کی استعداد ہی ضائع ہوگئی ہے، سچ ہے

تہیدستان قسمت راچہ سود از رہبر کامل      کہ خضر از آب حیوان تشنہ می آرد سکندر را

جب جہاز بندرگاہ میں پہنچ گیا تو سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے رخصت ہونے کے لئے اُن کے کیبن میں حاضر ہوا، اور درخواست کی کہ جس کتابچہ کا نام آپ نے "اقوالِ اشرف" تجویز فرمایا ہے، اس کی تزئین کے لئے سوانحِ حیات محی السنّت مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھکر بھیجدیئے جائیں ـــــ ارشاد ہوا کہ انشاء اللہ تعالیٰ بہ شرطِ یاد ضرور بھیج دوں گا، آپ تصنیفاتِ حکیم الامت کا مطالعہ جاری رکھئے، اچھا شوق ہے، تھوڑے دنوں کے بعد یاد دہانی کی تو سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کراچی سے سوانحِ حیات لکھ کر میرے پاس بھیج دیئے، اور میں نے اقوالِ اشرف میں اُسے شامل کر دیا،

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے رخصت ہوتے وقت درخواست کی کہ میرے حالِ زار و زبوں کے پیشِ نظر مجھ پر خاص توجہ فرمائی جائے، اور عرض کیا کہ

خورشید عمر بر سرِ دیوار و خفتہ ایم　　　فریاد از درازیِ خوابِ گرانِ ما

جواب ملا ـــــ جدّ و جہد جاری رہے سعی محمود و ہمیشہ مشکور ہوتی ہے، اس کے بعد حکم ہوا کہ ـــــ جایئے اسامان کی نگرانی کیجئے، اسلام عرض کیا اور چلا آیا،

ع حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد

# علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم

از

جناب مالک رام صاحب یم۔ اے

آج سے رُبع صدی قبل کم و بیش ۱۹۲۹ء کی بات ہے، یادش بخیر، میری طالب علمی کا زمانہ تھا، مین گورنمنٹ کالج لاہور مین پڑھتا تھا، جب علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کی کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" وہان پہنچی، چونکہ موضوع میرے مذاق کے مطابق تھا، مین نے اسے شوق کے ہاتھون لیا، اور عقیدت کی نظر سے پڑھا، اور جب پڑھ چکنے کے بعد کتاب ہاتھ سے رکھی، تو اس حسرت کے ساتھ کہ کاش یہ ابھی اور لمبی ہوتی، کتاب کی خوبی اور مصنف کی کاوش اور دیدہ ریزی کا اندازہ کچھ اس سے لگایا جا سکتا ہے، جب معلوم ہو کر یہ آج تک اردو ہی مین نہین بلکہ دوسری زبانون مین بھی اپنے موضوع پر اکیلی کتاب ہے لیکن مجھے یہان اس کتاب پر تبصرہ لکھنا منظور نہین،

اس مین مصنف مرحوم نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ لکھنے والون نے جتنی توجہ فارسی ماخذون پر کی ہے، اتنی ہی عربی سفرنامون اور تاریخ و جغرافیہ کی کتابون سے بے اعتنائی برتی ہے، حالانکہ یہ قیمتی معلومات کا خزانہ ہین، اور اُن سے کماحقہ استفادہ کئے بغیر ہمارے ملک کی تاریخ مکمل ہو ہی نہین سکتی،

خدا انھین خوش رکھے، میرے ایک ہم سبق اور عزیز دوست فیروز دین بھٹی تھے، خدا معلوم

آج کل کہاں ہیں، میری عربی کی واقفیت تو شد بُد سے زیادہ نہیں تھی لیکن وہ کم از کم مجھ سے زیادہ جانتے تھے، بی اے میں ان کا اختیاری مضمون عربی رہا تھا، ہم دونوں نے مشورہ کرکے فیصلہ کیا کہ اگر ممکن ہو تو یہ کام ضرور کرنا چاہئے، ارادہ یہ تھا کہ جس طرح ایلیٹ نے مختلف فارسی تاریخوں کے متعلقہ حصوں کا انگریزی میں ترجمہ کر دیا ہے، اسی طرح عربی ماخذوں کو اردو میں منتقل کر دیا جائے، چنانچہ میں نے ایک خط مرحوم کی خدمت میں لکھا کہ میں نے آپ کی کتاب پڑھی ہے، اور یہ ہمارا ارادہ ہے۔ مہربانی ہو گی اگر اس معاملے میں ہمیں اپنی رہنمائی سے مستفید کریں، اور سب سے پہلی یہ بات کہ ان کتابوں کی فہرست لکھیں، جو آپکے خیال میں ترجمہ کرنے کے لائق ہیں، فوراً جواب آیا، اس میں بیس ایک کتابوں کی فہرست تھی، اس پر میں بازار سے بلاذری کی فتوح البلدان کا ایک نسخہ خرید لایا، اور ہم نے اس کے ہندوستان سے متعلق حصے کا ترجمہ شروع کر دیا، اسی دوران میں سلیمان تاجر کا سفرنامہ جو نسبتۃً مختصر چیز ہے، میرے ہاتھ لگ گیا، اور میں نے جلدی سے اس کا ترجمہ بھی کر ڈالا لیکن افسوس کہ یہ مفید کام ہماری خواہش کے مطابق جاری نہ رہ سکا، پہلے تو ہماری تعلیمی مشغولیتوں کے باعث یہ بہت آہستہ آہستہ ہوتا رہا، پھر جب تعلیم سے فارغ ہوئے، تو غم روزگار نے وہ رہی سہی عافیت بھی نہ چھوڑی، وہ جگ ٹوٹ گیا، بھٹی صاحب کہیں اور میں کہیں، اور اس کے بعد آج تک اس موضوع کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا،

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان، لیکن پھر بھی کم نکلے

لیکن حسرتوں کے گنوانے سے فائدہ۔ ان کی فہرست بہت طولانی ہے، یہاں اس حکایت کے بیان کرنے سے مقصود یہ بتانا تھا کہ مرحوم سے میری واقفیت کی تقریب کیسے پیدا ہوئی، بہرحال اس کے بعد خط و کتابت کا سلسلہ قائم ہو گیا،

۱۹۳۶ء میں جناب امداد صابری صاحب دہلوی نے ایک رسالہ علامہ سید سلیمان ندوی کی قرآنی

غلطیاں" چھاپا، میں ان دنوں دہلی میں تھا، ایک دن میں جناب نواب سراج الدین احمد خاں سائل مرحوم کے مکان پر گیا، تو یہ رسالہ اُن کی بیٹھک میں پڑا مل گیا، میں اسے اٹھا لایا، اب یہ اتنے دن کی بات ہے کہ یقینی طور پر کچھ کہہ نہیں سکتا، تاہم اتنا یاد ضرور ہے کہ اس میں سیرۃ النبی میں نقل کردہ آیات قرآنی کے ترجموں کی بعض غلطیاں مصنف نے اپنے نزدیک دکھائی تھیں، مولانا نے غالباً دسمبر ۱۹۳۶ء کے معارف کے شذرات میں اس کا اس طرح جائزہ لیا، جس سے مترشح ہوتا تھا کہ اُن کے خیال میں یہ رسالہ نہ صرف جناب امداد صابری نے کسی اور صاحب کے کہنے پر لکھا ہے، بلکہ یہ غالباً ان کا لکھا ہوا بھی نہیں ہے، اور انھوں نے کسی اور سے لکھوا کے اسے اپنے نام سے شائع کر دیا ہے، اس پر صابری صاحب نے ازالہ حیثیت عرفی اور ہتک عزت کا ہرجانے کا دعویٰ کر دیا،

مرحوم سے میری پہلی ملاقات اسی سلسلہ میں ہوئی، وہ اس مقدمے میں پیشی کے لئے دہلی آئے، تو حسب معمول جامعہ ملیہ (قرول باغ) میں بھی تشریف لائے، ان دنوں میرا بھی اسی قرب و جوار میں قیام تھا، یہیں ایک شام میں بھائی حامد علی خاں صاحب کے مکان پر اُن سے ملا، نسبتہً چھوٹا قد، آفتابی چہرہ، بڑی بڑی تیز آنکھیں، کشادہ اونچی پیشانی، کسی قدر لمبی ناک، جو پھننگ کے قریب قدرے موٹی ہو گئی تھی، "قص الشارب اعفاء اللحی" کا مصداق چھوٹی لبیں اور گھنی گھری سی داڑھی، جو بہت لمبی نہیں تھی، اور جس میں سپید بال زیادہ تھے، اور سیاہ کم، صاف ستھرا، کھلتا رنگ، گلے میں شیروانی نما بند گلے کا کوٹ جس کی داہنی طرف کی جیب سے گھڑی کی زنجیر لٹک رہی تھی، اور دوسری طرف لکھنے کا قلم نظر آرہا تھا، نیچے سپید پاجامہ، اور سر پر عمامہ، جس کا شملہ پیچھے سے اٹھا کر خاص طریقے سے اڑس رکھا تھا، یہ تھا اُن کا حلیہ، میں یہ الفاظ لکھ رہا ہوں اور اُن کی صورت میری آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے،

جب مجھے اس مقدمے کی روئداد معلوم ہوئی، تو میں نے پیشکش کی کہ اگر اجازت ہو تو میں نواب سائل صاحب کے ذریعہ صلح صفائی کی کوشش کروں، اس پر انھوں نے رضامندی کا اظہار کیا، میں نے

نواب صاحب مرحوم سے مل کر طے کیا کہ صابری صاحب سے ملنا چاہیئے لیکن اگلی صبح اُن کے ہان جانے سے پہلے، مین پھر مرحوم کی خدمت مین حاضر ہوا، اور اُن سے دریافت کیا کہ آپ کن شرائط پر صلح کرنے کو تیار ہون گے، کیونکہ مین نے خیال کیا کہ فریق ثانی سے بات چیت کرنے سے پہلے مجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ مین اُن کی طرف سے کس حد تک جانے کا مجاز ہون،

جاڑون کے دن تھے، مین بھی آٹھ ساڑھے آٹھ بجے صبح کے وقت اُن کے پاس پہنچا، وہ جناب سید مرتضیٰ علی صاحب کے مکان پر اُترے ہوئے تھے، جب مین نے اطلاع کرائی ہے، تو وہ ناشتہ کرکے باہر برآمدے مین تشریف لا چکے تھے، بہت لطف اور مہربانی سے پیش آئے، علیک سلیک کے بعد پہلے میرے متعلق دو چار باتین ہوئین، لیکن چونکہ وقت تنگ تھا، اس لئے مین زیادہ دیر ٹھہر نہین سکا، میرے پوچھنے پر فرمایا کہ یہ مقدمہ محض غلط فہمی کی بنا پر دائر کیا گیا ہے، مین نے جو کچھ لکھا تھا، اس سے ہرگز میرا یہ منشا نہین تھا کہ کسی طرح جناب امداد صابری صاحب کی ہتک یا دل شکنی ہو، وہ اگر مقدمہ واپس لے لین، تو مین مناسب الفاظ معارف مین شائع کر دون گا، تاکہ ان کا ملال دور ہو جائے، خود مجھے بھی یقین تھا کہ معارف کے بنائے دعویٰ شذرات سے صابری صاحب کی مخالفت مقصود نہین تھی، بلکہ مرحوم اس سے صرف یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ

ع کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری مین

بہرحال اس وقت انھون نے جو کچھ مجھ سے کہا، اس سے میرا اطمینان ہو گیا، اور اس کے بعد سائل صاحب اور مین مدعی کے پاس پہنچے،

بقیہ حالات سب کو معلوم ہی ہین، فریقین نے راضی نامہ داخل کر دیا، اور مقدمہ واپس لے لیا گیا، مجھے اس سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ اس بہانہ میرا گذشتہ چھ سات برس کا غائبانہ تعلق ذاتی واقفیت مین تبدیل ہو گیا، اور اب خط وکتابت مین بھی نیاز و باقاعدگی پیدا ہو گئی،

اس کے کچھ دن بعد میں نے عورت اور اسلامی تعلیم لکھی، یہ اتنی بڑی جسارت تھی کہ میں آج بھی بعض اوقات اپنے آپ پر تعجب کرتا ہوں، موضوع نہ صرف اسلامی، بلکہ خالص علمی اور فقہی بھی، مجھے بجا طور پر اندیشہ تھا کہ کم از کم عامۃ المسلمین اسے دخل در معقولات سے زیادہ وقعت نہیں دیں گے، لیکن لکھ ڈالنے کے بعد اُسے ضائع کرنا بھی مشکل تھا، میں نے سوچا کہ اس خسارے کے سودے میں نفع حاصل کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ اُسے چھڑک کر بھیجا جائے، چنانچہ میں نے اُن سے ایک تو اس پر نظر ثانی کرنے کی درخواست کی، اور دوسرے مقدمہ لکھنے کی، انھوں نے لکھا کہ میں وعدہ نہیں کرتا، مضمون بھیج دیں، تو دیکھ کر بتاؤں، جب مسودہ ان کے پاس پہنچا، تو انھوں نے میری توقع سے بہت زیادہ اس کی تعریف فرمائی، لیکن اتنا اضافہ کیا کہ مجھے تمہارے بعض خیالات سے اختلاف ہے، ظاہر ہے کہ اس صورت میں مقدمہ لکھنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا، انھوں نے یہ نہیں لکھا تھا کہ انھیں کون سے مقامات پر مجھ سے اختلاف ہے، جب میں نے پوچھا تو فرمایا کہ لکھنے میں خواہ مخواہ طوالت ہو جائے گی، کبھی موقع ملے تو ذاتی ملاقات کے ذریعہ انھیں دور کیا جا سکتا ہے، اس کے علاوہ مجھے یونہی سا خیال ہوتا ہے کہ انھیں یہ بھی شبہ تھا کہ میں نے اسے دہلی کے ایک مشہور اہل قرآن عالم سے مشورہ کرنے کے بعد لکھا ہے، حالانکہ یہ ٹھیک نہیں میں نے جو کچھ لکھا تھا، بالکل اپنے ذاتی مطالعہ کے نتیجے میں لکھا تھا، بہر حال چونکہ اس کے تھوڑی مدت بعد میں ملک سے باہر چلا گیا، اس لئے معاملہ اسی پر ختم ہو گیا، نہ میں اُن سے مل سکا، نہ اس گفتگو کی نوبت آئی، یہ مسودہ بہت دن تک اُن کے پاس پڑا رہا، اور آخر انھوں نے اُسے ۱۹۴۶ء میں میرے ایک دوست کے پاس لاہور بھیج دیا،

اس دوران میں خود مجھے بھی غور و فکر کا موقع ملا، پہلے میں نے پردہ کی بحث میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ منہ چھپانا اسلامی پردے میں شامل نہیں، لیکن بعد میں مزید مطالعے اور قرآن و حدیث پر زیادہ وقت نظر سے غور کرنے پر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ منہ بھی اس حکم میں شامل ہے، اور بھی دو ایک جگہ خفیف سی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی، چنانچہ میں نے نہ صرف یہ مقام ہی بدل ڈالے، بلکہ پورا مضمون نئے سرے سے دوبارہ

لکھ کے اُسے شائع کردیا، جب یہ مطبوعہ نسخہ ان کی خدمت مین پہنچا، تو انھون نے اُس کی تعریف فرمائی،

اس تمام زمانے مین میری ان سے خط وکتابت رہی، وہ خط لکھنے مین ذرا سُست تھے لیکن کبھی ایسا نہین ہوا کہ دیر سویر انھون نے خط کا جواب نہ دیا ہو، مجھے اپنی ہیچ میرزی اور ہیچ مدانی کا پورا احساس ہے، لیکن جانے کیون، اس کے باوجود مین بزرگون کی خدمت مین ہمیشہ سے بہت بے باک رہا ہون، اور کبھی الٹی سیدھی بات کہنے مین شرم محسوس نہین کرتا، پھر اس پر بھی خدا کا شکر ادا کرتا ہون کہ وہ اس پر طرح دیتے ہین اور چشم نمائی کی جگہ چشم پوشی فرماتے ہین، حضرت علامہ مرحوم سے بھی میرا رویہ کچھ اس سے مختلف نہین تھا، مین اُن کی خدمت مین بھی گستاخ تھا، جو جی مین آتی، بے جھجک لکھ دیتا، لیکن یہ اُن کی ذرہ نوازی تھی کہ وہ کبھی ماتھے پر بل نہین لائے، لطف فرماتے، میرے لکھے سے درگذر کرتے، اور جواب دیتے،

افسوس کہ ان کے تمام مکاتیب محفوظ نہین رہے، تقسیم کے پہلے کے بیشتر خطوط لاہور مین رہ گئے، کچھ میرے مختلف ممالک کے سفرون مین ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکانی کرتے ہوئے کھو گئے، گذشتہ چند برس میں جو خط آئے تھے، ان مین سے جو اس وقت میرے پاس موجود ہین، انھین ضمیمہ مین درج کر رہا ہون تاکہ کم از کم یہ ضائع ہونے سے بچ جائین[1]، بعض جگہ تلمیح کو واضح کرنے کے لئے مین نے حاشیہ مین چند نقط لکھ دیئے ہین،

اردو مین مذہبی موضوعات پر لکھنے والون کی کمی نہین رہی، اُن مین سے بعض حضرات کی مصنفات کی تعداد سیکڑون تک پہنچتی ہے لیکن اس کے باوجود اردو زبان کی تاریخ مین کہین ان کا نام نہین ملتا، اس کے دو سبب ہین، اوّل نفسِ موضوع، اور دوسرا اسے پیش کرنے کا طریقہ، موضوع بالعموم عام لوگون کی دلچسپی کا نہین ہوتا، بنیادی مذہبی عقائد کو تو رہنے دیجئے، کہ ان مین کسی کو دم مارنے کی مجال نہین، لیکن جہان موضوع مین وسعت پیدا ہو سکتی ہے، اور یہ اپنون کے علاوہ بیگانون کے لئے بھی قابلِ مطالعہ اور کشش کا باعث ہو سکتا ہے، وہان بھی بہت کم ایسا اتفاق ہوا ہے کہ اُن مین سے کوئی کتاب زبان دبیان کے پہلو سے بھی معیاری رہی ہو، یہ اللہ والے لوگ اس بارے مین الا ماشاء اللہ عموماً بے نیاز واقع ہوئے ہین، مشکل اور نامانوس الفاظ، اور

---

[1] معارف: جگہ کی قلت کی وجہ سے یہ خطوط شائع نہین کئے گئے،

ترکیبوں کی بھرمار سے پڑھنے والے کا سر چکرانے لگتا ہے، غیر ضروری تکرار اور طول نویسی اس پر مستزاد، اور ان سب سے بڑھکر بسا اوقات اپنے طرزِ استدلال، اور متقدمین کی ہر رطب و یابس تحریر کی صحت پر اصرار، غرض کہ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کتابیں ایک خاص حلقے میں محدود ہو کے رہ گئیں، اور عام پڑھے لکھے ان سے استفادہ کرنے سے محروم رہ گئے، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں علم و ادب کی تاریخ لکھنے والے ان کا ذکر کیوں کرنے لگے تھے۔

خدا مغفرت کرے مولانا شبلی نعمانی مرحوم کی، سب سے پہلے انھوں نے اس بھول بھلیاں سے نکلنے کی راہ دکھلائی، انھوں نے خالص مذہبی اور علمی مضمونوں پر کتابیں اور مقالے لکھے، اور ایسی دلکش اور شستہ و رفتہ زبان میں کہ اس میں شیر و شکر کی حلاوت محسوس ہونے لگی، نہ صرف یہی، بلکہ یہ واقعہ ہے کہ اُن سے پہلے اردو میں صحیح علمی تحقیق بھی تقریباً مفقود تھی، اس میدان میں بھی اولیت کا سہرا انہی کے سر ہے، انھوں نے مختلف اسلامی اور تاریخی موضوعات پر اپنے زندۂ جاوید مضامین لکھے، ہر طرف سے اس بدعتِ حسنہ پر آفرین اور ہَلْ مِنْ مَّزِید کا نعرہ بلند ہوا، اس سے دوسرے اصحابِ قلم کو بھی توجہ اور جرأت ہوئی، چنانچہ اُن کے زمانے میں بعض صاحب نے اُن کے تتبع میں کتابیں لکھیں، اور اُن کے بعد دوسروں کے علاوہ خود اُن کے تربیت یافتہ تلامذہ نے اس پر جو اضافہ کیا ہے وہ اردو کا مایۂ ناز سرمایہ ہے، اس گروہ میں علامہ مرحوم کی ذات رئیس الطائفہ کی حیثیت رکھتی تھی، اگر انھوں نے اپنی عمر بھر میں صرف سیرۃ النبی ہی کی تکمیل کی ہوتی، تو یہی اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ تاریخ علم و ادب میں ان کا نام زندہ رکھنے کو کافی تھا، لیکن انھوں نے اس کے علاوہ ہمیں خطباتِ مدراس دیئے، جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر بالکل اچھوتے انداز میں روشنی ڈالتے ہیں، پھر انھوں نے جو تحقیقی کتابیں ---- ارض القرآن اور عرب ہند کے تعلقات اور عربوں کی جہازرانی ---- لکھی ہیں، وہ ہماری زبان کی بہترین کتابوں میں شمار ہونے کے لائق ہیں، اسی طرح سوانح عمریوں میں حیاتِ امام مالکؒ، سیرۃ عائشہؓ، خیام، حیاتِ شبلی، اپنے اپنے موضوع پر حرفِ آخر کا حکم رکھتی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ بنیادی طور پر ان کی تعلیم بھی سراسر مذہبی تھی، لیکن انھوں نے اپنے مطالعہ کو اسی حد تک محدود نہیں رکھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اسلوبِ فکر میں تنوع پیدا

ہو گیا، اور انھون نے اپنے گرامی قدر استاد کی پیروی مین ہماری زبان کو اپنی گوناگون تصنیفات سے مالامال کر دیا، اُن کی ہمہ گیری اور جامعیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، جغرافیہ، سیرت، ادب، تنقید، شعر، سفرنامہ، کوئی موضوع اُن کے افادات سے محروم نہین رہا، ان مین سے ہر ایک پر انھون نے معیاری کتابین لکھی ہین، جو نہ صرف معلومات کا خزانہ ہین، بلکہ خیال انگیز بھی، اور مزید کام کرنے والون کیلئے مشعلِ راہ کا کام دے سکتی ہین،

جو جگہ خالی ہوئی ہے، وہ تو اب خالی ہی رہے گی، اس سے پہلے کس کی پُر ہوئی ہے، جو اُن کی ہوگی، لیکن ان کے اخلاف اتنا تو کر سکتے ہین، کہ جو شمع انھون نے جلائی تھی، اگر وہ اس کی روشنی مین اضافہ نہین کر سکتے، تو کم از کم اس مین جان لڑا دین، کہ اس کی تابناکی مین کمی نہ آنے پائے، اور سچ تو یہ ہے کہ یہ ان کا اپنے آپ پر احسان ہوگا کہ اس بہانے ان کا اپنا نام زندہ جاوید ہو جائے گا، ورنہ مرنے والے کے کارنامے تو ایسے ہین کہ اگر کوئی انھین بھلانا بھی چاہے تو وہ بھلائے نہین جا سکتے،

بارے دنیا مین رہو، غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو، یان کہ بہت یاد رہو

# علالت سے وفات تک

## علامہ سید سلیمان ندوی

از

جناب سید ابو عاصم صاحب ایڈوکیٹ کراچی

"یہ مضمون ریاض کراچی کے سلیمان نمبر میں شائع ہوا تھا، اُس کے بعض حصے حذف کرکے جن کا تعلق علالت و وفات کے حالات سے نہیں ہے نقل کیا جاتا ہے۔" "م"

دم سرد ہے آہ پر آہ ہے تسلسل حوادث کا جانکاہ ہے

پہلی مرتبہ ۱۹۴۵ء میں مجھے اطلاع ملی کہ چچا جان کی طبیعت ناساز ہے، سید ھا اعظم گڈھ پہنچا، بیچ کا کمرہ حسب قاعدہ فرش و قالین سے مزین ہے، مسہری پر چچا جان لیٹے ہیں، سب عزیز و اقارب پہنچ چکے تھے، مجھے دیکھا، مسکرا کر فرمایا،

ع کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو

علالت کی نوعیت یہ معلوم ہوئی کہ سینہ میں شدید درد اٹھا جس نے کئی رات مسلسل سونے نہیں دیا، ڈاکٹر حفیظ صاحب کا علاج تھا، اُن کی تجویز تھی کہ قلبی شکایت ہے، فوراً ابھی جاکر علاج ہو مگر ڈاکٹر حفیظ صاحب ہی کے علاج سے جب افاقہ ہوگیا تو مزید جانچ نہ ہوسکی،

اسی سال جاڑوں میں راقم کے یہاں کبھی کبھی تشریف لاتے، رات کا وقت تھا کہ یک بیک تنفس کی

تکلیف شروع ہوئی، مگر مالش وغیرہ سے فوراً ہی یہ تکلیف جاتی رہی، اُس کے بعد یہ شکایت کبھی کبھی ہو جاتی تھی، اور معمولی ہومیوپیتھی دواؤں سے چلی جاتی تھی، اس وقت اس کی تشخیص نہ ہو سکی کہ اس کی نوعیت کیا ہے، ہمیشہ یہی خیال رہا کہ حلق کی خرابی ہے، اور سانس کی نالی میں بلغم پھنس جاتا ہے جس سے یہ تکلیف ہو جاتی ہے،

اتفاق سے اسی زمانہ میں بھوپال اور حیدرآباد سے بلانے کی گفتگو جاری تھی، حیدرآباد میں اگرچہ تنخواہ زیادہ تھی لیکن بھوپال سے ایک تو شعیب قریشی صاحب مدظلہ کا اصرار تھا، دوسری طرف بقول شعیب صاحب قاضی ریاست کا عہدہ تو ان کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکا لیکن تعلیم عربی کی اصلاح کی خدمت کے موقع کو وہ انکار نہ کر سکے، وہ بھوپال میں قاضی القضاۃ اور امیر جامعہ احمدیہ کی حیثیت سے بلائے گئے تھے، اور بالآخر جولائی ۱۹۴۶ء میں وہ بھوپال تشریف لے گئے، اور ۱۹۴۹ء اکتوبر تک مسلسل اُن کا قیام وہاں رہا، اور صحت اچھی رہی، کچھ لوگوں کو اُن کے دارالمصنفین چھوڑنے پر اعتراض تھا، اُن کی مظلومیت کی یہ انتہا ہے کہ خود مظلوم مورد الزام بنایا جا رہا ہے، اس کے باوجود اس نے اپنی زندگی میں کبھی بھی کسی کو بُرا کہنا تو بڑی بات ہے، کسی کا نام بھی اپنی زبان پر آنے نہیں دیا،

ع کبھی فرصت سے سُن لینا بڑی ہے داستاں میری

یوں تو وہ دو مرتبہ حرمین شریفین کی زیارت کر چکے تھے، لیکن اُن کے دل میں یہ بات کھٹکتی تھی کہ وہ دونوں سفر سیاسی تھے، اس سے پہلے ۱۹۲۴ء اور پھر ۱۹۲۶ء میں وفد حجاز میں ہندی مسلمانوں کے نمائندہ بن کر تشریف لے گئے تھے، کون کہہ سکتا ہے کہ وہ بھی رضائے الٰہی کے لئے نہ تھے، لیکن اللہ کے بندے اور رسول کے عاشق نے ان کے دربار میں صرف انہی کا نام لے کر حاضری مناسب سمجھی، چنانچہ ۱۹۴۹ء اکتوبر میں حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے،

واپسی شاید دسمبر میں ہوئی، راستہ ہی میں طبیعت خراب ہو گئی، بمبئی میں یوں تو بہت سے لوگ اپنا

مہمان بنانے کے متمنی تھے، لیکن بمبئی کے مشہور مخیر تاجر بھائی عزیز صاحب کی بے پناہ محبت سب پر غالب آئی، کسی کو رخصت کا موقع دیئے بغیر وہ اُن کو کرسی پر بٹھا کر اٹھا لائے، اور اپنی گاڑی مین بٹھایا، اپنے گھر لے آئے، جس خلوص محبت اور تن دہی سے انھون نے تیمارداری کی ہے، حق یہ ہے کہ اس نے بہت سے قریبی عزیزون کو بھی شرمندہ کردیا، اُن ڈاکٹرون کی تشخیص یہ ہوئی کہ دوسری شکایتون کے ساتھ دل بھی بڑھ گیا ہے، لیکن انھون نے اس کو کوئی اہمیت نہین دی، بلکہ یہی کہا کہ اس عمر مین عموماً دل بڑھ جایا کرتا ہے،

اسی زمانہ مین پاکستان آنے کی خبر گرم ہوچکی تھی، ہندوستان کے متعدد اخبار لکھ رہے تھے کہ وہ ہجرت کرنے والے ہین، حالانکہ حقیقت اس وقت صرف اس قدر تھی کہ یہان سے دعوت ضرور دی گئی تھی، مگر انھون نے اب تک قبول نہین فرمائی تھی، بلکہ پیشکش کی مزید تشریح چاہی تھی، وہ بستر پر بیمار تھے، لوگ چارون طرف سے گھیرے ہوئے تھے، اتنے مین ایک اخبار کے نامہ نگار صاحب تشریف لائے اور انھون نے سوال کیا کیا آپ پاکستان تشریف لیجارہے ہین، اسکے جواب مین انھون نے صرف یہ شعر پڑھا،

رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

نامہ نگار صاحب تو اسی شعر کا مزہ لیتے ہوئے رخصت ہو گئے، جب صحت ہو گئی تو وہ بھوپال تشریف لے گئے، وہان سے سبکدوش ہو کر لکھنؤ اعظم گڈھ اور کانپور مین چند مہینے قیام رہا،

مین ۱۹۴۸ء کے اوائل ہی مین کراچی آگیا تھا، اُن کے یہان آنے سے پہلے ایک مرتبہ اُن کے پاس بھوپال اور والدہ کے انتقال پر وطن اور بھی گیا، اُن کو پاکستان کا مشتاق اور دعاگو پایا، مگر آنے کے متعلق مجھے یقین نہین تھا ۱۳ رجون ۱۹۵۰ء کی صبح کو مین نے اخبار مین یک بیک یہ خبر پڑھی کہ چچا جان لاہور تشریف لے آئے ہین، اور ۱۴ رجون کو کراچی تشریف لانے والے ہین، ہم لوگ کینٹ اسٹیشن گئے، اور ان کو ڈار منزل لائے، ڈار منزل خواجہ شہاب الدین جو ان دنون وزیر داخلہ تھے، اُن کی عنایت خاص کی وجہ سے مجھے پہلے ہی مل چکا تھا، وہ ایک

خاص ولولہ کے ساتھ تشریف لائے تھے، اُن کی گفتگو مین کتنی امید اور کتنی آرزو جھلکتی تھی،

ڈار منزل جہانگیر روڈ کی ایک شاخ چمن اسٹریٹ پر واقع ہے یہ ایک پچھم رُخ کا مکان ہے، پھاٹک سے داخل ہوتے ہی سامنے پندرہ فٹ بے آب وگیاہ میدان ہے، اس کے بعد ۱۵ فٹ کا پختہ صحن ہے، اسی سے ملحق تین کمرے سڑک کے رُخ پر ایک سلسلہ سے ہین، پھاٹک کے سامنے کا کمرہ ملاقات کے لئے مقرر رہا، اس کے بعد بیچ کا کمرہ اُن کی خوابگاہ بنا، اور آخری کمرہ مین میرا قیام تھا، کلفٹن کوارٹرز کے پاس ایک مسجد تھی، لوگون نے اس کا نام جامع مسجد سلیمانیہ رکھنا چاہا، انھون نے اس کو ناپسند کیا، لیکن لوگ نہ مانے، آخر وہ اسی نام سو مشہور ہو گئی، وہان روز صبح بعد نماز درس قرآن کا سلسلہ شروع ہوا، اس مرتبہ مین نے ایک بات یہ دیکھی کہ تنفس کا دورہ عموماً رات کو کبھی کبھی پڑجاتا تھا، ہومیوپیتھی دوا سے فوراً سکون بھی ہوجاتا تھا، یہ تکلیف کھانے کے بعد تقریر کرنے یا کوئی حرکت کرنے سے ہوجاتی تھی، اس لئے ڈاکٹرون کا خیال تھا کہ یہ تکلیف ریاح اور سوء ہضم کا فساد ہے، اسی لئے ساری توجہ ریاح اور اصلاحِ معدہ کی طرف رہی،

ایک مرتبہ مسجد سلیمانیہ مین درس دے رہے تھے، اسی دوران مین اُن کی آواز مدھم ہوتی گئی، اور انھون نے گردن جھکالی، فوراً لوگون نے پکڑ لیا، اور اٹھا کر گاڑی پر گھر لائے، اور ڈاکٹر میجر حسن کو ٹیلیفون کیا، میجر حسن فوراً تشریف لائے، لوگون کو خیال ہوا کہ فالج کا حملہ تھا، میجر حسن صاحب نے معائنہ فرمایا، سب سے پہلے خون کا دباؤ دیکھا، وہ بجائے زیادہ ہونے کے معمول سے بھی کم تھا جس سے اس خیال کی تردید ہوئی، تلوؤن مین تھوڑی سی بے حسی ضرور تھی، چچا جان کو شدت سے انکار تھا کہ ان پر کسی قسم کا حملہ تھا، وہ کہتے تھے رات کو نیند نہین آئی تھی، اسی لئے آنکھ لگ گئی تھی، بہرحال احتیاطی طور پر میجر صاحب نے انجکشن دینے شروع کئے، انھون نے بڑی محبت، خلوص اور شرافت کا ثبوت دیا، جب مین نے فیس پیش کی اور اصرار کیا تو انھون نے سختی سے انکار کیا، اور فرمایا کہ مجھے کمانے کے مواقع تو بہت مین گے

لیکن آپ مجھے سعادت اور مسرت سے کیون محروم کرتے ہین حقیقت یہی تھی کہ یہ اُن کے دل کی آواز تھی، اس مین ذرا بھی رسمی تکلف نہ تھا، وہ باوجود بے انتہا مشغول ہونے کے خود تشریف لاتے، اور انجکشن دیتے، اُن کے علاج اور توجہ سے وہ کچھ صحت مند ہوگئے، یہ غالباً جنوری ۱۹۵۲ء کی بات ہے،

۱۹۵۲ء کی گرمیون مین بنیادی کمیٹی کا اجلاس نتھیا گلی مین طے پایا، چچا جان بھی تشریف لے گئے، آٹھ ہزار فٹ کی بلندی اُن کے قلب و اعصاب کے لئے ناقابلِ برداشت ہوگئی، اور ان پر تنفس کا شدید دورہ پڑا، فوراً ڈاکٹر آئے، انھون نے دیکھا اور کہا کہ خون کا دباؤ بہت بڑھا ہوا ہے، خان عبدالقیوم خان اور میان ممتاز دولتانہ نے اپنے خصوصی اثر سے فوجی اسپتال راولپنڈی پہنچایا، وہان کرنل صبور نے معائنہ کیا، دل کافی بڑھ چکا تھا، اور سب سے پہلی بار یہ تشخیص ہوئی کہ یہ تنفس کی تکلیف بھی قلب ہی کی وجہ سے ہے، وہان سے لاہور تشریف لائے، لاہور کے ایک تجربہ کار ڈاکٹر صاحب نے بھی وہی تشخیص کیا، اور نسخہ تجویز کیا، اور نمک کا سخت پرہیز بتایا، اس کے بعد کراچی تشریف لے آئے، یہان ڈاکٹر رحمان کی طرف رجوع کیا، انھون نے بھی اسی علاج سے اتفاق کیا، اور علاج ہوتا رہا، اور تنفس جاتا رہا، اور بہت دنون تک کوئی شکایت نہین رہی، ہان حکیم محمد نصیر الدین صاحب ندوی نے جو اُن کے شاگرد بھی، شیدائی بھی، معالج خاص بھی، اور محرم درد دل بھی ہین، طاقت کی دوائین ہمیشہ جاری رکھین

فروری ۱۹۵۳ء مین ڈھاکہ مین مجلس تاریخ کی کانفرنس تھی، اس کے صدر منتخب ہوئے، ڈاکٹرون کا مشورہ تھا کہ اتنا طویل سفر نہ فرمائین لیکن نہ مانے اور بذریعہ طیارہ تشریف لے گئے، ڈھاکہ کے خطبۂ صدارت مین ایک تاریخی صداقت کے اظہار کے بعد وہان کے طلبہ نے جو شرمناک سلوک اُن کے ساتھ کیا، وہ سب کو معلوم ہے، ایک نیم جان قلب کے مریض و ضعیف کے ساتھ ایسا سلوک انسانیت سے گذری ہوئی بات تھی،

جلسہ کے بعد محبی راحت رضوی صاحب کے یہان چند دن قیام رہا، اور وہان سے کلکتہ تک ہوائی جہاز اور بذریعہ ریل لکھنؤ ہوتے ہوئے دہلی پہنچے، کہتے تھے کہ راہ مین بختیارپور جنکشن (جہان سے ہمارے وطن کی ریل مڑتی ہے) پر ریل ٹھہری، بہت دیر تک حسرت بھری نگاہ ڈالتا رہا، پٹنہ جنکشن پر مقامی ندوی حضرات تشریف لے آئے تھے،

کچھ دن لکھنؤ میں قیام رہا، اعظم گڈھ سے شاہ معین الدین صاحب اور سید صباح الدین صاحب بھی ملنے آئے، ان دونون حضرات کو ان کی ذات سے والہانہ محبت تھی، اس غیر متوقع ملاقات کا ذکر مزہ لے لے کر اپنے خطوط مین مہینون کرتے رہے، اور سیر نہ ہونے کا گلہ کرتے رہے، ان حضرات کو کیا معلوم تھا کہ یہ ملاقات اُن کے لئے آخری ہی ثابت ہوگی، اور ع

بوئے گل سیر، ندیدیم و بہار آخر شد

کا مصرعہ ان پر صادق آئے گا،

اپریل ۱۹۵۳ء مین واپس کراچی تشریف لائے، کچھ ہی دنون کے بعد تنفس کا پھر دورہ پڑا، وہی انجکشن دیا گیا جس سے سکون ہوگیا، اس کے بعد سیاسی ہنگامون کا طوفان اٹھا، بنیادی کمیٹی کا جلسہ، علمائے کرام کا اجتماع، کیا کچھ نہ ہوا، منتین کین، خوشامدین کین، روٹھ گیا کہ ان ہنگامون سے آپ علٰحدہ رہین،

یان لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب مین
وان ایک خاموشی تری سب کے جواب مین

ایک دن تو مجھ سے چڑھ گئے، وہ دن تھا اور آخری دن، مین نے زبان بند کرلی، میری آنکھون مین آنسو آگئے، میرے انداز کو دیکھ کر وہ سمجھ گئے، اکثر چھیڑا کرتے تا کہ مین کچھ بولون، لیکن مین نے طے کر لیا کہ مین ہرگز ان کی گرانی طبع کا باعث نہ بنون گا، اس لئے صرف تعمیل حکم مین نے اپنا فرض بنا لیا، کوئی آتا مین اطلاع کر دیتا، لوگ آتے، اور گھنٹون بیٹھ جاتے اور ہر قسم کے موضوع پر لمبی لمبی بحثین ہوتین، دل کڑھتا، اکثر آنکھین روتین، چہرہ متغیر ہو جاتا، پیشانی پر شکن پڑ جاتی لیکن زبان بہرحال بند رہتی،

اگست ۱۹۵۳ء کی کوئی تاریخ تھی کہ زکامی کیفیت محسوس ہوئی، اور کچھ تنفس کی ہلکی سی تکلیف بھی، پھر حرارت آگئی یہی ۹۹ - اور ۱۰۰ کے درمیان، ڈاکٹر عبدالرحمان کے یہان خود تشریف لے گئے، انھون نے کچھ نسخہ زکام کا نسخہ دے دیا، دو چار دن مین بخار اتر گیا، لیکن تنفس کی تکلیف بڑھنے لگی تھی، مین نے انجکشن دیا گیا، تنفس کم ہوگیا،

ایک دو دن اسمبلی بھی تشریف لے گئے لیکن گاڑی مین اگلی سیٹ پر سر ٹیک دیا، مین نے بے قرار ہو کر پوچھا کوئی خاص تکلیف ہے، فرمایا نہین لیکن مجھے معلوم ہو رہا تھا کہ گھلتے جا رہے ہین، کچھ سمجھ مین نہین آتا کیا کرون، میری خواہش ہوتی کہ ان کو تکلیف نہ کرنی پڑے، اور اُن کی خواہش ہوتی کہ اُن کے لئے کسی کو تکلیف نہ ہو، میری خواہش ہوتی کہ ڈاکٹر اُن کے پاس آتا لیکن مین ذکر نہین کرتا، اس لئے کہ مجھے جواب معلوم تھا، وہ فرماتے مرض مجھ کو ہے یا کہ اُن کو، اور پھر جو شخص جتنا کر دے، اس کا احسان ہے، نہ کرے تو اس کی کوئی شکایت نہین، وہ پوچھتے تم کیسا ڈاکٹر چاہتے ہو، مین کہتا مجھے ایسا ڈاکٹر چاہیے جس کو جب جس وقت بلایا جائے، فوراً آجائے، خواہ اس کے لئے وہ کوئی فیس لے، وہ مسکرا دیتے، بات ختم ہو جاتی، لیکن دوسرے دن کپڑے پہن کر مجھ سے پہلے گاڑی مین جا کر بیٹھ جاتے، اب میری بے بسی دیکھنے کے قابل ہوتی، مین تھوڑی دیر تذبذب کی حالت مین کھڑا رہتا، نہ کچھ کہہ سکتا، نہ کچھ کر سکتا، شکست کھا کر گاڑی مین بیٹھ جاتا، اور گاڑی چل دیتی،

ساری تکلیفین خود اٹھانی ان کی فطرت بن چکی تھی، کسی کو اُن کی ذات سے تکلیف نہ ہو، اس کا بڑا خیال رکھتے تھے، اسی لئے ڈاکٹر کو گھر پر بلانے کی مخالفت کرتے تھے، کوئی ڈاکٹر اُن سے فیس نہین لیتا تھا، اور سب انتہائی محبت سے پیش آتے تھے، ڈاکٹر فاروقی سے بالکل عزیزون جیسے تعلقات تھے، وہ خود بھی اپنی ذات سے بڑے متواضع اور خلیق انسان ہین، ہمارے گھر مین کسی کو کچھ تکلیف ہو، اطلاع ملتے ہی آجاتے، دیکھتے، انجکشن لگاتے، عثمان صاحب کمپونڈر کو متعین کر دیتے، عثمان صاحب بھی بڑے ہی شریف اور محبت والے آدمی ہین، ان سب باتون کے باوجود ان کی خواہش یہی ہوتی کہ کسی کو تکلیف نہ دی جائے،

ڈاکٹر رحمان کے علاج کو ایک دو ہفتہ ہوا ہوگا کہ ایک دن مختار صاحب نے ٹیلیفون کیا کہ کرنل شاہ سید صاحب کو دیکھنا چاہتے ہین، کس وقت تشریف لائین، مین بہت خوش ہوا، کرنل شاہ کے اخلاق کی دل ہی دل مین تعریف کرتا ہوا چچا جان کو مطلع کیا، انھون نے فرمایا جس وقت جی چاہے تشریف لے آئین، اُن کی عنایت ہوگی، چنانچہ اسی دن گیارہ بجے تشریف لائے، اور بہت دیر تک معائنہ کرتے رہے، مین نے

اُن کی راے پوچھی، انھون نے پورے وقار اور سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا مین ابھی کوئی راے نہین دیسکتا، کل اُن کو جناح اسپتال لے آئیے مین اُن کے قلب کا اکسرے اور کارڈگراف لینے کے بعد کوئی فیصلہ کرونگا، چنانچہ دوسرے دن ٹھیک گیارہ بجے اُن کے دفتر پہنچ گیا، وہ دفتر مین نہین تھے، چچاجان کو دفتر مین بٹھا دیا، اور ڈاکٹر صاحب کی تلاش مین اسپتال کا رُخ کیا، وہ اسپتال کا چکر لگا رہے تھے، جیسے ہی مجھے دیکھا، تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے گلے مین پڑے ہوئے اسٹتھ اسکوپ سے کھیلتے ہوئے دفتر کی طرف تشریف لائے، اور بڑی تعظیم وتکریم اور تواضع سے پیش آئے، اور دوسرے کمرے مین لے گئے، وہان کارڈگراف لیا گیا، اور پھر وہان سے اپنی گاڑی پر دوسری جگہ گئے، وہان اکسرے لیا گیا، اور پھر تیسری جگہ خون کی جانچ کے لئے خون لیا گیا، اور دوسری جانچ مکمل ہوئی،

اتنی دوڑ دھوپ مین سانس کچھ تیز ہوگئی لیکن بڑے حوصلہ اور ہمت سے سارا کام کرتے رہے، گھر پہنچے تو سب لوگون نے گھیر لیا جیسا کہ ہمیشہ سے قاعدہ تھا جب کبھی وہ باہر سے آتے تھے، تو گھر کے سارے افراد اُن کے گرد جمع ہوجاتے تھے، لوگ تفصیل جاننا چاہتے تھے لیکن وہ چند جملون مین ساری بات کہہ جاتے تھے جس سے گھر کے لوگون کو تسلی نہین ہوتی تھی، مزید تفصیل اور استفسار کے جواب مین ان کا ایک نیم تبسم بس تھا، چنانچہ اسی طرح اُن سے تفصیل کی فرمایش ہوئی، انھون نے میری طرف اشارہ کردیا اور خود پلنگ پر لیٹ گئے اور زیرلب تبسم کے ساتھ اپنی ساری روداد لیٹے لیٹے سنتے رہے،

دوسرے دن شام کو ڈاکٹر صاحب کا ٹیلیفون آیا کہ مین ساری رپورٹ لے کر خود آؤن گا اور دوا اور علاج تجویز کرون گا، چنانچہ جب وہ تشریف لائے، تو کہا کہ قلب بڑھ گیا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ قلب کی کسی شریان مین ایک ایسی گرہ بن گئی ہے جس سے دورانِ خون مین دقت ہوتی ہے اور قلب کو زور لگانا پڑتا ہے، اور اسی سے تنفس کی تکلیف ہوتی ہے، کم و بیش تشخیص وہی تھی جو سارے اطبا اور ڈاکٹرون کی تھی، انھون نے ایک ٹکیہ ڈیجاکسن کا اضافہ کیا، کچھ دوائین کھانسی وغیرہ کی بھی دین، دس بارہ دن

کے علاج کے بعد حالت بظاہر اچھی خاصی معلوم ہونے لگی، اب وہ بستر سے ادھر ادھر چلنے پھرنے لگے، پاخانہ جو ان کے کمرے سے کچھ دور پر تھا، خود سے جانے لگے، اور فرماتے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی،

ڈاکٹروں کی شدید ہدایت تھی کہ کسی کو ملنے نہ دیا جائے، تاکہ دل و دماغ کو مکمل آرام نصیب ہو کسی قسم کی علمی اور سیاسی گفتگو میں حصہ نہ لیں، صرف انہی حضرات کو ملنے دیا جائے جن کی باتوں سے دل خوش ہو، میں نے ڈاکٹر صاحب سے اپنی عاجزی اور بے بسی کا اظہار کیا، اور ان سے استدعا کی کہ آپ خود گوش گذار کردیں، چنانچہ ایک دن ڈاکٹر صاحب نے کہنا شروع کیا، کہ آپ نے زندگی میں بہت کام کئے ہیں، اتنی خدمت کی ہے جتنی کم ہی لوگوں نے کی ہوگی، اور ابھی قوم کو آپ کی ضرورت ہے، اس لئے کچھ دنوں قومی، ملی، اور علمی مصروفیتوں سے بالکل علٰحدہ ہو جائیے صحت کے بعد انشاء اللہ پھر حصہ لے لیجئے گا، انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ کبھی مجھے اور کبھی ڈاکٹر صاحب کو دیکھ کر مسکراتے رہے،

اُن کی علالت کی اطلاع قصداً اخبارات میں نہیں دی تھی، اس لئے کہ لوگوں کا ہجوم بس سے باہر ہو جاتا، اس پر بھی مشتاقوں، مجنوں، اور مخلصوں کا تانتا لگا رہتا تھا، سمجھدار لوگ صرف دریافت حال کے بعد چلے جاتے تھے، میں لوگوں سے کہہ دیتا تھا کہ ان کا یہ حال ہے، آپ کہیں تو اُن کو مطلع کردوں، کچھ لوگ کہتے میں اُن کی خیریت پوچھنے آیا ہوں تکلیف دینے نہیں، بعض لوگوں کو اصرار ہوتا کہ آپ میری آمد کی اطلاع کر دیجئے، میں جانتا تھا کہ اگر اطلاع کرائی گئی تو وہ ضرور بلالیں گے، اور پھر کچھ نہ کچھ گفتگو بھی ہوگی، اور موضوع اور عنوان کی کوئی حدبندی باقی نہیں رہے گی،

شروع شروع جب لوگوں کو واپس کر دیا گیا، اور انھیں علم ہوا تو بہت خفا ہوئے، اور فرمانے لگے تم لوگ مجھے وزیرِ اعظم بنا دینا چاہتے ہو، مجھے یہ پابندیاں پسند نہیں ہیں، میرے پاس جو آتا ہے، محبت اور خلوص سے آتا ہے کسی غرض سے نہیں آتا ہے کسی کو نہ روکو، چنانچہ جس کی بھی اطلاع کی گئی ضرور بلا لیا گیا، اور اُن کے جسم ناتواں پر جتنا بھی وہ بار ڈال سکتا تھا اس کو برداشت کرتے، اور کبھی تکدر کا اظہار نہیں فرماتے،

کراچی یونیورسٹی کے ایک لائق پروفیسر اسلامی تاریخ کے پروفیسر کے تقرر کے سلسلہ میں اُن سے مشورہ کرنے کے لئے تشریف لائے، انھیں ان کی علالت کا علم نہیں تھا، ملازم کے ذریعہ انھوں نے اطلاع کرائی، فوراً بلالئے گئے، چچا جان رنج کے ساتھ اس ملک میں علمی فقدان کا ذکر کرنے لگے، اور فرمایا ہمارے پی، ایچ ڈی زندگی میں صرف ایک مقالہ لکھتے ہیں، اور ساری عمر اسی کو چوستے چاٹتے رہتے ہیں، حالانکہ پی ایچ ڈی ہونا صرف اس بات کی سند ہے کہ تم تحقیق کر سکتے ہو، محقق نہیں ہو، بعد میں مجھ سے پروفیسر صاحب نے فرمایا کہ علالت کا علم نہیں تھا، ورنہ کبھی تکلیف نہ دیتا، پھر بھی بیچارے پوری گفتگو کئے بغیر ہی اٹھ گئے، لیکن احساس والے لوگ کم ہی آتے،

ایک مرتبہ راجشاہی یونیورسٹی کے ایک لکچرار صاحب تشریف لائے، میں نے اُن کو ان کی حالت بتادی، کہنے لگے کوئی حرج نہیں، میں بھی علیگ ہوں، اس تعلق سے آپ ہی کے پاس تھوڑی دیر بیٹھ جاؤں گا، چنانچہ مجھ سے برادرانہ گفتگو کرتے رہے، اتنے میں چچا جان اندر کے کمرے سے باہر تشریف لے آئے، لکچرار صاحب نے سلام کیا، اور انھیں کے ساتھ صوفہ پر بیٹھ گئے، مزاج پرسی کے بعد انھوں نے وحدۃ الوجود کا مسئلہ چھیڑ دیا، پہلے تو انھوں نے معذرت کی کہ میں اپنی صحت سے مجبور ہوں، لیکن تھوڑی دیر بعد خود اُن سے نہیں رہا گیا، اور تقریباً ایک گھنٹہ تک اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے رہے، لکچرار صاحب الجھتے رہے، اور ان کی تسلی نہیں ہو پائی تھی، انھوں نے پھر سوال کیا، فرمانے لگے بھائی! بس اب دم نہیں رہا، ہاں اس سلسلہ میں سعدی کا صرف ایک شعر سن لیجئے،

یکے قطرہ باران ز ابرے چکید ۔۔۔ خجل شد چو پہنائے دریا بدید
کہ جائے کہ دریاست من نیستم ۔۔۔ گر او ہست حقا کہ من نیستم

اس شعر کو سُن کر لکچرار صاحب جھومنے لگے، کہنے لگے کہ ہزاروں مرتبہ اس شعر کو سنا تھا لیکن کبھی اس مطلب کو نہیں سمجھا تھا، اب وحدۃ الوجود کے مسئلہ کو سمجھ گیا، آپ سے صرف ایک گذارش ہے کہ کبھی خط وکتابت

کی اجازت دیدیجیے، فرمایا بڑے شوق سے، یہ سچ ہے،

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

کچھ دنوں کے بعد کراچی کے ایک پروفیسر صاحب تشریف لائے، انھوں نے اپنی علمی لیاقت کے متعلق کوئی تحریر چاہی، فرمایا کہ یہ تو ایک قسم کی شہادت ہے، اور شہادت بغیر ذاتی واقفیت کے دینا دیانت کے خلاف ہے، اس کے بعد خاموش ہوگئے، پروفیسر صاحب کے چہرہ پر افسردگی چھا گئی، یہ بھی اُن سے دیکھا نہیں گیا، آخر میں اُن سے سوالات شروع کئے، اور وہ جوابات دیتے رہے، اس کے بعد انھوں نے پوچھا کہ اس موضوع پر آپنے کون کونسی کتابیں پڑھی ہیں، ان کا نام بتائیے، جو انھیں یاد تھا، بتاتے رہے، اس کے بعد خود عربی، انگریزی، اردو کتابوں کا نام لے کر پوچھنا شروع کیا، بیچارے پروفیسر صاحب کو پسینہ آگیا، لیکن انھوں نے نہایت صفائی سے جوابات دئے، جو جانتے تھے اس کو بتایا، جو نہیں جانتے تھے اس کا اعتراف کرلیا، اس کے بعد تحریر کا وعدہ فرمالیا، پھر خود اس سوال کا جواب دینے لگے، سوال یہ تھا کہ اسلام کے اندر غیر اسلامی عنصر کہاں کہاں سے اور کب داخل ہوا، وہ گفتگو کر رہے تھے، ٹھہر ٹھہر کر جیسا کہ ان کا ہمیشہ کا قاعدہ تھا، لیکن تسلسل کا یہ عالم تھا کہ جیسے بند ٹوٹ چکا ہے اور سیلاب تھمتے نہیں تھمتا، اسی سلسلہ میں قدیم وجدید فلسفہ یونانی فلسفہ، اسرائیلیات، سارے عالم کے فلسفہ کی تاریخ کی ارتقاء پر سیر حاصل بحث کرتے رہے کہ کس طرح یونانی (Logos) جس سے (Logio) وغیرہ مشتق ہیں، کلمہ، کلام، اور پھر علم کلام کی بنا پڑی، اس دن کی ساری گفتگو بڑی ہی پر از معلومات تھی جو الحمد للہ محفوظ کرلی گئی،

میں بار بار کھانے کے لئے کہہ رہا تھا لیکن ان کی بات ہی نہیں ختم ہوتی تھی، یہاں تک کہ میں نے ان کو سہارا دے کر اٹھایا، اور دوسرے کمرے میں لے جانے لگا، پھر بھی وہ دو ایک بات بولتے ہی جاتے تھے، سانس تیز ہو چکی تھی، پیروں میں خود سے کھڑے ہونے کی طاقت نہیں تھی، ہاتھ میرے کاندھے پر تھا، اور میں

ان کو اپنے سہارے پر کھڑا کئے ہوئے تھا، صرف زبان اور دماغ مین طاقت موجود تھی، جو آخر وقت تک اسلام اور دین کی خدمت مین مصروف رہی،

بنیادی کمیٹی کی سفارشات پر غور کرنے کے لئے اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا، "اسلام ریاستی مذہب ہو" قوم کا مطالبہ تھا، ان کے بیان کا ایک مسودہ اُن کے سامنے پیش کیا گیا، انھون نے اس کو پڑھا اور رد کر دیا، دوسری مرتبہ جب محترمی راغب احسن صاحب اور مولانا عبد القدوس بہاری تشریف فرما تھے، انھون نے خود سے اپنے بیان کی اصلاح کی، اور اخبارات کو بھیجنے کی اجازت دی،

اسلام کے ریاستی مذہب کی تائیدی جلسہ کی صدارت کے لئے انھون نے پیر غلام مجدد سرہندی کو نامزد کیا، یہان کے تمام علما مین وہ پیر صاحب کے خلوص اور جوش جہاد کے بہت معترف تھے، اُن کی ذات پر انھین بہت بھروسہ تھا،

ایک مرتبہ رات کے گیارہ بجے تھے، ابھی ابھی ان کی آنکھ لگی تھی کہ کسی نے دروازہ پر دستک دی، دروازہ کھولا گیا تو دیکھا ایک مولوی صاحب اپنے ساتھی کے ساتھ ایک بیان پر دستخط لینے کے لئے تشریف لائے ہین، اُن سے کہا گیا کہ ابھی آنکھ لگی ہے، ان حضرات کا اصرار ہوا کہ جگا دیا جائے، اور ان کی شدید علالت اور اسکی نوعیت بتائی گئی تو بڑی مشکل سے واپس تشریف لے گئے، اس ہنگامہ مین اُن کی آنکھ کھل گئی، فرمانے لگے، کہ مجھے صرف یہ بتاو کہ کون حضرات تشریف لائے تھے؟ اُن کی غرض نہ بتاؤ، جب انھین نام معلوم ہوا تو ایک دم خاموش ہو گئے، صبح جب ڈان مین اُن حضرات کا بیان دیکھا تو فرمایا کیا اسی لئے آئے تھے؟ دوسرے دن ڈاکٹر عبد الحی صاحب تشریف لائے، تو اُن سے بڑے دکھ کے ساتھ شکایت کی۔ ———

——— ڈاکٹر صاحب نے ندامت سے اس طرح سر جھکا لیا، جیسے انہی سے یہ غلطی ہوئی ہو،

ہمارے ایک عزیز لوہے کے تاجر ہین، وہ ان سے ملنے کے لئے آئے، اُن سے تجارت کی حالت پوچھی

انھون نے ملک کی اقتصادی بدحالی کا بہت ہی پردرد منظر کھینچا، وہ اُن کی بات بڑے غور سے سنتے رہے، جب وہ ختم کرچکے تو فرمانے لگے ہین تو پاکستان کے مستقبل سے مایوس نہین ہون، مشکلات فرد اور ملت کی آزمایش کیلئے ہوتی ہین، اور آزمایش ہی فرد اور قوم کو زندہ رکھتی ہے مشکلات سے گھبرانا نہین چاہئے، بلکہ مردانہ وار ان کا مقابلہ کرنا چاہئے،

اب انھین جلد جلد دورہ پڑنے لگا تھا، کرنل شاہ کی راے ہوئی کہ اُن کو جناح اسپتال مین داخل کردین لیکن اسپتال مین داخل کرنے کے لئے گھر کا کوئی فرد تیار نہین تھا، وہان کے ماحول اور بےبسی سے اور وحشت ہوتی تھی، آخر کرنل شاہ کی راے کے مطابق ڈاکٹر عبدالصمد کا نپوروالے بھی علاج مین شریک کرلئے گئے، کرنل شاہ اور ڈاکٹر عبدالصمد مین مشورہ ہوا، دونون بالکل متفق تھے، چنانچہ اسی نہج پر علاج ہوتا رہا،

جمعرات یعنی ۱۹ر نومبر ۱۹۵۳ء کے دن وزیر شام ۴ بجے تشریف لائے، اور انھون نے ایک مسئلہ چھیڑ دیا، چچاجان نے گفتگو شروع کی، بار بار کلام پاک سے حوالے دیتے جاتے، جب وہ تشریف لائے تھے مین انجکشن کے لئے قیوم صاحب کو لانے جارہا تھا، مین ان کو لے کر واپس آیا تو وہ محو گفتگو تھے، حاضرین کی اجازت لے کر بستر پر لیٹ گئے، کمزوری اور ضعف کے سبب سے رگ کی تلاش مین بڑی دقت ہوتی تھی، کبھی کبھی غلط جگہ سوئی چبھ جاتی تھی، تو بڑی تکلیف ہوتی تھی، انتہائی ضبط کے باوجود آہ نکل جاتی تھی، ایک ہاتھ مین ناکامی ہوئی تو دوسرے مین کوشش کی گئی، بارے اس مین کامیابی ہوئی، اس کے بعد وہ اُٹھ بیٹھے، گفتگو کا تار جہان سے ٹوٹا تھا، وہین سے شروع کردیا، کس کو یقین آسکتا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو ابھی دو منٹ قبل درد اور تکلیف سے بےچین تھا، میرا دل کڑھ رہا تھا، لیکن زبان سے بول نہین سکتا تھا، مین قیوم صاحب کو چھوڑ کر جب واپس آیا تو دیکھا کہ گفتگو اب بھی جاری ہے، یہان تک کہ مغرب کا وقت ہوگیا، وزیر شام نے باہر صحن مین نماز پڑھی، اس کے بعد کچھ دیر گفتگو کے بعد وہ رخصت ہوئے، ساری گفتگو عربی مین ہورہی تھی، مین ان کو گاڑی تک رخصت کرنے گیا، وہ بڑے متحیر اور متاثر تھے،

جمعہ ۲۰ر نومبر ۱۹۵۳ء ایک صاحب مجھ سے ملنے آئے، اُن کے ساتھ ایک اور صوفی منش بزرگ تھے، ان سے یہ طے تھا کہ ہم لوگ ماہر القادری صاحب کو دیکھنے جائیں گے، چنانچہ ان دونوں کو ملاقات کے کمرے میں بٹھا دیا، اور خود کپڑا بدلنے چلا گیا، اور فوراً واپس آ گیا، چچا جان اسی کمرے میں محوِ خواب تھے، ان صاحب نے مجھ سے روایت بیان کی کہ صوفی صاحب کہہ رہے تھے، عاصم صاحب جلد واپس آ گئے، سید صاحب پر انوار کی ایسی بارش ہو رہی تھی کہ اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا،

ایک دن مجھ سے سوال کیا کہ تمہارے والد کا کس عمر میں انتقال ہوا، میں نے عرض کیا کہ رحلت کے وقت اُن کی عمر باسٹھ ۶۲ برس کی تھی، پھر پوچھا اور بڑے بھائی (حکیم سید ابو حبیب صاحب) کی عمر کیا تھی،

ان کی عمر تو ستّھ برس تھی،

پھر کہنے لگے کہ میں نے تو خاندان میں سب سے زیادہ عمر پائی،

میں اُن کا مطلب سمجھ گیا، اسی لئے عرض کیا، لیکن بڑے دادا (یعنی ان کے والد سید ابو الحسن صاحب) کی عمر تو ۸۲ برس کی تھی، وہ مسکرا کر خاموش ہو گئے، لیکن میں اس گفتگو سے سہم گیا، پھر اپنا وہم سمجھ کر اس کو ٹال گیا،

ایک دن حکیم نصیر الدین صاحب ندوی تشریف لائے، انھوں نے حسب عادت بڑے حوصلہ افزا الفاظ کہے،

قلب کی حالت بہت اچھی ہے، الحمد للہ نبض بھی متوازن ہے، چہرہ بھی شگفتہ ہے، ماشاء اللہ بہت اچھی حالت ہے

وہ اُن کی باتیں سنتے رہے، اور مسکراتے رہے، صرف یہ شعر پڑھ دیا،

اُن کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منھ پر رونق	وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

ایک مرتبہ شعیب قریشی صاحب کا لڑکا عمر جو سلمان کا ہم عمر اور مخلص دوست ہے، اُن سے

ملنے آیا، اس کو اپنے پاس بلایا، اور بٹھا کر فرمایا، تم تو محمد علی کی جوانی کی ہو بہو تصویر ہو،

آخری دنون مین اپنے گذرے ہوئے بزرگون اور عزیزون کی یاد بہت آنے لگی تھی، ہم لوگون کو اپنے قریب بلاتے، سب لوگ اُن کے پلنگ کے پاس فرش پر بیٹھ جاتے، وہ اُن روحون کو عجیب انداز سے یاد کرتے، کبھی اُن کے خلوص و محبت کو یاد کرکے بے چین ہوجاتے، کبھی اُن سے متعلق گذرے ہوئے واقعات اُن کو تڑپا دیتے، اُن کی آنکھون مین اکثر محبت کے آنسو چھلکتے دیکھے، دور کے عزیزون مین سے بھی کوئی ملنے آجاتا، تو سب سے پہلے اُس سے اپنا رشتہ بتاتے، پھر خاندانی تعلقات و روابط کے قصے اتنا مزہ لے لیکر بیان کرتے کہ سننے والے کی آنکھون کے سامنے ان بیتے ہوئے دنون کا نقشہ پھر جاتا، اور اپنے پچھلے بزرگون کی محبت اور عظمت دل مین جاگزین ہوجاتی،

جمعہ ۲۰ نومبر ۱۹۵۳ء کو اصرار سے غسل کیا، اور مل مل کر بدن کو صاف کراتے رہے، غرض بڑی مکمل صفائی ستھرائی کرائی،

ہفتہ کا دن سکون سے گذر گیا، پچھلے پہر رات کو یک بیک میری آنکھ کھل گئی، کان مین بڑی درد بھری ایک آواز آئی، غور سے سُنا تو چچا جان بڑے درد و کرب سے یہ شعر پڑھ رہے تھے،

موت کا ایک دن مقرر ہے ؎ نیند کیون رات بھر نہین آتی

مین مضطر ہوگیا، اتنے مین والدہ نے آواز دی، مین تڑپ کر بستر سے کودا اور اُن کے کمرے کی طرف گیا، دیکھا کہ تنفس کا زور ہے، چہرہ درد و کرب کا آئینہ دار ہے، لیکن مجھے دیکھکر مسکرا دیئے، مین نے کہا مین ابھی ڈاکٹر کے پاس جاتا ہون، کہنے لگے ابھی نہ جاؤ، ڈاکٹر صاحب سو رہے ہون گے، اُن کو تکلیف ہوگی، مین اب کچھ بہتر ہون، نماز فجر کے بعد جانا،

مین نے والدہ سے کہا مجھے پہلے کیون نہین اٹھا دیا؟ انھون نے فرمایا، وہ تو اب بھی مجھے روک رہے تھے:

رات کی تاریکی دور ہوچکی تھی، سپیدۂ سحر نمودار ہوچکا تھا، ہوا تیز تھی، ٹھنڈ خاصی تھی، فضا مین

ایک عجیب اداسی محسوس ہورہی تھی،

آج اتوار کا دن شروع ہوچکا تھا، مین نے فجر کی نماز پڑھی، بارگاہ الٰہی مین اُن کی صحت عاجلہ وکاملہ کے لئے دعا مانگی، ڈرائیور کو بیدار کیا، اور ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا، ان کا پھاٹک کھل چکا تھا، لیکن کسی آدمی کا پتہ نہ تھا، مین ہر طرف دیوانون کی طرح بھٹکتا رہا تھا، اتنے مین ایک ملازم آیا، اُس نے کہا ڈاکٹر صاحب نماز فجر کے بعد سوگئے ہین،

مین نے کہا ڈاکٹر صاحب کو اٹھا دو، لیکن وہ چلا گیا،

تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر صاحب کے لڑکے نے مجھے دیکھا،

مین نے اُن سے حال بیان کیا،

انھون نے ڈاکٹر صاحب کو باہر بھیجا،

ڈاکٹر صاحب نے کہا آپ جائیے مین ابھی آتا ہون، جب مین لوٹ کر آیا، تو ان کو پہلے سے بہتر دیکھا، انھون نے ازخود کہا کہ مجھے دوا کی ایک ٹکیہ اور دیدو، چنانچہ دیدی گئی، اتنے مین ڈاکٹر صاحب آگئے، انھون نے کہا اچھا کیا کہ ٹکیہ کھالی، پھر پوچھا کہ دل مین درد تو نہین ؟ فرمایا الحمدللہ ذرہ برابر نہین ہے،

ڈاکٹر صاحب : پھر کوئی بات نہین ہی،

ڈاکٹر صاحب سے سوال کیا، ڈاکٹر صاحب ! یہ مرض اچھا بھی ہوجاتا ہے ؟

ڈاکٹر صاحب، کیون نہین، آپ اچھے ہوجائین گے،

پھر فرمایا میرے خیال مین کوشش بیکار ہے،

ڈاکٹر صاحب : ایسی مایوسی کی بات نہین ہی،

مین ڈاکٹر صاحب کو لے کر باہر آیا، اُن سے پوچھا کیا حال ہے ؟ کہنے لگے حملہ ہوگیا تھا، کمزور جسم ہے، مین نے پوچھا کوئی تشویش کی بات تو نہین ؟ کہنے لگے کوئی بات نہین ہے، آج پھر انجکشن لگوا دیجئے گا، وہ

چلے گئے، میں واپس آگیا، اس کے بعد ہم لوگوں کے ساتھ مل کر انھوں نے ناشتہ کیا، دو توس جیلی لگے ہوئے اور ایک نیم برشت انڈا کھایا،

تھوڑی دیر بعد سفیر حجاز آگئے، میں نے کہا کہ اسی کمرے میں بلا لیجئے، کہنے لگے نہیں مجھے ملاقات کے کمرہ میں لے چلو، میں نے ان کو سہارا دیا، اور اس کمرہ میں پہنچا دیا، وہاں بھی بستر لگا رہتا تھا، اس پر لیٹ گئے، خطیب صاحب بستر کے قریب ہی بیٹھ گئے، اُن سے بھی اسی طرح گفتگو کرتے رہے، جیسے ابھی دورہ پڑا ہی نہ تھا، گیارہ بجے کے قریب میں انجکشن کے لئے قیوم صاحب کو لانے گیا، حالت اتنی بہتر ہو چکی تھی کہ انھوں نے کہا کہ اگر میں ایک گھنٹہ کے بعد آؤں تو کوئی حرج تو نہیں، میں نے کہا کوئی ہرج نہیں، چنانچہ وہ ایک بجے آئے، اور انجکشن لگا کر چلے گئے، ہم لوگ کھانے سے فارغ ہو کر اُن کے پلنگ کے پاس بیٹھ گئے، اس دن انھوں نے کھیر کی فرمائش کی تھی، تھوڑی سی کھائی باقی رکھوا دی کہ بعد میں کھاؤں گا، شاید دو بجے ہوں، عادل میاں پینٹ وغیرہ پہن کر آئے اور نانا کے پاس بڑی شان سے السلام علیکم مولانا صاحب کہکر کھڑے ہو گئے، اور کہنے لگے ابا ہم صاحب بن گئے ہیں، انھوں نے کہا تم صاحب ہو گئے مولوی نہیں ہو گے، انھوں نے اسی بے تکلفی سے فرمایا، نہیں ہم صاحب نہیں گے، متبسم ہو کر بولے تو پھر ہم تم سے رنج ہو جائینگے، عادل میاں نے فوراً جواب دیا، اچھا تو نہیں بنیں گے، اس پر وہ ہنسنے لگے، اور عادل میاں پینٹ میں ہاتھ دیکر اٹھلاتے ہوئے چلے گئے، اور وہ اس کو محبت بھری نگاہ سے دور تک دیکھتے رہے،

اب اتفاق سے میں تنہا رہ گیا، مجھ سے مخاطب ہوئے، اور بہت ہی سنجیدہ ہو کر کہا عاصم میاں!

میں نے کہا جی!

آپ کو والد صاحب کی خدمت کا موقع نہیں ملا،

میں نے کہا جی نہیں،

پھر فرمایا تمھیں والدہ کی خدمت کا بھی موقع نہیں ملا، میں نے عرض کیا جی نہیں

پھر تھوڑی دیر توقف فرمایا، اور مجھے عجیب نظروں سے دیکھتے رہے، مین ان کا مفہوم مطلق نہ سمجھ سکا، انکی باتون مین عجیب بات نظر آئی، مین اس کو بیان نہین کرسکتا ہون، شاید آنکھیں پرنم تھین، بڑے ہی درد مین ڈوبی ہوئی دھیمی آواز مین فرمایا، لیکن اس مرتبہ تمھیں موقع مل گیا،

مین بلبلا اٹھا، اور بے اختیار زبان سے نکلا "میرے باپ! مین نے تو آپ کی کوئی خدمت نہین کی" وہ صرف مسکرا دیئے، اور مجھے دیکھتے رہے، میرا دل بھر آیا، اور مین وہان سے اٹھکر اپنے کمرہ مین چلا آیا، والد مرحوم کی یاد نے تڑپا دیا، اپنی کم فہمی پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے کہ مین بالکل نہین سمجھا کہ یہ الوداعی فقرے تھے ورنہ قدمون سے آنکھیں ملتا، اور پیر پکڑ کر کہتا کہ مجھے بے سہارا چھوڑ کر نہ جائیے،

کوئی چار بجے کے قریب والدہ سے مخاطب ہوے، اور کہنے لگے کہ آپ عاصم کے ساتھ مطمئن ہین،

وہ کہنے لگین کہ یہ کوئی سوال ہے، ——؟

فرمایا میرے سوال کا جواب دیجیے، فضول باتون مین مت الجھائیے،

والدہ نے ان کے سوال کا جواب دیا، "بے شک"

پھر فرمایا الحمد للہ میرا قلب بھی بہت مطمئن ہے،

والدہ نے میرے پاس آکر اُن کے فقرون کو دہرایا،

مین نے اُن کی تسلی کردی،

لیکن خود اپنا دل کسی نامعلوم خوف سے دھڑکنے لگا،

مجھ پر ایک عجیب اضطراب کی کیفیت تھی، کچھ سمجھ مین نہین آتا تھا، لیکن عجیب سناٹا سا معلوم ہوتا تھا، جیسی اداسی تھی وہ بیان سے باہر ہے، مین اٹھا پھر اُن کے کمرہ مین گیا، دیکھا کہ سلمان وضو کرا رہے ہین، یہ خدمت اُن کی سب سے چھوٹی لڑکی کے لئے مخصوص تھی، ہمیشہ وہی وضو کرایا کرتی تھی، عصر کی نماز پڑھی، اور وہ کھانے کے وقت کی بچی ہوئی کھیر منگا کر نوش کی، پھر سلمان نے پان دیا، ان کا معمول تھا کہ ہر دو کھانے ناشتہ

احمد شام کی چائے کے بعد وہ تھوڑی پان کھاتے تھے، اور اقتدا خان مقتدا خان کا الائچی دانہ تمباکو نوش فرماتے تھے، اس مرتبہ پان کھانے کے بعد وہ مل نہیں رہا تھا، میں نے تلاش کرکے ان کو دیا، جب میں نے تمباکو دیا، تو انھون نے مجھے بڑی عجیب نظر سے دیکھا، اور جب تک کھڑا رہا، دیکھتے رہے، مین ان کا مفہوم کچھ بھی نہین سمجھا، اب سمجھتا ہون کہ شاید وہ حسرت بھری نگاہ تھی، رخصتی کا پیام تھا، فرقت کا پیغام تھا، آہ مجھ کو کیا خبر تھی،

کیا خبر تھی انقلاب آسمان ہو جائیگا　　　باپ کا ملنا نصیب دشمنا[1] ہو جائیگا

ساڑھے پانچ بجے مشتاق جوہری ملنے آئے، وہ بھی چچا جان سے خصوصی محبت کرتے ہین، اُن سے وہ بیان کرتے رہے کہ رات پھر تنفس کا دورہ پڑ گیا تھا، اب اچھا ہون، اس کے بعد مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا، سلمان نے نماز پڑھوائی، بیٹھے بیٹھے نماز ادا کی، جب نماز سے فارغ ہوے تو مسکرائے، سلمان نے پوچھا کیا بات ہے ؟

فرمایا آج مین نے شوکت علی کی نماز پڑھی

سلمان نے پوچھا کیا مطلب ؟

فرمایا وہ اسی صورت سے نماز پڑھتے تھے،

اس کے بعد سلمان نے کہا ابا سو جائیے آپ رات کو بھی نہین سوے ہین، انھون نے فرمایا بہت اچھا، اس کے بعد وہ بستر پر لیٹ گئے، اور روشنی بجھا دی، اسکے بعد سلمان دبے پاؤن آئے، اور اُن کے سر سے ٹوپی اُتارنے لگے، انھون نے پوچھا کون ؟ سلمان نے کہا کوئی نہین، اور پھر وہ سو گئے،

مین نے باہر صحن مین مشتاق صاحب کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھی، نماز کے بعد اسی چٹائی پر مشتاق صاحب سے باتین کرنے لگا، اتنے مین تھوڑی دیر بعد غلام محمد صاحب آئے اب تاریکی کچھ بڑھ چلی تھی، وہ بھی

---

[1] یہ شعر اسی ترمیم کے ساتھ میری اہلیہ کی زبان سے بے ساختہ نکلا، "ہم"

وہیں چٹائی پر بیٹھ گئے، اور خیریت پوچھی، اُن کو حال بتاتا رہا، اتنے میں سلمان نے روشنی جلائی، اور پکارا دیکھئے تو دیکھئے تو، ہم لوگ دوڑ پڑے، دیکھا کہ وہ مٹھی بھینچ رہے ہیں، اور گہری سانس لے رہے ہیں، فوراً ڈاکٹر عبدالصمد صاحب کو ٹیلیفون کیا، انھوں نے فرمایا، ابھی میرے پاس دو بچے ہیں، ہم لوگوں نے سمجھا کہ شاید وہ اس وقت نہ آسکیں گے، میں دوڑا کہ کسی دوسرے کو لاؤں مگر گاڑی باہر گئی ہوئی تھی، پیدل ہی بھاگا، تھوڑی دور جاکر ٹیکسی لی، اور مارٹن ہسپتال کے ڈاکٹر فاروقی کے پاس گیا، معلوم ہوا کہ وہ گھر پر نہیں ہیں، اب وہاں سے پیر الٰہی بخش کالونی گیا، ایک ڈاکٹر صاحب سے حال بیان کیا، انھوں نے کہا یہ تو میرے مطب کا وقت ہے، میں نہیں جاسکتا، پھر پوچھا معالج کون ہیں، میں نے کرنل شاہ اور عبدالصمد کا نام بتایا، وہ کہنے لگے کہ ایسے ایسے ڈاکٹروں کے بعد میں کیا علاج کروں گا، میں نے کہا ڈاکٹر صاحب میں آپ کو علاج کے لئے کہاں کہہ رہا ہوں، میں تو صرف اس لئے آپ کو لیجانا چاہتا ہوں کہ آپ دیکھ کر مجھے یہ بتلا سکیں کہ انکی حالت کیسی ہے، کہنے لگے کوئی بات نہیں نیند آگئی ہوگی، میں نے کہا ازراہ کرم یہی بات وہاں دیکھ کر کہہ دیجئے گا، چنانچہ وہ راضی ہوگئے،

نہ معلوم کیوں یکایک دل کا سارا اضطراب ساری بیقراری، ساری تڑپ، ساری دھڑکن ختم ہوگئی، جیسے سکون ہوگیا، دل نے کہا شاید اب بہتر حالت ہے، شاید اب وہ خطرہ سے باہر ہیں، شاید میں اُن کو دیکھ سکوں گا، اُن سے باتیں کرسکوں گا، ان کی نورانی صورت سے اپنے قلب کو منور کرسکوں گا، اُن کی اس غفلت کی نیند پر اپنی پریشانی کا اظہار کروں گا، وہ مسکرا کر فرمائیں گے آپ کیا سمجھے تھے، میں چل بسا، میں کہوں گا، میں قربان ایسا کیوں ہونے لگا، تھوڑی دیر تک اسی کا چرچا رہے گا، ٹیکسی اپنی پوری رفتار کے ساتھ گھر کی طرف لوٹ رہی تھی، میرے خیالات کی رو اس سے بھی زیادہ تیز تھی،

آہ! جب گھر پہنچا تو کیسی خاموشی تھی، موت کی خاموشی، تاریکی بھیانک تاریکی، دل بیٹھنے لگا، تیز تیز قدم رکھتا ہوا دروازہ پر پہنچا، دیکھا غلام محمد صاحب اور مشتاق صاحب زمین پر پھیلے ہوئے بیٹھے ہیں،

مین نے ان سے لرزتے ہوئے پوچھا "خیریت!" — انھون نے کوئی جواب نہین دیا، صرف گردن ہلا دی، ان کا اترا ہوا چہرہ اور بہتی ہوئی آنکھین سب کچھ بتلا چکی تھین کمرہ کے اندر قدم رکھا، دیکھا کہ اُسی شان سے لیٹے ہوئے ہین، اوپر سے چادر اوڑھا دی گئی ہے، عجیب قیامت کا منظر تھا، گھر کے سارے افراد اس شمع کے چارون طرف پروانون کی طرح کھڑے ہین، سب کی آنکھون سے آنسوؤن کی جھڑی لگی ہے، والدہ، اُف چوڑی ندارد، چہرہ سفید، آنکھین جل تھل لیکن ضبط و صبر کی کوہ پیکر بنی کھڑی ہین، مجھے دیکھتے ہی لپٹ گئین، اور کہا بیٹا ضبط و صبر کا مقام ہے، مین نے کہا اماّن مین ڈاکٹر کو لاتا ہون۔

ہان میرے لال تم ڈاکٹر کو لاتے ہو لیکن وہ ڈاکٹر سے بے نیاز ہو چکے،

میرا سر چکرا گیا، معلوم ہوا جیسے دل کی دھڑکن بند ہو جائے گی، حلق خشک ہو گیا، والدہ نے مجھے اپنے کلیجہ سے لگا لیا، اور میرا سر اپنے شانے پر رکھ لیا، وہ میری پیٹھ پر تھپکی دیتی رہین اور زبان سے یہی کہتی رہین، صبر بیٹا صبر، شمیمہ کو پکار کر مفرح منگوایا، اور مجھے دیا، پھر پانی پیتا رہا، ایک بیک کچھ خیال آیا، مین ہوش مین آ گیا، ڈاکٹر صاحب باہر کھڑے تھے، اُن کو دکھلا دون، شاید ان لوگون کا خیال غلط ہو، بس مین تیر کی طرح باہر گیا، اور ڈاکٹر کو لے آیا، والدہ کہتی رہین کہ ابھی ڈاکٹر عبد الصمد آ چکے ہین، اور اعلان کر چکے لیکن دل نہین مانا، ڈاکٹر صاحب نے دیکھا اُف! کتنا شاہانہ سکوت، کتنی پر وقار نیند تھی، ابدی نیند، ہائے انھون نے بھی دوسرا فیصلہ نہین سنایا، ان کو رخصت کیا ہی تھا کہ سلمان ڈاکٹر رحمان کو لیکر آئے اور آتے ہی چادر الٹ دی — اور اُن کی داڑھی چھو کر بے تابانہ پکارنے لگا، ابا — ابا — میرے ابا — بولئے!

ڈاکٹر رحمان نے بھی دیکھا اور کھڑے ہو گئے، سلمان کے سر پہ ہاتھ پھیرا، اور کہا، صبر کرو صبر، اور رخصت ہو گئے،

مجھ پہ اب سکتہ کا سا عالم تھا، کچھ سمجھ مین نہین آتا تھا کہ کیا ہوا، اور کیا ہو رہا ہے، مین بُت بنا کھڑا تھا، سلمان بہت بے قرار ہو رہا تھا، والدہ سلمان کو پکڑ کر لائین، اور مجھ سے لپٹا دیا، مین نے اس کو سینہ سے چپٹا لیا،

میرے پاس الفاظ نہین تھے جس سے مین اُن کو تسکین دیتا، شاید دل کی بات دل تک پہنچ رہی ہو،

مین سلمان سے علٰحدہ ہوا اور صوفہ پر گر پڑا، والدہ نے مجھے پھر مفرح دیا، اور کہا بیٹا تم اپنے آپ کو سنبھالو دل کو مضبوط کرو، تم پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے، سب کام تم ہی کو انجام دینا ہے،

اب مین نے دل کی قوت کو مجتمع کرنا شروع کیا، مجھے ہوش آچکا تھا، اتنے مین ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

ـــ ریڈیو پاکستان کا ٹیلیفون تھا، انھون نے پوچھا کہ ہم نے بہت ہی افسوسناک خبر سنی، کیا وہ سچ ہے،

ہاں! آپ نے جو کچھ سنا سب سچ ہے،

سب بچیان، سلمان، ــ والدہ پلنگ کے چارون طرف کلام پاک لے کر بیٹھ گئے، اور تلاوت شروع کردی، ریڈیو سے اعلان کے فوراً ہی بعد لوگون کا تانتا شروع ہوگیا،

زہرہ آپا، مولانا محمد علی کی صاحبزادی، شوکت علی کی بہو، زاہد علی صاحب کی بیگم، روتی ہوئی آئین اور کہنے لگین، لله میرے چچا کو مجھے دکھا دو، پھر بیگم وسیم، گلنار آپا، (بیگم شعیب قریشی) تشریف لائین،

باہر لوگون نے تجہیز و تکفین کے متعلق سوالات شروع کردیئے، ان مسائل پر آہ مین نے کب سوچا تھا، کچھ سمجھ مین نہین آتا تھا، اتنے مین شعیب قریشی کے داماد ڈاکٹر عابد نے کہا، آپ متردد نہ ہون، جہان ماموں یعنی عبدالرحمٰن صدیقی کا مزار ہے، وہین انتظام کرلین گے مجھے کچھ تجربہ ہے، اور لوگون کی رائے ہوئی، کہ جہان مولانا شبیر احمد صاحب صاحب مدفون ہین وہان انتظام کیا جائے، اس لیے سب سے پہلے مین نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو ٹیلیفون کیا، اور اس جگہ دفن کرنے کی اجازت مانگی انھون نے کہا مجھے یہ بھی معلوم نہین ہے کہ مولانا عثمانی کہان مدفون ہین، مین نے اُن کو بتایا کہ میونسپلٹی کی زمین ہے اور آپ اجازت دے سکتے ہین، میرے دماغ مین تھا کہ نقوی صاحب چیف کمشنر کی وہ قائمقامی کررہے ہین، انھون نے کہا آپ ان لوگون سے ملئے جنھون نے مولانا عثمانی کی تدفین کا انتظام کیا تھا،

مجھے فوراً مولانا عبدالقدوس بہاری کا خیال آیا، چنانچہ ان کو ٹیلیفون کیا، ان کو کوئی پتہ نہین تھا،

بیچارے ڈاکٹر عابد نے کہا کہ میرے ساتھ چلیے، مین انھی کے موٹر پر مولینا عبدالقدوس بہاری اور دوسرے لوگون کے یہان سے ناکام ہوکر شعیب صاحب کے مکان پر پہنچا، اور وہان سے ٹیلیفون کے ذریعہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے مکان کا پتہ چلایا، اور اُن کی تلاش مین نکلا، کچھ دیر تک بھٹکتا رہا، بالآخر یہ معلوم ہوا کہ کلکٹر صاحب نے میونسپل کمشنر مسٹر ہورانڈ سے اجازت مانگی، انھون نے فرمایا کہ میرا ارادہ اس زمین کو قبرستان بنانے کا نہین، اس لئے نہین مل سکتی،

اب مین اور عابد سیدھے اس قبرستان پہنچے، جہان عبدالرحمن صدیقی سوئے ہوئے ہین، اور انھی کے قریب مسجد کے دامن مین قبر کھودنے کا حکم دے کر گھر لوٹے، یہان معلوم ہوا کہ مولانا تمیز الدین خان نے نقوی صاحب چیف کمشنر کو ٹیلیفون کیا تھا، انھون نے وعدہ کیا ہے کہ انشاء اللہ صبح تک انتظام ہوجائے گا، اس کے بعد طے پایا کہ کل ساڑھے آٹھ بجے اس عاشقِ رسول کا جنازہ اُٹھے گا، دس بجے کے قریب شعیب صاحب کا اندرونِ سندھ سے ٹیلیفون پہنچا، کہ مین نماز جنازہ مین شرکت کی غرض سے صبح آؤنگا، لیکن راستہ مین اُن کی گاڑی خراب ہوگئی، اس لئے نماز جنازہ مین شریک نہ ہوسکے،

اب اخبارات اور خبر رسان ایجنسیون کے مسلسل ٹیلیفون آنے شروع ہوئے، کہین سے جنازہ کے متعلق استفسار، کہین تدفین کے متعلق، بعض اُن کے سوانحِ حیات جاننے اور چھاپنے کے لیے بے چین، اور اس پر لوگون کا ہجوم، بس قیامتِ صغریٰ کا منظر تھا، اپنی بے بسی اور بیچارگی کو کیا کہون کہ اتنی بھی فرصت نہین ملتی تھی کہ کہین چھپ کر رو ہی لون، دوڑتے دوڑتے پیر جواب دے چکے تھے، ایک بجے تک لوگ جمع رہے،

رات بھر دعاؤن اور قرآن خوانی، اگر، عود، اور لوبان نے کیسا سمان کھینچا تھا، اس کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جس کے گھر کا سب سے بیش قیمت سرمایہ اس کی آنکھون کے سامنے اس سے چھن گیا ہو، جب کبھی فرصت ملتی، مین اُن کے قریب جاتا، اور اُن کی پیشانی کو بوسہ دیتا، اُن کے جسم کو غور سے دیکھتا، کیا کہون یقین کرنے کو دل ہی نہین چاہتا تھا، بس یہی خیال ہوتا اب اٹھیں گے، اب بولین گے، اب غنا

کی نماز کے لئے پکارین گے، اب وضو کے لئے بلائین گے، رات ڈھلتی جا رہی تھی، سناٹا بڑھتا ہی جا رہا تھا، اب ان کے تہجد کا وقت آگیا، لیکن وہ تہجد مین ناغہ کرین گے، انھون نے تہجد کبھی ناغہ نہین کی ہے، اب وقت پر تہجد کی نماز کے لئے گھنٹی بجے گی، اب اُن کے جسم کو حرکت ہوگی، لیکن آہ کچھ بھی نہین ہوا،

اُف صبح ہوگئی، رخصت کی صبح، دائمی فرقت کی صبح، وداع کی صبح، آہ وہ صبح جس مین کوئی پیغام حیات نہین، بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری فضا نے کفن اوڑھ لیا ہے،

اُلا! ہم اس جسمِ اطہر کو اٹھا کر بیچ کے کمرے مین لائے، قینچی سے کاٹ کاٹ کر سارے کپڑے علٰحدہ کئے، بے اختیار جی یہی چاہتا تھا، کہ بس لپٹ جاؤن اور کہون،

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملین گے    کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اَور

سب لوگون نے مل کر تخت پر لٹایا، آہ سارا جسم کتنا نرم تھا، جس طرف موڑا جاتا تھا، مڑ جاتا تھا، چہرے پر وہی سنجیدگی، وہی وقار، وہی متانت، وہی تبسم، اب تک جو تھا، مین نے پھر پیشانی کو چوم لیا، ڈاکٹر عبدالغنی صاحب نے شہادت کی انگلی چوم لی، اور لرزتی ہوئی آواز مین کہا کتنی مبارک ہین یہ انگلیان، جو سرور کائنات کی سیرت نگاری مین زندگی بھر مصروف رہین، اندر، میں ــــ اور ــــ شمون ماموں پانی ڈال رہے تھے، صوفی جی کپڑے سے طہارت کر رہے تھے، ڈاکٹر بتا رہے تھے، سلمان بُت بنا کھڑا تھا، کبھی پانی ڈالتا، اور کبھی قریب آکر غور سے دیکھتا رہتا،

آخر آٹھ بجے رخصت کا لباس پہنایا گیا، داڑھی مین عطر لگایا گیا، کافور چھڑکا گیا۔ اور پلنگ پر لٹا دیا گیا،

دوسرے کمرے مین سفیر مصر، سفیر حجاز، ڈاکٹر محمود حسین، سابق وزیر تعلیم، اور بہت سے لوگ تھے، وہ بلائے گئے، انھون نے آخری زیارت کی، اور پھر کمرہ بند کر دیا گیا، اور عورتون کو بلا لیا گیا،

باہر ہر طرف کمپونڈ مین ہزارون کی تعداد مین لوگ جمع تھے۔ ہر طرف دری بچھا دی گئی تھی، سب

کلام پاک بیٹے قرآن خوانی میں مصروف تھے،

ساڑھے آٹھ بجے گھر سے جنازہ نکلا، ٹرک پر رکھا گیا، دو بڑے بڑے بانس دونوں طرف لگا دیئے گئے، تاکہ ہزاروں آدمی کاندھا دے سکیں، لوگوں نے پھول سے اُسے ڈھک دیا، اُس کے بعد جنازہ ایک جلوس کی شکل میں گھر سے رخصت ہوا، سفیر مصر نے کہا کہ آپ مسجد میں نماز کے لئے چلے جائیں لیکن انھوں نے کہا مجھے اس سعادت سے کیوں محروم کرنا چاہتے ہیں، ہر شخص کاندھا دینے میں ایک دوسرے سے سبقت کرنا چاہتا تھا،

اللہ! ان کے جنازہ کا منظر بھولتا ہی نہیں، امیر غریب، فقیر، سفیر، سب اس طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے، جیسے اُن کا باپ اُن کا بھائی، اُن کا سب کچھ آج رخصت ہو رہا ہے جس راستہ سے یہ جلوس گذرتا تھا، مکان کی چھتوں پر سے عورتوں کی آہ و بکا کی آوازیں آتی تھیں، ممالکِ اسلامیہ کی سفراء آگے بڑھ کر کاندھا دے رہے تھے، اُن کی آنکھیں نمناک اور لب کانپ رہے تھے، جیسے اُن کا عزیز ترین محبوب اُن سے چھن گیا ہو، یوں تو اُن کی محبوبیت کے بہت سے واقعات دیکھے لیکن اس دن اندازہ ہوا کہ ہر خاص و عام کے قلوب میں ان کی کتنی جگہ تھی،

سفیر حجاز خطیب صاحب جنازہ کے آگے ایک طرف مجھے اور دوسری طرف سلمان کو اپنی طرف لئے ہوئے تھے،

پوری سڑک طے کرنے کے بعد ٹیوٹاؤن مسجد جہاں ایک مرتبہ انھوں نے بقرعید کی نماز پڑھائی تھی اور ایک دو جمعہ بھی پڑھائے تھے، وہ ابھی زیرِ تعمیر مسجد ہے، اس کی تعمیر کا سامان پھیلا ہوا تھا، اس کے وسیع احاطہ میں مسجد کے محرابی در کے سامنے جنازہ رکھا گیا، اور ڈاکٹر عبدالحی صاحب نے نماز پڑھائی،

اللہ! افسوس کسی کا گھر لُٹ گیا، اور کوئی اپنی شہرت کے لئے اس کو بھی وسیلہ بنانا چاہتا تھا، اسی لئے ڈاکٹر صاحب کا انتخاب کیا گیا، ان سے خلوص و موانست تھی، نماز کے بعد زیارت کے لئے لوگوں کا اصرار ہوا، اتنی کثیر لوگوں کا ہجوم ہوا، پھر زائرین اور مشتاقین کی ایک قطار بنا دی گئی، جو یکے بعد دیگرے سامنے سے آتے، چہرۂ انور کو

ایک نظر دیکھ کر گذر جاتے تھے، ہر شخص آتا اور ایک نظر دیکھتا، یا پھر شاید دیکھ بھی نہیں پاتا، اور صرف محبت اور عقیدت کے آنسوؤں کی بارگاہ میں پیش کر کے چلا جاتا، ایک انجینئر صاحب چیخ چیخ کر پکار رہے تھے زیارت کرتے جائیے آگے چلتے جائیے،

قطار کسی صورت سے ختم ہی نہیں ہو پاتی تھی، اُن کا چہرۂ انور نور سے معمور تھا، ایک طرف آفتاب کی روشنی اُن پر ——— پڑ رہی تھی دوسری طرف خود اس آفتاب کی تابانی لوگوں کی نگاہوں کو خیرہ کئے ہوئے تھی کتنا شاہشکوہ کتنا درویشانہ جلال، اور کتنا روحانی وقار تھا، سلمان اور میں اُن کے سرہانے کھڑا اس منظر کو دیکھ رہا تھا، دھوپ سے بچانے کے لئے چادر کا ایک کونہ پکڑے ہوئے تھا، تین طرف سے اور لوگ گھیرے ہوئے تھے، اس منظر کو دیکھ کر کلیجہ پھٹ رہا تھا، خیالات وجذبات کا سیلاب امنڈتا آرہا تھا، آنسو تھے کہ تھمتے نہ تھے کلیجہ تھا کہ پھٹا جاتا تھا لیکن نگاہیں تھیں، کہ اُن کے چہرۂ انور پر مرکوز تھیں کہ

جی بھر کے دیکھ لیں یہ جمال جہاں فروز پھر یہ جمال نور تو دیکھا نہ جائیگا

کبھی جی چاہتا کہ چیخ چیخ کر روؤں اور سینوں کے بند شکووں کے در کھول دوں،

اے عم محترم! آج کیوں نہیں بولتے، دیکھئے آج کتنے آپکے مشتاقان دید جمع ہیں، آپنے کسی کو کبھی مایوس نہیں لوٹایا، آپنے نصیحت سننے کے لئے لامتناہی سلسلہ کلمہ گویوں کا ٹوٹا پڑ رہا ہے، یہ تو وہی ہیں جن کے لئے آپنے اپنے چین کو چین نہیں سمجھا، اپنی راحت کو راحت نہیں سمجھا، یہ کسی غرض سے نہیں آئے ہیں یہ آپ سے محبت اور خلوص سے ملنے آئے ہیں، انجینئر صاحب کی آواز کانوں میں ہتھوڑے کی طرح سے پڑ رہی تھی،

حکیم صاحب وائس چانسلر آئے آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں، اور وہ گذر گئے، سابق وزیر یوسف ہارون، سابق وزیروں میں سے سب وزیر اعظم ان دنوں پنجاب میں علیل تھے، اُن کا نمائندہ اور گورنر جنرل کا نمائندہ شریک تھا، خواجہ ناظم الدین باہر تھے،

یہاں سے جنازہ اٹھا اور کئی فرلانگ کی مسافت طے کر کے اٹھارہ ہزار مربع گز زمین کا وہ وسیع رقبہ

جس کے ایک طرف مولانا شبیر احمد کا مزار ہے، وہاں پہنچا اُن کے مزار کے سامنے رکھا گیا۔ اور چونکہ اجازت ملنے مین دیر ہوئی، اس لئے ابھی تک قبر تیار نہ تھی، مولانا عثمانی کے مزار پر جھکیرہ فون لگا دیا گیا تھا، شام کو

ابوالخیر صاحب نے ایسی تقریر کی جس نے سب کو رُلا دیا،

اُن کی تقریر جذبات و خیالات اور معلومات سے لبریز تھی، آخری فقرہ تو ہمیشہ یاد رہیگا، انھون نے کہا

"اے سلیمان! تمھارے جانے کا اتنا غم نہین ہے جتنا اس گنجینۂ علم کا صدمہ جو تمھارے ساتھ دفن ہو رہا ہے"

اس کے بعد قبر تیار ہوئی،

قبر کے اندر ایک طرف غلام محمد صاحب دوسری طرف مین، اور میرے ساتھ صلاح الدین احمد صاحب

ندوی اُترے سلمان اوپر والے حصہ مین کھڑے تھے،

آہ اس کے بعد مین نے اپنے ہاتھون سے اپنے سب سے قیمتی سرمایہ کو زمین پر لٹایا، آہ جس کی نفاست طبع

شکن بستر بھی گلی محسوس کرتی تھی آج وہ مٹی کی خوابگاہ مین سو رہا ہے،

چہرہ کھول دیا گیا پھر ڈھک دیا گیا،

میرے بڑے ابا حکیم سید ابو حبیب صاحب کا نواسہ مصطفیٰ بتیابانہ چیخا،

ارے میرے چھوٹے نانا کو ایک مرتبہ اور دکھلا دو،

جس کو سردی سے گرمی سے ہوا سے لُو سے ہمیشہ بچایا جاتا تھا، وہ آج منون مٹی کے اندر چھپا دیا گیا،

میرے لئے ہر طرف تاریکی،

ہر طرف اندھیرا،

ہر طرف سناٹا تھا،

اللہ بس باقی ہوس

ٹھہرے گا دل، تھمین گے اشک آہ! مگر، ابھی نہین،

# ہند و پاکستان میں ماتم

"ہندوستان و پاکستان میں اس حادثہ پر جس قدر ماتم کیا گیا، ان دونوں ملکوں کے اکابر نے جو بیانات دیئے، اور اخبارات و رسائل نے جس قدر لکھا، ان سب کی تفصیل کی گنجائش نہیں، نمونۃً چند بیانات اور تحریروں کے مختصر اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں"۔ "م"

## بیانات

عبدالوہاب عزام سفیر مصر:

"علامہ ندوی جیسے اہل علم کی موت سے نہ صرف پاکستان بلکہ پورے عالم اسلام کو نقصان پہنچا ہے۔ وہ قاہرہ کی عرب اکیڈمی کے ممبر بھی تھے، جہاں وہ عربی کے ایک بہت بڑے عالم کی حیثیت سے بڑی وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے"۔......"

شیخ ابوالخیر سفیر شام:

"ہم کو علامہ سید سلیمان ندوی کی موت سے دکھ ضرور ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ اس کا دکھ ہے کہ جو علوم و فنون ان کے سینے میں تھے، وہ بھی اُن کے ساتھ دفن ہو گئے"۔......"

گورنر جنرل پاکستان:

"... مولانا سید سلیمان ندوی کے پایہ کا عالم صرف پاکستان ہی میں نہیں بلکہ تمام عالم اسلام میں بھی کوئی نہ تھا۔"

خواجہ شہاب الدین گورنر سرحد:

".... علم و فضل کے لحاظ سے تمام عالم اسلام میں اُن کا پایہ بلند تھا، اُن کے انتقال سے عالم اسلام کو

زبردست نقصان پہنچا ہے، مجھکو بھی ذاتی نقصان ہوا، کیونکہ مین نے اُن سے بہت سے فیوض حاصل کئے؛"

سردار عبدالرشید، وزیر اعلیٰ سرحد :

..... ابھی پاکستان کو مولانا جیسے علم وکردار کے آدمیون کی سخت ضرورت تھی،

سردار عبدالرب نشتر :

....."انھون نے اسلامی تاریخ کی تدوین مین جو گران قدر خدمات انجام دی ہین، انھین تاابد قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا"۔

مس فاطمہ جناح :

"سید سلیمان ندوی کی وفات سے قوم ایسے جید اور فاضل عالم سے محروم ہو گئی ہے جس نے اپنی تمام زندگی اسلام کا پرچم بلند کرنے کے لئے وقف کر رکھی تھی؛"

ابو صالح محمد اکرام : چیف جسٹس پاکستان وصدر قانون کمیشن :

..... مولانا ندوی قانون کمیشن کے رکن تھے، حکومت پاکستان نے یہ کمیشن ملک کی عدالتون مین اسلامی قانون جاری کرنے کے سلسلہ مین مقرر کیا تھا، اُن کی موت نے ہمین جو نقصان پہنچایا ہے اسکی تلافی ناممکن ہے"

چودھری خلیق الزمان :

..... وہ نہ صرف ایک ممتاز عالم، بلند پایہ مورخ اور زبردست اہل قلم تھے، بلکہ دلاویز شخصیت کے بھی حامل تھے، بڑی میٹھی گفتگو کرتے تھے، خلافت اور دوسری اسلامی تحریکون مین انھون نے جو حصہ لیا، وہ فراموش نہین کیا جاسکتا، یہ جب تک سیرۃ النبی زندہ ہے، وہ بھی زندہ رہین گے،

مولانا قطب میان مرحوم فرنگی محل لکھنؤ :

"مولانا مرحوم کے ان روابط کے پیش نظر جو ہمیشہ سے ہمارے خاندان کے ساتھ قائم ہے مجھکو یہ سانحہ اپنے گھر کا سانحہ نظر آرہا ہے"

مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی :

وہ نہ صرف علم و فضل بلکہ زہد و تقویٰ میں بھی ممتاز درجہ کے مالک تھے،

مولانا محمد سعید مجتہد :

.... علامہ کے انتقال نے سب سے زیادہ نقصان ہندوپاکستان میں عربی ادب کو پہنچایا ہے، موصوف عربی ادب میں بھی ایک ممتاز مقام رکھتے تھے، ہندی الاصل ہونے کے باوجود قدیم اور عصری عربی ادب کے ماہر تھے، اُن کے عربی مضامین کو نام ہٹا کر دیکھا جاتا تو یہ امتیاز کرنا مشکل تھا کہ یہ مقالہ کسی عرب کا ہے یا ہندوستانی کا،

ڈاکٹر عبدالعلی، ناظم ندوۃ العلماء لکھنو

..... تقریباً تیس سال موصوف کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا، یہ مدت جتنی ہی بڑھتی گئی، اتنی ہی موصوف کی قدر میرے دل میں بڑھتی گئی، میں نے ذاتی تعلقات میں انھیں شفیق بھائی پایا، تو ندوۃ العلماء کے کاموں میں اُن کی رائیں رضائے الٰہی کی طلب پر مبنی پائیں، اگر اختلاف رائے کی کبھی نوبت آئی تو میں نے انھیں ایک شریف اور کریم انسان پایا، اور جلد وہ اختلاف اشتراک عمل میں تبدیل ہو گیا،

مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی

مرحوم مشرقی اور اسلامی لٹریچر کے ایک مقبول ترین اور تسلیم شدہ عالم تھے، اور اس کے لئے انھوں نے عظیم ترین خدمات سرانجام دی تھیں، جد و جہد آزادی کے دوران میں قوم پرستانہ نظریات اور خیالات کے دل و جان سے حامی تھے،

مفتی عتیق الرحمان ندوۃ المصنفین دہلی،

"..... آہ! کسے خبر تھی کہ عالم اسلام کا یہ گوہر شب چراغ اس قدر جلد ہم سے جدا ہو جائے گا....."

علمائے میرٹھ کی تعزیت :

"آج کے پرآشوب دور میں اسلامی تاریخ، اسلامی علوم و فنون اور مآثر اسلامی کو فلسفۂ جدیدہ کی روشنی میں جس حُسن و خوبی کے ساتھ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے مرتب کیا، اور تاریخ اسلامیہ کے بہت سے اہم پہلو فلسفۂ تاریخ کی روشنی میں مدوّن کئے، بالخصوص سیرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تالیف و تصنیف، یہ آپ کی زندگی کی زندہ جاوید یادگار اور صفحۂ زمین کے بسنے والے انسانوں کے لئے ہدایت و تعلیم کا ایک سرچشمہ ہے، اور امتِ مسلمہ بجا طور پر اس مورخِ اسلام کے علمی کارناموں پر ہمیشہ فخر کرے گی،

## اخبارات میں ماتم

جنگ کراچی، مورخہ ۲۶ نومبر ۱۹۵۳ء

"برصغیر بھارت و پاکستان کے عظیم ترین عالم محقق، مورخ، ادیب اور مفکر حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کی وفات ایک پورے عہد کی موت اور ایک پورے دور کا اختتام ہے، یہ عہد مسلمانوں کی علمی تحقیقی خدمات کا دور تھا، جس نے اس برصغیر میں اسلامی نشو و ارتقاء اور ملی تفکر و تجسس کی نئی اساسیں استوار کیں، اور برصغیر میں حضارتِ اسلامیہ کی بنیادیں رکھیں،

بصیرت لاہور مورخہ ۲۷ نومبر ۵۳ء :-

عہد حاضر کے فرزندانِ اسلام جن ممتاز اور نامور ہستیوں اور رہبروں پر بجا طور پر ناز کرسکتے ہیں ان میں سے ایک حضرت علامہ سید سلیمان ندوی ہیں....."

نوائے وقت لاہور، ۳۰ نومبر ۵۳ء :

اسلامی علوم و فنون کی تحقیق و تصنیف کا جو پودا حضرت مولانا شبلی نعمانی نے لگایا تھا اس کی آبیاری میں سید سلیمان ندوی نے جس کاوش اور جانفشانی سے حصہ لیا، اہلِ علم و فضل ہمیشہ اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے رہیں گے، شاید ہی کوئی مسلمان گھرانا ہوگا جس میں سیرت نبوی، سیرت عائشہ، رحمت عالم

وغیرہ موجود نہ ہوں، یہ بلند پایہ تصنیفات اُن کے لئے لازوال خراجِ تحسین کی حیثیت رکھتی ہیں، .....''

ڈان (اداریہ) کراچی :-

..... وہ نہ ایک ممتاز مصنف اور مشہور اہلِ علم تھے، بلکہ اُن کی ایک یادگار دار المصنفین کے بانی کی حیثیت سے ایک مدت مدید تک رہیگی، یہ وہی ادارہ ہے جہاں سے علم کی شعاعیں برابر پھیلتی رہی ہیں، جو علوم کا خزانہ اور صبر آزما علمی تحقیق و تدقیق کا بڑا مرکز رہا ہے، اور جس نے ایک عہد کے علمی ضمیر کو بنانے اور ترقی دینے میں گہرا اثر ڈالا ہے،

..... علامہ موصوف کی زندگی کا مشن قرآن و سنت کی تعلیم کو خاطر خواہ طریقہ پر پیش کرنا تھا، ..... ہر شخص اُن کو محبت کی نظر دن سے دیکھتا تھا، اس لئے اُن کی رحلت سے ہر شخص کو ذاتی نقصان پہنچا ہے،

ڈان (میگزین سیکشن) کراچی،

''..... اُن کی موت سے ایک ایسی دل آویز شخصیت، ایک ایسا متبحر اہلِ علم، ایک ایسا زبردست اہلِ قلم، ایک ایسا غیر جانب دار مورخ اور ایک ایسا عالم باعمل ہم میں سے اُٹھ گیا، جو صدیوں کے بعد پیدا ہوا کرتا ہے،

حمایت اسلام لاہور، ۱۱ر دسمبر ۵۳ء

..... اُن کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ نہ صرف زمانہ حاضر کے اسلوبِ فکر سے واقف تھے، بلکہ فکر کی پوری تاریخ اُن کے سامنے تھی، اور وہ اس حقیقت سے پوری طرح باخبر تھے، کہ فکر و عمل کے اسلوب ہر زمانہ میں بدلتے رہتے ہیں، ..... انھوں نے تعلیماتِ اسلامیہ بورڈ کے صدر کی حیثیت سے پاکستان کے دستور کے متعلق علما اور جدید پود کی جو رہنمائی فرمائی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم افراط و تفریط سے بچ گئے .....

الجمعیۃ دہلی، مورخہ ۲۶ر نومبر ۱۹۵۳ء

''..... آپ بیک وقت ادیب بھی تھے، اور شاعر بھی، مورخ بھی تھے، اور سوانح نگار بھی، فلسفی بھی تھے، اور متکلم، مفسر بھی تھے، اور فقیہ بھی، سیرۃ النبی اور دوسری بلند پایہ تصانیف سے جو شہرت

اور مقبولیت آپ نے حاصل کی، وہ بہت کم لوگوں کو ملا کرتی ہے، ......... افسوس ہے کہ آج ہم سے وہ ہستی جدا ہو گئی، جو پروفیسر مارگولیتھ کی تاریخ کا جواب دیا کرتی تھی، اور جس کی تحقیقات کا لوہا انسائیکلوپیڈیا آف اسلام اور انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کے مصنفین کو بھی ماننا پڑا۔ ......... افسوس آج ہم سے ایک ایسا عالمِ دین، مفسر، مؤرخ، ادیب اور اڈیٹر جدا ہو گیا، جو عصری رجحانات اور نفسیات کا ماہر اور عقلی ترقی کے نئے تقاضوں کا شناسا تھا، ......"

مدینہ بجنور مورخہ ۲۸ر نومبر ۵۳ء،

"۲۲ر نومبر کی شام کو کراچی میں مولانا سید سلیمان ندوی اللہ کو پیارے ہو گئے، وہ آفتابِ علم و حکمت گہن میں آ گیا جس کی شعاعوں نے ہندوستان اور پاکستان کی علمی مجلسوں، ادبی محفلوں، اور دینی انجمنوں کو اپنی آب و تاب سے بقعۂ نور بنا رکھا تھا، ......... رسالہ معارف کے صفحات ایک مدت سے جس راہِ فکر اور جس روشن خیالی کی دعوت دے رہے ہیں، یہ مولانا مرحوم ہی کے فیضانِ نظر کا اثر اور ان ہی کے مافی الضمیر کا عکس ہے، معارف سے قبل رسائل میں مضامین کا انداز محققانہ نہیں ہوتا تھا، سطحی موضوعات پر ہمارے ادبا، جو کچھ قلم برداشتہ لکھ دیتے تھے، اسے بہزار تشکر و امتنان زیبِ قرطاس کر دیا جاتا تھا، لیکن معارف نے اسلوبِ نگارش کی پرانی قدریں کچھ اس انداز سے بدلیں کہ سطحی نگارشات کی کوئی وقعت ہی باقی نہ رہی، مولانا کے اس تجدیدی کارنامے کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، اگر ہم انھیں دنیائے ادب کا ایک مصلح یا ایک مجدد کہہ دیں تو یہ خطاب اس عظیم الشان شخصیت کو زیب دیتا ہے، ....."

سیاست کانپور:

"..... معارف میں علامہ مرحوم کے شذرات ملک بھر میں شہرت رکھتے تھے، یہی حال اُن کے قلم سے نکلنے والی تنقیدات کا تھا، گذشتہ چند سال سے وفیات کے عنوان سے وفات پانے والے معاصرین کے حالات لکھنے لگے تھے، یہ مضامین اپنے رنگ میں بہت خوب نہایت درجہ موثر، اور مرحوم کی زندگی

کی تصویر کشی مین کامل ہوتے تھے، ......"

حق، لکھنؤ :

"............ یہ عظیم المرتبت ہستی ...... اپنی نیکی، اپنے علم، اپنے اخلاق، اپنی خدا ترسی اور اپنے تقوای و طہارت کے باعث زمانہ قدیم کے ان بزرگون اور پایہ کے نمونہ کی تھی جن کے زرین نقوش آج بھی زمانہ کی ریگ پر نظر آرہے ہین، جو بھولے بھٹکے مسافرون اور گم کردہ راہ رفیقون کو صراطِ مستقیم بتاتے ہین ......"

تنا کر مدراس :-

"حضرت علامہ سید سلیمان ندوی کی اچانک وفات سے علم و فضل کی ایک ایسی کرسی خالی ہوگئی جس کا پر کرنے والا اس وقت ساری دنیاے اسلام مین کوئی نظر نہین آتا،

انقلاب بمبئی مر دسمبر ۵۳ء

..... سید صاحب شروع سے نیک طبیعت اور شریف النفس انسان تھے، ان کی نیک فطرت ماحول پر غالب رہی، یہی وجہ ہے کہ انھون نے علم و تحقیق کی راہ مین ہمیشہ صراطِ مستقیم ہی کو پسند کیا،...."

جمعیتہ العلماے اسلام پاکستان کی تعزیتی قرارداد :-

"............ استاذ الاساتذہ بطل الاسلام علامۂ اجل حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات موجودہ حال و ماحول کے لئے سانحۂ عظیم اور مملکتِ اسلامیہ کے لئے ناقابلِ تلافی نقصان ہے ............ ان کی رحلت سے پورے عالم اسلام بلکہ عصر حاضر کی تمام علمی و تعلیمی و فکری و اجتہادی حلقہ جات و مجالس کی تابناکیان کم ہوگئین، ......... وہ اس دور مین علوم اسلامی کی عزت و آبرو تھے، معیار علم و عمل تھے، اور دینی و ملی تحریکات و دوائر کے اعتبار سے اس منصب پر فائز تھے، جو خالی ہونے کے بعد مدیات والوف سنین مین بمشکل پُر ہو سکتا ہے،

انجمن ترقی اردو پاکستان :

.......مرحوم اردو زبان کے نامی انشار پرداز اور ادیب تھے، اپنی متعدد تصانیف اور مجلہ معارف کے ذریعہ اردو زبان اور ادب کی جو گران قدر خدمات انجام دی ہیں، وہ ناقابل فراموش ہیں"،

نقیب امارتِ شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ، :

"حضرت علامہ سید سلیمان ندوی کا حادثۂ انتقال دنیائے اسلام کے لئے عظیم ترین حادثہ ہے"

# قطعات اور تاریخی مادے

از

جناب قاضی معراج الدین صاحب ڈھولپوری

آہ مرد پاک باطن سید سلیمان ندوی جانشین مولانا شبلی علیہ الرحمہ

۵۳ ۱۹ء

باسم اللہ الرافع الدرجات عزاسمہ

۷۳ ھ ۱۳ھ

ھو الغفور الوھاب

۷۳ ھ ۱۳

تاریخ رحلت بلند پایہ

۵۳ ء ۱۹

آہ مرد حکیم سخن سید سلیمان ندوی

۷۳ ھ ۱۳

فاضل بلیغ

۵۳ ء ۱۹

مرد میدان تحقیق مؤرخ فلک اوج

۵۳ ء ۱۹

غریق حقائق و معارف آگاہ

۵۳ ء ۱۹

جانشین خاص، جادو کلک مولانا شبلی مرحوم؛

۵۳ ء ۱۹

مغز سلوک معرفت

۵۳ ء ۱۹

اے باادب واحسرتا واحسرتا

۷۳ ھ ۱۳

بہشت منزل ہے خوش اقبال باد

۵۳ ء ۱۹

آج دانا ادب متقدمین کی یادگار زندہ نہیں رہی

۷۳ ھ ۱۳

(۱)
آہ آن سید سلیمان ذی حشم — پاک صورت پاک باطن پاک دین
سن بہ ہجری رحلتش معراج گفت — رونق ہنگامہ خلد برین

(۲)
خیر باد اکہہ گئے دنیا کو آج — تھے سلیمان سید عالی نشان
۷۳ ۱۳ھ
عیسوی میں کہہ دل معراج سال — عازم خلد برین فخر جہان
۵۳ ء ۱۹ء

(۳)
ازین دہر فانی بدار بقا رفت — چو سید سلیمان بزرگ و فہیم
بہجری بیاورد معراج سال — مہ ملک اجلال باغ نعیم
۷۳ ۱۳ھ

(۴)
وہ سید سلیمان وذی اقتدار — گئے آج دنیا سے سوے عدم
سن عیسوی میں ہو معراج سال — بہار تمنائے باغ ارم
۵۳ ۱۹ء

(۵)
فضائے جہان را نمودی الم دیدہ رنج ماتم
بشد زین سرائے خیالی، ادیب راچو مغموم کوی
منظم تاریخ ہجری، حزین قلب معراج گفتا
محب ولستان جنت، محمد سلیمان ندوی
۷۳ ھ ۱۳ھ

(۶)
تلاطم سا اٹھا جہان میں، ہوا عالم حشر برپا
ہر اک سمت چھائیں گھٹائیں صفیں بچھ گئیں رنج و غم کی
مسیحی پئے سال رحلت، ای معراج تاریخ لکھے
زر افشان خلد برین ہیں، محمد سلیمان ندوی
۵۳ ء ۱۹ء

(۷)
قیامت نے انگڑائیاں لیں بنا دل سراپا محشر
زمانے نے آنسو بہائے، ہوئی غیر حالت جہان کی
فلک نے پئے سال رحلت ہجری سنایا یہ مصرع
مقیم بہشت دل افزا، محمد سلیمان ندوی
۷۳ ہجری ۱۳

(۸)
بگرداب رنج مسلسل، گرفتار کردہ جہانے
برفتہ بدریائے رحمت، محمد سلیمان ندوی
ملائک پئے سال رحلت، مسیحی بمعراج گفتا
سخن گوئے عرفان جنت، محمد سلیمان ندوی
۵۳ عیسوی ۱۹

(۹)

مچا تہلکہ اہلِ دل میں، اٹھا شورِ محشر جہاں سے
زمانہ ہوا صرفِ ماتم، بہیں ندیاں اشکِ غم کی
خبر دی بسالِ ہلالی، ملائک نے معراجؔ مجکو
مکینِ بہشتِ حسین ہیں، محمد سلیمان ندوی

۷۳ ہجری ۱۳

(۱۰)

نمودم بہ خیلے تفکر ہمگی وو و تباریخ موزوں
چو رفتہ بآغوشِ رحمت، محمد سلیمان ندوی
سر و شم بسالِ مسیحی، بگفتا اے معراجؔ محزون
تمنائے توسیعِ جنت، محمد سلیمان ندوی

۵۳ عیسوی ۱۹

دردمندِ غمِ دل معراجؔ دھولپوری

۵۳ عیسوی ۱۹

# قطعۂ تاریخ

از

جناب قاضی فتح محمد فاتح بی اے منشی فاضل بھکر

آہ برفت آن ندوی سلیمان
جانبِ جنت شادان و فرحان
خلق بگرش زار و پریشان
چاک گریبان سینہ بریان
اہلِ کراچی افتان خیزان
سوے جنازہ زود گریزان
جملہ مسلمان ششدر و حیران
آہ سلیمان آہ سلیمان
صورت و معنی ظاہر و پنہان
اسف و تاسف خوان و گریان
اشک پیاپے ریزان ریزان
آہ تواتر افشان افشان
اشک بہ دیدہ دجلہ دجلہ
نالہ و گریہ قلزم و عمان
درد و عنا و کرب و مصیبت
ہو شر باشد صورتِ طوفان
درد ز حد تکلم افزون
رنج برون از حیطۂ امکان

رفت مورخ و عالم و شارح | صدرِ گرامی محفلِ عرفان
سیرتِ احمدِ مرسل گفته | سفته به سلک لآلی تابان
نثرِ مقفیٰ نظم مرصع | فکر به اوجِ ثریا طیران
آه ز مرگش گشت فسرده | مسند ایمان منبر ایقان
تختِ فقه را صدر نمانده | رخت سلیمان زتسک سلیمان
صبر و تحمل هیچ نمانده | قلب پریشان قالبِ بے جان
یاد ز شبلی تازه گشته | رفت بسویش بسته دامان
لکھنؤ پٹنه و اعظم گڑھ را | شهرتِ خاص بداد سلیمان
مرقد شهر کراچی گشته | الله الله سبحان سبحان
قائلِ حکمت و تحقیقش را | رازی و سینا و سعدی سحبان
نامِ بلندش تابان هر سو | ماهِ درخشان انجم رخشان
باز نیاید از ما رفته | رفت بگوشهٔ روضهٔ رضوان
صبر و تحمل باید کردن | اے دلِ نالان اے دلِ نادان

فاتحه خواند و فاتح گفته

اہلِ ادب، دہ گونہ سلیمان
۴۳- × ۱۹۱ × ۱۰ = ۹۱۰
۱۹۵۳ء

## یادِ سیدؒ

از جناب یحییٰ اعظمی

ہو گئی پھر تازہ یادِ سیدِ معجز رقم | آ گئی تیئیس ۲۳ نومبر کی گذشتہ شام غم

ہو گیا مصروفِ ماتم، پھر جہانِ علم و فن
وقفِ غم پھر ہو گئی دنیائے قرطاس و قلم

مسندِ استاذ پھر سونی نظر آنے لگی
بن گئی "بزمِ معارف" پھر سراپا بزمِ غم

زمزمے حکمت کے ہیں اب وہ نہ نکتے علم کے
ہو گئی ہے کس کے ماتم میں جبینِ خامہ خم

دیر سے روشن تھی جو وہ شمعِ دانش بجھ گئی
ہے بجا گر ہیں سیہ پوش آج اسرار و حکم

کس کی محفل میں قلم اسکا ہے اب معجز طراز
وہ کہ مسجودِ ملک تھا جس کا ہر نقشِ قلم

نسخۂ سیرت ابھی تک تشنۂ تکمیل ہے
اب کہاں سے لائیں ہم وہ خامۂ معجز رقم

ہم نے مانا منتظر تھی قدس کی محفل، مگر
اس قدر عجلت تھی کیا اے سیّدِ ذالاحشم

کارنامے تیرے مقبولِ حریمِ قدس ہیں
تیری صورت کی قسم "پاکیزہ سیرت" کی قسم

سرورِ کونین کے دربار میں ہے مستجاب
زندگی بھر کی تری سعیِ گرامی لاجرم

صرف کر دی مدحِ سرکارِ دو عالم میں حیات
تیرے طغرائے شرف کے واسطے یہ کیا ہے کم

تیری ہی ذاتِ گرامی کے لئے مخصوص تھے
طرۂ تاجِ معارف، خاتمِ مجد و کرم

تیرے فیضانِ معارف سے سبھی تھے بہرہ مند
ہند سے تا خاکِ پاکستان عرب سے تا عجم

روز اٹھتے ہیں کہاں ایسے رجالِ علم و فن
عصرِ نو میں یہ مبارک زندگی تھی مغتنم

غیر ممکن ہے تلافی آہ اس فقدان کی
تیری ہستی تھی وطن میں نازشِ خیرالامم

سینۂ اُمت سے مٹ سکتا نہیں ہرگز یہ داغ
کس طرح ملت بھلائے "سید الملت" کا غم

تیرے اس عزمِ سفر کی ہم کو کیوں ہوتی خبر
دیر سے تھے دور تیری بزم سے اے محترم

آہ کیا معلوم تھا، اے سید و مولائے ما
محفلِ امکان سے اب اٹھنے کو ہیں تیرے قدم

ورنہ کچھ جلوے جمالِ آخریں کے جا کے ہم
اپنی چشمِ تر میں کر لیتے ادب سے مرتسم

آہ یہ تنہا نہیں اک ملت و اُمت کا غم
بلکہ ہے سارے جہانِ دانش و حکمت کا غم

# صد آہ

از

جناب حکیم سیّد مصلح الدین صاحب کاظمی

آہ اے سید و علامہ سلیمان صد آہ — آہ اے باعثِ صد نازشِ دوراں صد آہ
آہ اے پرچمِ معمورۂ شبلی منزل — آہ اے طرۂ آن شبلیِ ذیشان صد آہ
آہ اے آنکہ بتو غالب و حالی نازاں — آہ اے صاحبِ اقبالِ درخشاں صد آہ
آہ اے رمز شناسِ ادب و روحِ سخن — آہ اے واقفِ اسرارِ قلمداں صد آہ
آہ اے شاہِ سخن، فخرِ زمن، نازِ وطن — آہ ممدوحِ ہمہ گبر و مسلماں صد آہ
آہ اے تابعِ سنّت و متبوعِ زماں — آہ اے پیکرِ اوصافِ رسولاں صد آہ
آہ اے مجتنبِ جملہ نواہی ز شباب — آہ تا شیب چناں تابعِ قرآں صد آہ
عالمِ عظمتِ سرکارِ دو عالم بکمال — کاتبِ سیرتِ لولاک بدیساں صد آہ
صدقِ بوبکرؓ، نظامِ عمرؓ و حبِ علیؓ — بود روشن ز تو با غیرتِ عثمانؓ صد آہ
انجمان پرتوِ خود گرچہ فرو می ریزند — بود نورِ تو دگر، اے مہِ تاباں صد آہ
آمدی دشتِ سخن گشت گلستانِ بہار — رفتہ، شد ہمہ گلزار بیاباں صد آہ
گلشنِ علم و ادب آہ نمودی ویراں — کردی آباد مگر شہرِ خموشاں صد آہ
ہاتفم گفت بتاریخِ وفاتش ثاقب — "رونقِ باغِ ادب آہ سلیماں" صد آہ

۱۳۷۳ھ

عیسوی ہم بہمیں لہجۂ غم ظاہر کرد
"جُودِ استادِ زماں رفت" ز ایماں صد آہ

۱۹۵۳ء

# قطعۂ تاریخ

از

جناب سید شاہ محمد منظور الرحمن اختر کاکوی

پھول پژمردہ ہیں اور کلیاں اداس — روح فرسا کیا خبر لائی صبا
مرثیہ خواں کیوں ہیں مرغانِ چمن — رنگ پھیکا ہوگیا کیوں باغ کا
رہبر قوم وامامِ اہلِ دین — مخزنِ صد علم وزہد واتقا
فخرِ اشرف، نازِ شبلی حیف حیف — ہائے وہ سیرت نگارِ مصطفےٰ
گلستانِ علم کو تھا جس پہ ناز — وہ گلِ سرسبد ہی مرجھا گیا
وہ سلیمان باعثِ فخرِ بہار — سوگ میں ہے جس کے سارا انڈیا
ہند ہی کیا عالمِ اسلامیاں — وقفِ نالہ وقفِ غم وقفِ بکا
اہلِ ندوہ غم کی اک تصویر ہیں — دارِ شبلی میں ہے اک محشر بپا
روح یہ کس کی چلی سوئے فلک — جس سے روشن ہوگئے ارض وسما
عالمِ بالا سے آئی ہے صدا — مرحبا اھلاً وسھلاً مرحبا
می شود بارانِ رحمت رازدل — بر مزارش روز وشب صبح ومسا

سالِ رحلت اس سے جب پوچھا گیا
بولا اختر "فخرِ ملت ہائے وا"
۱۳۷۳ھ

## آہ سید سلیمان ندوی

از جناب فانی مرادآبادی

آج اک نیر درخشاں تیرگی میں کھوگیا — وسعتِ آغوشِ ظلمت میں سویرا ہوگیا

تلملا کر مسکراہٹ رہ گئی غنچوں کی آج — ہو گئی تبدیل اشکوں میں ہنسی پھولوں کی آج

لٹ گیا تاریخِ حاضر کا موادِ بے شمار — بجھ گئی شمعِ کمالی، چھن گیا جوشِ بہار

اُٹھ کہ ماہِ بزمِ ندوہ پر گہن طاری ہے آج — دودِ اسود، ابرِ تیرہ، نور پہ بھاری ہے آج

ایک اعظم گڑھ ہی کیا عالم ہوا ماتم کناں — جسم کیا دل بھی ہیں ملبوس لباسِ غم کناں

سیرتِ شاہِ دو عالم کا مصنف مر گیا — گوہرِ نایاب سے پہلو زمیں کا بھر گیا

مر گیا سید سلیمان؟ کون کہتا ہے ندیم — سو گیا وہ گور میں کس نے کہا تجھ سے ندیم

اُس کی تصنیفاتِ لافانی تو زندہ ہیں ابھی — اُس نے جو سینچے تھے وہ پودے شگفتہ ہیں ابھی

موت اُس کی اصل میں اک دورِ تمہید ہے — ورنہ ہر سعی سلیمان زندۂ جاوید ہے

آنے والے ہر مورّخ کے لئے زندہ ہے وہ — جادۂ تاریک میں نجم درخشندہ ہے وہ

اس کی تصنیفات دیں گی تقویت اسلام کو
ڈال دیں گی گردشوں میں گردشِ ایام کو

## تاریخِ وفاتِ حسرت آیاتِ علامہ سید سلیمان ندوی

از

جناب مشتاق راندیری

(١)

سینہ کوبی میں ہر اک ہے مبتلا
ہے جہان غمگین و دل افگا آج
خلد کا پروانہ سید کو ملا
داخلِ جنت ہوا دیندار آج

١٣٧٣ھ

(٢)

سید عالی و سلیمان جاہ
وہ مورخ وہ فخر العلما حشم
اُن کو جنت خدا نصیب کرے
جن کی خو تھی نوا نعیم و کریم

١٩٥٣ء

(۳)

موت عالم کی موت عالم ہے
مضطرب ہو رہے ہیں اہلِ دل
بے شبہہ سید سلیمان تھے
زبدۂ خلق زینتِ محفل

۱۳۷۳ھ

(۴)

سید با خدا کے مرنے پر
موت کو موت بھی نہیں آئی
باغ نسرین پا ئیں خلد میں وہ
جن کے غم میں ہے خلق بولائی

۱۳۷۳ھ

## قطعہ تاریخ و تاریخی مادے

راقم تر دامن سید مہدی حسن

۱۳۷۳ھ

جادو رقم ۔ سیفِ قلم ، علامہ ۔ استاد الکل

۱۳۷۳ھ

علوم اسلام کے جوئے شیر کے فرہاد
سید محمد سلیمان بدر الاسلام

۱۹۵۳ء

غفرہٗ المجید

۱۳۷۳ھ

ہر طرح سے وہ کامیاب ہوئے
اُس کی رحمت سے فیضیاب ہوئے
اپنی خدمات کا صلہ پایا
داخل خلد بے حساب ہوئے

۱۳۷۳ھ

در سن رحلتش چو شد مامور
ہاتفے گفت زاہدے مغفور

۱۳۷۳ھ

# ہجری و عیسوی تاریخی مادے

از

جناب نسیم دہلوی

### برائے ۱۳۷۳ھ

۱۔ آہ مولانا سید محمد سلیمان صاحب ندوی رحلت فرمود ہی انا للہ و انا الیہ راجعون

۲۔ آہ علامہ سید محمد سلیمان ندوی علیہ الرحمۃ،

۳۔ ہائے سید محمد سلیمان صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ

۴۔ بلند قدر زیبائے جہان مولانا سید محمد سلیمان ندوی مرحوم

۵۔ ہادی دین سید محمد سلیمان ندوی رحلت کرد،

۶۔ ارتحال علامہ جہان سید محمد سلیمان صاحب ندوی

۷۔ بقول انہ من سلیمٰن و انہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم،

۸۔ آہ مقبول دوران عالیجناب مولانا سید محمد سلیمان صاحب ندوی چل بسے،

### برائے ۱۹۵۳ء

۱۔ آہ ہادی مخدوم مولانا سید محمد سلیمانؒ صاحب ندوی انا للہ و انا الیہ راجعون،

۲۔ ادیب، مولانا سید محمد سلیمان ندوی غفرلہ اللہ،

۳۔ امیر علم دینؒ ادیبؒ مولٰنا سید محمد سلیمان صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ

۴۔ موحد ادیب مولانا سید محمد سلیمان صاحب ندوی رضوان میں ہیں

۵۔ صاحب اقبال و علم و فضل مولانا سید محمد سلیمانؒ صاحب ندوی

۶۔ آہ واحد مورخ اسلام مولانا سید محمد سلیمان صاحب ندوی مرحوم

۷۔ ادیبؒ مولانا سید محمد سلیمان صاحب کراچی پاکستان میں فوت ہوئے

۸۔ حضرت ادیب سید محمد سلیمان صاحب ندوی

## قطعۂ تاریخ

از

جناب عطاء الرحمٰن پانوی

کرے کیا کہ انسان مجبور ہے  
خدائی میں حکم قضا ہے اٹل

یہ سید سلیمان ندوی کی موت  
ہے ماتم کی جا اور غم کا محل

یہ ان کی نہیں علم و فن کی ہے موت | نہ آنکھوں سے کیوں آئیں آنسو نکل
وہ علامۂ دہر شیریں مقال | مکمل صفات و مجسم عمل
عطاؔ کو ہوئی فکر تاریخ کی | تو یہ مادہ خود ہی آیا نکل

نہ کچھ تعمیہ اور نہ کچھ تخرجہ
غم عالم بے بدل باعمل
سنہ ۱۳۷۳ھ

# قطعۂ تاریخ ارتحال

از

جناب اصطفا خان صاحب لکھنوی

اہل مرتبت سید سلیمان ندوی

بفردوس سید سلیمان ندوی | ز دار فنا رفت شاداں و فرحاں
سبک گام چوں بود بر جادۂ دیں | گراں بود منزل چہ سان گشت آساں
نماز عشا کرد و از اشارہ | بہ پیک اجل گفت لبیک شاداں

بگفت اصطفا سال رحلت بہجری
دلا شیخ الاسلام سید سلیمان
سنہ ۱۳۷۳ھ

# مجلسِ ادارت

جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی — صدر

جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی — رکن

جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی — "

جناب مولانا عبدالسلام صاحب ندوی — "

شاہ معین الدین احمد ندوی — مرتب

سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے — شریک

---

(طابع و ناشر صدیق احمد)